بہار/گرما ۱۹۹۷

آج

ترتیب: اجمل کمال

نیر مسعود جون ایلیا اسد محمد خاں ذی شان ساحل

شمس الرحمٰن فاروقی اُدے پرکاش وجے دان دیتھا

فہمیدہ ریاض خالدہ حسین اسٹان سیسر

تھامس الوئے مارتینیز ہیوگو فان ہوفمنستال اٹالو کلوینو

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

کتب خانہ

پیپربیک سیریز

نیّر مسعود
طاؤس چمن کی مینا

محمد خالد اختر
لالٹین
اور دوسری کہانیاں

حسن منظر
سوئی بھوک

اسد محمد خاں
غصے کی نئی فصل

نسیم انصاری
جوابِ دوست

سعید الدین
رات

ریشارد کاپوشنسکی
شہنشاہ

صادق ہدایت
بوفِ کور

مکمل قیمت: ۶۰۰ روپے
پورا سیٹ براہِ راست خریدنے پر ۴۰۰ روپے میں دستیاب ہوگا
رجسٹرڈ ڈاک کا خرچ ۵۰ روپے اس کے علاوہ ہے

ملنے کا پتا:
آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰
فون: 8113474

ترجمے:

راشد مفتی　　زیبا علوی

افضال احمد سید　　عبدالعظیم سومرو

محمد سلیم الرحمٰن　　اجمل کمال

شمارہ ۲۵　　بہار/گرما　　۱۹۹۷

آج

ترتیب: اجمل کمال

Scanned with CamScanner

بہار اک ۱۹۹۷
اپریل ـ ستمبر ۱۹۹۷

مینیجنگ ایڈیٹر
زینت حسام

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۴۰، سیکٹر ۱۱ بی، نارتھ کراچی ٹاؤن شپ، کراچی ۷۵۸۵۰

طباعت
ایجوکیشنل پریس
پاکستان چوک، کراچی

رابطے کے لیے پتا:
اے ۱۶، سفاری ہائٹس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰
فون: ۸۱۱۳۳۷۳
ای میل: aaj@biruni.crum.com.pk

بیرونِ ملک خریداری کے لیے پتا:
محمد عمر میمن
۷۱۵۳، ریجنٹ اسٹریٹ، میڈیسن، وسکانسن ۵۳۷۰۵، یو ایس اے

مدیر "سوغات"، بنگلور

محمود ایاز کی یاد میں

Scanned with CamScanner

ترتیب

نیر مسعود

۷

گنجفہ

جون ایلیا

۴۳

ولایتِ خائباں

آزمایش　خلوت　مقولۂ عنکبوت

پہنا، دراز اور ژرفا　تمثیل　بودش

اسد محمد خاں

۵۳

شہر کے لیے

تلسی داس کا ایک گیت

ذی شان ساحل

۶۵

ملکہ کی واپسی　دہشت گرد شاعر

آدمی زندگی　شام ہم　جہاز

اندھیرے میں　نظم　نظم

Scanned with CamScanner

شمس الرحمٰن فاروقی

۷۳

ایرانی فارسی، ہندوستانی فارسی اور اردو: مراتب کا معاملہ

اُدے پرکاش

۱۰۹

چھپن تولے کا کردھن

۱۲۷

ٹیپچو

وجے دان دیتھا

۱۵۳

آدم زاد

فہمیدہ ریاض

۱۹۵

وہ چلی گئی

خالدہ حسین

۲۱۰

پارس بیا

Scanned with CamScanner

اسٹان سیسر

۲۲۴

ایک فراموش کردہ ملک

تھامس الوسے مارٹینیز

۲۸۵

وعدہ

ہیوگو فان ہوفمنشتال

۳۰۴

آگ کے رنگ

انتخاب

اِٹالو کلوینو

۳۱۷

دولت سورما

نیر مسعود

گنجفہ

"… یہ تو عرض کر چکا ہوں کہ گنجفے میں آٹھ بازیاں ہوتی ہیں: تاج، زرِ سفید، شمشیر، غلام- یہ اوپر کی بازیاں کہلاتی ہیں- پھر نیچے کی بازیاں ہیں: چنگ، زرِ سُرخ، برات، قماش…

زرِ سُرخ کا میر [جو] "آفتاب" کہلاتا ہے، … پورے کھیل میں سب سے اہم پتّا ہے- اس کے بعد زرِ سفید کا میر جو "ماہتاب" لقب رکھتا ہے- رُتبہ، ظاہر ہے کہ، ماہتاب کا آفتاب سے کم تر ہے، لیکن یہ بات آفتاب کی درخشانی تک محدود ہے-

…دن کو آفتاب جس کھیلنے والے کے پاس ہو وہ بازی کو شروع کرتا ہے اور آفتاب کے جلو میں ماہتاب ایک کم قیمت، بلکہ بے قیمت، پتّا ہوتا ہے- رات کے وقت آفتاب کے حقوق ماہتاب کو مل جاتے ہیں اور آفتاب کی حیثیت ایک معمولی میر کی رہ جاتی ہے-"

(خطوطِ مشاہیر)

اپنی زندگی مجھ کو بلوے والی رات سے بُری لگنا شروع ہوئی- اُس رات جب میں قبرستان سے گھر واپس آ رہا تھا تو راستے میں کئی جگہ مجھ کو روک کر پوچھ گچھ کی گئی- پوچھ گچھ کیا، صرف تین سوال کیے جاتے تھے: "کیا نام ہے؟"، "کہاں رہتے ہو؟" اور "کیا کرتے ہو؟" پہلے اور دوسرے

سوال کا جواب میں فوراً دے دیتا تھا لیکن تیسرے سوال پر اٹک جاتا تھا۔ میں جواب سوچتا رہ جاتا اور پوچھنے والے مجھے ڈپٹ کر فوراً گھر جانے کی تاکید کرتے۔ پھر کسی اور راہ چلتے کو روک کر اس سے بھی سوال کرنے لگتے۔ اس میں دو ایک کی پٹائی بھی ہو گئی۔ شروع شروع میں تو میں بہت ڈرا ہوا تھا کہ یہ تیسرا سوال کہیں مجھ پر بھی نہ ہاتھ اٹھوا دے، اس لیے اس کا جواب دیتے ہوئے بوکھلا جاتا تھا، لیکن اپنا گھر قریب آتے آتے مجھ کو اس سوال پر کچھ کچھ غصہ آنے لگا۔ اور جب آخری بار مجھ سے پوچھا گیا "کیا کرتے ہو؟" تو میں نے دل ہی دل میں جواب دیا:

"اماں کی کمائی کھاتا ہوں۔"

اماں کی کمائی میرے ابا بھی کھاتے تھے۔ دمے کی بیماری اور لاٹری کے شوق نے انھیں کسی کام کا نہ رکھا تھا۔ میں نے انھیں پڑے پڑے کھانسنے یا لاٹری کے ٹکٹ پھاڑ پھاڑ کر پھینکنے کے سوا کچھ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ گھر کا خرچ اماں چکن کی کڑھائی کر کے چلاتی تھیں۔ اماں ہی نے مجھے تعلیم بھی دلوائی جس کے دوران ان کو شاید یہ خیال ستانے لگا کہ کہیں ابا کا روگ مجھے بھی نہ لگ جائے، اس لیے انھوں نے مجھ کو آگے پڑھنے کے لیے اپنی ایک منھ بولی بہن کے یہاں الہ آباد بھیج دیا۔ مجھ کو یقین ہے کہ وہ اُن بہن کو ہر مہینے میرے خرچ کے علاوہ اوپر سے بھی کچھ بھیجتی تھیں۔ میرے الہ آباد جانے کے دوسرے تیسرے سال ابا کی وفات ہو گئی تھی لیکن میری تعلیم الہ آباد ہی میں پوری ہوئی جس کے بعد میں لکھنؤ واپس آ گیا تھا، اور اب کئی سال سے آوارہ گردی کر رہا تھا اور اپنے مرحوم باپ کی طرح اماں کی کمائی کھا رہا تھا۔ کام اگر کچھ کرتا تھا تو بس اتنا کہ جمعرات جمعرات ابا کی قبر پر شمع جلا آتا تھا۔ لیکن میں اپنی زندگی سے خوش تھا۔

بلوے کی اُس رات اِس تیسرے سوال کا جواب دیتے دیتے میں نے اپنی اس زندگی کو، جس سے میں خوش تھا، بار بار، لیکن ہر بار ایک ہی طرح سے، گزرتے ہوئے دیکھا اور آخر مجھ کو اپنے آپ پر غصہ اور اپنی اماں پر ترس آنے لگا جو اُس وقت اور بڑھ گیا، غصہ بھی اور ترس بھی، جب گھر کے دروازے پر پہنچ کر پڑوسیوں سے مجھ کو معلوم ہوا کہ اماں بلوے کی خبر سنتے ہی برقع اوڑھ کر مجھے ڈھونڈھنے نکل گئی تھیں اور ابھی تک واپس نہیں آئی ہیں۔ انھیں روکنے کی بہت کوشش کی گئی تھی لیکن انھوں نے کسی کی نہیں سنی۔ مجھے خیال آیا کہ اُن سے بھی پوچھا جا رہا ہو گا،

Scanned with CamScanner

"کیا نام ہے؟"، "کہاں رہتی ہو؟"، "کیا کرتی ہو؟" میں اُسی وقت ان کی تلاش میں جا رہا تھا لیکن پڑوسیوں نے مجھے زبردستی روک لیا۔ اماں سب کو قسم دے گئی تھیں کہ اگر میں اُن کی واپسی سے پہلے گھر پہنچ جاؤں اور ان کو ڈھونڈھنے کے لیے پھر نکلنے لگوں تو مجھے جانے نہ دیا جائے۔ پڑوسی مجھ سے بلوے کا حال پوچھ رہے تھے لیکن میں نے یہ کہہ کر انھیں ٹال دیا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔ اور سچی بات بھی یہی تھی۔ مجھ کو اماں کی فکر لگ گئی تھی اور میں پڑوسیوں کے روکنے سے رُکنے والا نہیں تھا لیکن صرف یہ سوچ کر رک گیا کہ اگر میرے چلے جانے کے بعد اماں واپس آئیں گی تو پھر میری تلاش میں نکل کھڑی ہوں گی، اس لیے میں گھر کے اندر آ گیا۔ دالان میں چوکی پر میرا کھانا سینی سے ڈھکا رکھا تھا اور ایک پڑوسن اس کے پاس بیٹھی میرا انتظار کر رہی تھیں۔ اماں ان کو بھی قسم دے کر گئی تھیں کہ میرے آتے ہی مجھ کو کھانا کھلا دیں۔ میں نے پڑوسن کو رخصت کر دیا۔ کھانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن بھوک بھی بہت لگ رہی تھی۔ ہاتھ منہ دھو کر سینی کے پاس بیٹھ گیا۔ اُسی وقت اماں آگئیں۔

اُن کو باہر ہی پڑوسیوں سے معلوم ہو گیا تھا کہ میں صحیح سلامت گھر پہنچ گیا ہوں، پھر بھی وہ گھر کے اندر اس طرح بَین کرتی ہوئی داخل ہوئیں جیسے میری لاش دیکھنے کے لیے لائی جا رہی ہوں۔ اور میرے پاس پہنچ کر انھوں نے وہ سب کیا جو کوئی ماں اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کو پانے کے بعد کر سکتی ہے۔ اُس وقت مجھ کو اندازہ ہوا کہ وہ اب تک مجھ کو چھوٹا سا بچہ سمجھتی ہیں جو ماں کی انگلی پکڑ کر چلنے کا عادی ہو۔ اُسی وقت مجھ کو یہ بھی احساس ہوا کہ میں بہت بڑا ہو چکا ہوں اور "کیا کرتے ہو؟" کا میرے پاس ایک ہی جواب ہے۔

مجھے کھانا کھلانے سے لے کر بستر پر لٹا کر تھپکنا شروع کرنے تک وہ بار بار مجھ کو اس طرح چھو کر دیکھتی رہی تھیں جیسے انھیں یقین نہ آ رہا ہو کہ میں پورے ہاتھ پیر لے کر گھر واپس آیا ہوں۔ اب میں چپ چاپ لیٹا ہوا تھا، نیند آ چلی تھی اور اماں قریب بیٹھی مجھے دیکھے جا رہی تھیں۔ دیر کے بعد انھوں نے پوچھا:

"کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں،" میں نے جواب دیا، "کیوں؟"

"راستے میں کچھ ہوا تو نہیں؟"

Scanned with CamScanner

"کچھ بھی نہیں،" میں نے کہا، "کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"کسی نے کچھ کہا؟"

"نہیں تو۔"

وہ اسی طرح مجھے دیکھتی رہیں۔ پھر بولیں:

"اب سے ہم تمھیں باہر نہیں نکلنے دیں گے۔"

تب میں نے کہا؛

"اماں، اب سے میں تمھاری کمائی نہیں کھاؤں گا۔"

اُسی رات اماں پر کھانسی کا پہلا بڑا دورہ پڑا۔

میں نے اماں کو بتائے بغیر کام کی تلاش میں نکلنا شروع کر دیا، لیکن مجھ کو یہی خبر نہیں تھی کہ کام کس طرح تلاش کیا جاتا ہے، اس لیے پہلے کی طرح آوارہ گردی کر کے واپس آ جاتا تھا، اور کچھ دن بعد گھر سے نکلتے وقت مجھے یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ کام ڈھونڈھنے نکل رہا ہوں۔ لیکن اب آوارہ گردی میں بھی میرا دل نہیں لگتا تھا۔ رفتہ رفتہ گھر سے میرا نکلنا کم ہو گیا، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بڑھ گیا، اس لیے کہ اب میں دن میں کئی کئی بار باہر نکلتا تھا، لیکن تھوڑی ہی دیر بعد گھر واپس آ جاتا، پھر نکلتا، پھر واپس آ جاتا۔

اُسی زمانے میں ایک دن میں نے اماں کو دیکھا کہ بہت باریک سفید کپڑے کا ایک پرچہ آنکھوں سے قریب قریب لگائے ہوئے اس پر سفید دھاگے سے ایک نازک سی بیل کاڑھ رہی ہیں۔ میں ان کے پاس چوکی پر بیٹھ گیا اور بولا:

"اماں، کپڑا آنکھوں کے اتنے قریب کر کے نہ کاڑھا کرو۔ نگاہ کمزور ہو جائے گی۔"

"وہ تو کمزور ہو ہی گئی ہے، بیٹے،" انھوں نے کہا۔ پھر ان پر کھانسی کا ہلکا سا دورہ پڑا۔

"کھانسنے بھی بہت لگی ہو۔"

"کھانسی تو آتی جاتی رہتی ہے،" وہ بولیں، "مگر رات کو سانس جو پھولتی ہے۔"

"تو کوئی دوا..."

"دوا ہے،" انھوں نے کہا، "کھاتے ہیں۔ فائدہ بھی ہے۔"

Scanned with CamScanner

لیکن انھیں فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ یا شاید وہ دوا کھا تی ہی نہیں تھیں۔ میں نے ایک دن ان کو پھر ٹوکا:

"اماں، تمھاری کھانسی کم نہیں ہو رہی ہے۔"

"کم تو ہو گئی ہے۔ بس رات کو زیادہ آتی ہے،" انھوں نے بتایا، پھر کچھ رک کر پوچھا، "تمھاری نیند تو نہیں خراب ہوتی؟"

میری نیند خراب نہیں ہوتی تھی، لیکن ایک رات کوئی خواب دیکھ کر میری آنکھ کھل گئی۔ اندھیرا تھا اور میں اس خواب کو بھول گیا تھا۔ میں نے اُسے یاد کرنے کی کوشش کی۔ نہیں یاد آیا۔ میں نے کروٹ بدل لی اور دوبارہ سونے کو تھا کہ مجھے اماں کے کھانسنے کی دبی دبی آواز سنائی دی۔ مجھ کو نیند کا ایک جھونکا آیا، پھر ایک اور، لیکن کھانسنے کی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ میں نے آنکھیں پوری کھول دیں اور کانوں پر زور دیا۔ آواز باہر صحن کی طرف سے آ رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ صحن میں تاروں کی ہلکی روشنی تھی لیکن اماں مجھے نظر نہیں آ رہی تھیں۔

"اماں!" میں نے پکارا، "انگنائی میں کیا کر رہی ہو؟"

جواب میں صرف کھانسی کی آواز سنائی دی۔ میں اٹھ کر صحن میں آ گیا۔ اماں کنویں کے پاس زمین پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے قریب جا کر انھیں پکارا۔ پھر جھک کر دیکھا۔ وہ اپنے دوپٹے کے ایک پلو کا گولا سا بنا کر منھ پر رکھے کھانس رہی تھیں اور ان کا بدن بار بار جھٹکے کھا رہا تھا۔ میں ان کے قریب بیٹھ گیا۔

"اتنی دیر سے کھانس رہی ہو،" میں نے کہا، "مجھے جگایا بھی نہیں؟"

وہ جواب دینے کی حالت میں نہیں تھیں۔ میں انھیں پکڑ کر دالان میں لے آیا اور بستر پر بٹھا کر ان کی پیٹھ سہلانے لگا۔ دیر میں ان کی سانس ٹھہری۔ انھوں نے پانی مانگ کر پیا، پھر بولیں:

"تم کیوں اٹھ گئے؟"

"خواب دیکھا تھا،" میں نے جواب دیا۔ پھر وہ خواب مجھے کچھ کچھ یاد آنے لگا۔

"سو جاؤ" وہ بولیں، "ہم بھی سو جائیں گے۔"

میں نے دیکھا تھا کہ میں کھانا کھا رہا ہوں اور تم سامنے بیٹھی مجھے پنکھا جھل رہی ہو۔

Scanned with CamScanner

انھیں ہنسی آ گئی۔

"یہ بھی کوئی خواب ہے؟" انھوں نے کہا، اور اُن کے ساتھ ہی ساتھ میں نے کہا:

"اماں، مجھے چکن کاڑھنا سکھا دو۔"

انھوں نے کچھ پریشان ہو کر میری طرف دیکھا اور کہا، "نہیں بیٹے، آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔"

"تو کوئی اور کام سکھوا دو،" میں نے کہا، "یا کہیں نوکری دلواؤ۔ آخر کب تک ابا کی طرح تمھاری کمائی کھاؤں گا؟"

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہیں، پھر بولیں:

"اچھا ابھی تو سو جاؤ۔ ہمیں بھی نیند آ رہی ہے۔"

پھر انھوں نے لیٹ کر دوپٹے سے چہرہ ڈھانپ لیا۔

صبح اٹھتے ہی میں نے ان کو پریشان کرنا شروع کر دیا اور یہ خیال نہیں کیا کہ میں خود ایسا بچہ ہو رہا ہوں جو ماں کی انگلی پکڑ کر چلنا چاہ رہا ہو۔ میرے بار بار کے تقاضوں کو اماں خاموشی سے سن رہی تھیں، لیکن جب میں نے ایک بار پھر کہا

"آخر کب تک ابا کی طرح..."

تو اُن کا چہرہ لال ہو گیا، لیکن انھوں نے میرا گال تھپتھپا کر بہت نرم لہجے میں کہا:

"یہ ایک دم سے اپنے باپ کا کیوں بیری ہو گیا ہے، لڑکے؟"

"بیری نہیں، اماں،" میں بولا، "لیکن اُن کی ذات سے تم نے کتنے دکھ سہے ہیں۔"

"ہم نے کون سے دکھ سہے ہیں؟ دکھ تو انھوں نے سہے۔ مرد کو اچھا لگتا ہے کہ اُس کی عورت اُسے کما کر کھلائے؟ اُن کا زمانہ تھا تو انھوں نے ہمیں کما کر کھلایا، جب کسی کام کے نہ رہے..."

"میں نے تو انھیں کبھی کماتے نہیں دیکھا۔"

"تم نے دیکھا ہی کیا ہے، بیٹے،" وہ بولیں اور اچانک روہانسی ہو گئیں، "کون سا سکھ تھا جو مرنے والے نے ہمیں نہیں دیا۔ اور تمھارے لیے بھی کیا کچھ نہیں کیا۔"

Scanned with CamScanner

"میرے لیے؟" میں نے پوچھا۔ "میرے لیے انھوں نے کیا کیا؟"

"وہ تمھیں ولایت بھیج رہے تھے۔"

"ولایت؟"

"پڑھنے کے لیے،" انھوں نے کہا، "نہیں بھیج سکے، تو اب جو چاہے کہہ لو۔"

وہ پھر روہانسی ہو گئیں اور کچھ دیر تک خاموش رہیں۔

"ولایت۔۔"

"تمھارے پیدا ہونے سے پہلے ہی انھوں نے کہہ دیا تھا اگر بیٹا ہوا تو اسے ولایت میں پڑھوائیں گے۔"

"ولایت۔۔۔ تمھیں پتا ہے ولایت کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے کیا خبر،" وہ بولیں، "وہی بتاتے تھے سات سمندر پار کوئی کالج وج ہے۔"

"انھیں پتا بھی تھا ولایت جا کر پڑھنے میں کتنا خرچ بیٹھتا ہے؟"

"پتا کیوں نہیں تھا۔ کتنوں سے پوچھ پوچھ کر تو حساب لگایا تھا۔"

"کتنا لگا؟"

"مجھے کیا خبر کتنا لگا، مگر بہت تھا۔"

"پھر؟"

"پھر کیا، اللہ کے بندے نے ہمت نہیں ہاری۔ پہلے تو رستم نگر اور شاہ گنج والے مکان بیچے۔"

"دو دو مکان بیچ ڈالے؟"

"مکان کا ہے کو، کھنڈر تھے،" انھوں نے کہا، "پھر دفتر سے جتنا اُدھار مل سکتا تھا وہ لیا۔ کچھ پیسا ہمارے زیوروں سے آیا۔"

"تمھارے زیور بھی بِکوا دیے؟"

"اُن کے دل کو لگی ہوئی تھی۔"

"اور تمھارے دل کو؟"

"جو اُن کا دل وہ ہمارا دل۔ مگر ہم یہ انتظام دیکھ دیکھ کے کڑھتے بھی تھے کہ، اکیلی اولاد اور

Scanned with CamScanner

سات سمندر کا سفر..."

"اچھا، پھر یہ سب روپیا گیا کہاں؟"

اماں چپ رہیں۔ دیر تک نہیں بولیں تو میں نے پوچھا:

"سب لاٹری میں اُڑا دیا؟"

"نہیں۔ لاٹری تو جب اُن کا ہاتھ خالی ہو گیا... اُس کے پیسے ہم دیتے تھے۔"

"پھر اپنا روپیا کہاں اُڑایا؟"

"نہ انھوں نے بتایا، نہ ہم نے پوچھا۔ لیکن اتنی بات ہم جانتے ہیں، وہ کسی بُرے شغل میں نہیں تھے۔"

اس کے بعد وہ اس طرح خاموش ہوئیں کہ ان سے کچھ پوچھنا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوا، اس لیے میں بھی خاموش رہا، لیکن جب وہ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف جانے لگیں تو میں نے انھیں روک لیا۔

"اچھا، اس کے بعد؟"

"اس کے بعد کیا۔ سانس نے انھیں کسی کام کا نہ رکھا تھا۔ کھانسی اٹھتی تو معلوم ہوتا تھا دم اکھڑ جائے گا۔ نوکری پوری ہونے سے پہلے ہی دفتر والوں نے پنشن دے دی۔"

"کتنی پنشن ملتی تھی؟"

"اللہ جانے۔ ہمیں تو اس کی صورت دیکھنے کو ملی نہیں۔"

"پنشن بھی اُڑا ڈالتے تھے؟"

اس پر اُن کا چہرہ پھر لال ہو گیا۔

"اُڑانا اُڑانا کیا کر رہے ہو؟" انھوں نے کہا، "وہ اڑانے والے آدمی نہیں تھے۔"

"تو پھر پنشن..."

"دفتر کا قرضہ بھگتانے کے لیے بیچ دی۔ اب اسے تم اُڑانا کہہ لو۔"

مجھے اپنے سوالوں پر شرمندگی محسوس ہوئی۔ یہ بھی محسوس ہوا کہ میں نے اماں کو تکلیف پہنچائی ہے، اور یہ بھی کہ میں اپنے باپ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا؛ یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کس دفتر میں کام کرتے تھے۔

"ابا کس دفتر میں کام کرتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"لمبا سا انگریزی نام تھا، ہمیں یاد ہی نہیں ہو سکا۔"

"دفتر میں وہ کیا تھے؟"

"وہ بھی کوئی انگریزی نام تھا۔"

اس کے بعد پھر وہ دیر تک خاموش رہیں۔ آخر میں نے کہا:

"اچھا، ابا کی اور باتیں بتاؤ۔"

"کیا بتائیں،" انھوں نے کہا، "پنشن بیچ کر آئے تو دو دن تک کھانے پیے بغیر پڑے رہے۔ جان دے دینے پر مستعد تھے۔ ہم نے تمھاری جان کی قسم دی تو آپے میں آئے۔"

"پھر؟"

"پھر کیا، دوسرے دن سے ہم نے سوئی سنبھال لی۔"

"تمھیں چکن کاڑھنا آتا تھا؟"

"چھٹپنے ہی سے۔"

"کس نے سکھایا تھا؟" میں نے پوچھا اور مجھے احساس ہوا کہ میں اپنی ماں کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔

"پھپھی اماں نے،" وہ بولیں، "شوقیہ کاڑھتی تھیں۔ کھیل ہی کھیل میں ہم نے بھی سیکھ لیا۔ لیکن ہاتھ میں ایک ہنر آ گیا۔ نہیں تو آج تیرے میرے گھر میں جھاڑو برتن کر رہے ہوتے۔"

پھر اماں نے بتایا کہ انھوں نے کئی غریب لڑکیوں کو چکن کا کام سکھایا تھا اور یہ لڑکیاں اجرت پر کڑھائی کرنے لگی تھیں۔ جب ابا کے ہاتھ خالی ہو گئے تو یہی لڑکیاں کام آئیں اور ان کے ذریعے گول دروازے میں چکن کے ایک تھوک بیوپاری کے یہاں سے اماں کو بھی کام ملنے لگا تھا۔ اماں نے بیوپاری کی تعریف کی:

"لالہ بھلے مانس ہیں۔ اچھے کام کی پہچان ہے۔ کوئی کام بہت پسند آ جاتا ہے تو اپنی طرف سے بڑھا کے مزدوری دیتے ہیں۔"

پھر انھوں نے کوئی اور ذکر چھیڑ دیا اور بہت دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہیں۔ اس دن

Scanned with CamScanner

سے پہلے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اماں اتنی اچھی گفتگو کر لیتی ہیں۔ ان کی باتوں میں کھو کر میں بھول ہی گیا کہ ہماری گفتگو کہاں سے شروع ہوئی تھی۔ لیکن اماں نہیں بھولی نہیں، اس کا مجھے یقین ہے۔

۲

میں نے گھر سے نکلنا اور بھی کم کر دیا۔ زیادہ تر خالی بیٹھا بے دھیانی کے ساتھ دیکھا کرتا کہ اماں چوکی پر بیٹھی کڑھائی کر رہی ہیں اور کچھ کچھ دیر بعد کھانسنے لگتی ہیں۔ کبھی کبھی اُن پر کھانسی کا دورہ سا پڑ جاتا تو میں دوڑ کر انھیں پانی پلا دیتا، یا اُن کی پیٹھ سہلانے لگتا۔ تھوڑی دیر میں وہ ٹھیک ہو جاتیں اور پھر سوئی سنبھال لیتیں۔

ایک دن اُن کی پیٹھ سہلاتے سہلاتے میری نظر اُن کے پہلو میں رکھے ہوئے پارچوں کے ڈھیر پر پڑی اور میں نے کہا:

"اماں، اتنا کام نہ کیا کرو۔"

"موٹا کام ہے،" انھوں نے کہا، "اس میں دیر ہی کیا لگتی ہے۔"

میں نے ایک بار پھر کھردرے، رنگین کپڑے کے پارچوں کو دیکھا۔ یہ بھی دیکھا کہ اماں نے اُن پر رنگین دھاگوں سے بڑے بڑے پھول کاڑھے ہیں۔ میں اُن کو بہت ملائم اور باریک کپڑے پر سفید دھاگے سے کڑھائی کرتے دیکھتا آیا تھا۔ میں نے ایک گیروے رنگ کا کڑھا ہوا پارچہ اٹھا کر کہا:

"یہ کیسی کڑھائی ہے؟ پہلے تو تم..."

"مہین کام اب ہم سے نہیں ہوتا۔ ہاتھ کانپنے لگا ہے۔ آنکھ بھی وہ نہیں رہی،" انھوں نے گہری سانس کھینچ کر کہا، "پہلے ہمارا کام ولایت جاتا تھا۔"

"ولایت؟"

"وہاں ہمارے نام کی تو نہیں، کام کی بڑی دھوم تھی۔ لالہ بتاتے ہیں وہاں سے اُن کے پاس ہماری کڑھائی کے پرانے نمونے آتے ہیں کہ ایسا کام بھیجو۔"

مگر یہ میں نے اُڑے اُڑے سے رنگ کا ایک اور پارچہ اٹھا کر اس پر کڑھے ہوئے پھولوں کو دیکھا۔

"بازارو کام ہے،" نان نے کہا، "جس چیز کا چلن ہو جائے۔"

"یہ کون پہنتا ہوگا؟"

"خوب پہنتے ہیں، مرد بھی، عورتیں بھی۔"

"میں نے تو نہیں دیکھا۔"

"تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ اب کی باہر نکلنا تو خیال کر کے دیکھنا۔"

انھوں نے اپنی پیٹھ پر سے میرا ہاتھ ہٹایا اور ایک پارچہ اٹھا کر سوئی سنبھال لی۔ پارچے پر چھپی ہوئی وضع کو آنکھوں کے قریب کر کے کچھ دیر تک دیکھتی رہیں، پھر ان کی سوئی چھپائی پر چلنے لگی۔ میں نے دیکھا کہ پارچے پر رنگین دھاگے سے وہی چھپائی اُبھر رہی ہے۔ میں نے نان کو دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھیں اور ان کی سوئی چھپی ہوئی وضع پر چل رہی تھی۔ میں نے پھر ان کو دیکھا۔ وہ اب بھی میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

"نان، بغیر دیکھے کاڑھ رہی ہو؟"

"دیکھ تو لیا۔"

"ایک ہی بار تو دیکھا ہے۔"

"بار بار کیا دیکھیں،" انھوں نے کہا، اور پھر کہا، "موٹا کام ہے۔"

اس کے بعد میں خاموش بیٹھا انھیں کام کرتے دیکھتا رہا۔ وہ واقعی بڑی تیزی سے کڑھائی کر رہی تھیں۔ ایک پارچہ پورا کر کے دوسرا اٹھاتیں، اس پر چھپی ہوئی وضع کو آنکھوں کے قریب کر کے دیکھتیں، پھر اُن کی سوئی وضع پر چلنے لگتی۔ وہ اسی طرح کڑھائی کرتی رہیں یہاں تک کہ رات زیادہ آ گئی۔ انھوں نے کڑھے ہوئے پارچوں کو اٹھایا، دو تین بار گنا اور قاعدے سے تہ کر کے رکھ دیا۔ پھر بغیر کڑھے ہوئے پارچوں کو اٹھا کر گنا اور کچھ دیر تک میری طرف دیکھتی رہیں، پھر بولیں:

"نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"آ رہی ہے،" میں نے کہا، "تم بھی سو جاؤ۔ بہت رات ہو گئی ہے۔"

"تھوڑے ٹکڑے رہ گئے ہیں،" انھوں نے کہا، "پورے کر لیں، پھر سوتے ہیں۔"

"یہ تو بہت ہیں۔ انھیں چھوڑو، کل کر لینا۔"

"بہت نہیں ہیں، ابھی سوئے جاتے ہیں،" انھوں نے کہا، اور پھر وہی کہا، "موٹا کام ہے۔"

اُن کی سوئی پھر چلنے لگی۔ میں کچھ دیر تک پارچے پر عنابی رنگ کے دھاگے سے اُبھرتے ہوئے پانچ یا چھ پنکھڑیوں والے بڑے سے پھول کو دیکھتا رہا۔ پھر اپنے بستر پر دیوار کی طرف منھ کر کے لیٹ رہا اور شاید فوراً ہی سو گیا۔

دو تین بار اماں کے کھانسنے کی آواز سے میری آنکھ ذرا ذرا دیر کو کھلی جس کا مطلب میں نے یہی سمجھا کہ وہ جاگ رہی ہیں اور کام کر رہی ہیں اور صبح ہونے میں ابھی دیر ہے۔

دن چڑھے میری آنکھ کھلی تو دیکھا اماں چوکی ہی پر سو گئی ہیں۔ ان کا ایک ہاتھ بغیر کڑھے ہوئے پارچوں پر رکھا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان پارچوں کی تعداد قریب قریب اتنی ہی ہے جتنی میرے سوتے وقت تھی۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ سب سے اوپر والے پارچے کے عنابی پھول کی چوتھی پنکھڑی میں اماں کی سوئی لگی ہوئی تھی۔ میں نے اماں کا شانہ پکڑ کر آہستہ سے ہلایا، پھر ذرا زور سے ہلایا اور ان کو دھیرے سے پکارا، پھر زور سے پکارا۔ وہ ہلکی سی آہٹ پر جاگ جایا کرتی تھیں، اس لیے میں نے اُن کو غور سے دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ سو رہی ہیں یا بے ہوش ہیں۔ میں زور زور سے ان کا شانہ ہلانے لگا تو انھوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔

"اماں، کیسی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں،" انھوں نے کہا، "ہم ٹھیک ہیں، گھبراؤ نہیں۔"

"رات کو طبیعت خراب ہو گئی تھی؟"

"نہیں... ہاں، کچھ..."

پھر اُن پر کھانسی کا دورہ پڑا۔ میں دوڑ کر پانی لے آیا۔ اُن کو دینے لگا تو دیکھا اُن کا ہاتھ بُری طرح کانپ رہا ہے۔

"ہم پلائے دے رہے ہیں،" میں نے کہا اور ان کو پانی پلا دیا، پھر انھیں سہارا دے کر بستر

Scanned with CamScanner

پر لٹایا اور ان کے سرہانے بیٹھ گیا۔ ذرا دیر بعد ان کی سانس پھولنا شروع ہوئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ میں نے انھیں پھر لٹانا چاہا تو انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔ دوپہر کے قریب ان کی حالت کچھ سنبھلی۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان کی طبیعت کو پوچھتا تھا لیکن انھیں چپ سی لگ گئی تھی۔ صرف ہاں یا نہیں میں جواب دے رہی تھیں۔ ایک بار میں نے پوچھا:

"اماں، کچھ کھاؤ گی؟"

تو انھوں نے سر ہلا کر انکار کر دیا۔ میں نے بھی سویرے سے کچھ نہیں کھایا تھا، اور اب مجھے بھوک لگ رہی تھی۔

"کچھ کھا لو" میں نے اماں سے کہا۔

انھوں نے پھر سر ہلا کر انکار کیا اور دیر تک چپ رہیں۔ پھر اچانک زور سے بولیں:

"حُسنیٰ کو بلاؤ۔"

"حُسنیٰ؟"

"مکان جانتے ہو؟"

میں حسنیٰ بی کو نہیں جانتا تھا۔ پہلی بار اماں سے یہ نام سن رہا تھا۔ اتنے میں ان پر پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔ میں نے ان کی پیٹھ سہلانا شروع کی لیکن انھوں نے میرا ہاتھ ہٹا دیا اور کھانسی کے جھٹکوں کے بیچ میں اٹک اٹک کر کہا:

"حُسنیٰ... مکان نہیں جانتے؟ .. پیپل والا مکان ... آتش بازی اور گرشتی کے بیچ میں..."

پھر وہ گھٹنوں میں سر دے کر کھانسنے لگیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کو اس حالت میں چھوڑ کر کس طرح جاؤں۔ لیکن جب انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پہلے سے بھی زیادہ زور سے بولیں:

"تم گئے نہیں؟"

تو مجھے ان کے لہجے میں کچھ ایسی وحشت محسوس ہوئی کہ میں گھبرا کر گھر سے نکل آیا۔

چوک میں آتش بازی کی دکان مجھے معلوم تھی۔ لڑکپن سے اسے دیکھتا آ رہا تھا، لیکن یہ مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ اس کے پاس گرشتی کی دکان اور دونوں دکانوں کے بیچ میں کوئی گلی بھی ہے۔

خاصی چوڑی گلی تھی اور دور تک ادھر ادھر مڑتی چلی گئی تھی۔ دونوں طرف مکان بہت تھے لیکن سب کے سب کھنڈر ہو رہے تھے۔ گلی شاید ان گرے پڑے مکانوں ہی کی وجہ سے چوڑی معلوم ہونے لگی تھی۔ درخت کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ میں گلی کے موڑوں کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ آخر دو مکانوں کے پیچھے سے پیپل کی پھنگی جھانکتی دکھائی دی۔ کچھ دیر بعد میں ڈھیلی ڈھیلی اینٹوں والی ایک چھوٹی دیوار کے سامنے کھڑا تھا۔ درخت اسی دیوار میں سے اگا تھا اور اس کی جڑوں نے دور دور تک پھیل کر دیوار کو جکڑ رکھا تھا۔ جڑوں سے کچھ ہٹ کر مکان کا آدھا کھلا دروازہ تھا۔ میں نے دروازے کے کواڑ کو دو تین مرتبہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے کسی مرد کی آواز آئی:

"آ رہے ہیں۔"

آواز کچھ پہچانی ہوئی سی تھی۔ میں نے اسے یاد کرنے کی کوشش کی، لیکن اسی وقت مجھے اماں کا خیال آ گیا کہ گھر پر معلوم نہیں ان کی کیا حالت ہوگی۔ دروازے پر کھڑے کھڑے مجھے یہ بھی خیال آیا کہ میں ان کے پاس پڑوس کی کسی عورت کو بٹھا کر نہیں آیا ہوں۔ مجھے ان کی پھولی ہوئی سانس، اور کھانسی کے جھٹکے، اور کپکپاتے ہوئے ہاتھ یاد آئے۔ قریب تھا کہ میں گھر کی طرف بھاگنا شروع کر دوں، لیکن اسی وقت میں نے دیکھا کہ آدھے کھلے دروازے کے پیچھے اندھیری اندھیری ڈیوڑھی میں ایک عورت کھڑی مجھ کو دیکھ رہی ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور اس نے بڑھ کر دروازے کا ایک پٹ تھوڑا اور بھیڑ دیا۔ پھر مجھے اس کی آواز سنائی دی:

"کون صاحب ہیں؟"

"منشی صاحب یہیں رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی، یہی مکان ہے۔"

"آپ ہی ہیں؟"

"جی ہاں، کہیے۔"

"اماں کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ آپ کو بلوایا ہے۔"

وہ کچھ دیر تک دروازے کی اوٹ سے مجھے دیکھتی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ میں نے کہا:

"ان کی سانس بہت پھول رہی ہے۔ اور کھانسی ... کانپ بھی رہی ہیں۔ آپ کو جلدی بلایا

ہے۔ شاید

میں رک گیا۔ وہ کچھ نہیں بولی، اور مجھے پھر شبہ ہوا کہ میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ میں نے کہا:

"میں اُن کو اکیلا چھوڑ کر آرہا ہوں۔"

اس نے کچھ رک رک کر کہا:

"ہم انا کو کھانا کھلا رہے تھے۔ آپ چلیے۔ ہم ابھی آتے ہیں۔"

اس کے لوٹنے کا انتظار کیے بغیر میں تیزی سے واپس ہوا۔

اماں اسی طرح گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُن کی سانس اب بھی کچھ کچھ پھول رہی تھی لیکن کھانسی رک گئی تھی۔ آہٹ پا کر انھوں نے سر اٹھایا۔

"کہہ دیا،" میں نے اُن کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا، "ابھی آرہی ہیں۔"

"پریشان ہو گئی ہو گی بچاری،" اماں نے اپنے آپ سے کہا، پھر مجھ سے پوچھا، "تمھارے ساتھ ہی نہیں چلی آئی؟"

"نہیں،" میں نے کہا، "اپنے انا کو کھانا کھلا رہی تھیں۔"

"کیا کرے غریب،" اماں بولیں، "اپاہج باپ ہے۔"

"اماں، یہ حُسنی کون ہیں؟"

"بھلی لڑکی ہے،" انھوں نے بتایا، "چکن کاڑھتی ہے۔ ہم سے کام سیکھنے آتی تھی۔"

"تم سے؟" مجھے خواہ مخواہ کچھ حیرت ہوئی، "میں نے تو نہیں دیکھا۔"

اماں کچھ کہتے کہتے رکیں۔ شاید "تم نے دیکھا ہی کیا ہے" کہنے جا رہی تھیں۔ پھر بولیں:

"تم اُس وقت الہ آباد میں تھے۔"

"اور ان کے باپ کو کیا ہو گیا ہے؟"

"پیر رہ گئے ہیں دکھیارے کے،" انھوں نے کہا، "تم تو اس کا منجن بہت لایا کرتے تھے۔"

"منجن؟"

"ہاں۔ وہی لاڈلے کا بادشاہی منجن۔"

لاڈلے؟ میں نے حیرت سے پوچھا، وہ لکھنؤ ہی میں ہے؟

"مُردے سے بدتر۔ دونوں ٹانگیں سوکھتی چلی جا رہی ہیں۔"

اسی وقت دروازے پر آہٹ ہوئی اور حُسنیٰ اندر داخل ہوئی۔ وہ برقعے کی نقاب اُلٹے ہوئے تھی اس لیے میں نے اُسے پہچان لیا۔ مجھ کو حیرت ہوئی کہ وہ اتنی جلدی پہنچ گئی۔ اماں اُسے دیکھتے ہی بشاش ہو گئیں۔

"آؤ بیٹی، آؤ" انھوں نے کہا، "ہم کو معلوم تھا تم اڑ کر پہنچو گی۔"

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی دالان کی طرف بڑھنے لگی اور میں زینہ چڑھ کر مکان کی چھت پر آ گیا۔

ختم ہوتی ہوئی دوپہر کی دھوپ میں سُستی کے ساتھ اڑتی ہوئی چیلوں کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ میں نے شاید برسوں سے سر اٹھا کر اوپر نہیں دیکھا ہے۔ اس وقت ہر طرف پھیلے ہوئے شفاف نیلے آسمان اور لاڈلے کے نام نے مجھے بچپن کے زمانے میں پہنچا دیا۔ اس زمانے میں نخاس کا اتواری بازار جن لوگوں کی وجہ سے مجھے اپنی طرف کھینچتا تھا اُن میں نٹوں، جادوگروں اور انوکھے جانور پکڑ کر لانے والے ایک آدمی کے علاوہ لاڈلے بھی تھا۔ وہ سڑک کے کنارے ایک چادر بچھا کر کھڑا ہوتا تھا۔ چادر پر چھوٹی چھوٹی کھلی ہوئی تھیلیوں میں پچاس ساٹھ قسم کی جڑی بوٹیاں ترتیب سے سجی ہوتیں۔ ان کے پیچھے ایک پتلے سے بکس کے بند ڈھکنے پر کئی قطاروں میں بادشاہی منجن کی چھوٹی اور بڑی شیشیاں رکھی رہتیں، اور ان کے پیچھے لاڈلے کھڑا ہوتا۔ وہ گٹھے ہوئے بدن اور ہموار سفید دانتوں والا آدمی تھا۔ اس کے سامنے جلدی ہی خریداروں کا مجمع لگ جاتا تھا۔ تب وہ بولنا شروع کرتا۔ بولنے میں اس پر عجب جوش اور جلال سا طاری رہتا تھا لیکن اس کی تقریر ہمیشہ ایک ہی سی ہوتی تھی۔ شروع میں کچھ دیر تک وہ انگریزی بولتا تھا، یا شاید وہ اس کی اپنی گڑھی ہوئی کوئی بولی تھی جو انگریزی نہ جاننے والوں کو انگریزی معلوم ہوتی تھی، پھر وہ بتاتا کہ اس نے ولایت میں پڑھا ہے اور اگر چاہے تو آج ہی ڈپٹی کلکٹر ہو جائے لیکن اسے بادشاہی منجن بنانے میں ڈپٹی کلکٹری سے زیادہ مزہ آتا ہے، پھر چادر پر سجی ہوئی تھیلیوں کو باری باری چھڑی سے چھو کر بڑی روانی کے ساتھ بیان کرتا کہ ان میں کون کون جڑی بوٹیاں ہیں اور ان کی کیا کیا خاصیتیں ہیں، اور ان کے جمع کرنے میں کیسے کیسے خطروں کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ پھر وہ اپنے بادشاہی منجن کی دو شیشیاں اٹھا کر

انھیں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر بتاتا کہ یہ منجن ان سب چیزوں کا مرکب ہے اور ان کا نسخہ شاہی خزانوں میں بڑی حفاظت کے ساتھ رکھا جاتا تھا۔ اس کی تقریر میں سنجیدگی کے ساتھ مسخرے پن اس طرح گھلا ملا ہوتا کہ سننے والوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں پر ہنسیں اور کہاں پر نہ ہنسیں۔ میری بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا، لیکن میں اس کی تقریر کو زیادہ توجہ سے سنتا ہی نہیں تھا۔ میں اس سے کچھ کچھ ڈرتا بھی تھا لیکن اس وقت کا انتظار بھی کرتا تھا جب وہ منجن کی فروخت شروع کرنے سے پہلے تانبے کے ایک موٹے سکے کو دانتوں سے دباتا اور انگوٹھے کی مدد سے قریب قریب دوہرا کر دیتا۔ پھر وہ اس ٹیڑھے سکے کو خریداروں میں گشت کراتا۔ کچھ خریدار اسے دوبارہ سیدھا کرنے کی ناکام کوشش کرتے اور سکہ پھر لاڈلے کے پاس واپس آجاتا تھا۔ لاڈلے اسے پہلے کی طرح دانتوں سے دبا کر پھر سیدھا کر دیتا۔ اس کے بعد منجن کی بکری شروع ہو جاتی تھی۔ میں بھی ہر دوسرے تیسرے اتوار کو ایک چھوٹی شیشی خریدتا، پابندی سے استعمال کرتا اور دانتوں سے سکے ٹیڑھے کرنے کی کوشش کرتا۔

کچھ عرصے بعد بازار میں مجھ کو اتنی دلچسپی نہیں رہی جتنی پہلے تھی۔ بازار بھی ویسا نہیں رہا جیسا پہلے تھا۔ میں نے اس پر بھی دھیان دینا چھوڑ دیا تھا کہ لاڈلے اب بھی وہاں منجن بیچتا ہے یا نہیں۔ پھر مجھ کو الٰہ آباد بھیج دیا گیا۔ تعلیم ختم کر کے لکھنؤ واپس آنے کے بعد میں دو تین دفعہ اتوری بازار کی سیر کو گیا لیکن اب وہاں بھیڑ بھاڑ بہت ہونے لگی تھی۔ آخر میں نے اتوار کے دن نخاس کی طرف سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا اس لیے کہ اس کا بازار میری آوارہ گردیوں میں رکاوٹ پیدا کرتا تھا۔

اپنے بچپن کے اس بازار اور اس کی ساری دلچسپیوں کے ساتھ ساتھ لاڈلے کو بھی میں کب کا بھول چکا تھا، لیکن اس وقت، جب اوپر آسمان کی نیلاہٹ میں بولتی ہوئی چیلیں آہستہ آہستہ چکر لگا رہی تھیں اور نیچے اس کی بیٹی میری ماں سے باتیں کر رہی تھی، مجھے وہ بازار اور اس میں کھڑا ہوا لاڈلے بلکہ اس کا دانتوں سے ٹیڑھا کیا ہوا سکہ تک نظر آنے لگا تھا۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی جب اماں نے نیچے سے مجھے آواز دی اور میں نیچے اتر کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ بستر پر بیٹھی تھیں اور قریب قریب ٹھیک معلوم ہو رہی تھیں۔ چوکی پر سے کڑھے ہوئے پارچے غائب تھے اور ان کی جگہ سینی میں گرم کھانا رکھا ہوا تھا۔

سیکھ نہ کھالو، ' ناں سے کہا، ' آج ہم نے اپنے بیٹے کو بھوکا مار دیا۔

وہ ' حسنی ' گئیں؟ ' میں نے پوچھا۔

"وہی بےچاری پکا گئی ہے۔"

میں نے چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا:

"تم بھی تو آؤ، یا وہیں دے دوں؟"

نہیں، ہمیں وہ کھلا گئی ہے۔"

دو ہی تین نوالوں کے بعد مجھے محسوس ہونے لگا جیسے ناں کا پکایا ہوا کھا رہا ہوں۔ آخر مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے ناں سے پوچھا:

حسنی کو کھانا پکانا بھی تمھیں نے سکھایا ہے؟

تم نے خوب پہچانا، ' ناں خوش ہو کر بولیں، ' ہاں، جب ہم سے کام سیکھنے آتی تھی ' ہم نے کہا بیٹی ہانڈی چولھا کرنا بھی سیکھ لو، ' اور انھوں نے یہ کہا، ' مگر تم نے پہچانا خوب۔

کیوں؟ اپنی ناں کا ہاتھ تو میں ہزاروں کے بیچ میں پہچان سکتا ہوں۔'

ناں دھیرے سے ہنسیں، پھر انھیں کچھ یاد آ گیا۔

"ہاں، یہ بتاؤ، حسنی سے تم نے کیا کہا تھا؟"

"بتا دیا تھا تمھاری طبیعت خراب ہے۔"

"اور؟"

'اور؟ یہ بھی بتا دیا تھا کہ تم نے بلایا ہے۔"

"اور اپنا اتا پتا بتائے بغیر بھاگ کھڑے ہوئے؟'

مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

'ہاں، اب تم نے کہا تو یاد آیا، ' میں بولا، ' انھوں نے پوچھا ہی نہیں۔ مجھے بھی واپس آنے کی جلدی تھی۔"

"ایسی بھی کیا بدحواسی، لڑکے۔"

تو پھر وہ کس طرح..."

"خود ہی تمھیں پہچانا اور چلی آئی۔"

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نناں سے مجھ سے ایک سوال سننے کے لیے یہ بات چھیڑی ہے، اس لیے میں نے وہ سوال کر دیا:

"مگر انھوں نے کس طرح مجھ کو پہچان لیا؟"

"تمھارے کرتے سے،" نناں ذرا فخر کے ساتھ بولیں۔

میں نے اپنے کرتے کو دیکھا۔ وہ پرانا ہو چکا تھا لیکن نناں نے اپنے ہاتھ سے اس پر بہت گنجان بیل کاڑھی تھی جس کا ایک ٹانکا بھی اب تک اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔ میں نے بیل پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

"تمھارے ہاتھ کی کڑھائی پہچان لی؟ لیکن انھوں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں..."

مگر اپنا سوال پورا کرنے سے پہلے پہلے اس کا جواب میری عقل میں آ گیا۔ میری حیثیت کا آدمی ایسی کڑھائی کا کرتا صرف اس صورت میں پہن سکتا تھا کہ وہ کاڑھنے والی کا بیٹا ہو۔ یہ سب کی سمجھ میں آنے والی بات تھی، کسی کی سمجھ میں بھی آ گئی۔

نناں نے غور سے میری طرف دیکھا، کچھ کہنے کو ہوئیں، پھر رک گئیں۔ میں نے کھانا ختم کر لیا تو بولیں:

"برتن کنویں پر رکھ دو۔ ہم دھو دیں گے۔"

"نہیں، ہم دھوئے دیتے ہیں،" میں نے اٹھتے ہوئے کہا، "تمھارے برتن کہاں ہیں؟"

"وہ دھو کر رکھ گئی ہے،" نناں نے بتایا، "اور سنو..."

میں کنویں کی طرف جاتے جاتے رکا۔

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"کل دوپہر کو وہ آئے گی۔ تم گھر ہی پر رہنا۔"

"کیوں؟"

"اسے تم سے کچھ کام ہے۔"

"مجھ سے؟"

"ہاں۔ کچھ پڑھوانا ہے۔"

Scanned with CamScanner

حُسنی دوپہر کے کچھ بعد اماں کے پاس آئی۔ میں اٹھ کر کنوئیں کی طرف چلا گیا۔ وہ دونوں دیر تک دالان میں کچھ باتیں کرتی رہیں۔ پھر اماں نے مجھے آواز دی۔

وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں۔ حسنی ان کے سرہانے کی طرف بیٹھی تھی۔ میری ہی ہم عمر یا مجھ سے کچھ چھوٹی معلوم ہوتی تھی۔ ناک نقشہ درست تھا، صورت میں ہلکی سی شباہت باپ کی بھی تھی۔ یہ سب میں نے ایک نظر میں دیکھ لیا، پھر چوکی پر رکھے ہوئے پارچوں کو ایک طرف ہٹا کر بیٹھ گیا۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ کل کے بے کڑھے ہوئے پارچے اماں نے کسی وقت کاڑھ ڈالے ہیں اور چوکی پر کچھ اور بے کٹے ہوئے پارچے رکھے ہوئے ہیں۔ اُسی وقت اماں نے کہا:

"یہ لو۔"

اور بستر پر لیٹے لیٹے ایک لفافہ میری طرف بڑھایا۔ میں نے بھی چوکی پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر لفافہ لے لیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"یہ بند ہے،" میں نے اماں کو بتایا۔

اماں نے حسنیٰ کی طرف دیکھا۔ حسنیٰ نے کچھ اشارہ کیا اور اماں نے کہا،

"کھول لو۔ ان کے باپ نے دیا ہے۔"

میں نے لفافہ کھولا۔ اندر کے پرانی کاغذ پر موٹے قلم سے لکھا ہوا تھا:

"یہ کاغذ ہے منجانب علی محمد عرف للاڈلے ولد علی حسین عرف دُلارے نواب ساکن شہر لکھنؤ محلہ چوک پیپل والا مکان کہ اب میں بوڑھا ہوا۔ صحت میری درست لیکن عمر میری اتنی ہو گئی ہے کہ جتنی عمر ہو جانے کے بعد آدمی کو موت قریب معلوم دینے لگتی ہے۔ بنا بریں یہ تحریر لکھ کر چھوڑتا ہوں۔

معلوم ہونا چاہیے کہ میں ہفتہ واری بازاروں میں روزی کماتا تھا۔ تین بازاروں میں بادشاہی منجن بیچتا تھا، دو میں درد چوٹ اور مردُمی کا پہاڑی تیل اور ایک میں جادو دکھاتا تھا۔ ساتویں دن چھٹی مناتا تھا۔

میرے صرف ایک بیٹی مسمات حُسنیٰ ہے کہ جس کی عمر اب کے جاڑوں میں تیس برس کی ہو جائے گی۔ وہ پندرہ برس کی ہو رہی تھی کہ

Scanned with CamScanner

میری ٹانگیں بےکار ہو گئیں اور سب پندرہ برس سے چکن کاڑھ کاڑھ کر وہی مجھ کو کھلا رہی ہے۔ وہ میری اکلوتی اولاد ہے اس لیے از روئے قانون میرے بعد میرا سب کچھ اُسی کا ہے۔ لیکن یہ جو تحریر میں لکھ کر چھوڑ رہا ہوں اس کا مقصد یہ بتانا نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ میرا وہ سامان جو لکڑی والے صندوق میں ہے اس میں سے میری بیٹی کو کچھ نہ دیا جائے لیکن اُس میں کی ایک ایک شے اس کو اچھی طرح دکھلا دیں تاکہ اُس کو معلوم ہو جائے کہ اس کو کیا کیا نہیں ملا ہے۔ فقط علی محمد عرف لاڈلے بقلم خود۔'

میں نے یہ تحریر پڑھ کر حسنیٰ کی طرف دیکھا۔

"یہ اُن کا وصیت نامہ ہے۔"

"وصیت نامہ؟" اس نے ذرا سہم کر پوچھا، پھر کچھ سوچ کر حیران ہو گئی۔

"اپنے سامان کے بارے میں۔"

"سامان کے بارے میں؟" اس نے اماں کی طرف دیکھ کر پوچھا اور کچھ اور حیران ہو گئی۔

"پڑھ کر سناؤ تو ذرا۔" اماں نے مجھ سے کہا۔

میں نے پڑھ کر سنانا شروع کیا۔ پینڈی تیل کے ذکر پر آ کر میں ذرا رکا، پھر اسے چھوڑ کر آگے پڑھنے لگا۔ تحریر ختم ہوئی تو میں نے کاغذ تہ کر کے لفافے میں رکھا اور لفافہ اماں کو دے کر صحن میں کنویں کے پاس آ گیا۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ یہ تحریر اُسی آدمی کی ہے جو کلاس میں بادشاہی منجن بیچا کرتا تھا اور میں اُس سے کچھ کچھ ڈرتا تھا۔ میرا یہ بھی جی چاہ رہا تھا کہ لکڑی والے صندوق کے اُس سامان کو دیکھوں جس میں سے کسی کو کچھ نہیں ملنے والا تھا، اور یہ بھی کہ لاڈلے کو کچھ لکھتے ہوئے دیکھوں۔

میں نے حسنیٰ کو جاتے ہوئے دیکھا۔ اٹھ کر اماں کے پاس جا رہا تھا کہ پڑوس کی دو تین عورتیں آ گئیں اور میں پھر کنویں کے پاس بیٹھ گیا۔ پڑوس کی عورتیں کچھ دن سے اماں کے پاس زیادہ آنے لگی تھیں۔ وہ گھر کے کاموں میں اماں کا ہاتھ بھی بٹاتی تھیں۔ اماں کی طبیعت اب ٹھیک معلوم ہوتی تھی لیکن ہاتھ بہت کانپنے لگا تھا، پھر بھی جب پڑوسنوں کے جانے کے بعد میں اُن کے پاس پہنچا تو وہ بستر پر بیٹھی کڑھائی کر رہی تھیں۔ انھوں نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر کام میں لگ

گئیں۔ میرا خیال تھا وہ لالہ کے وصیت نامے کے بارے میں باتیں کریں گی، لیکن وہ کچھ نہیں بولیں اور میں کپڑے پر ان کی سوئی کو چلتے دیکھتا رہا، پھر بولا:

"اماں، تمھارا ہاتھ زیادہ کانپ رہا ہے۔"

انھوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں ان کے پاس ہی چوکی پر بیٹھ گیا۔ دیر تک ان کے کاڑھے ہوئے پارچوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا، یہاں تک کہ سورج ڈوبنے کا وقت آ گیا۔ انھوں نے پارچوں کو لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا، پھر میری طرف دیکھا۔

"آج جمعرات ہے،" انھوں نے مجھ کو بتایا۔

"یاد ہے،" میں نے کہا، "لالٹین ماچس کہاں ہے؟"

قبرستان سے واپسی پر میں ادھر ادھر گھومتا ہوا گھر پہنچا تو میں نے دیکھا اماں سو رہی ہیں اور چوکی پر میرا کھانا رکھا ہے۔ کھا کر میں بھی جلدی ہی سو گیا۔

۳

دوسرے دن دھوپ چڑھنے سے پہلے ہی پہلے اماں نے سب پارچے پورے کر لیے تھے۔ انھوں نے کھانا پکایا، مجھے کھلایا، پھر کہا:

"بیٹے، ایک کام کرو گے؟"

"بتاؤ۔"

انھوں نے پارچوں کی گٹھری سی بنا کر مجھے دی اور کہا:

"ذرا یہ حسنی کو دے آؤ۔ وہ لالہ کے یہاں پہنچا دے گی۔"

"میں ہی پہنچائے دیتا ہوں،" میں نے کہا، "لالہ کی دکان مجھے معلوم ہے۔"

"نہیں نہیں،" اماں نے جلدی سے کہا، "اسی کو دے آؤ۔ لالہ سے نیا کام بھی لانا ہے۔"

"نیا کام بھی میں لا دوں گا۔"

"حساب کتاب بھی کرنا ہے،" انھوں نے کہا، پھر کہا، "بات مانو۔"

میں نے بات مان لی اور ایک بار پھر پیپل والے مکان کے دروازے پر جا کر دستک دی۔

اندر سے پھر وہی مردانی آواز آئی:

"آ رہے ہیں۔"

لیکن باہر ایک بہت بوڑھی عورت نکلی اور مجھے اس طرح دیکھنے لگی جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے اسے پہچاننے کی کوشش کیے بغیر کہا:

"یہ سامان لائے تھے۔"

"کیسا سامان؟"

"چکن،" میں نے کہا، "لالہ کی دکان پر بھجوانا ہے۔"

"اچھا، ٹھہریے،" اس نے کہا اور اندر چلی گئی، کچھ دیر بعد پھر نکلی اور بولی، "آ جائیے، بلا رہے ہیں۔"

چھوٹی سی ڈیوڑھی کے بعد کچا صحن تھا۔ ایک طرف کھپریل پڑی تھی، دوسری طرف دالان تھا۔ تیسری طرف مہندی کی چھدری چھدری باڑھ اور اس کے پیچھے زنگ آلود ٹین کے دو چھوٹے چھوٹے سائبان جن کے آگے بوسیدہ ٹاٹ کے پردے لٹک رہے تھے۔ عورت مجھے دالان میں لے گئی اور وہاں میں نے اتنے برسوں کے بعد لاڈلے کو دیکھا۔

وہ دالان کے ایک پلنگ پر آدھا لیٹا آدھا بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ کو اس میں اس کے سوا کوئی خاص فرق نظر نہیں آیا کہ پہلے اس کے بال پورے سیاہ تھے، اب ان میں خضاب کی سرخی تھی۔ میں نے اس کی ٹانگوں کی طرف دیکھا لیکن ان پر ایک پرانا کمبل پڑا ہوا تھا۔

"میاں، بیٹھیے،" اس نے میرے سلام کا جواب دے کر کہا، "اسے ادھر رکھ دیجیے۔"

بوڑھی عورت نے گٹھری میرے ہاتھ سے لے کر دالان کے کونے میں رکھے ہوئے لکڑی کے صندوق پر ٹکا دی اور ایک چوکی کی طرف اشارہ کر کے بولی:

"آرام سے بیٹھ جاؤ بھیا۔"

میں چوکی پر بیٹھ کر لاڈلے کی طرف دیکھنے لگا۔

"بٹیا سیتاں گئی ہیں،" اس نے کہا، "بتا گئی تھیں آپ آئیں گے۔ کچھ کہلوانا تو نہیں ہے؟"

"اماں نے کہلوایا تھا، سیا کام لانا ہے،" میں نے کہا، "اور حساب کتاب۔"

ہم بتا دیں گے، سب ہو جائے گا۔ اس نے کہا اور بوڑھی عورت کو بتایا، ان کی ماں نے ہماری بٹیا کو کام سکھایا ہے۔"

ہم جانتے نہیں کیا؟ عورت بولی، کتنے دن تو ہمارے ہی ساتھ وہاں گئی ہے۔

ہاں گئی تھیں، "للّا نے بولا۔

پھر کچھ دیر تک وہ مجھ سے باتیں کرتا رہا جو زیادہ تر چکن کی صنعت اور کچھ میری تعلیم کے بارے میں تھیں۔ وہ بہت نرم اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بڑی شائستہ گفتگو کر رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اتنے سلیقے سے گفتگو نہیں کر سکتا۔ آخر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

بٹیا دیر کی گئی ہوئی ہیں، اس نے کہا، جی چاہے بیٹھیے۔ اب آتی ہوں گی۔

نہیں، "میں نے کہا، "بہت کام ہے۔

اور اس سے پہلے کہ وہ پوچھتا میاں آپ کیا کرتے ہیں؟ میں اسے سلام کر کے دالان سے باہر نکل آیا۔ مجھے اس کی آواز سنائی دی:

"بہن سے ہمارا آداب کہہ دیجیے گا۔"

مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ میں نے خود کو للّا کے سوال سے بچا لیا۔ لیکن چوک سے باہر آتے آتے مجھے خیال ہونے لگا کہ یہ سوال اس کو اسی وقت کر لینا چاہیے تھا جب وہ میری تعلیم کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ کچھ اور آگے بڑھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اس کو اس سوال کا جواب پہلے ہی معلوم تھا۔ اسے حسنی نے بتایا ہوگا۔ "حسنی کو کس نے بتایا؟" میں نے خود سے پوچھا اور خود ہی جواب دیا، "ظاہر ہے، اماں نے۔"

مجھے اپنے اوپر ترس اور اماں پر غصہ آنے لگا۔ گھر پہنچتے پہنچتے میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اماں سے خوب لڑوں گا۔ میں نے یہ بھی طے کر لیا کہ لڑائی کی شروعات اس طرح کروں گا:

اماں، یہ کون سی بات ہے؟ ایک تو مجھے کچھ کرنے نہیں دیتیں، پھر دنیا بھر میں روتی سی پھرتی ہو کہ میں کچھ نہیں کرتا۔"

لیکن مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ اماں میرے پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ختم ہو گئی تھیں۔ شاید فالج گرا تھا، یا دل کا دورہ ہوگا۔ مرنے سے پہلے وہ ایک پڑوسن کو صرف اتنا بتا سکی تھیں کہ روپے کہاں رکھے ہیں۔

۳

اس کے بعد کا سب کچھ مجھے خواب کا سا معلوم ہوتا رہا۔ مجھے دھندلا دھندلا یاد ہے کہ گھر کے اندر پڑوس کی عورتیں اور باہر مرد جمع تھے اور مجھ سے جو کچھ کہا جا رہا تھا وہ میں کر رہا تھا۔ اماں کے بتائے ہوئے روپے میں نے نکالے تھے اور گنے بغیر مردوں میں سے کسی کو دے دیے تھے۔ میت کے ساتھ قبرستان پہنچ کر میرا ذہن تھوڑی دیر کے لیے کچھ صاف ہوا تو میں نے شکایت کی تھی کہ اماں کو ابا کی قبر کے پہلو میں جگہ نہیں ملی، اور مجھے بتایا گیا تھا کہ ابا کی قبر کے آس پاس کوئی جگہ خالی نہیں رہ گئی ہے۔

دوسرے دن سے اماں کا پرسا دینے کے لیے عورتوں نے میرے یہاں آنا شروع کیا۔ یہ زیادہ تر چکن بنانے والی پرتکلف پوش عورتیں تھیں۔ میں ان میں سے کسی کو نہیں پہچانتا تھا اس لیے چوکی پر خاموش بیٹھا رہتا اور پڑوس کی رہنے والیاں اُن سے بات کرتی تھیں۔ مجھ کو اُن کی باتوں میں دلچسپی نہیں تھی لیکن اس پر کچھ حیرت ضرور ہو رہی تھی کہ اماں کی اتنی بہت سی جاننے والیاں ہیں اور ان کو اماں کے مرنے کی خبر اتنی جلدی ہو گئی۔

تین دن تک میرے لیے پڑوس کے گھروں سے کھانا آتا رہا۔ چوتھے دن حسنیٰ بھی آئی۔ اس کے ساتھ کئی عورتیں تھیں۔ پڑوس والیوں سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ میں کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا، پھر میں نے اس کی طرف دیکھا۔

"لالہ کے یہاں چلے جائیے گا،" اس نے کہا، "انھوں نے بلوایا ہے۔"

"مجھ کو بلوایا ہے؟"

"کہہ رہے تھے ضروری کام ہے۔ کچھ حساب کتاب بھی کرنا ہے۔"

"وہ دکان پر کس وقت بیٹھتے ہیں؟"

"پورے وقت بیٹھتے ہیں،" اس نے بتایا، پھر کچھ دیر خاموش رہ کر بولی، "ہم اسی دن آ رہے تھے، لیکن..."

اس نے جملہ پورا کیے بغیر چہرے پر نقاب ڈال لی اور دوسری عورتوں کے ساتھ واپس چلی گئی۔

اس رات کسی گھر سے میرے لیے کھانا آیا تو میں نے واپس کر دیا۔ مجھے یاد آیا کہ ماں کے مرنے کے دن میں نے اُن کے روپے نکال کر محلے کے کسی آدمی کو دے دیے تھے اور قبرستان سے واپسی پر اُس نے بچے ہوئے روپے مجھے لوٹا دیے تھے۔ اس نے خرچ کا حساب بھی بتایا تھا جو میں نے سنا نہیں۔ اب، کھانا واپس کرنے کے بعد، میں نے تکیے کے نیچے سے وہ روپے نکالے اور انھیں گننا شروع کیا تھا کہ ایک پڑوسن میرا واپس کیا ہوا کھانا لے کر آ گئیں۔ انھوں نے مجھے گودیوں میں کھلایا تھا اور میں اُن کو خالہ کہتا تھا۔ جانے والی رات اماں انھیں خالہ کو قسم دے گئی تھیں کہ مجھ کو کھانا کھلا دیں۔ اس وقت خود وہ خالہ مجھ کو قسمیں دے رہی تھیں کہ کھانا کھا لوں۔ میں کہہ رہا تھا کہ میں بازار میں کھا لیا کروں گا اور وہ بازار کے کھانے کو زہر بتا رہی تھیں۔ دیر تک میری اُن کی بحث ہوتی رہی۔ آخر میں نے تکیے کے نیچے سے نکالے ہوئے روپے اُن کے ہاتھ میں دے دیے اور کسی طرح انھیں راضی کر لیا کہ آئندہ میرے کھانے کا انتظام میرے ہی پیسے سے کریں۔ وہ مجھ کو کھانا کھلا کر واپس گئیں اور اماں کے مرنے کے بعد پہلی مرتبہ میں نے کچھ راحت سی محسوس کی جس کی وجہ سے اماں کا غم بھی مجھے پوری طرح محسوس ہونے لگا۔

دوسرے دن میں لالہ کے یہاں گیا۔

وہ دو در کی بڑی دکان تھی۔ لالہ کے دو جوان لڑکے دکان داری دیکھ رہے تھے۔ گاہکوں اور کاریگر مردوں عورتوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا۔ خود لالہ ان سب سے ذرا ہٹ کر ایک اونچے سے تخت پر بیٹھے تھے۔ پیچھے گاؤ تکیہ لگا ہوا تھا۔ بہت صاف ستھرے بوڑھے آدمی تھے۔ بھنویں سفید ہو چکی تھیں۔ ان کے سامنے ایک صندوقچہ اور اس کے اوپر کاغذوں کا پلندہ رکھا ہوا تھا جسے وہ الٹ پلٹ رہے تھے۔ میں ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں نے انھیں سلام کیا اور کہا:

"آپ نے بلوایا تھا۔"

لالہ نے دو تین بار مجھے سر سے پیر تک دیکھا، پھر بڑے تپاک سے بولے:

"آؤ بھیا، آؤ۔ ادھر نکل آؤ۔"

میں اُن کے قریب ہی تخت کے کونے پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے بتایا کہ اماں کی خبر ان کو

حسنی سے ملی، پھر بولے:

"کیا بتائیں بیٹا، ہمارے تو سمجھو ہاتھ کٹ گئے۔"

اس کے بعد وہ دیر تک اماں کی باتیں اور ان کے کام کی تعریفیں کرتے رہے۔ انھوں نے اماں کی بیماری اور کفن دفن کی تفصیل بھی پوچھی، پھر کاغذوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے پھر سر اٹھایا اور بولے:

"ہاں، ہم نے تمھیں بلوایا تھا۔ ایک تو ان کا حساب کتاب کرنا تھا،" اور یہ کہتے کہتے انھوں نے کاغذوں کو ہٹا کر صندوقچہ کھولا، کچھ روپے نکال کر میرے قریب تخت پر رکھ دیے اور کہا، "یہ تو ان کی اخیر دنوں کی مزدوری باقی تھی۔ پہلے اسے رکھو۔ گن لو بیٹا۔"

کوئی بڑی رقم نہیں تھی۔ میں نے اٹھا کر گن لی۔ لالہ نے مجھے رُکے رہنے کا اشارہ کر کے رومال میں بندھی ہوئی ایک اور رقم صندوقچے میں سے نکال کر میری طرف بڑھائی۔

"نہیں لالہ،" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا، "پیسے میرے پاس ہیں۔"

"تمھارے ہی پیسے ہیں بیٹا۔ کوئی ہم اپنی طرف سے دے رہے ہیں؟" لالہ نے کہا۔ "وہ ہمارے پاس تمھارے نام سے جمع کراتی تھیں۔ گھر پر تو بچتا بچاتا نہیں تھا۔ مزدوری ہی میں سے کچھ پیسے کٹوا لیتی تھیں۔"

میں نے رومال کی طرف دیکھا، پھر لالہ کی طرف۔

"لیکن لالہ، یہ زیادہ معلوم ہو رہے ہیں۔"

"تھوڑا تھوڑا بہت ہو جاتا ہے، بیٹا،" لالہ نے کہا۔ "اچھا، اب دھیرج سے سنو ہم کیا کہہ رہے ہیں۔" انھوں نے رومال کی طرف اشارہ کیا۔ "کچھ دن غم غلط کرو۔ جب یہ تھوڑے پڑنے لگیں تو ہمارے پاس آ جانا۔ ہم کام دیں گے۔"

"لالہ، مجھے کام نہیں آتا،" میں نے کہا، "اماں نے سکھایا ہی نہیں۔"

"ہم سکھوا دیں گے،" لالہ بولے، "نہیں تو کچھ اور کام نکالیں گے۔ اب تمھیں کچھ تو کرنا ہی کرنا ہے۔ بھروسے کا آدمی ہمیں بھی چاہیے ہوتا ہے۔"

پھر وہ خیالوں میں کھو گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اٹھوں یا بیٹھا رہوں۔ اتنے میں لالہ نے بولنا شروع کر دیا:

Scanned with CamScanner

تماشا رہتا تھا۔ کبھی ہم کہتیں سن صاحب، بیٹے کو کام سے لگوا دیجیے، کب تک آوارہ گردش کرے گا۔ کبھی وہ کہتیں لالہ، ہمارے بیٹے کو کہیں کام سے لگواؤ کب تک بے کار گھومے گا۔ ہم جو کام تجویز کرتے انھیں چھوٹا معلوم ہوتا۔ ہم کہتے چھوٹے ہی کام سے آدمی بڑا ہوتا ہے۔ ہم خود کاندھے پر گٹھر لادے، ہاتھ میں گز لیے کتنے دن گلیاں ناپتے پھرے ہیں۔ آواز لگاتے لگاتے گلا پڑ گیا تھا۔ وہ کہتیں لالہ، تم ٹھیک کہتے ہو۔ لیکن لڑکے کو اس کا باپ ولایت بھیج رہا تھا، اب وہ گلیوں میں پھیری لگائے گا تو مرنے والا قبر میں چین سے سو پائے گا؟"

دیر تک لالہ ایسی ہی گفتگو میں دہراتے رہے۔ انھیں شاید زیادہ بولنے کی عادت ہو گئی تھی۔ آخر وہ تھک سے گئے اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ انھوں نے رومال اٹھا کر مجھ کو دیا، کچھ اور قریب ملا کر میرے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر میرے کرتے کی کڑھائی پر ہاتھ پھیرا۔

اب دیکھنے کو نہیں ملے گا یہ کام، انھوں نے کہا اور ان کی گردن ادب سے جھک گئی اور دیر تک جھکی رہی۔ میں جانے کے لیے مڑنے لگا تو انھوں نے سر اٹھا کر کہا:

اچھا بھیا، جاؤ، غم غلط کرو۔

لالہ کے یہاں سے آنے کے بعد میں اماں کے ساتھ اماں کی قبر پر بھی جمعرات جمعرات شمع جلانے لگا۔ باقی وقتوں میں آوارہ گردیاں کرتا تھا۔ اس وقت تک غم غلط کرنے کا یہی ایک طریقہ مجھے آتا تھا۔

۵

لالہ کا دیا ہوا رومال یوں ہی بندھا کا بندھا میں نے پڑوس والی خالہ کے حوالے کر دیا تھا اور تاکید کر دی تھی کہ پیسے ختم ہونے لگیں تو یاد کر کے مجھے بتا دیں۔ ہر چوتھے پانچویں دن میں ان سے پیسوں کو پوچھتا اور وہ یہی بتاتیں کہ ابھی بہت ہیں۔ کھانے کا کچھ حساب بھی بتاتیں اور آخر میں یہ ضرور کہتی تھیں:

چیونٹی کے انڈے بھر تو تم کھاتے ہو۔ تمھارا خرچ ہی کیا۔

اس پر میں ہنس پڑتا، پھر گھومنے نکل جاتا۔

Scanned with CamScanner

ایک جمعرات کو میں چوک سے ہو کر گھر آ رہا تھا۔ بازار بند ہونے کا دن تھا اور وہاں میرے دیکھنے کی کوئی چیز نہیں تھی لیکن آتش بازی کی دکان کے پاس سے گزرتے ہوئے میرے قدم رکنے لگے۔ بند دکان کے پٹرے پر پیر نیچے لٹکائے ہوئے لاڈلے اکیلا بیٹھا تھا۔ میرا خیال تھا وہ مجھے پہچان نہیں سکے گا، اس لیے آگے بڑھا جا رہا تھا، لیکن اس نے مجھ کو دیکھا تو کچھ اس طرح گردن ہلائی کہ مجھے رک جانا پڑا۔ میں نے اسے سلام کیا اور پوچھا:

"آپ کیسے ہیں؟"

"بس،" اس نے جواب دیا۔ پھر اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ کیا۔

پٹرے کے اوپر بیٹھا ہوا وہ بھاری بھرکم آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن کمر کے نیچے اس کی ٹانگیں سوکھی ہوئی لکڑیوں کی طرح لٹک رہی تھیں۔ اماں اس کی حالت مجھے بتا چکی تھیں لیکن پھر بھی اس وقت اس کو دیکھنا ایک تکلیف دہ کام معلوم ہو رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا اس سے کیا کہوں، اس لیے خاموش کھڑا اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ وہ پٹرے کے سہارے کھڑی ہوئی اپنی موٹی سی لاٹھی کو گھور رہا تھا۔

"بہن کا معلوم ہو گیا تھا،" کچھ دیر بعد اس نے کہا، "بہت جی چاہتا تھا اُن کو قبر تک تو پہنچا آؤں۔"

"نہیں، ایسی حالت میں آپ کہاں جا سکتے۔"

"اُن کے ہم پر بڑے احسان تھے،" اس نے کہا، پھر اچانک وہ سوال کر دیا، "میاں، اب آپ کیا کرتے ہیں؟"

"اب پوچھ رہے ہو، لاڈلے؟" میں نے دل میں کہا اور صفائی کے ساتھ جھوٹ بول دیا:

"لالہ کے یہاں کام کر رہا ہوں۔"

میں نے یہاں تک سوچ لیا تھا کہ اگر وہ پوچھے گا تو اسے یہ بھی بتا دوں گا کہ کیا کام کر رہا ہوں۔ مگر اس نے پوچھا:

"گھر میں آپ کیا کرتے ہیں؟"

"گھبراتا ہوں،" میں نے جواب دیا، "اسی لیے دن بھر ادھر اُدھر گھومتا رہتا ہوں۔"

"ہاں، کچھ تو جی بہل جاتا ہوگا،" اس نے کہا اور یہ نہیں پوچھا کہ دن بھر گھومتا ہوں تو لالہ

کے یہاں کس وقت کام کرتا ہوں۔

"آپ کیسے ہیں؟" میں نے پھر پوچھا۔

"ہم تو ویسے ہی ہیں، لیکن بٹیا چلی گئیں،" اس نے کہا اور گردن جھکالی۔

اُس کی بات فوراً میری سمجھ میں نہیں آ سکی لیکن میرے کچھ پوچھنے سے پہلے اس نے خود ہی بتا دیا:

"یرقان ہو گیا تھا۔"

میں اس کے پاس دکان کے پٹرے پر بیٹھ گیا۔

"یہ کب؟" میں نے پوچھا، "مجھے خبر ہی نہیں ہوئی۔"

"کون خبر کرتا،" اس نے کہا اور چپ ہو گیا۔

میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا پوچھوں، اس لیے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھوں، پھر رخصت ہو جاؤں۔

اُس نے مجھے اٹھتے دیکھا، کچھ کہنا چاہا، پھر رک گیا، پھر کچھ کہنا چاہا، پھر رک گیا۔ میں بھی جاتے جاتے رک گیا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ کچھ دیر تک ناخن سے اپنی لاٹھی کی موٹھ کریدتا رہا، پھر جھجکتے جھجکتے بولا:

"میاں، ہماری کچھ مدد کر دیجیے گا؟"

یہ تو ہونا ہی تھا، لاڈلے، میں نے دل میں کہا، لیکن اُس وقت میری جیب خالی تھی، اس لیے میں بھی جھجکتے جھجکتے بولا:

"ہاں، بتائیے۔"

"ہمارا کچھ سامان ہے، اپنے یہاں رکھ لیں گے؟ بس ایک چھوٹا بکس ہے۔ جگہ نہیں گھیرے گا۔"

یہ کہتے کہتے وہ پٹرے پر سے پھسل پڑا۔ میں اُسے سنبھالنے کے لیے لپکا، لیکن وہ اپنی دونوں کہنیاں پٹرے پر ٹکائے ہوئے تھا۔ اس طرح کہنیاں ٹیکے ٹیکے اُس نے ہاتھوں سے لاٹھی پکڑ لی اور بہت دھیرے دھیرے جھکتا ہوا زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ مہندی سے رنگا ہوا سر سوکھے ہوئے

Scanned with CamScanner

گھٹنوں سے کچھ اوپر اٹھا کر اس نے اکڑوں بیٹھے بیٹھے آگے سرکنا شروع کیا۔ میں اس کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور دیکھ رہا تھا کہ اس کا سر اور کندھے بار بار داہنی طرف اور بائیں طرف جھکتے ہیں، جیسے کوئی شرابی نشے میں جھوم رہا ہو۔ اُس کو اس طرح چلتے دیکھنا اسے پٹرے پر بیٹھے دیکھنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ کام تھا۔ یہ شاید اسے بھی معلوم تھا، اس لیے کہ گلی کے دہانے میں داخل ہو کر وہ رکا اور میری طرف گردن موڑ کر بولا:

"آپ بڑھیے، ہم پہنچ رہے ہیں۔"

یہ مجھے غنیمت معلوم ہوا اور میں تیز قدموں سے چلتا ہوا پیپل والے مکان کے دروازے پر جا کر ٹھہر گیا۔ دیر کے بعد وہ آتا دکھائی دیا۔ مجھ تک پہنچتے پہنچتے اُس کی سانس پھول گئی تھی۔ کچھ دیر تک وہ دہلیز پر بیٹھا رہا، پھر بولا:

"آپ کو بڑی تکلیف ہوئی، میاں۔"

مکان کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔ اُس نے ایک پٹ کو اپنے کندھے سے ٹھیلا۔ دروازہ ہلکے سے چرچرایا اور کھل گیا۔ اس نے لاٹھی ایک طرف رکھی، دونوں ہاتھوں سے اپنی سوکھی ہوئی ٹانگوں کو پکڑ کر اٹھایا اور دہلیز پر رکھ دیا جیسے وہ اس کی نہیں، کسی اور کی ٹانگیں ہوں۔ اور مجھے واقعی ایسا معلوم ہوا کہ وہ دونوں ٹانگیں لاٹھی کے ساتھ دہلیز پر پڑی چھوڑ کر ابھی اٹھ کھڑا ہو گا۔ لیکن اُس نے لاٹھی پکڑی اور اُسی طرح بیٹھے بیٹھے چلتا ہوا ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ اُس نے مڑ کر مجھے دیکھا اور کہا:

"چلے آئیے میاں، زیادہ دیر نہیں بٹھاؤں گا۔"

میں نے اس گھر میں حسنی کو نہیں دیکھا تھا، پھر بھی وہاں مجھے اس کی کمی محسوس ہوئی۔ دالان میں بچھی ہوئی چوکی سی چوکی سے ملی ہوئی تھی جس پر بیٹھ کر اماں کام کرتی تھیں۔ لاڈلے اس چوکی پر ایک ہاتھ رکھے زمین پر بیٹھا ہوا تھا۔

"آپ کو بہت زحمت دے رہا ہوں، میاں،" اس نے کہا اور دالان کے کونے میں رکھے ہوئے لکڑی کے بڑے صندوق کی طرف سرکنا شروع کیا۔ صندوق کے پاس پہنچ کر اس نے ڈھکنے پر ہاتھ رکھا اور میری طرف دیکھا۔ ڈھکنا اس کے کندھے سے کچھ اونچائی پر تھا۔ میں نے پوچھا:

"اسے کھولنا ہے؟"

"جی ہاں۔ دیکھیے کوشش کرتا ہوں۔"

لیکن پورے قد سے کھڑے ہوئے بغیر اُس بھاری ڈھکنے کو اٹھانا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بڑھ کر صندوق کھول دیا۔

"دیکھیے، داہنے ہاتھ پر شیشیاں رکھی ہیں؟" اس نے پوچھا۔

میں نے صندوق میں جھانکا اور بادشاہی منجن کی چھوٹی بڑی شیشیوں کو فوراً پہچان لیا۔

"ہیں،" میں نے کہا، "نکالوں؟"

"آپ سلامت رہیے۔"

صندوق میں اور بھی بہت سا سامان تھا۔ ایک طرف تام چینی کا ایک تسلہ تھا جس میں سیاہی مائل لکڑی کے تراشے ہوئے بھدّے بھدّے سانپ بچھو اور گرگٹ کی شکل کے جانور تھے۔ ایک طرف لمبے پھلوں والے چاقو، زنجیریں، ہانڈیاں وغیرہ تھیں۔ اس طرح کا سامان میں نے نخاس کے بازار میں جادو دکھانے والوں کے پاس دیکھا تھا۔ اس سامان کو دیکھ کر مجھے یہ بھی یاد آ گیا کہ اسی بازار میں ایک شخص طلسماتی تیل فروخت کرتا تھا۔ وہ بھی تام چینی کے تسلے میں اسی طرح کے سانپ بچھو وغیرہ رکھتا تھا جو طلسماتی تیل میں تربتر ہوتے تھے۔ البتہ میں اور دوسرے لوگ انھیں اصلی سمجھتے اور خیال کرتے تھے کہ طلسماتی تیل انھیں خطرناک کیڑوں مکوڑوں میں سے نکالا گیا ہے۔ تیل فروخت کرنے والا بھی یہی دعویٰ کرتا تھا۔

میں نے بادشاہی منجن کی سب شیشیاں باہر نکال کر لاڈلے کے آگے رکھ دیں۔ ایک ادھ کھلی گٹھری میں جڑی بوٹیوں والی تھیلیاں بھی تھیں۔ میں نے گٹھری کو سنبھال کر باہر نکالا اور شیشیوں کے پاس رکھ دیا۔ لاڈلے نے کچھ حیرت سے میری طرف دیکھا، پھر 'جیتے رہیے' کہہ کر گٹھری کھولی، دو تین تھیلیوں کو نکال کر اُن کی جڑی بوٹیوں پر لگی ہوئی پھپھوندی کو دیکھا، مایوسی سے سر ہلایا اور تھیلیاں واپس رکھ کر گٹھری مضبوطی کے ساتھ باندھ دی۔ میں نے گٹھری کو اٹھا کر صندوق میں رکھا تو مجھے ایک کٹوری میں تانبے کے سکّے بھی نظر آئے جن میں سے کچھ کو ٹیڑھا کر دیا گیا تھا۔ میں نے سکّے نکال کر لاڈلے کو دیے۔ اس نے ایک ٹیڑھا اور ایک سیدھا سکہ اپنی ہتھیلی پر رکھا، کچھ دیر سوچتا رہا، پھر ہتھیلی میری طرف بڑھا کر بولا:

"رکھ دیجیے میاں، ان کا بھی کام نہیں ہے۔"

صندوق بند کر کے میں اس کی طرف مڑا۔ اس نے شیشیوں کو تیزی کے ساتھ گنا، پھر مجھ

سے بولا:

"آج آپ کو بہت پریشان کیا۔"

"نہیں، ٹھیک ہے،" میں نے کہا، اور پوچھا، "بس یہی شیشیاں رکھوانا ہیں؟ اور ان کا بکس؟"

"ان کا بکسا وہ اوپر رکھا ہے۔ ہم کسی سے اتروالیں گے،" اس نے کہا اور صندوق کی پشت والی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

صندوق سے کئی ہاتھ اوپر ایک مچان پر رکھے ہوئے چپٹے سے بکس کو بھی میں نے بادشاہی منجن کی شیشیوں کی طرح فوراً پہچان لیا۔

"میں اُتارے دیتا ہوں،" میں نے کہا۔

بیچ میں صندوق حائل تھا اس لیے مجھے بکس تک دونوں ہاتھ پہنچانے میں دقت ہوئی۔ میں نے ایک ہاتھ سے بکس کو کھینچا، دوسرا ہاتھ نیچے لا کر اسے اتارا، اور للاڈلے کے سامنے رکھ دیا۔ للاڈلے نے اس کو ہاتھ سے پونچھ کر اس کا ڈھکنا ہٹایا۔ اندر کپڑے کی کترنیں سی بھری ہوئی تھیں۔ للاڈلے انھیں کچھ دیر تک خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر ان کو نکال کر صندوق کے ڈھکنے پر رکھنے لگا یہاں تک کہ بکس خالی ہو گیا۔ اب وہ بکس میں ایک ایک کر کے منجن کی شیشیاں رکھ رہا تھا۔ میں نے ایک نظر کترنوں کو دیکھا۔ ان میں سے قریب قریب ہر ایک پر چکن کی کڑھائی تھی۔ میں نے ایک کترن کو اٹھا کر دیکھا۔ سب سے اوپر سفید دھاگے سے ایک نازک سا بوٹا بڑی صفائی کے ساتھ کاڑھا گیا تھا۔ اس کے نیچے کسی اناڑی ہاتھ نے اسی وضع کے آٹھ دس بوٹے کاڑھنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے باری باری کئی کترنوں کو اٹھا کر دیکھا۔ اُن پر چکن کی مختلف کڑھائیوں کے نمونے تھے۔ ہر کترن پر سب سے اوپر کسی منجھے ہوئے ہاتھ کا نمونہ اور اس کے نیچے اس کی کچی پکی نقلیں تھیں۔ میں چپ چاپ ان نمونوں کو دیکھتا رہا، پھر مجھے للاڈلے کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ بکس میں شیشیاں رکھ کر اس کا ڈھکنا بند کر چکا تھا اور اب معلوم نہیں کتنی دیر سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے اُس کی طرف دیکھا تو اس نے ایک ہاتھ اوپر اٹھا کر کترنوں کو ٹٹولا، پھر صندوق کے ڈھکنے کو تھپتھپا کر بولا:

"اب انھیں اِسی میں رکھے دیتے ہیں۔"

اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے ایک ہاتھ سے زور لگا کر اس نے صندوق کا ڈھکنا تھوڑا اوپر اٹھایا اور دوسرے ہاتھ سے کنستروں کو جھک کر اٹھانے کی کوشش کی۔

"آپ رہنے دیجیے،" میں نے کہا اور ڈھکنے کو تھوڑا اور اوپر اٹھا کر سب کنستر میں صندوق کے اس گوشے میں رکھ دیے جو شیشیوں کے ہٹ جانے سے خالی ہوا تھا۔ پھر میں لاڈلے کی طرف مڑا۔ وہ زمین پر کہنیاں ٹیکے، آگے کو پھیلی ہوئی خشک ٹانگوں کے پیچھے کچھ بیٹھا، کچھ لیٹا ہوا تھا اور چند میں معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا:

"اور تو کوئی کام نہیں ہے؟"

اس نے بکس کی طرف دیکھا اور بولا:

"آپ کے گھر سے ٹال قریب پڑتا ہے۔ ہم اتوار اتوار اسے آپ کے یہاں سے اٹھا لیا کریں گے، شام کو پھر رکھ دیں گے۔ لیکن اگر آپ کو تکلیف ہو۔"

"مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔"

"تو آج شام تک ہم بکس آپ کے یہاں پہنچا دیں گے۔"

"آپ کہاں تکلیف کریں گے،" میں نے کہا، "میں اسے لیے جاتا ہوں۔"

"نہیں میاں، ہمارا بوجھا آپ کیوں ڈھوئیے۔"

"اس کا وزن ہی کتنا ہے،" میں نے بکس اٹھاتے ہوئے کہا، "مجھے پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"بہت برا لگ رہا ہے، میاں۔"

"اس میں برا لگنے کی کون سی بات ہے،" میں نے کہا، "اچھا، اور تو کوئی کام نہیں ہے؟"

"آج آپ کو ہم نے کتنا ہلکان کیا،" اس نے کہا، آگے پھیلی ہوئی ٹانگوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹا اور لاٹھی کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔

"اچھا،" میں نے صحن کی طرف مڑتے ہوئے کہا، "اتوار کو میں گھر ہی پر رہوں گا۔"

"ٹھہریے میاں، ہم بھی آ رہے ہیں۔"

میں رک گیا۔

"کہاں جانا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو دروازے تک پہنچا دیں۔"

Scanned with CamScanner

"نہیں، آپ یہیں رہیے۔ میں چلا جاؤں گا۔"

باہر نکل کر مجھے خیال آیا کہ میں نے اُسے بیٹی کا پُرسا نہیں دیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ اُس نے خود ہی مجھ کو پُرسے کا موقع نہیں دیا، اس لیے میں واپس نہیں ہوا۔

گھر پر اماں کی چوکی کے نیچے اس کا بکس رکھ کر میں سیدھا لالہ کی دکان پر پہنچا لیکن جمعرات کی وجہ سے دکان بند تھی۔ گھر واپس آیا اور اس کے بعد صرف قبرستان جانے کے لیے باہر نکلا۔

دوسرے دن جا کر میں نے لالہ کو بتایا کہ میرا غم غلط ہو گیا ہے۔ لالہ نے اسی دن سے مجھ کو رکھ لیا۔ میں نے کام کو پوچھا تو کہا بعد میں بتائیں گے۔

اتوار کو وہ نہیں آیا۔ اس کے بعد والے اتوار کو بھی نہیں آیا۔ میں نے دن بھر اس کا رستہ دیکھا۔ شام کو میں اس کے مکان پر پہنچا۔ دروازے کی نیچے والی کنڈی میں قفل پڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے پڑوس والوں سے پوچھ تو معلوم ہوا پچھلے اتوار کو صبح کے وقت وہ گھر سے نکلتے دیکھا گیا تھا۔ اس کے بعد سے واپس نہیں آیا ہے۔ اُس کے بارے میں اِدھر اُدھر کچھ پوچھ گچھ کی گئی تھی لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کہاں ڈھونڈھا جائے۔

اُس کو تلاش کرنے کی بہت کوشش بھی نہیں کی گئی اس لیے کہ زیادہ تر پڑوسیوں کو قریب قریب یقین تھا کہ وہ کسی دوسرے شہر چلا گیا ہے اور وہاں بھیک مانگ رہا ہوگا۔

**

The Annual of Urdu Studies

Editor:
Muhammad Umar Memon

Associate Editor
G. A. Chaussee

Published by:
University of Wisconsin-Madison
Center for South Asia
1220 Linden Drive
Madison, WI 53706, USA.
Fax: 608/265-3538
Internet: mumemon@facstaff.wisc.edu
chaussee@students.wisc.edu

Number 12 (1997)
devoted to the writings by and on Naiyer Masud
available in Pakistan

Special price : Rs 500

Please call or write to:
aaj ki kitabain
A-16, Safari Heights,
Block 15, Gulistan-e-Jauhar,
Karachi 75290.
Phone 8113474
e-mail: aaj@biruni.erum.com.pk

Scanned with CamScanner

جون ایلیا

ولایتِ خائباں

عُزرا ابنِ سلامہ اور جندب ابنِ یاسر، ساکنانِ شہرِ صیدا
"خائباں" کے سب سے عالی شان شہرستان "آسف آباد" میں
وارد ہوئے تو وہ "سرائے سیمیں" میں ٹھہرے
"سرائے سیمیں" اک خوش نظم و خوش منظر سرائے ہے
وہ بعدِ چاشت روزانہ سرائے سے نکلتے اور آسف آباد کے
بازار و برزن میں، خیابانوں میں، کوچوں میں، خربوں میں
وہاں کی وضع اور اس شہر کے باشندگاں کے حال احوال
اور کیفیات کی تحقیق کر کے اس کی روداد کو اپنی بیاضوں میں رقم کرتے
آسف آباد" کہ دونوں یک سر مات اور مبہوت تھے
وہ یوں کہ وہ باہر سے آئے تھے
انھوں نے رہگذاروں شاہراہوں پر ہزاروں لوگ دیکھے
تیز رفتار و شتاباں، سست رفتار و خراماں
مگر جو صورت سخت حیرت ناک تھی یہ تھی کہ سب اہلِ آسف آباد
اک خوابِ عمیق و جاوداں میں غرق تھے
اور شہر میں اک شور، شورِ سامعہ آزار برپا تھا

وہ شورِ سامعہ آزار اسعت آباد کے خوابیدہ گردوں کے
پیاپے بے خلل بے وقفہ خراٹوں کا تھا
وہ ایک موسیقیِ نحی نادر تر
نہ جانے کتنی صدیوں کی ریاضت کا نتیجہ
اور اسعت آباد کے خوابیدہ گردوں کا تمامی روزگار و کاروبار
اور دفتر دیوان کا نظم و نسق
ہر اک نفس کے وارِدے پر ایک الہامی طریقِ معجزہ آسا پہ چلتا تھا

* * *

یکم شعبان کو بعدِ غروبِ آفتاب، ابنِ سلامہ اور جندب ابنِ یاسر
زندہ بیدار اور اُس کے یار اور ہم کارِ یک دل
سرمد آرکانی سے "قہوہ خانۂ شرخاب" میں اک خاص طورِ روبروئی سے ملے
پھر چند ہی لمحوں میں ان کے درمیاں
احساس اور اظہار کے بسیار گونہ سلسلے تھے جو چلے

ابنِ سلامہ اور جندب ابنِ یاسر! غالباً تم دونوں پہلی بار
اس نادر ولایت، "خائباں" میں آئے ہو
میں، اور میرا یارِ جانی، جاودانی زندہ بیدار، اپنے دل کے دل سے
جاں کی جاں سے
تم دونوں کو اپنے شہر میں خوش آمدیدِ جاوداں کہتے ہیں
ہم بھی ایک دن اِس شہر میں باہر سے آئے تھے رہا، حرّان، تدمر اور بخارا سے
عزیزو! خائباں میں شاید اب تک صرف دو سیاحِ دانش یار آئے ہیں
بُریرا ابنِ سلامہ اور جندب ابنِ یاسر تم!

مجھے تم سے عجب حیران کن اک بات کہنا ہے عجب حیران کن اک بات
اور وہ یہ کہ ہم بھی خائباں کے شہر اسعت آباد کے شہری ہیں
لیکن تم یقیں کرنا کہ ہم روزانہ وقتِ فجر جاگ اٹھتے ہیں
اور خوابیدہ گردی کی کسی بھی کیفیت کے ابتلا سے
یک سرہ محفوظ اپنے وقت پر گھر سے نکلتے ہیں
عزیرا ابنِ سلامہ اور جندب ابنِ یاسر! تم یہ سوچو گے کہ ہم دونوں
بجائے روز و شب خوابیدگی کے عارضے سے کس طرح محفوظ ہیں
اور وہ بھی عالی شان شہرستان اسعت آباد میں
اور تم یہ پوچھو گے کہ اس کا کیا سبب ہے
بات کچھ یوں ہے کہ جب ہم سرزمینِ خائباں میں آئے ہیں تو
فخرِ جالینوس محسن یارِ قرمز نے
ہمیں اپنی قرابادینِ خاص الخاص کی اک معجزہ پرور دوا دی تھی
اور اس کا نام ہے "اکسیرِ عقلانی"
اُسے ہم روز وقتِ فجر استعمال کرتے ہیں
اسی اکسیر کی تاثیر ہے جس کے سبب ہم اس عذابی عارضے خوابیدہ روزی
اور اس خوابیدہ گردی کے مرض سے یک سرہ محفوظ ہیں
تم بھی بتاؤ، تم نے اب تک کوئی خرّاٹا لیا، کوئی بھی خرّاٹا؟
یہاں ہر گفتگو ہر بحث ہر تحریر خرّاٹوں میں ہوتی ہے
اسے تم سرزمینِ خائباں کا امتیازِ خاص بھی کہہ لو
یہ باتیں بھی کہ "جانم! تم مری پہلی محبت ہو میں تم پر جان دیتا ہوں..."
"مجھے بھی ہاں مجھے بھی تم سے حد درجہ..."
یہاں سب گفتگو خرّاٹوں میں ہوتی ہیں
اگر تم بھی یہاں دو اک مہینے تک رہو تو یہ مرض تم کو بھی ہو جائے

Scanned with CamScanner

***

ہمیں، بنِ سلامہ اور جندب، تم سے ملنے اور تم سے حرف زن ہونے کی
بے حد آرزو تھی اور کئی دن سے
ہمیں مشہور قصہ گو سلافی نے تم دونوں عزیزوں کی جو کیفیت بتائی ہے
وہ ظاہر ہے کہ یکسر قابلِ قصہ اور عجب تر ہے
یہاں کا حال ہی افسون و افسانہ نما تر ہے

***

عزیزو! فاتساں کے رہنے والوں میں سے
شاید کم سے کم اسی کی جو خواہش ہے
وہ خواہش سراسر اور ہی کچھ ہے
وہی جو اپنی خواہش اور دنیا کے ہر اُس شائستہ آدم زاد کی خواہش ہے
پر کیا ہو کہ اپنے فاتساں کے ہر دور معمول ہیں کس سر کے معمول
اُن میں سے کوئی خود میں نہیں ہے کوئی بھی
جو بھی ہے وہ ناخود میں زندہ ہے
ہے باقی تو وہ بیچ بیچ پچھل پائے میں بیچ بیچ
اور انہیں کے ہاتھ میں سب کچھ ہے سب کچھ
و ہمیں بے حد افسوس ہے اور وہ یہ ہے کہ اس بیداد زیادہ
و یکسر درہم افتادہ ولایتِ فاتساں کے ہر سے باشندے
و حسنال ترقہ اور اس کے دل و دیں کے خستہ خواب کی تعبیر،
ماضی میں پلٹ جائیں
اُلٹ جائیں

سو وہ تاریک اندیشہ یہاں کی سادہ دل نسلوں کو جو تعلیم
سے بے حد پاک دل کی پاک پندار آفریں
تعلیم دیتے آئے ہیں
وہ یہ ہے یعنی یہ کہ ساری آدمیت کی ہزاروں سال سے لے کر
ہماری نسل تک کی زندگی کا سب سے زرّیں دور اس ماضی میں گذرا ہے
جو لافانی ہے لافانی رہے گا اور ہم سب کو بہر صورت
اسی میں زندہ رہنا ہے اگر زندہ ہی رہنا ہے
درخشندہ ہی رہنا اور رخشندہ ہی رہنا ہے
زُرارہ ابنِ حُذیفہ اور جندب ابنِ یاسر! تم یقیں کرنا
یہاں اجناس کے سرچشمے کے حکم کی رُو سے ہر اک ماکول اور مشروب میں
خواب آور ادویہ کی آمیزش ضروری ہے نہیں تو پھر سزا ہے
الغرض مقصد جو ہے یہ ہے کہ سارے لوگ اپنے ہوش سے عاری رہیں
اور صرف بے ہوشی میں سرگرم اور مگرد کار، بداحوال، بداطوار ہوں
اس ماجرا آگیں ولایت کی تمامی دانش و بینش تمامی فرّخی، فرہنگ
ہر فرّ و فراوانی فزائش کا جو سرچشمہ ہے وہ خوابیدہ روزی اور بس خوابیدہ گردی ہے
فسونِ افسانگی، خاموش آوازوں کا شور اور نیم روشن گرد و پیش
ابہام کی سمتیں، ہیولے، تیرہ اندیشی

***

فسونِ افسانگی، خاموش آوازوں کا شور اور نیم روشن گرد و پیش
ابہام کی سمتیں، ہیولے، تیرہ اندیشی
کسے معلوم کیا ہے... شاید ایسا ہو کہ ساری بُودش اک خواب و فسونِ جادو نہ ہو
سبھی کچھ اک فریبائی... فریبائی ہو... سب کچھ یعنی مطلب یہ کہ..

مطلب یہ کہ سب کچھ ایک الف نہ ہو۔ سب کچھ ایک الف نہ۔
گماں ہا در گماں ہا ۔۔ یک رَد رَد و دُوراَدُور بے نام و نشاں ہا۔۔۔ ہا
ہُریرا ہی... ہُریرا ہی... تو آب گل... یعنی گل۔۔
سب ہم ہی۔ بس ہم ہی... جدھر ای بیٹھا۔۔ حراخرہا... خراخرا

رُوپوشی

یاد میں خوف ہے
سخت اُفتاد ہے
جاں گسل کربِ تعزیر ایجاد ہے

لمحہ لمحہ درخشاں پُرسایہ کی شامِ ناشاد میں خوف ہے
خش خشِ بادِ تنہائی اُفتاد میں
پرتوِ نیم رنگِ گماں ہائے رنگ آشفتگی زاد میں خوف ہے

میں تو اب یاد سے
یاد کے جاں گسل کربِ تعزیر ایجاد سے
اپنے دل کو بچائے ہوئے
بُود کی رائیگانی میں روپوش ہوں
خود فراموش ہوں
یاد میں خوف ہے

Scanned with CamScanner

آزمایش

جو بستی خواب بن جائے کسی کا
ایسی بستی میں
حصارِ ذاتِ ہستی میں
کوئی آساں نہیں رہنا
کہ ہم خوابوں میں رہ سکتے ہیں
لیکن خواب کی بستی میں رہنا اک سزا ہے
ایک کاوش ہے، اذیت ناک کاوش ہے
بلا کی آزمایش ہے

خلوت

مجھے تم اپنی باہوں میں جکڑ لو اور میں تم کو
کسی بھی دل کشا احساس سے جذبے سے یکسر ناشناسانہ
نشاطِ شوق کی سرشاری حالت سے بیگانہ
کسی بھی لمحۂ پُرماجرا سے بے حسابانہ
مجھے تم اپنی باہوں میں جکڑ لو اور میں تم کو

Scanned with CamScanner

فسوں کارا، نگارا، خوبہارا، آرزو آرا!
بھلا لمحوں کا میری اور تمہاری خواب پرور
آرزومندی کی سرشاری سے کیا رشتہ
ہماری باسی یادوں کی دل داری سے کیا رشتہ
مجھے تم اپنی بانہوں میں جکڑ لو اور میں تم کو
یہاں اب تیسرا کوئی نہیں یعنی محبت بھی

مقولۂ عنکبوت

میں پیاپے جو موجود ہوں
صرف موجود ہوں
صرف موجود ہونے کی حالت میں ہونے کو جو حوصلہ چاہیے
وہ خدایاں خدا میں بھی شاید نہ ہو
عنکبوتِ رواقِ کہن کا مرے یہ مقولہ ہے:
ہے بھی نہیں
اور تھا بھی نہیں

پہنا، درازا اور ژرفا

فضائے نیلگونِ آسماں ہے اور میں ہوں
اور وہ سب کچھ نہیں ہے جو کبھی تھا
اور وہ جو ہو بھی سکتا تھا مگر اک وہم ہی تھا
اور اب تو خود سے اک بےگانہ واری ہے
بلا کی دم گدازی ہے
کہ نبودش زخمِ کاری ہے

میں خود سے سرزنشدہ ہوں
میں جاں بر کف شدہ ہوں
میں خود اپنا گزندہ ہوں
سو اب میں خون تھوکوں گا
عجب اک شنگرفی سی قے کروں گا

کیا یہ حالت آج کی ہے
آج کی؟
میرا گماں یہ ہے
یہ حالت آج کی ہرگز نہیں ہے
یہ تو میرے باطنِ باطن
یہ میرے کارنِ کارن کے جبرِ سرمدی کا
ایک حالِ جابرانہ ہے
یہی میرا فسانہ تھا یہی میرا فسانہ ہے

مرے ہم زاد کربِ اُفتاد نے
سیر و سفر ورزِ ہلاکت زاد نے
نسیان سے شیطان نے مجھ کو بنایا ہے
کہ میں نسِ رایگاں کی شش جہت میں مر کے آیا تھا
کہ میں تاوانِ ہستی بھر کے آیا تھا

یہاں کوئی حقیقت بھی نہیں ہے اور فسانہ بھی
جو کچھ ہے وہ پسا ہے گماں کا ایک پسنا ہے
درازا اور ژرفا ہے
وہ یعقوبِ سراسر داستاں کا صرف ہوا ہے
سو بے ہوش اور اس کا زخم کاری کیا
گمانِ صد عذابِ ذات کی لمحہ شماری کیا

تمثیل

(پہلا منظر)

میں لمحوں کا گدا گر تھا
تمہارے جاوداں افروز لمحوں کی پذیرش کا گدا گر تھا
سراسر اک گدا گر
ایک بے کشکول و کاسہ ایک بے کوچہ بہ کوچہ
بے صدا و بے دعا از خود گزشتہ اک گدا گر تھا

جو گُلمانِ پُر سر و سودا کے جاں پرور سراغِ آرزو آگیں میں
رفتہ اور آئندہ کے خوابوں کی گدائی پیشہ کرتا تھا
خیالوں کو، نفس ہوش خیالوں کو، ابد اندیشہ کرتا تھا
یہ اک تمثیل تھی بے صنفِ تمثیل
اور جو کچھ تھا یہی تھا بس یہی کچھ تھا

(دوسرا منظر)

پھر اس کے بعد جانانہ
تمھاری جاودانہ آرزو کے بازوانِ مرمریں
میرے، مرے آغوش کے مرگِ سفیدِ بے فغاں میں
میری دل جُو زندگی تھے ارجمندی تھے
میں جن میں خرّم و خُرسند رہتا تھا
یہ میری دم بہ دم کی زندگی کی صنفِ تابی تھی
مری ہر آرزو پہلو بہ پہلو سبزہ گوں تھی اور شہابی تھی

(تیسرا منظر)

پھر اس کے بعد کے منظر میں
(یعنی اس گھڑی میں)
جو پیش آیا ہے وہ کچھ یوں ہے کہ میں تم میں
تمھارے جاں فزا آغوش کی نزدیک تر خوشبوئی میں
اور اس کے گرداگرد میں دم توڑ دیتا ہوں
پھر اس کے بعد زندہ ہو کے اٹھتا ہوں

قیامت کی ہنسی ہنستا ہوں
پھر سکتے میں رہ جاتا ہوں
آخر اک نہایت خندہ آور گریہ کرتا ہوں

بُودِش

کروڑ کہکشانوں میں
سرآشفتہ عبث کا ایک درہم کالبد شہپور زن
ہر دم خود اپنے آپ کی درہم زنی برہم زنی کی
حالتِ بکولِ تجسیمِ جہاں سوزی میں جلتا ہے
خلا انفاسِ تاریکی کے مرغولے اگلتا ہے
یہ بالا کیا یہ ژرفا کیا یہ پہنا کیا؟
کوئی سمتی نہیں بودِش کے کوئی بھی نہیں کوئی
سرابِ وہم کے خوابیدہ گردوں کی دَوِش ہے
سُوے ہرزہ سُوے ہرزہ
اور اِک دریوزگیِ پیشہ گماں کی بند بازی ہے
خیالِ دور پروازِ جہاتِ بے نہایت کی جو ساری تَرَد ہے
وہ نسلِ آدم کے خللِ دل گرانی کے سوا کیا ہے
ازل ہاے ازل کا اور ابد ہاے ابد کا جو عبث ہے
اس کی آخر کیا شمارِش ہے
شمارِش کا گلہ کیا ہے
کسی کے زوزۂ گفتار میں آخر رکھا کیا ہے
یہ جو کچھ بھی ہے جو کچھ

ایک سنجش، چشم بندی کی زبوں فرجام سنجش ہے
یہ منظر چہرہ پرچیں، رستاخیز ہر لمحہ کا منظر ہے
جو یکسر واژگوں ہے اور نگوں سر ہے
جو بینائی کی ہر دم خوار کاری ہے
سو جو لمحہ ہے بینش کا وہ بس شکوا گزاری ہے
سو جو مفہوم ہے دانش کا وہ دیوانہ وری ہے
یہاں اندازہ گیری کا جو لمحہ ہے نکوہش ہے
کوئی معنی نہیں بودش کے بودش خوار کارِ وہم بودش ہے
ازل سے جس کا مفہومِ خجستہ اس نفس تک ایک ہرزہ ہے
گماں بھی اور گماں میں جو بھی گزرا اور گزرتا ہے وہ یاوہ ہے
سبھی کچھ ایک یکسر ناسزیدہ تر تماشے کا تماشا ہے

اہُورا اور انساں اور اہرمن
بس اک سنگین و شرم آور سرانجامی
کے شورِ ہمیشہ حال کا
سبھا یہ ہیرزم ہیں
یہ اپنے آپ ہی سے، جو سراسر وہم ہے،
ہمیشہ بے اندازہ تر گم ہیں
یہ بالا کیا یہ ژرفا کیا یہ پہنا کیا؟
کوئی معنی نہیں بودش کے کوئی بھی نہیں کوئی

**

اسد محمد خاں

شہر کے لیے

چالیس بیالیس برس پہلے جب میں بیس برس کا تھا
میں نے خواہش کی تھی
شہر کے ساتھ بوڑھا ہونے کی

یہ بہت مشکل بہت آسان سی خواہش تھی
(یا شاید اُس وقت آسان لگتی تھی)
اِس میں کسی کا کوئی بیچ نہیں تھا
شہر اور میں
اِس قصے میں بس ہم دو ہی تھے،
یا سمجھو تو تیسرا وہ پارسی بھائی تھا
سولا ہیٹ پہنے
ڈوبتے سورج کی طرف چہرہ کیے
منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا ہوا

Scanned with CamScanner

اُسے دیکھتے ہی میں پہچان گیا تھا کہ وہ شہر کے ساتھ بوڑھا ہوا ہے
شہر کا اگوا ہے وہ

نئی جٹی کے پرانے پُل کے برابر گرڈروں پائپوں کا ایک پُل ہے
جس پر ریل کی پٹری بھی ہے
لوہے کے اس پھیلاوے اور نئی جٹی پُل کے بیچ ایک دمدمہ سا ہے
جس پر جانے کو فٹ پاتھ کے ساتھ نئی نیچی دیوار لانگھنی پڑتی ہے
اوور ٹائم ختم کر کے جب میں کیاماڑی سے آ رہا ہوتا
تو وہ مجھے اس دمدمے پر کھڑا ملتا تھا
سفید زین کا بند گلے کا کوٹ اور سفید پتلون پہنے
وہ کسی دَرِ مہر کا خادم یا دستور دکھائی پڑتا تھا
ہاتھ میں چھوٹی سی کتاب لیے
(یہ اُس کی دعاؤں کی کتاب ہوگی)
کانوں تک آیا ہوا خاکی رنگ کا سولا ہیٹ پہنے
سردی گرمی برسات، سورج کی طرف چہرہ کیے
شہر کے اس پہلے پُل پر کھڑا وہ مجھے روز نظر آتا تھا
اُس کا سُبھاؤ کسی اہم تقریب کے emcee
یا بہت باادب چوبدار کا ہوتا تھا

اُسے پہلی بار دیکھ کر ہی میں سمجھ گیا تھا کہ وہ شہر کا اگوا ہے
جو روز اس پُل پر شہر کے لیے کچھ مانگنے آتا ہے
پھر مجھے پتا چل گیا کہ وہ کیا مانگنے آتا ہے
خود بہ خود پتا چل گیا کہ وہ شہر کو دینے کے لیے
سورج سے رات مانگنے آیا کرتا ہے:

مغرب سے کچھ دیر پہلے وہ اپنی کتاب بند کرتا اُسے کوٹ کی اوپر والی جیب میں رکھ دیتا پھر کچھ پڑھتے ہوئے ہاتھوں کے موزوں اشارے سے عرض کرتا کہ شہر اعظم، عالم پناہ! گزارش یہ ہے کہ اس بخت آور شہر کو اب اس کی رات بخش دی جائے

بس پہ جاتا ہوا سورج اس ساگوں بھرے شہر کی رات اس کے حوالے کر جاتا

وہ شہر کا اگوا، جیٹھ اتارے دم سے فٹ پاتھ پر آتا

اور اپنی بھاری ذمہ داری میں جھکا ہوا

اُس دن کی رات لیے شہر میں داخل ہو جاتا۔

شہر پھر دھیما ہو جاتا

(چالیس بیالیس برس پہلے کا)

شہر پھر دھیما اور شانت ہو جاتا

***

تلسی داس کا ایک گیت

سن ۶۸ سے ۷۱ تک میں نے شاعر جون ایلیا کی ڈائجسٹ کے لیے کچھ کمرشل لکھائی کی تھی۔ جیسا کہ جون کی عادت ہے، اپنی ڈائجسٹ کے ایک ایڈیٹوریل میں اس نے قاری کو مرعوب اور مجھے خوش کرنے کو (یا اپنی محبت میں) لکھ دیا کہ اسد محمد خاں، جو ہمارے لیے فلاں چیز لکھ رہا ہے، فی الاصل سنجیدہ کہانی کار اور تمثیل نگار ہے اور یہ گیت بھی لکھتا ہے۔ اور پھر (جیسا کہ جون کی عادت ہے) میرے گیتوں کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اس نے بڑی ڈھٹائی سے مجھے اپنے عہد کا تلسی داس لکھ دیا۔ (اللھم اعطنا!)

میں اس طرح کے سہری ٹائٹل کے لیے کبھی، کسی حال میں راضی نہیں ہوتا۔ میں میں ہوں اور اپنی طرح کا لکھتا ہوں ـــــ کسی جیسا، یا کم تر یا فروں تر، یعنی چہ؟

ویسے بھی کسی کو عظیم ترین یا قریہ ایشیا وغیرہ کہنا بچکانہ حرکت ہوتی ہے۔ اسی طرح

خدائے سخن یا فردوسیِ اسلام کا معاملہ ہے۔ 'خدا' وغیرہ بہت غیر ذمہ دارانہ غلو ہے اور 'فردوسی' کا یہ ہے کہ وہ پان سات برس میں نہیں نمٹ جاتا، صدیوں کی مار کھا کے بھی زندہ رہتا ہے۔ یہ سب اردو کی زرد صحافت سے وابستہ سہل پسندی بلکہ تو سر بازی ہے۔ ہاں، شوبز میں اس طرح کا Greatest Ever اور Colossal اور Mammoth کا دعویٰ چل جاتا ہے، سنجیدہ کاموں میں نہیں چلتا۔

ہمیں یاد ہے پچاس پچپن برس پہلے تک آغا حشر کاشمیری کو شیکسپیئرِ ہند لکھا جاتا تھا جو چھوٹا سفلہ پن تھا۔

جون نے مجھے اردو کا پاس نمانے کا (گویا مغربی پاکستان یا ایف بی ریا کا) تلسی داس لکھا۔ میں نے فون پر اُسے کچھ سخت سست کہا اور خفت کے مارے بیس پچیس دن تک شہر کے لکھنے والوں کو شکل نہیں دکھائی۔

بعد میں غصے کا رُخ خود اپنی طرف ہو گیا، اس لیے کہ مجھے اس بیان کے مضمرات کا علم ہی نہیں تھا۔ تلسی داس کو میں اُس طرح کب پڑھ پایا ہوں جس طرح کسی کو پڑھنے کا حق ہوتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تلسی داس بڑا ہے تو اِس عاجز اور دوسرے عاجزوں سے کتنا بڑا ہے۔

خیر، پھر کچھ تلاش اور جستجو کی اور مَیں نے تلسی کو پڑھنا شروع کیا۔ جستہ جستہ چیزیں ملتی رہیں، مل رہی ہیں۔

ایک بار نواباد (لیاری کوارٹر، بغدادی) کے میرے دوست عبدالغفور بلوچ نے، جو مجھے کتابیں اور محبت دیتے رہتے ہیں (اور جو زبانوں سے پیار کرتے ہیں کہ وہ سب دل آویز دنیائیں ہیں جنھیں دریافت کرنا اُن کے لیے ہر حال میں ضروری ہے)، تو عبدالغفور بلوچ نے مجھے تلسی داس کی "ونئے پتریکا" عطا کی۔ یہ مہاکوی گوسوامی تلسی داس کے شہرہ آفاق پد (گیت) ہیں اور استوتیاں (قصائد) ہیں دیوتاؤں دیویوں کی مدح میں۔ بیشتر کے راگ طے شدہ ہیں اور عنوان ہی میں بتا دیا گیا ہے کہ گیت کو کس راگ میں گایا جائے گا۔

"ونئے پتریکا" بہت ہی اچھا تحفہ تھا جو کوئی پڑھا کو آدمی کسی دوسرے پڑھا کو آدمی کو دے سکتا تھا۔

تلسی داس نے "رامائن" (رام چرت مانس) لکھی ہے۔ عام طور پر اُن کی وجہِ شہرت یہی

Scanned with CamScanner

ہے، مگر رامائن کی شعری لطافت اور کرافٹ اور دانش کا موازنہ ونے پتریکا کی شعری جھلکیوں سے کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے۔ یوں سمجھیے، ایک بالکل ہی نئی دنیا کے دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں۔

تلسی مذہبی پیشوا تھے۔ (انھیں کوئی گل، چوڑا مسئی گوسوامی تُلسی داس جی مہاراج لکھا جاتا ہے۔) بنارس جیسے ritually charged شہر میں ان کی رہائش تھی اور قصیدے پر قصیدہ اپنے ایک یا دوسرے دیوتا کی شان میں لکھتے رہتے تھے۔ ہاں کبھی ایسا کچھ ہو جاتا تھا کہ خالص رسمی مذہبی تحریروں کے بیچ کوئی جھلملاتا ہوا نیا نویلا تن دکھائی پڑ جاتا اور اندازہ ہوتا کہ گوسوامی کے دینی دانش کی ادائی میں لکھی گئی فرمائشی تحریروں کے بیچ اُن کی ستارے مارتی جینیئس نے اپنا ظہور کر دیا ہے۔

تو میں تلسی داس کے انھی لمحوں کو capture کرنے چل پڑا ہوں۔ اُن کے وہاں ایسے moments بہت ہیں۔ اس وقت اُن کا ایک پد (جو شو پاربتی کا قصیدہ ہے اور رنگ بسنت میں رچایا ہوا ہے) اردو ترجمے میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ گیت کے ساتھ دی گئی چند جملوں یا سطروں کی شرح اور فرہنگ سے مدد لے کر اور ہندی اردو کی لغات سامنے رکھتے ہوئے، کچھ اپنے شعری وجدان کے بھروسے، میں اس کام کا آغاز کر رہا ہوں۔ ترجمے میں جو کسر رہ گئی ہے اُس کے لیے زباں دانوں اور عارفوں سے معافی چاہتا ہوں۔

ویسے اب میں جون ایلیا سے بھی خوش ہوں۔ اگر اُس نے اتنی ونگر بات کہہ کے مجھے بوکھلا نہ دیا ہوتا تو میں کیوں تلسی داس کو اس طرح پڑھنے میں جُت جاتا ___ اُتنا ہی یا اس سے زیادہ لاعلم رہتا جتنا جون کے اس sweeping ریمارک سے پہلے تھا۔

***

یہ گیت کی استھائی ہے:

دیکھو دیکھو بن بنیو آج اُماکانت
مانو دیکھن تمھیں آئی رتُ بسنت

Scanned with CamScanner

یعنی، شِو دیکھ لے کر تُو آج بہار میں پھولتا ہوا، جنگل بنا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے خود بسنت تیرے دیدار کو آ گئی ہے۔

[شِو کے آدھے وجود میں (indicating his attributes as 'ardh-naari') اُن (پاروتی یا اَردھ آنگی) کا ... ما ہے۔ سو وہی بسنت کی رُت ہے۔ شِو کے بہت سے ناموں میں یہ نام اُماکانت، یعنی ... کا صاحب اور مالک، تلسی نے سی male-female principle کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کیے ہیں۔]

آگے کہتے ہیں:

(۱) جنّی تنّی دُوتی چمپک کُسُم مال
(۲) اور بسن نیل نوتن تمال

(۱) پاروتی کے بدن کی تجلی گویا چمپا کے پھولوں کی مالا ہے؛
(۲) نیلا ملبوس تمال کے (نیلے) پتّوں کا ہے۔

(۳) کل کدلی جنگھ، پد کمل لال
(۴) سُوچَت کٹی کیہری، گتی مَرال

(۳) خوب صورت رانیں کیلے کے تنے اور پاؤں کنول کے لال پھول ہیں۔
(۴) کمر کو دیکھ کر شیر (چیتے) کا اور چال دیکھ کر ہنس کا خیال آتا ہے۔

(۵) بھوشن پرسون بہو وِدھ رنگ
(۶) نوپور کِنکِنی کلکھ وہنگ

(۵) گہنے طرح طرح کے رنگ برنگے پھول ہیں
(۶) پازیب اور کردھنی کے دل آویز بول پرندوں کے نغمے ہیں۔

Scanned with CamScanner

(۷) کر تول بکل پل کو رسال
(۸) عسری بیل بگہ، کنبھو کی لتا جال

(۷) ہاتھ مولسری اور آم کی نئی کونپلیں،
(۸) چھاتیاں بیل کے پھل اور جولی تاک کی بیلوں کا جال ہے۔

(۹) آنن سروج بگہ مدھوپ گونج
(۱۰) لوچن بسال نو نیل کنج

(۹) پاروتی کا چہرہ کنول ہے اور سر کے بال گنجارتے ہوئے بھنورے ہیں،
(۱۰) بڑی بڑی آنکھیں نیلے کنول کے سے پھول ہیں۔

(۱۱) پک بچن چرت مور بر پی کیر
(۱۲) ست سن باس لیلا سمیر

(۱۱) اُن کی مدھر آواز کوئل ہے اور مزاج خوب صورت مور اور توتے۔
(۱۲) اُن کی ہنسی سُمن (چنبیلی) کا سفید پھول اور اُن کی چھلیں تین طرح سے چلنے والی
خنک، مہکی ہوئی، دھیمی ہوا ہے۔

(۱۳) کہہ تلسی داس سنو سیو سُجان
(۱۴) اُر بسی پر پنچ رہے ہنگا بان

(۱۳) تلسی کہتا ہے کہ عرفانِ اعلیٰ کے مالک اے شیو شنکر، سن!
(۱۴) کہ خواہشِ نفسانی کے دیوتا نے میرے سینے میں بس کر سب کچھ تہہ و بالا کر دیا ہے۔

Scanned with CamScanner

(۱۵) کری کرپا ہر بے جرم پسند کام
(۱۶) بے بیروے بسیں سکھ راسی رام

(۱۵) کرم کر مجھے کام دیو کے دام فریب سے نکال لے،
(۱۶) تاکہ میرے دل میں امن اور اسودگی دینے والے راجی آن بسیں۔

***

دیکھیے کوئی ایچ جنگل سے باہر کی نہیں ہے۔ تلسی داس نے شروع ہی میں "تن جنیو آج" کہہ دیا تھا۔ وما توفیقی الا باللہ۔

**

گابرئیل گارسیا مارکیز

منتخب تحریریں

("آج"، شمارہ ۲، بہار ۱۹۹۱، کتاب کی صورت میں)

لاطینی امریکا کے ملک کولمبیا سے تعلق رکھنے والے نوبیل انعام یافتہ ادیب
کی تحریروں کا ایک جامع انتخاب

دو مکمل ناول
"کرنل کو کوئی خط نہیں لکھتا" اور "ایک پیش گفتہ موت کی روداد"
تیرہ منتخب کہانیاں
دو ناولوں "تنہائی کے سو سال" اور "وبا کے دنوں میں محبت" کے منتخب ابواب
مارکیز کی نوبیل انعام پیش کیے جانے کے موقعے کی تقریر اور ایک اہم مضمون
"کولمبیا کا مستقبل"
مارکیز کے فن پر دو مشرقی نقادوں کے مضامین
اپنی زندگی، فن اور خیالات پر مارکیز کی ایک طویل گفتگو
مارکیز کی شخصیت اور حالات زندگی کے بارے میں
ان کے ایک ہم وطن دوست ادیب کی ایک طویل تحریر

قیمت: دو سو روپے

آج کی کتابیں

سی ۱۶، ۱، سفاری ماشس، بلاک ۱۵، گلستان جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

ذی شان ساحل

ملکہ کی واپسی

چتّل کی نمبر پلیٹ والی سیاہ، چمک دار مرسیڈیز میں
ملکہ کو ایرپورٹ سے لایا گیا
راستے کے دونوں جانب کھڑے، تھکے ہوئے پولیس والوں نے
اسے دیکھ کر تالیاں نہیں بجائیں،
تیز رفتار کوچ کی چھت پر لوگوں کو بیٹھا پا کر
ملکہ بھول گئی کہ کراچی میں مزارِ قائد پر کیا پڑھنا ہے
(اور سیٹی بجانے لگی)
جنوبی افریقہ کی کرکٹ ٹیم میں
بے چارے ڈانتا کے بھائی کو شامل ہونا چاہیے
(اس نے اپنے دل میں ہمدردی سے سوچا)
میں گولڈن ٹیمپل میں جا کر
کشمیر کی آزادی کے لیے دعا مانگوں گی
(اس نے ڈیوک آف ایڈنبرا سے وعدہ کیا)
مجھے ہمدرد یونیورسٹی سے ایم بی اے کی ڈگری لینی چاہیے
کاش، میں سینٹ جوزف کالج کی پرنسپل بن سکتی

Scanned with CamScanner

شہزادہ چارلس کو ریاں اور سندھڑی آم کتنے پسند ہیں
(ملکہ سوتے میں بڑبڑاتی رہی)
درۂ خیبر، شاہ فیصل مسجد، شاہی قلعہ، ایوانِ صدر
موہنجا پیلیس، پارلیمنٹ ہاؤس، اڈیالہ جیل...
ہمیں ان سب عمارتوں کو لندن لے جانا چاہیے
ولیم اور ہیری ڈاؤننگ اسٹریٹ پر
ایک سجے ہوئے ٹرک میں
ملکہ کو واپس آتا دیکھ کر کتنا خوش ہوں گے
(پرنس فلپ نے سونے سے پہلے اپنی نوٹ بک میں لکھا)
شاہی مہمانوں کے جانے کے بعد
صرف ایک یونین جیک
کارساز کے ٹریفک سگنل پر احترام سے لہراتا رہا
جسے کسی نے نہیں دیکھا

دہشت گرد شاعر

ایک خوش گوار دن
جب لوگ اپنے دفتر اور بچے
اسکول وقت پر پہنچ جاتے ہیں
دہشت گرد شاعر اپنے خوابوں کی بندوق لے کر
ہوائی فائرنگ شروع کر دیتے ہیں
کوئی ہلاک نہیں ہوتا، کوئی زخمی نہیں ہوتا
کسی کو ڈر نہیں لگتا

Scanned with CamScanner

کسی درخت سے ایک پتا تک نہیں گرتا
کسی کھڑکی کا شیشہ بھی نہیں ٹوٹتا
شاعر اپنا کام جاری رکھتے ہیں، مگر
شام ہونے تک کسی دیوار میں ایک سوراخ تک نہیں کر پاتے
کسی دروازے پر نشان بھی نہیں ڈال پاتے
لوگ حسبِ معمول گھروں کو واپس آتے ہیں
بچے راستوں میں کرکٹ کھیلتے ہیں لیکن کسی کو
خوابوں کے خالی کارتوس نہیں ملتے
دہشت گرد شاعر کہیں نظر نہیں آتے
جب رات ہوتی ہے تو اچانک اندھیرے میں کبھی
روشنی کی لکیریں آسمان کی طرف جاتی نظر آتی ہیں
اسی معمولی چمک میں ستارے
اپنا راستا بناتے ہیں، اسی راستے پر
دہشت گرد شاعر اپنی بندوق لیے زندگی بھر
پریڈ کرتے رہتے ہیں

آدمی زندگی

آسمان کا ایک حصّہ
میرے دیکھنے کے لیے ہے
اور زمین کا ایک حصّہ تمھارے چلنے کے لیے
سورج تمھاری آنکھوں سے نکلتا ہے اور چاند
میرے دل میں ڈوب جاتا ہے

Scanned with CamScanner

سمندر کا شور تمہارے دل میں بند ہے اور
دریا کی خاموشی میری آنکھوں میں
تم ایک کشتی میں سفر کرتی ہو اور میں
اس کے ساتھ ساتھ اڑنے والے بادل میں
مجھے دیوار پر بیٹھا ہوا سفید کبوتر اچھا لگتا ہے
اور تمہیں پنجرے میں قید ایک کالی چڑیا
جو اندھیرے میں، بارش کے بعد
نکلنے والی بیر بہوٹیوں کی طرح سرخ ہو جاتی ہے
تمہارا دل گرینائٹ سے بنا ایک مور ہے
جو اپنے پیروں کو دیکھ کر رو نہیں سکتا
اور میرا دل مٹی میں دھنسی ہوئی ایک بارودی سرنگ
جو تمہیں راستے سے گزرتا دیکھ کر
دھماکے سے ٹکڑے ٹکڑے ہونا بھول جاتی ہے

ٹائم بم

میرے پاس
ایک تصویر ہے
اور ایک دیوار جو تصویر کو
مضبوطی سے تھامے رکھتی ہے
اور ایک کیل جو دیوار اور تصویر سے گزر کے
میرے دل میں اتر جاتی ہے
میرے پاس ایک آئینہ ہے

اور ایک موم بتی جس کا دھواں
آئینے پر جمتا رہتا ہے
اور ایک پیالہ جس میں بارش کا پانی
اور شہد یا موم جمع نہیں کیا جا سکتا
میرے پاس ایک گیت ہے
جو اندھیرے میں گایا جاتا ہے
میرے پاس ایک کہانی ہے
جو روشنی میں سنائی جاتی ہے
میرے پاس ایک خواب ہے
جو کسی کو سنایا نہیں جا سکتا
میرے پاس ایک دل ہے
اور ایک ٹائم بم جو دل کے آس پاس
ہمیشہ ٹک ٹک کرتا رہتا ہے

جہاز

ہمیشہ حیران کر دینے والی
ایک لڑکی کو لے کر
آنے والا ہے جہاز
اسے اپنے اندر سمو کے
کتنی خوشی ہوتی ہے جہاز کو
وہ لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا
ایرپورٹ سے باہر جا کے

شہر میں کھو جانے کی پیڑ کی

سوچتا ہے جہاز اور بار بار
آسمان کے چکر لگانے لگتا ہے
زمین کو چھونے سے پہلے
بادلوں میں چھپنے کی کوشش کرتا ہے
اگر میں دوبارہ اس کے گھر کے اوپر سے گزرا
تو کیا پہچان پائے گی مجھے

سوچتا ہے جہاز
اور آدمیوں کی طرح
دکھی ہونے لگتا ہے
آنسو نہیں نکل سکتے اس کے،
اپنے پروں کو
آنکھوں پہ نہیں رکھ سکتا
سائنس کہتی ہے
مشین ہوتا ہے جہاز
محبت نہیں کر سکتا

سنتا ہے جہاز
اور بے قرار ہو کر پھر سے اڑ جاتا ہے

Scanned with CamScanner

اندھیرے میں

(ثروت حسین کے لیے)

اندھیرے میں ڈوبے ہوئے
ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر
مسافر گاڑی رکتی ہے
جسے ستارے بھی دیکھتے ہیں
اور چاند بھی،
تھوڑی دیر کے بعد
ہمارے خوابوں کے بغیر
سفر کرنے والی یہ ٹرین
ہم سے بادلوں کی طرح
بہت دور چلی جائے گی،
اگر میں سمندر کے اتنے قریب نہ ہوتا
تو شاید رات کی تاریکی میں
ریل گاڑی گذر جانے کے بعد
پٹریوں کو چمکتا دیکھتا اور
اسٹیشن پر ہی صبح کا انتظار کرتا،
ایک صبح کتنی خوشگوار ہو سکتی ہے
ایک رات کتنی تاریک ہو سکتی ہے
ایک چھوٹا سا اسٹیشن،
ایک کم رفتار ریل گاڑی
ہمارے خوابوں سے زیادہ دور نہیں ہوتے،
ہمیں زندگی اور محبت کے درمیانی فاصلے کو

زیادہ نہیں بڑھانا چاہیے، اندھیرا
ہماری آواز کو روشنی میں سفر کرنے سے
روک دیتا ہے اور صبح ہونے تک
ہم کچھ کہہ نہیں پاتے، رات ختم ہونے پر
وہ سارے لفظ ہمیں پلیٹ فارم پر
سوئے ہوئے ملتے ہیں جنہیں ہمارے بغیر
ٹرین میں جگہ نہیں مل سکی،
دھوپ میں کھلنے والے پھولوں کی طرح
ہم ان سب لفظوں کو سائے میں رکھیں گے
اور ہر رات اندھیرے میں ایک چھوٹے اسٹیشن پر
رکنے والی گاڑی کا ہمیشہ انتظار کریں گے

نظم

(محمد خالد اختر کے لیے)

اگر آسماں اتنا نیلا نہ ہوتا
تو اک خواب ہم اپنی آنکھوں میں لے کر
کبھی اس جہاں سے گذر ہی نہ پاتے
ہوائیں کوئی گیت گانے سے پہلے
پرندے فضا میں بکھر ہی نہ پاتے
گل و برگ شاید نکھر ہی نہ پاتے
بنالے کہاں راستا اپنا بادل
ستارے زمیں پر اتر ہی نہ پاتے،

ہر اک صبح، شب سے بچھڑ ہی نہ پاتے
جو ہے اس محبت کے کھوتے افق پر
اگر آسماں اتنا نیلا نہ ہوتا
تو ہم اس کی شدت سے مر ہی نہ پاتے
کسی دل میں روز، اپنا گھر ہی نہ پاتے

نظم

گھر سے نکلو
پارک کے کونے میں
لکڑی کی پرانی بنچ پر بیٹھو
شام ہو تو دھوپ کو جاتے ہوئے دیکھو
دور کچے راستے پر بج رہی ہیں گھنٹیاں
اڑ رہی ہے دھول، دریا کے کنارے آ رہی ہیں کشتیاں
کشتیوں میں لوگ اور لوگوں کے چہروں پر خوشی
جو تمھاری شام میں شامل نہیں ہے اور تمھاری زندگی سے دور ہے
پارک کے کونے میں رکھی بنچ
اور تمھارے گھر کے بیچ
ایک دریا کے برابر فاصلہ ہے یا کوئی پکی سڑک
جس پر تمھارے خواب چلتے ہیں مگر اک عمر تک
تم راستے میں بجنے والی گھنٹیوں، دریا کے کنارے کشتیوں اور
دھول میں لپٹی خوشی کو دیکھ پاتے ہی نہیں
صبح ہوتی ہے، گزر جاتا ہے دن، آتی ہے شام
رات ہو جاتی ہے اور تم پارک تک اک بار بھی جاتے نہیں

Scanned with CamScanner

شمس الرحمٰن فاروقی

ایرانی فارسی، ہندوستانی فارسی اور اردو: مراتب کا معاملہ

میں نے اس مضمون میں ایک ایسا سوال اٹھایا ہے جس کا مکمل جواب دینے سے میں قاصر ہوں۔ گویا اس مضمون کی مثال کسی ناقص اور خام کارانہ جاسوسی کہانی کی ہے جس میں حسبِ ذیل سوالات کو بے جواب چھوڑ دیا گیا ہے: کس نے کیا؟ کیسے کیا؟ اور کیوں؟ اس مضمون کی سب سے زیادہ دل چسپی شاید اس بات میں بھی ہو کہ میں نے جو سوال اس میں اٹھایا ہے، وہ اب سے پہلے کبھی اٹھایا نہیں گیا تھا، بلکہ اس کے وجود کی طرف کوئی اشارہ بھی نہیں کیا گیا تھا۔ یہ سوال بجائے خود دل چسپی کا حامل ہے کہ جو مسئلہ میں نے یہاں اٹھایا ہے اس کا آج سے پہلے کسی کو خیال کیوں نہ آیا تھا؟ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جائے تو شاید ہمیں کچھ یہ بھی پتا لگے کہ گزشتہ سوا سو برس میں ہمارے مورخینِ زبان و ادب کا ذہن کس طرح کام کر رہا تھا؟ لیکن میں اس سوال کا جواب دینے کی سعی نہ کروں گا، کیوں کہ میرا اپنا سوال خود ہی کچھ کم ٹیڑھا نہیں ہے۔

میرے مسئلے کو مختصراً یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ:

(۱) انیسویں صدی کے اوائل کے آس پاس ہندوستانی فارسی گویوں اور فارسی بولنے والے ہندوستانی الاصل لوگوں اور اہلِ اردو میں خود اعتمادی کی زبردست کمی پیدا ہوئی۔ یہ لوگ ہندوستانی فارسی اور اسی اعتبار سے اردو کو ایرانی فارسی کے مقابلے میں کم تر اور حقیر سمجھنے لگے، یعنی اپنے دہی کو آپ ہی کھٹا کہنے لگے۔

(۲) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی فارسی گویوں کو استناد حاصل نہ رہا اور ان کی فارسی اسی

Scanned with CamScanner

حد تک معتبر ٹھہری جس حد تک وہ ایرانی فارسی کے مطابق ہو۔

(۳) اردو کا حال اور بھی بُرا ہوا۔ اردو میں مستعمل فارسی عربی الفاظ کے استعمال پر یہ شرط عائد کی جانے لگی کہ ان الفاظ، تراکیب اور فقروں کو اسی وقت صحیح مانا جائے جب وہ فارسی ضابطوں اور قاعدوں کے مطابق ہوں یا جن کے لیے فارسی سے سند مل سکے۔ بہ الفاظ دیگر، زبان کی حیثیت سے اردو کا کوئی آزاد وجود نہ رہ گیا۔

(۴) مندرجہ بالا باتوں کو مراتب کے حسب ذیل گوشوارے کے ذریعے ظاہر کیا جا سکتا ہے:

اعلیٰ: ایرانی فارسی، یعنی وہ فارسی جو ان اہلِ ایران نے لکھی جو ہندوستان کبھی نہیں آئے۔

متوسط بالائی: ہند ایرانی فارسی، یعنی وہ فارسی جو ان ایران نژاد شعرا نے لکھی جنھوں نے اپنی تخلیقی زندگی کا بڑا حصہ ہندوستان میں گزارا۔

متوسط زیریں: ہندوستانی فارسی، یعنی وہ فارسی جو ہندوستانیوں یا ان ایرانیوں کی اولادوں نے لکھی جو ہندوستان میں رہ بس گئے۔

سطح اسفل سے ذرا اوپر: اردو، بشرطیکہ اس میں جو فارسی الفاظ، فقرے، تراکیب وغیرہ استعمال کیے جائیں وہ فارسی قواعد، محاورے، معنی اور تلفظ وغیرہ کے اعتبار سے درست ہوں۔

سطح اسفل: وہ اردو جس میں فارسی الفاظ وغیرہ کا استعمال فارسی ضوابط اور روزمرہ وغیرہ کا خیال کیے بغیر کیا گیا ہے۔

واضح رہے کہ یہاں ایران سے مراد موجودہ ایران ہی نہیں بلکہ بہت سارا وہ بھی علاقہ ہے جو آج وسط ایشیا کہلاتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ فارسی سے مراد عربی بھی ہے، اس حد تک جس حد تک عربی الفاظ اور فقرے فارسی میں شامل ہیں۔

میں یہ بات بھی شروع ہی میں عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ مندرجہ بالا گوشوارے کی رو سے جو صورت حال بنتی ہے وہ آج بھی کم و بیش موجود ہے، اگرچہ عام اہلِ اردو اس سے انکار کریں گے۔

میرا سوال یہ ہے کہ جو صورت حال میں نے اوپر پیش کی وہ کب، کس طرح، اور کیوں وجود میں آئی؟ اور اب تک باقی کیوں ہے؟ رہی یہ بات کہ اردو والے اس کو نہ مانیں گے کہ ہماری صورت حال وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کی، تو مندرجہ ذیل مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) کچھ دن پہلے میں نے الہ آباد میں، جہاں میں رہتا ہوں، ایک لکچر دیا۔ کچھ ادبی موضوع تھا

Scanned with CamScanner

اور سننے والے سب پڑھے لکھے مختلف عمروں کے خواتین و حضرات تھے۔ لکچر بہت دلچسپی سے سنا گیا، لیکن اس کے بعد ایک صاحب جو عمر میں کم و بیش میرے برابر رہے ہوں گے اور شکل سے میری ہی طرح کچھ پرانے خیال کے لگ رہے تھے، میرے پاس تشریف لائے۔ انھوں نے ارشاد فرمایا:

"آپ نے لفظ دیہات کو گاؤں کے معنی میں واحد استعمال کیا ہے۔" میں نے کہا، "جی ہاں! کیوں نہیں۔ گاؤں اور دیہات ہم معنی ہی تو ہیں اور اردو میں دیہات واحد مستعمل ہے۔" انھوں نے فرمایا، "مگر لفظ دِہ کے معنی ہیں گاؤں، اور یہ لفظ خود واحد ہے۔ آپ نے اس کی جمع بنائی دیہات، اور اسے واحد استعمال کیا۔ پھر یہ بھی کہ آپ نے اس لفظ میں عربی قاعدے سے ات لگا کر جمع بنا دی جب کہ دِہ فارسی لفظ ہے، اس میں عربی کی علامت جمع لگ ہی نہیں سکتی۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا جواب دوں۔ میں نے اپنی بات دہرائی کہ اردو کا محاورہ یہی ہے کہ یہاں دیہات بمعنی گاؤں واحد استعمال کیا جاتا ہے۔ اس پر وہ کچھ نہ بولے لیکن ایسا لگا کہ ان کی تشفی ہوئی نہیں۔

(۲) تھوڑا ہی عرصہ ہوا کہ "ہماری زبان" میں مضمون اس بات پر بحث چھڑی رہی کہ "استفادہ حاصل کرنا" صحیح ہے کہ نہیں۔ کہا یہ گیا کہ چوں کہ عربی میں 'استفادہ' کے معنی ہیں 'فائدہ اٹھانا'، اس لیے اردو میں بھی "استفادہ حاصل کرنا" درست نہ ہوگا؛ "استفادہ کرنا" بولنا چاہیے۔ میں نے جزوراً کہا کہ اردو پر عربی کا قاعدہ جاری کرنا درست نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ کئی فارسی اردو لغات سے "استفادہ حاصل کرنا"، 'استفادہ اٹھانا' وغیرہ استعمالات کے صحیح ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ میں نے مولانا حالی کی سند پیش کی کہ انھوں نے 'استفادہ حاصل کرنا' لکھا ہے۔ میں نے سید سلیمان ندوی کا قول پیش کیا کہ اردو میں جو لفظ آجائے اسے اردو کے محاورے کے اعتبار سے صحیح یا غلط قرار دینا چاہیے، عربی کے اعتبار سے نہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود لوگ یہی کہتے رہے کہ چوں کہ عربی میں لفظ "استفادہ" کے اندر "حاصل کرنا" کا مفہوم موجود ہے لہذا ہم "استفادہ حاصل کرنا" کو صحیح قرار نہ دیں گے۔ رہے لغات تو وہ غلط ہیں۔ جہاں تک سوال مولانا حالی کا ہے تو ممکن ہے انھوں نے سہو سے لکھ دیا ہو یا سہو کتابت ہو۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی نے لفظ "استفادہ" پر تو کلام کیا نہیں ہے، ایک عام اصول بیان کیا ہے؛ جب تک مولانا

سلیمان ندوی یہ صاف صاف نہ کہہ دیں کہ "استفادہ حاصل کرنا" صحیح ہے، ہم نہ مانیں گے۔(۱)

(۲) امیر خسرو کے بارے میں معلوم ہے کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے فارسی گو ہیں، اور تمام دنیا کے تمام فارسی گویوں میں بھی ممتاز ہیں۔ عرصہ ہوا میں نے لڑکپن میں غالب کا یہ قول پڑھا تو رنجیدہ ہوا کہ اہلِ ہند میں سوائے امیر خسرو کے کوئی مسلم الثبوت نہیں۔ میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔(۲) ("ٹھیک نکل جانا" بمعنی لغزش ہو جانا۔) مجھے افسوس یہ ہوا کہ غالب نے فیضی تک کو مسلم الثبوت نہ مانا، اگرچہ اکبر نے اسے کئی ایرانی شعرا پر ترجیح دیتے ہوئے اپنا ملک الشعرا مقرر کیا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ افسوس مجھے تب ہوا جب میں نے "شعر العجم" میں علامہ شبلی کا یہ بیان دیکھا کہ امیر خسرو نے ایسے بہت سے الفاظ اور محاورے استعمال کیے ہیں جو فارسی کے اہلِ زبان کے یہاں نہیں ملتے۔ شبلی نے مزید کہا کہ ایسے استعمالات کی بنا پر بدگمانوں کو یہ کہنے کا موقع ملتا ہے کہ ہندوستان میں طویل قیام کے باعث خسرو کی فارسی میں ہندوستانی پن ہے۔ شبلی نے خسرو کے نام نہاد ہندوستانی محاوروں کی ایک فہرست تو بنا دی لیکن امیر خسرو کی مدافعت میں کچھ نہ کہا، سوائے اس کے کہ میں نے اس پر غور نہیں کیا ہے۔(۳) مجھے بڑا رنج اس بات کا ہوا کہ شبلی تو خسرو کے زبردست مداح تھے، اور مجھے خود شبلی اور خسرو سے بے انتہا عقیدت ہے، لیکن شبلی نے خسرو کی مدافعت تو در کنار، قوتِ استدلال کا بھی مظاہرہ نہ کیا کہ خسرو ایسے بڑے شاعر کو زبان میں تصرف کرنے کا حق کیوں نہ ہوتا۔ پھر یہ بھی دیکھنا تھا کہ کوئی لفظ یا محاورہ کسی ایک دو لغات یا چند ایک شعرا کے یہاں نہیں ملتا تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ اس لفظ یا محاورے کا وجود ہی نہیں ہے۔

(۳) انیسویں صدی کے اواخر میں پڑھے لکھے حلقوں میں یہ بحث چلی کہ فارسی لفظ "نم" جس کے معنی ہیں "بھیگا پن"، کیا اسے محض "بھیگا" کے معنی میں بھی استعمال کر سکتے ہیں؟ علماے زبان نے فتویٰ دیا کہ چوں کہ فارسی میں "نم" کے معنی "بھیگا ہوا" نہیں ہیں اس لیے "چشمِ نم"، "دیدۂ نم" جیسی ترکیبیں، جو اردو میں رائج ہیں، درست نہیں ہیں۔ جلال لکھنوی کے صاحبزادے حکیم مہدی کمال نے لکھا کہ "چشمِ نم" یا "دیدۂ نم" کو استعمال کرنا یا لفظ "نم" کو "بھیگا ہوا" کے معنی میں استعمال کرنا درست نہیں ہے کیوں کہ "نم" کے معنی ہیں "بھیگا پن" نہ کہ "بھیگا ہوا۔"(۴)

Scanned with CamScanner

(۵) کچھ عرصے بعد بعض لوگوں نے خان آرزو کے سرکہ آرالغت "چراغِ ہدایت" کا حوالہ دیا کہ خاں آرزو نے اس لغت میں لکھا ہے کہ "نم" بمعنی "بھیگا ہوا" بھی درست ہے اور سند میں ایرانی استاد اور امیر محسن تاثیر کا شعر بھی درج کیا ہے جس میں "نم" بمعنی "بھیگا ہوا" استعمال کیا گیا تھا۔ اب ہمارے علمائے زبان کی ضد دیکھیے کہ علامہ طباطبائی نے محسن تاثیر کا کلیات دیکھنے اور شعر کے متن کی تصدیق کرنے کی بجائے یہ فرمایا کہ محسن تاثیر کا شعر کاتب نے غلط نقل کیا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ فارسی ابھی ہندوستان میں مُردہ نہیں ہوئی ہے، اس کے ہزاروں بولنے والے اب بھی موجود ہیں۔ میں نے اہلِ زبان کے منہ سے "نم" بمعنی "نم ناک" نہیں سنا۔ اس میں کوئی شک نہیں "چشم نم" بمعنی "چشم نم ناک" بالکل غلط ہے یا یہ ہندوستانیوں کا گڑھا ہوا فقرہ ہے۔(۵)

(۶) طباطبائی کا یہ بھی خیال تھا کہ اہلِ اردو نے بہت سے الفاظ عربی کے طرز پر بنا لیے ہیں، لیکن یہ سب الفاظ غلط ہیں کیوں کہ وہ اصل عربی میں نہیں ہیں۔ مثلاً "تمارت"، جو عربی ہے ہی نہیں، فارسی لفظ "تموز" سے عربی طرز پر بنا لیا گیا ہے۔ یا عربی "ذہن" سے "ذہانت"، یا عربی "شمول" سے "شمولیت"۔ یہ سب غلط ہیں اور ان کا استعمال نہ کرنا چاہیے۔(۶)

طباطبائی کے مندرجہ بالا بیان کے بارے میں یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہ ستر اسی سال پرانا ہے اور اب یہ حال نہ ہوگا۔ ابھی چند ہی ہفتے پہلے مجھے ایک شاعر نے لکھا کہ "خیریت" بروزن فاعلن غلط ہے کیوں کہ عربی میں "خیریت" بروزن مفعولن ہے۔ اس سے کچھ دن پہلے ایک صاحب نے اعتراض کیا تھا کہ "حیثیت" بروزن فاعلن غلط ہے کیوں کہ عربی میں "حیثیت" بروزن مفعولن ہے۔ اگر میں ان لوگوں کو یہ جواب دیتا کہ اردو میں یہی صحیح ہے اور بہرحال اردو کے الفاظ پر عربی کا قاعدہ جاری نہ کرنا چاہیے تو میری بات کوئی نہ مانتا۔ لہذا میں نے مجبوراً "نوراللغات" کے حوالے سے کہی کہ "نوراللغات" میں "خیریت" اور "حیثیت" دونوں کو بروزن فاعلن صحیح قرار دیا گیا ہے۔ اس کے باوجود ایک صاحب نے پھر یہی اعتراض کیا کہ "ماہیت" کو تو بروزن مفعولن ہونا چاہیے کیوں کہ اس کے بارے میں نوراللغات نے کوئی حکم نہیں لگایا۔

(۷) لطف کی بات یہ ہے کہ ہمارے علمائے زبان کے نزدیک ایرانی فارسی گویوں کو عربی میں بھی تصرف کرنے کا حق تھا، لیکن اردو گویوں کو فارسی یا عربی میں تصرف کرنے کا حق نہیں

تھا؛ حتیٰ کہ ہندوستانی فارسی گو کو بھی یہ حق نہ تھا کہ وہ عربی الفاظ میں تصرف کرے۔ امیر مینائی کے شاگرد زاہد سہارنپوری نے کہیں "تقدس" کی "دال" ساکن کے بجائے متحرک استعمال کیا۔ امیر مینائی نے اس کو غلط قرار دیا، تو زاہد سہارنپوری نے دلی کے ایک پرانے شاعر خواجہ نصیر کا ایک شعر سند کے طور پر لکھا جس میں "تقدس" کی دال متحرک نظم ہوئی تھی۔ لیکن امیر مینائی نے جواب میں لکھا کہ خواجہ نصیر مرحوم کی سند کافی نہیں ہے، ہاں اگر کسی ایرانی اہلِ زبان نے لکھا ہوتا تو ٹھیک تھا۔(۷)

(۸) انیسویں صدی کا وسط آتے آتے ہندوستانی فارسی گویوں کی وقعت اتنی کم ہو گئی کہ غالب کو یہ بات کچھ اچنبھے والی اور کچھ پریشان کن معلوم ہوتی تھی کہ کوئی ایرانی شاعر کوئی ایسا لفظ استعمال کرے جسے کسی ہندوستانی نے وضع کیا ہو۔ چناں چہ لفظ "بے پیر" کے بارے میں انھوں نے لکھا کہ یہ لفظ تورانی بچہ ہاے ہندی نژاد کا بنایا ہوا ہے۔ مرزا جلال اسیر خود مختار ہیں اور ان کا کلام سند ہے۔ میں کیوں کر کہہ سکتا ہوں کہ ان کا لکھا ہوا لفظ غلط ہوگا۔ مگر حیرت اور سخت حیرت ہے کہ ایرانی امیرزادہ ایسا لفظ لکھے۔(۸)

(۹) جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، نیاز فتح پوری اپنے رسالے "نگار" میں "باب الاستفسار" کے نام سے ایک کالم لکھا کرتے تھے جو بعد میں کتابی شکل میں چھپ گئے۔ اس کتاب سے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> "ذمہ" عربی لفظ ہے جس کے معنی "عہد"، "امان و ضمیر" کے ہیں۔ اردو میں یہ "جواب دہی" کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے جو اپنے اصلی مفہوم کے لحاظ سے درست نہیں۔ "رویہ" بروزن "صبیہ" عربی لفظ ہے جس کے معنی "غور و فکر" کے ہیں۔ روش کے معنی میں اس کا استعمال فارسی والوں نے بھی نہیں کیا۔ اردو میں البتہ صرف عوام اس معنی میں بولتے ہیں۔(۹)

میں یہ بات بر سبیل تذکرہ واضح کروں کہ "ذمہ دار" بمعنی "جواب دہ" اور "رویہ" یعنی واو مفتوح اور "ی" مشدد بمعنی "روش"، ایک عرصے سے معیاری اردو ہیں اور "پلیٹس" (۱۸۸۴) اور "نور اللغات" (۱۹۲۴ تا ۱۹۳۱) جیسے مستند اور محتاط لغات میں درج ہیں۔

(۱۰) اب چند بیانات مشہور ماہرِ لغات، ماہرِ اسلامیات اور شاعر حضرت شوق نیموی (۱۸۶۳ تا ۱۹۰۴) کے یہاں سے ملاحظہ ہوں۔

"خودرفتہ" کا فقرہ اردو میں اٹھارویں صدی سے رائج ہے۔ لیکن شوق نیموی لکھتے ہیں کہ فارسی اساتذہ کے یہاں "خودرفتہ" نہیں ملتا صرف "ازخودرفتہ" ملتا ہے، یا شاید کسی نے استعمال کیا ہو، واللہ اعلم۔ راقم الحروف کو اردو میں "ازخودرفتہ" لکھنا معیوب معلوم ہوتا ہے۔ چوں کہ اہلِ علم اساتذہ "خودرفتہ" نہیں لکھتے اس لیے راقم الحروف بھی نہیں لکھتا۔ لہٰذا ان دونوں الفاظ کو ترک کر کے "وارفتہ" لکھتا ہے۔(۱۰)

آج بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو عربی لفظ "عادی" کو بمعنی "عادت رکھنے والے" نہیں استعمال کرتے کیوں کہ عربی میں اس کے معنی ہیں "وہ چیز یا کام جس کی عادت پڑ جائے۔" شوق نیموی کا فتویٰ تھا کہ اگر "عادی" اگر مع عطف و اضافت ہو تو "عادت رکھنے والے" کے معنی میں غلط ہے۔ ہاں اگر تنہا استعمال ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔ یعنی اگر "عادی" کسی مرکب صورت میں آئے تو اسے عربی معنی ہی میں استعمال ہونا چاہیے۔(۱۱)

(۱۱) ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ غالب کا قول تھا کہ اہلِ ہند میں امیر خسرو کے سوا کوئی مسلّم الثبوت نہیں۔ غالب کا خیال کچھ بھی ہو، لیکن حقیقتِ حال تو یہ ہے کہ تیرھویں صدی سے شروع کر کے انیسویں صدی تک فارسی زبان کے جو عظیم لغات مرتب کیے گئے، وہ سب ہندوستانیوں نے لکھے۔ ان میں کچھ وہ تھے جو ایرانی تھے لیکن ایک دو نسلوں سے ہندوستان میں رہ رہے تھے اور کچھ ہندو تھے مثلاً ٹیک چند بہار (۸-۱۶۸۷ تا ۶۶-۱۷۶۶) اور وارستہ سیالکوٹی (وفات ۱۷۶۶) اور کچھ مثلاً خان آرزو یا محمد پادشاہ، اتنے دنوں سے ہندوستان میں آباد تھے کہ ہر معنی میں ہندوستانی بن چکے تھے۔ غالب پر بھی دو نسلیں ہندوستان میں گزر چکی تھیں، لیکن وہ ان تمام لغت نگاروں کو مسترد کرتے تھے جو ایرانی شاعر نہ تھے یا جنھوں نے اپنا لغت خود ایران میں بیٹھ کر مرتب نہیں کیا تھا۔ چناں چہ انھوں نے تفتہ کو لکھا کہ "لغت نویس تو رہے اور قیاس پر بھروسا کرتے ہیں۔ ہر لغت نویس وہی لکھتا ہے جو اس نے صحیح سمجھا۔ نظامی یا سعدی کی لکھی ہوئی کوئی فرہنگ ہو تو ہم سے مانیں۔ ہندوستان کو ہم کس طرح مسلم الثبوت جانیں۔"(۱۲)

جس زمانے میں کہ غالب نے تفتہ کو یہ خط لکھا تھا انھیں دنوں "نامۂ غالب" نام کا ایک رسالہ بھی کسی نے لکھا، جس میں انھوں نے حسب ذیل رائے ظاہر کی:

> ہند کے شاعروں میں اچھے اچھے خوش گو اور معنی یاب ہیں، لیکن یہ کون احمق کہے گا کہ یہ لوگ دعوائے زبان دانی کے یاب ہیں۔ رہے ڈکشنری لکھنے والے، خدا ان کے پیچ سے نکالے۔ اشعار قدما آگے دھر لیے اور اپنے قیاس کے مطابق چل دیے۔ وہ بھی کوئی ہم قدم نہ کوئی ہم راہ، بلکہ سو یہ سو پراگندہ طبع۔ رہنما ہو تو راہ بتائے، استاد ہو تو شعر کے معنی بتائے۔ ڈکشنری لکھنے والوں کے پردے کھولتے جاؤ، لباس ہی لباس دیکھو گے، شخص معدوم۔ فرہنگوں کی ورق گردانی کرتے رہو، ورق ہی ورق نظر آئیں گے، معنی موہوم۔(۱۳)

(۱۳) مرزا رحیم بیگ کے نام تحریر کردہ نامہ غالب، اور تفتہ کے اپنے خط دونوں میں غالب نے اپنے بارے میں ایک ہی طرح کے الفاظ استعمال کیے ہیں: یعنی انھیں زبان فارسی کا فہم پیدائشی ہے، یہ خدا کا ان کو خاص عطیہ ہے۔ زبان فارسی کی باریکیاں انھیں ازخود معلوم ہو جاتی ہیں جس طرح فولاد میں جوہر پیوست ہوتا ہے۔ غالب کا کہنا تھا کہ اپنی ان صفات کی بنا پر وہ دوسرے ہندوستانی فارسی گویوں سے مختلف اور افضل ہیں۔ تقدیر کی ستم ظریفی یہ ہوئی کہ ہندوستانی فارسی گویوں کے بارے میں غالب کا عدم اعتماد خود ان کو بھی ایسا شکار بنا گیا۔ اپنے بارے میں غالب کی رائے کتنی ہی اچھی کیوں نہ رہی ہو لیکن شبلی اور طباطبائی جیسے ایران پرستوں کی توقیر انھیں کبھی حاصل نہ ہو سکی۔ شبلی نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ وہ لفظ "اندز" کے لیے غالب کی سند کو کافی نہیں سمجھتے کیوں کہ غالب اہل زبان نہیں۔(۱۴)

۳

ایرانی فارسی کو ہندوستانی فارسی کے اوپر رکھنا، ایرانی کے لیے یہ آزادی تسلیم کرنا کہ وہ عربی زبان پر تصرف کر سکتا ہے لیکن اردو بولنے والے کو فارسی اور عربی کے بارے میں اس تصرف کی اجازت نہ دینا، اس بات پر اصرار کرنا کہ اردو میں فارسی عربی کے جو عناصر ہیں ان پر فارسی کے

Scanned with CamScanner

قاعدے جاری کیے جاتے ہیں، یہ سب باتیں ہمارے ساتھ کچھ بہت عرصے سے نہیں ہیں۔ لیکن یہ باتیں اردو ماحول میں اتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں اور تقریباً ہر جگہ ان کو بلا تحقیق و حجت کچھ اس طرح تسلیم کر لیا گیا ہے جیسے کہ یہ صورت حال اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود اردو زبان۔ وہ لوگ بھی جو سلسلۂ مراتب کے موجودہ نقشے کی عائد کردہ تنگیوں کو ناپسند کرتے ہیں، وہ بھی ان تنگیوں کی پابندی کرتے ہیں، اس خوف سے کہ کہیں انھیں جاہل نہ قرار دے دیا جائے۔ ہاں شعرا نے کبھی کبھی بعض مخصوص استعمالات یا پابندیوں پر سوالیہ نشان قائم کیا ہے لیکن نیم دلی کے ساتھ اور بہت کم۔ سید سلیمان ندوی اور عبدالستار صدیقی جیسے ماہرین نے البتہ مضامین اور دیگر تحریروں میں سخت احتجاج کیا کہ یہ بات درست نہیں ہے کہ اردو زبان کو بطور زبان وہ اختیارات اور مراعات نہ دی جائیں جو کسی بھی زبان کو، چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو، حاصل ہیں۔(۱۵)

سلیمان ندوی اور عبدالستار صدیقی کی تحریروں کا اثر صرف چند پابندیوں پر پڑا۔ زیادہ تر تنگیاں اور پابندیاں ویسی ہی رہیں۔ پھر یہ بھی ہے کہ انھوں نے ایسی مثالوں اور معاملات کو ہاتھ ہی نہیں لگایا جو سب سے زیادہ نمایاں ہیں اور جن کا وقوع بے انتہا کثیر ہے۔ مثال کے طور پر ہمارے یہاں بہت سے فارسی عربی الفاظ ہیں جن کا اصل تلفظ وتد مفروق کے وزن پر ہے مثلاً عربی کا لفظ "جمع" اور فارسی کا لفظ "شہر"۔ اردو میں یہ سب الفاظ وتد مجموع یعنی "نظر" کے وزن پر بولے جاتے ہیں۔ لیکن شاعری میں ہمیں اصرار ہے کہ انھیں اصل فارسی عربی کے تلفظ کے اعتبار سے ہی باندھا جائے۔ اس پابندی کی کوئی وجہ ہے نہ ضرورت، لیکن یہ آج بھی ویسی ہی باقی ہے اور اکثر لوگوں کے خیال میں روز اول سے یوں ہی چلی آ رہی ہے۔ سید سلیمان ندوی یا عبدالستار صدیقی نے اس مسئلے پر کوئی کلام نہیں کیا۔

حقیقت حال یہ ہے کہ "جمع"، "شمع"، "شہر"، "شہد" وغیرہ الفاظ کو اصل عربی فارسی تلفظ کے ساتھ نظم کرنے کی پابندی روز اول سے نہیں ہے۔ ابھی بات یہ ہے کہ اس پر ابھی دو سو برس بھی نہیں گزرے۔ لیکن اسے اور اس طرح کی دوسری پابندیوں کو قبول عام حاصل ہے اور ان کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ ہم فطری طور پر یہ سوچنے لگے ہیں کہ جو خلاقانہ تصرف ایرانی اہل زبان عربی پر کر سکتا ہے وہ ہم اردو والے فارسی اور عربی پر نہیں کر سکتے۔ ہم نے یقین کر لیا ہے کہ ہماری لسانی حیثیت ایرانی اور عرب کے مقابلے میں بالضرور کم تر اور فروتر ہے۔ ہمارا اعتقاد یہ بن

Scanned with CamScanner

گیا ہے کہ ادبی اور نفیس قرار دیے جانے کے لیے اردو کو ضروری ہے کہ وہ عربی، فارسی میں بالکل کوئی مداخلت نہ کرے اور ان زبانوں کو مقدس اور ناتغیر پذیر قرار دے۔

یہ بات یقین کرنے کی نہیں ہے کہ ایسی صورتِ حال، جس میں خود پر اعتماد کی کمی اور خود سے نفرت پوری طرح نمایاں ہے، روزِ اول سے ہی ہمارے ساتھ رہی ہوگی۔ تاریخ کے کسی موقعے پر ہمارے ساتھ ایسا ہوا ہوگا۔ لیکن کب ہوا؟ کس نے اسے ہونے کا موقع فراہم کیا؟ اور یہ کیوں ہو؟ ہماری ادبی یا لسانی تاریخوں میں یہ سوالات کبھی نہیں اٹھائے گئے۔ کسی شخص نے کبھی بھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنی زبان کے بارے میں اپنے رویے کی وضاحت کریں اور اس کا تجزیہ کریں، کیوں کہ اس رویے کا اثر ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اس کا اثر ہماری ادبی تہذیب پر ہے، ہمارے اپنے ادب کی شخصیت کے تصور پر ہے، ہمارے ادب کی فہرست استناد پر ہے اور ان خطوط اور راہوں پر ہے جن پر ادبی یا نام نہاد نفیس اردو کو زبردستی چلنا اور ارتقا کرنا پڑا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کا اثر زبان کی نوعیت اور تاریخ کے بارے میں ہمارے نظریات پر بھی پڑا۔

زبان کے بارے میں اس نظریے کو اختیار کرنے کے پیچھے کہیں نہ کہیں کوئی ذہنی رکاوٹ رہی ہوگی۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اور ادبی اداروں (دونوں اکثر ایک ہی چیز ہوتے ہیں) کو یہ تسلیم کرنا شروع کرنے میں بھی بہت مشکل ہوئی کہ گجری (یعنی پرانی اردو جو چودھویں صدی عیسوی سے گجرات میں بہ کار آ رہی تھی) اور دکنی (یعنی پرانی اردو جو دکن میں پندرھویں صدی عیسوی سے مستعمل تھی) دونوں ایک ہی زبانیں ہیں اور یہ اردو سے الگ کوئی بولیاں نہیں ہیں بلکہ خود اردو ہی ہیں۔ چوں کہ گجری اور دکنی کے بیشتر شعرا و ادبا فارسی اور عربی الفاظ پر بے جھجک اور عام معمول کے طور پر تصرف کرتے تھے، اس لیے ہمارے علمائے ادب کو کسی صورت سے یہ کہنے کی گنجائش بالکل نہ تھی کہ گجری اور دکنی والے بھی عربی فارسی الفاظ و تراکیب کا احترام کرتے اور انھیں اردو سے برتر جانتے تھے، یعنی ان کا وہی شیوہ تھا جو شمالی ہند کے اردو مصنفوں نے اٹھارویں صدی کے اواخر میں اختیار کیا۔ اس کے مقابلے میں یہ کہنا آسان تھا کہ گجری اور دکنی ہماری زبان کی معیاری اور معمولی شکلیں نہیں ہیں، کیوں کہ پھر یہ تسلیم کرنے کی ضرورت نہ پڑتی کہ اردو زبان کے اوائلی تین سو برس میں عربی فارسی کو وہ فوقیت نہ تھی جو اٹھارویں صدی کے آخر

Scanned with CamScanner

سے ہمارے مصنفوں نے رائج کی۔

ایسا ہی معاملہ ان افسانوں کے ساتھ ہے جو زبان اردو کی نوعیت اور اس کے آغاز کے بارے میں مشہور ہیں۔ سب سے مشہور افسانہ تو یہ ہے کہ اردو کا جنم مسلمانوں کے فوجی بازاروں اور قیام گاہوں میں ہوا۔ اس افسانے کے نتیجے میں دو اور افسانے (جو اسطور یعنی myth کی وقعت اور عظمت اختیار کر چکے ہیں) وجود میں آئے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ اردو مسلمانوں کی زبان ہے اور دوسرا یہ کہ چوں کہ یہ فوجی قیام گاہوں، بازاروں اور کم مرتبہ لوگوں کے درمیان پیدا ہوئی اور پلی بڑھی، اس لیے اسے اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ اسے صاف، شستہ اور شریف بنایا جائے۔ اور اردو زبان کو صاف شستہ اور شریف بنانے کا عمل اٹھارویں صدی کے نصف آخر میں دہلی کے استادوں نے شروع کیا۔

مندرجہ بالا افسانوں کی قوت کے پیش نظر یہ کچھ تعجب کی بات نہیں لگتی کہ لفظ 'اردو' جو ہماری زبان کے نام کی حیثیت سے ۱۷۸۰ کی دہائی سے پہلے وجود ہی نہ رکھتا تھا، اس کی بنیاد پر حسب ذیل دلیل قائم کی گئی۔ یعنی یہ کہا گیا کہ چوں کہ 'اردو' کے معنی ہیں 'لشکر'، 'لشکر گاہ' یا 'بازار لشکر'، لہٰذا یہ ثابت ہوا کہ اردو زبان کا جنم غیر ملکی مسلمان فوجیوں اور مقامی ہندو شہریوں اور بازاریوں کے میل جول کی وجہ سے ہوا۔ لوگوں نے ذرا سا رک کر یہ سوچنے کی بھی زحمت نہ کی کہ جب ۱۷۸۰ کی دہائی کے پہلے لفظ 'اردو' کو ہماری زبان کے نام کے طور پر استعمال ہی نہیں کیا گیا اور ۱۷۸۰ کے آتے آتے ہندوستان میں کوئی غیر ملکی مسلمان فوجی نہ رہ گیا تھا اور اس وقت جو غیر ملکی فوجیں تھیں، بھی وہ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی تھیں، ایسی صورت میں یہ کہنا کہاں تک مناسب ہے کہ اس زبان کا نام 'اردو' اس لیے پڑا کہ یہ مسلمان فوجیوں کے 'اردو' یا 'لشکر گاہ' یا "لشکر بازار" میں پیدا ہوئی تھی؟ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جس زمانے میں یہ نام ہماری زبان کے لیے استعمال ہونے لگا اس وقت کوئی مسلمان غیر ملکی فوجی یہاں نہ تھا۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اس زبان کا نام شروع میں 'ہندی' یا 'ہندوی' تھا اور مسعود سعد سلمان لاہوری (۱۰۴۶ تا ۱۱۲۱) کے بارے میں کہا گیا کہ اس نے ایک ہندوی دیوان مرتب کیا۔(۱۶) خسرو نے بھی 'ہندوی' یا 'دہلوی' زبان کا نام لیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے اس میں چند جزو شعر نذر دوستوں کی نذر کیے ہیں۔(۱۷)

Scanned with CamScanner

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ فارسی کے پرانے لغات میں، جو ہندوستان میں مرتب ہوئے، کہیں بھی لفظ "اردو" ہماری زبان کے نام کے طور پر نہیں آیا ہے؛ ہاں لفظ "ہندی" یا "ہندوی" اکثر ان الفاظ کے لیے لایا گیا ہے جنھیں ہم آج اردو کے الفاظ قرار دیتے ہیں۔ خیر، اب ذرا چند ایسے اردو انگریزی لغات دیکھ لیے جائیں جو انگریزوں نے مرتب کیے۔ یہاں لفظ "اردو" کی تعریف میں طرح طرح کی دل چسپ باتیں لکھی گئی ہیں۔ سب سے پہلا اقتباس ڈنکن فوربس کی ڈکشنری (مطبوعہ ۱۸۶۶) کا ہے:

urdu m an army, a camp, a market *urdu ı mu'alla*, the royal camp or army (generally means the city of *Dihlı* or *Shahjahanabad*,and *urdu ı mu alla kı zaban*, the court language) This term is very commonly applied to the Hındustanı language as spoken by the Musalman population of India proper.(١٨)

حسبِ ذیل اقتباس فیلن کے لغت (مطبوعہ ۱۸۷۹) کا ہے:

ur'du, n.f. *Originally*, a camp.
1 An army, a bazaar attached to a camp .
2 The Hındustanı language as spoken by the Mohamedans of India, or the Hindus who have learnt of them or have intercourse with them..
--i-muaal'la
1. The court language
2. The Delhı ıdıom.(١٩)

سب سے آخر میں اردو انگریزی کے مقبول ترین، اور بقولِ بعض مستند ترین، لغت پلیٹس مطبوعہ ۱۸۸۴ کا بیان دیکھیے:

Urdu, s m. Army, camp, market of a camp, s.f (=*urdu zaban*). The Hındustani language as spoken by the Muhammadans of India, and by Hindus who have intercourse with them or who hold appointment in the Goverment courts &c.. *urdu-i-mu'alla*, The royal camp or army (generally means the city of Dehlı or Shahjahanabad), the court language (=*urdu-ı-mu'alla ki zaban*), the Hındustanı language as spoken ın Dehlı.(٢٠)

ان تمام اقتباسات سے حسبِ ذیل باتیں صاف ظاہر ہیں:

(۱) اردو مسلمانوں کی زبان ہے، یا حد سے حد ان ہندوؤں کی بھی جو مسلمانوں سے میل جول رکھتے ہیں۔

(۲) اردو مغل دربار کی زبان کا نام ہے۔

(۳) اردو شاہی لشکر گاہ کا نام ہے، جس سے عام طور پر دہلی یعنی شاہ جہاں آباد کا شہر مراد لیا جاتا ہے۔

(۴) اردو کے معنی ہیں فوج۔

ان میں سے تیسری بات تو صحیح ہے، پہلی بات بالکل جھوٹ ہے اور دوسری بات صرف اس حد تک صحیح ہے کہ مخصوص سیاق و سباق میں 'اردو' کے معنی 'لشکر گاہ' یا "لشکر بازار" ضرور ہوتے ہیں۔ چوتھی بات بھی بالکل غلط ہے کیوں کہ ہماری زبان میں "اردو" کے معنی "فوج" کبھی نہیں ہوئے۔

لیکن زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مندرجہ بالا اقتباسات میں حسب ذیل اہم اطلاعات نہیں ہیں:

(۱) اردو وہ زبان ہے جس کا مقبول ترین نام 'ہندی' ہے یا پھر 'ریختہ'۔

(۲) اردو مغل دربار کی زبان کبھی نہیں رہی لیکن یہ انیسویں صدی کے آخر تک بھی ہندوستان میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی تھی جیسا کہ آئندہ ظاہر ہوگا۔

یعنی سب سے بڑا ظلم ان لغت نگاروں نے یہ کیا کہ اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان قرار دیا اور یہ نہ بتایا کہ جس زمانے میں یہ لغات لکھے جا رہے تھے، اس زمانے میں بھی ہماری زبان کا مقبول ترین نام "ہندی" تھا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی پالیسی یہی تھی کہ ہندی نام کی زبان کو ہندوؤں سے مختص قرار دیا جائے اور اسے ایک الگ زبان کہا جائے۔ اور مسلمانوں کے لیے ایک الگ زبان مخصوص قرار دی جائے جس کا نام پہلے "ہندوستانی" رکھا گیا اور بعد میں جب یہ نام نہ چلا تو انگریزوں نے اسے "اردو" کا نام دیا۔

اس بات کو ثابت کرنے کے لیے گلکرسٹ کی کتاب The Oriental Linguist کے شروع کے ہی صفحات پڑھ لینا کافی ہے۔ وہ صاف صاف لکھتا ہے کہ اس زبان کے بولنے والے اسے "ہندی" کہتے ہیں لیکن "ہندی" سے شبہ ہوتا ہے کہ اس کا تعلق ہندوؤں سے ہے حالاں کہ یہ زبان مسلمانوں کی ہے اور اس کا نام "ہندوستانی" ہونا چاہیے۔ اس زبان کو بولنے والے اسے "ہندی" کہتے ہیں تو کیا ہوا۔ وہ سب لاعلم اور بے وقوف لوگ ہیں۔ (۱۴)

خیال رہے کہ یہی گلکرسٹ اس بات کو قبول کر چکا ہے کہ اردو کے معنی ہیں دربار کی صاف

Scanned with CamScanner

اور شستہ زبان (۲۲)۔ لیکن چوں کہ اتنا کہنے سے بات پوری طرح جمتی نہ تھی اور یہ دکھانا ضروری تھا کہ اردو زبان دراصل فوجیوں کی زبان ہے، لہٰذا میر امن کی زبانی "باغ و بہار" میں حسب ذیل فرضی باتیں کہلائی گئیں۔

> آخر امیر تیمور نے (جن کے گھرانے میں اب تلک نام نہاد سلطنت کا چلا جاتا ہے) ہندوستان کو لیا۔ ان کے آنے اور رہنے سے لشکر کا بازار شہر میں داخل ہوا۔ اس واسطے شہر کا بازار اردو کہلایا۔ جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تب چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم، قدردانی اور فیض رسانی اس خاندان لاثانی کی سن کر، حضور میں آکر جمع ہوئے۔ لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکٹھے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے، ایک زبان اردو کی مقرر ہوئی۔ (۲۳)

میر امن نے مندرجہ بالا فقرے میں کئی جھول چھوڑ دیے ہیں تاکہ جاننے والے جان جائیں کہ یہ بیان بھی محض فسانہ ہے۔ واضح رہے کہ "باغ و بہار" کی تصنیف کا مقصود انگریزوں کو، نہ کہ ہندوستانیوں کو اردو پڑھانا تھا۔ لہٰذا میر امن اتنا صاف جھوٹ بولتے وقت اس خیال میں رہے ہوں گے کہ یہ باتیں ابنائے وطن تک نہ پہنچیں گی۔ اب یہ ہندوستانیوں اور اہل اردو کی بدقسمتی ہے کہ "باغ و بہار" ہندوستانیوں میں گھر گھر مقبول ہوئی اور آج بھی اکثر لوگوں کی نظر میں اردو نثر کا آغاز "باغ و بہار" سے ہی ہوتا ہے۔ میر امن کے بیان میں بڑے بڑے جھول حسب ذیل ہیں:

(۱) انھوں نے یہ تاثر دیا ہے کہ تیمور سے لے کر تا حال (یعنی عہد شاہ عالم ثانی) ایک ہی خاندان اور ایک ہی راج ہندوستان پر رہا۔ ظاہر ہے کہ واقعہ اس کے بالکل خلاف ہے۔

(۲) میر امن نے یہ تاثر دیا ہے کہ تیمور کی آمد (۱۳۹۸) اور اکبر کی تخت نشینی (۱۵۵۶) میں کوئی خاص فاصلہ نہیں بلکہ ایک تسلسل ہے۔

(۳) اکبر چوں کہ دلی میں کبھی رہا نہیں لہٰذا یہ سب باتیں فرضی ہیں کہ اس کے زمانے میں لوگ چاردانگ ملک سے آکر دلی میں جمع ہوئے

Scanned with CamScanner

اور وہاں بازار کی وہ بولی بنی جسے زبان اردو کہا گیا۔

(۴) میر امن نے یہ بات بھی صاف اڑا دی ہے کہ اس زبان کا اصل نام ہندی ہے اور اس میں خسرو بلکہ مسعود سعد سلمان تک نے شعر کہے ہیں جبکہ اکبر کیا تیمور تک کا وجود نہ تھا۔

(۵) میر امن نے اس بات کو صاف نہیں کیا ہے کہ ان کے آخری جملے میں اردو کی زبان سے مراد اس جگہ کی زبان ہے جس کا نام اردو ہے، یعنی شہر دہلی نہ کہ لشکر گاہ اور لشکر بازار کی زبان۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان کے آغاز کے لیے ایک قطعی فرضی افسانہ جو انگریزوں نے میر امن کی زبانی مشہور کیا، ہماری تاریخ کا حصہ بن گیا۔ پھر یہ کہنے میں بھی آسانی ہوئی کہ یہ زبان چونکہ بازاری لوگوں اور فوجیوں کی تھی اس لیے اسے تہذیب اور صفائی کی ضرورت تھی۔ پھر یہ افسانہ گڑھا گیا کہ ۱۷۵۰ سے شروع ہو کر لکھنؤ کے آخری زمانے تک زبان کی صفائی اور اصلاح کا عمل جاری رہا۔ صفائی اور اصلاح سے مراد لی گئی اردو فارسی عربی عناصر کو دیسی عناصر پر مقدم ٹھہرانا اور دیسی الفاظ کو جہاں تک ممکن ہو سکے ہٹا دیا جانا، زبان قرار دے کر دیسی زبان سے دور رکھنا۔

انگریزوں کو یہ بات منوانے میں بڑی دیر لگی کہ وہ زبان جسے ہم آج اردو کہتے ہیں اور جس کا پرانا نام ہندی تھا اور جسے انگریزوں نے ہندوستانی بھی کہنا چاہا، دراصل سارے ملک کی زبان ہے اور صرف مسلمانوں کی نہیں۔ بعض وقت وہ دونوں باتیں بیک وقت کہتے نظر آتے ہیں چنانچہ Yule اور Burnell کے مشہور لغت *Hobson Jobson* (اول اشاعت ۱۸۸۶) میں لکھا ہے کہ ہندوستانی وہ زبان ہے جو ہندوستان کے مسلمان فاتح بولتے ہیں لیکن یہ سارے ملک میں پھیلی ہوئی ہے اور آج بھی اسے *lingua franca* کی حیثیت حاصل ہے۔(۲۴)

اب ذرا ایک منٹ یہ دیکھ لیں کہ "اردو" کو زبان اردو کے نام کے طور پر سب سے پہلے کہاں استعمال کیا گیا ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے مصحفی کا حسب ذیل شعر نقل کیا ہے:

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

Scanned with CamScanner

(۳۵)

قیاس کیا جاتا ہے کہ اس شعر میں میر سے مراد میر تقی میر اور مرزا سے مراد مرزا سودا ہیں۔ چوں کہ سودا کا انتقال جون ۱۷۸۱ میں ہوا اور اس شعر میں "خدا رکھے" کا فقرہ استعمال کیا گیا، اس لیے قیاس یہ بھی چاہتا ہے کہ یہ شعر جون ۱۷۸۱ سے پہلے کہا گیا جب سودا زندہ تھے۔ چوں کہ مصحفی کی پیدائش ۱۷۵۰ کی ہے اور اگر انھوں نے پندرہ سال کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا تو یہ شعر ۱۷۶۵ کا ہونا چاہیے۔ لیکن مصحفی کی سودا اور میر سے ملاقات ۱۷۷۲-۳ سے پہلے نہیں ہوئی، لہٰذا اگر ہم یہ فرض کریں کہ یہ شعر میر اور سودا کے بارے میں ہے اور یہ سودا کی زندگی میں کہا گیا ہے تو اس کا زمانۂ تصنیف ۱۷۷۳ تا ۱۷۸۱ ٹھہرتا ہے۔

لیکن یہاں ایک دو الجھنیں اور بھی ہیں۔ مثلاً "خدا رکھے" کا فقرہ، میر اور سودا کے لیے نہیں بلکہ زبان کے لیے ہو سکتا ہے، یعنی خدا زبان کو رکھے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ یہ شعر مجھے مصحفی کے آٹھوں دواوین اور ان کے غیر مطبوعہ قصائد (مرتبہ نورالحسن نقوی) میں نہیں ملا۔ حافظ محمود شیرانی انتہائی محتاط محقق تھے اس لیے ممکن ہے انھوں نے یہ شعر مصحفی کے کسی معتبر غیر مطبوعہ نسخے میں دیکھا ہو، لیکن فی الحال تو یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ پوری صحت کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ شعر مصحفی کا ہی ہے اور سودا کی زندگی میں ہی کہا گیا تھا۔

لفظ اردو کا سب سے پہلا ذکر زبان کے معنی میں مصحفی کے یہاں مصدقہ طور پر دیوان چہارم میں ملتا ہے جو ۱۷۹۶ کے آس پاس مرتب ہوا۔ مصحفی مسدس حسب حال خود ابتدائے زمانہ میں لکھتے ہیں:

ہر جائے گوش چشم بنا ناک کان کو
اپنی زبان سمجھے ہیں اردو زبان کو

(۳۶)

یہاں مصحفی ان لکھنؤ والوں کی برائی کر رہے ہیں جو اردو میں بے وجہ فارسی الفاظ ٹھونستے ہیں یعنی ناک کان کی جگہ گوش چشم استعمال کرتے ہیں۔

خان آرزو نے عبدالواسع ہانسوی کی فرہنگ "غرائب اللغات" (مرتبہ تقریباً ۱۶۹۰) پر حواشی لکھے اور جو بجائے خود "نوادر الالفاظ" نامی کتاب بن گئے (تاریخ تصنیف ۱۷۴۳)۔ اس میں

Scanned with CamScanner

انھوں نے جگہ جگہ لفظ "اردو" کو "شہر دہلی" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ دیکھیں گے، انشا نے "دریائے لطافت" (تاریخ تصنیف ۱۸۰۷) میں بھی لفظ "اردو" کو "شہر دہلی" کے معنی میں استعمال کیا ہے۔

۳

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ زبان کے نام کے طور پر "اردو"، اور زبان اردو کے آغاز کے بارے میں لشکری زبان کا نظریہ، دونوں انگریزوں کی ایجاد ہیں۔ ان کے نتیجے میں بھی اردو کو ہی زبان کے بارے میں یہ فرض کرنے میں کچھ مشکل نہ ہوئی کہ ہماری زبان ایک عامیانہ زبان ہے اور اس کا وہ مرتبہ نہیں جو فارسی عربی کا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اردو والوں کی نگاہوں میں زبان اردو کی قدر و قیمت میں کمی اس وجہ سے آئی کہ انگریزوں نے اردو کو ہٹا کر انگریزی رائج کر دی اور اعلیٰ طبقے کی زبان بننے کا شرف اردو کے ہاتھ سے نکل گیا۔ صحیح معنی میں تو اردو صاحبِ اقتدار طبقے کی زبان کبھی نہیں تھی۔ لیکن اگر اردو کی قدر و قیمت میں کمی اس وجہ سے آئی کہ اقتدار کی زبان نہ رہ گئی تو پھر فارسی کے بارے میں کیا کہا جائے؟ اٹھارویں صدی میں فارسی ہر جگہ رائج تھی۔ اٹھارویں صدی کے نصف دوم میں تمام بڑی ہندوستانی حکومتوں کی زبان فارسی تھی حتیٰ کہ مادھو راؤ سندھیا (وفات ۱۷۹۳) جو شاہ عالم اور اپنے پیشوا کے نام پر ہندوستان کے بہت بڑے حصے پر حکمراں تھا، خود فارسی بخوبی جانتا تھا اور اس کی سرکاری زبان فارسی تھی۔ (۱۷۲) اسی بہ قیاس، جنوب میں ٹیپو سلطان اور نظام الملک اور شمال میں اودھ اور بنگال کے حکمراں سب فارسی میں کام کرتے تھے۔ تو پھر کیا وجہ ہوئی کہ ہندوستانیوں نے اپنی فارسی کو نامعتبر اور حقیر کہنا شروع کر دیا؟

یہ بات خیال میں رکھنے کی ہے کہ اٹھارویں صدی کا وسط آتے آتے ہندوستانیوں کو اپنی فارسی پر اس درجہ اعتماد اور اطمینان حاصل ہو چکا تھا کہ وہ خود کو اہلِ زبان فارسی والوں سے کم نہ سمجھتے تھے، بلکہ برتر سمجھتے تھے، جیسا کہ مندرجہ ذیل چند مثالوں سے ثابت ہوگا۔

شیخ علی حزیں (۱۶۹۳ تا ۱۷۶۶)، ایرانی شاعر اور امیرزادہ، اپنے ملک میں حالات

ناسازگار پا کر ۱۷۳۴ کے آس پاس ہندوستان پہنچا۔ یہاں اسے سب لوگوں نے، بالخصوص مغل شہنشاہ محمد شاہ اور اس کے وزیر عمدۃ الملک میر خاں انجام نے، ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لیکن شیخ کے مزاج میں کچھ ٹیڑھ تھی اور اسے ہندوستان کبھی پسند نہ آیا۔ وہ جگہ جگہ ہندوستانی شاعروں اور خاص کر ہندوستانی فارسی گویوں پر اعتراض کرتا تھا اور اس نے اپنی خود نوشت میں بھی ہندوستان کو کچھ اچھے الفاظ میں یاد نہیں کیا ہے۔ آج کا زمانہ ہوتا تو سب ہندوستانی فارسی گو حضرات شیخ علی حزیں کے فرمودات کو آنکھوں سے لگاتے۔ لیکن وہ زمانہ وسط اٹھارویں صدی کا تھا جب ہندوستانیوں کو اپنے بارے میں کوئی احساسِ کمتری نہ تھا۔ لہذا ۵۱-۱۷۵۰ میں خان آرزو نے خود شیخ علی حزیں کی شاعری پر سخت اعتراضات کرتے ہوئے ایک رسالہ "تنبیہ الغافلین" لکھا۔ اس کے چند سال بعد آزاد بلگرامی (۱۷۸۶-۱۷۰۴) نے اپنے تذکرے "خزانۂ عامرہ" میں خان آرزو کے بعض اعتراضات کو تسلیم کیا، بعض کو نہیں مانا۔ لیکن آزاد بلگرامی نے خود بھی عرفی جیسے ایرانی شعرا پر نہایت زبردست اعتراضات کیے۔(۲۸) لیکن علی حزیں کے دفاع میں جواب دینے والا بھی ایک ہندوستانی ہی تھا، یعنی سیالکوٹی مل وارستہ جنھوں نے "رجم الشیاطین" (۲۹) کے نام سے خان آرزو کا رد لکھا۔ میر افضل ثابت الہ آبادی اس زمانے کے بڑے فارسی گویوں میں تھے۔ ان کے ایک شعر پر علی حزیں نے اعتراض کیا تھا کہ اس کا مضمون فلاں ایرانی شاعر سے مستعار ہے۔ اس پر میر افضل ثابت کے بیٹے ثبات نے ایک پورا رسالہ "ثبات" کے نام کا لکھ ڈالا جس میں شیخ علی حزیں کے سینکڑوں شعروں کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہ پرانے شعرا سے مستعار ہیں۔

منیر لاہوری (وفات ۱۶۴۴) کے بارے میں خان آرزو نے لکھا ہے کہ فیضی کے بعد اس سے بڑا کوئی شاعر مغل درباروں میں نہ ہوا۔ منیر نے سولھویں صدی کے چار بڑے ایرانی شاعروں یعنی عرفی، طالب، زلالی اور ظہوری پر تنقید لکھی۔ خان آرزو نے اس کا جواب "سراج منیر" کے نام سے لکھا۔ یعنی بنیادی بات یہ ہے کہ ایرانی شاعروں پر اعتراض کرنے والے بھی ہندوستانی ہیں اور ان کا دفاع کرنے والے بھی ہندوستانی ہیں۔ ہندوستانیوں کو اپنے اوپر اطمینان کلی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ ایرانیوں کی ہر بات کو حدیث و قرآن سمجھ لیں (جیسا کہ بعد میں غالب نے کیا)۔(۳۰)

ان سب سے دل چسپ واقعہ وہ ہے جو سودا اور فاخر مکین کے درمیان گزرا۔ یہ زمانہ ہے

۱۷۷۴ سے ۱۷۸۱ کا اور جگہ ہے لکھنؤ۔ (۱۳) سودا نے خود یہ تمام واقعہ اپنے کلیات میں "عبرت الغافلین" کے نام سے درج کیا ہے۔ سودا لکھتے ہیں:

> اشرف علی خاں، جو ایک شریف خاندان کے بزرگ ہیں اور میرے پرانے ملاقاتی، انھوں نے پندرہ سال محنت کی اور بہت سی پرانی بیاضیں دیکھیں اور پھر اپنی ایک بیاض مرتب کی جس میں کوئی ایک لاکھ شعر ہوں گے۔ یہ بیاض وہ فاخر مکین کے پاس لے گئے، خدائے وہاب انھیں سلامت رکھے۔ اشرف علی خاں نے مرزا مکین سے بہت التجا کی کہ وہ اس بیاض کے اغلاط درست کر دیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا، مجھے اس طرح کے کام کے لیے۔ وقت ہے نہ دماغ، لیکن میں آپ کی خاطر یہ کام کر دوں گا لیکن شرط یہ ہوگی کہ میں تمام ہندوستانی شعرا مثلاً فیضی، غنی، نسبتی ناصر علی، بیدل، سراج الدین علی خان آرزو، اور میر شمس الدین فقیر وغیرہ کے کلام پر قلم پھیر دوں گا اور ایران کے شعرا کے کلام پر اصلاح دوں گا اور ان کا انتخاب کروں گا۔ اس گفتگوئے لغو کو سن کر خان موصوف اپنی بیاض واپس لے آئے اور مرزا فاخر مکین کی شرطوں کو نامنظور کر دیا۔

لیکن حالات کچھ ایسے ہوئے کہ غریب اشرف علی خاں کو اپنی بیاض مرزا فاخر مکین کی ہی خدمت میں پیش کرنی پڑی۔ مرزا فاخر مکین نے خسرو، سعدی، رومی، اور جامی جیسے لوگوں کے بہت سے اشعار یہ کہہ کر کاٹ دیے کہ یہ کمزور ہیں یا مہمل ہیں۔ رہا سوال ہندوستانیوں کا، مثلاً واقف، قبول، ناصر علی، آیت اللہ ثنا، اور بعض ایرانیوں کا، مثلاً مولانا روم اور شیخ علی حزیں وغیرہ، تو ان کے کلام پر مرزا مکین نے بے تکلف اصلاحیں دیں۔

ظاہر ہے کہ اشرف علی خاں کو مرزا فاخر مکین کی اس حرکت پر انتہائی رنج ہوا اور غصہ بھی آیا۔ وہ ان مجروح صفحات کو لے کر سودا کے پاس گئے کہ مکین کے اعتراضوں پر انصاف کی نظر ڈالیے اور ان کا جواب لکھیے۔ سودا نے پہلے تو انکار کیا اور کہا کہ مجھے اتنی فارسی آتی ہی نہیں کہ میں یہ کام کر سکوں اور انھوں نے کئی اور معتبر نام تجویز کیے کہ وہ اس کام کے اہل ہیں۔ لیکن اشرف علی

خان نہ مانے۔ مختصر آیہ کہ میری درخواست اور انکار کے باوجود خان موصوف نے اس عاجز کے سامنے وہ اوراق رکھ دیے جو مرزا مکیں کے قلم سے مجروح تھے اور رنجیدہ اور ناخوش اپنے گھر چلے گئے۔ اب سودا کو کوئی چارہ نہ تھا۔ انھوں نے مرزا فاخر مکیں کے اعتراضوں کو دیکھا اور ان کا مناسب رد لکھ کر اس رسالہ کا نام "عبرت الغافلین" رکھا اور اس میں مرزا فاخر مکیں کے بعض اشعار پر بھی اعتراض کیے۔(۳۲)

ایسی بہت سی مثالیں مل جائیں گی لیکن یہ چند مثالیں کافی ہوں گی۔ بس اتنا اور دیکھ لیجیے کہ وہی سیالکوٹی مل وارستہ جنھوں نے شیخ علی حزیں کے دفاع میں خان آرزو کا رد لکھا، خود اپنے لغت "مصطلحات شعرا" میں کئی ہندوستانیوں کا کلام بطور سند لاتے ہیں۔(۳۳) اور فاخر مکیں جو ایک ہندوستانی اور فارسی کے معمولی شاعر ہیں، یہ غرہ رکھتے ہیں کہ کیا سعدی اور کیا رومی، میں سب کے کلام کو لائق اصلاح قرار دیتا ہوں۔ اور مرزا مکیں کا رد لکھنے والا بھی ایک ہندوستانی ہے، یعنی مرزا سودا، اور یہ رد اتنا مسکت ہے کہ مرزا فاخر مکیں کا قلم تو چپ ہو جاتا ہے لیکن وہ اپنے لفنگے شاگردوں کو سودا کی زد و کوب کے لیے لا دیتے ہیں۔(۳۴)

آپ خود سوچیں کہ فارسی زبان اور ادب میں ہندوستانیوں کو اپنی صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا کہ نہیں؟ مندرجہ بالا مثالوں سے کیا یہ پوری طرح ثابت نہیں ہوتا کہ ہم اہل ہند کو اپنے بارے میں شک کرنے کی کوئی وجہ تھی نہیں، لیکن پھر بھی اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ہم نے خود پر شک کرنے اور خود کو ایرانیوں کے مقابلے میں حقیر سمجھنے کی جس رسم کی بنا ڈال دی وہ اب تک ہماری جان کے ساتھ ہے۔

جہاں تک سوال اردو کا ہے تو اٹھارویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے شمالی ہند کی اردو سارے ہندوستان میں پھیل چکی تھی اور بڑی حد تک یہی اردو ہر جگہ معیاری کہلائی۔ اورنگ آباد، جو پہلے ہی سے دہلوی لہجے میں اردو بولنے والوں کا جنوبی مرکز تھا، اب اور پھلا پھولا۔ آزاد بلگرامی کے علاوہ سراج اورنگ آبادی (۱۷۱۳ تا ۱۷۳۵)، لچھمی نرائن شفیق (۱۷۴۵ تا ۱۸۰۸)، اور خود ولی کے نام اورنگ آباد کی ادبی حیثیت پر دال ہیں۔ نوابان کرناٹک کی وجہ سے مدراس اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں دہلوی اردو اور اردو کی ادبی حیثیت کا استحکام ہوا۔ ملا عبد العلی بحر العلوم (۱۷۳۹ تا ۱۸۱۰) اور مولانا باقر آگاہ (۱۷۴۵ تا ۱۸۰۶) کے نام مدراس اور

اطراف مدراس کی ادبی حیثیت کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ حیدرآباد اور میسور میں تو اردو کا چلن پہلے سے تھا ہی۔ یہی عالم گجرات کا تھا جہاں ۱۷۵۰ کے آس پاس عبدالولی عزلت جیسا غیر معمولی شاعر نمایاں ہو کر دلی اور پھر دکن پہنچا۔ ادھر مہاراشٹر میں شاہ تراب خطائی ۱۷۳۵ کے آس پاس مراٹھی صوفیہ شاعری کو اردو میں منتقل کر رہے تھے۔ دلی کے اطراف میں آگرہ اور فرخ آباد اردو مرکز کی حیثیت سے نمایاں تھے۔ یہ سلسلہ لکھنؤ، الہ آباد، بنارس، پٹنہ، مرشد آباد سے ہوتا ہو کلکتہ پہنچ چکا تھا۔ ۱۸۰۷ میں مرشد آباد اور عظیم آباد کی اہمیت اردو ادب کے مراکز کی حیثیت سے اس قدر نمایاں ہو چکی تھی کہ انشا کو "دریائے لطافت" میں مرشد آبادی اور عظیم آبادی اردو بولنے والوں پر طنز کرنا پڑا کہ وہ لوگ اپنے کو دلی والا اہلِ زبان اور اپنے شہر کو اردو (دلی) سمجھیں تو سمجھیں لیکن ہیں وہ مقامی اور دیہی لوگ۔ (۳۵)

انشا نے مرشد آبادیوں اور عظیم آبادیوں کا مذاق اڑایا تو سہی اور لکھنؤ والوں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ معمولی معمولی الفاظ کا تلفظ صحیح نہیں کرتے۔ (۳۶) لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک کم ہی ایسا تھا کہ لوگ فارسی عربی الفاظ کے ساتھ خلاقانہ آزادیاں نہ برتتے ہوں۔ میر کی مثال سامنے کی ہے۔ ان کے کسی معاصر نے یہ الزام نہیں لگایا کہ ان کی زبان عامیانہ یا عامیوں کی زبان سے مختلف ہے، بلکہ تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے ان کی زبان کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ میر بہت مانوس زبان استعمال کرتے ہیں۔ "آبِ حیات" میں آتش کا واقعہ لکھا ہے کہ جب انھوں نے لفظ "بیگم" کو اردو تلفظ کے مطابق زبر کے ساتھ باندھا تو ان سے کہا گیا کہ حضور ترکی میں تو کاف پر پیش ہے اور فارسی زبان کے قاعدے بھی اسی تلفظ کا تقاضا کرتے ہیں، تو آتش نے ہنس کر جواب دیا کہ جب ہم ترکی جائیں گے تو ترکی بولیں گے، ابھی تو ہم اردو بول رہے ہیں۔ (۳۷) اس کے برخلاف امیر مینائی کو دیکھیے کہ آتش کے بمشکل ایک صدی بعد عربی کے تلفظ میں دہلی کے محاورے کے مطابق ایک معمولی تصرف نہیں برداشت کر سکتے اور ایرانی استادوں کی سند مانتے ہیں۔

۴

یہ تبدیلی کیسے آئی؟ کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ فارسی زبان و ادب کے بارے میں ہندوستانی خود اعتمادی

Scanned with CamScanner

اٹھارویں صدی کے وسط میں اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور پھر اس کے بعد خود بخود ہی کارواں ہو گیا؟ لیکن ادب اور ثقافت کی دنیا میں معاملات اس طرح ہوتے نہیں۔ فیشن بدل جاتے ہیں، کوئی مصنف یا کوئی طرز مقبول سے غیر مقبول ہو جاتا ہے یا کوئی بھلایا ہوا طور دوبارہ زندہ ہو جاتا ہے، لیکن اپنی زبان و ادب کے بارے میں رویہ اتنا بدل جائے کہ لوگ اپنے اچھے کو خود ہی برا کہنے لگیں، یہ کسی بہت بڑی نفسیاتی یا تاریخی وجہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

انگریزوں کی دیکھا دیکھی ہمارے مورخوں کا یہ رواج رہا ہے کہ وہ اٹھارویں صدی کو ہندوستان میں زوال، نقصان اور انتشار کی صدی سے تعبیر کرتے ہیں۔ مغل حکومت ۸۳۷۱ کے بعد روز بروز کمزور ہوتی چلی گئی، اس میں تو کوئی شک نہیں۔ لیکن جس طرح کی تباہی اور بربادی کی گرم بازاری کا حال ہمارے مورخین بیان کرتے ہیں، اس کے نشانات اتنے واضح نہیں ہیں۔ اور اس میں تو کوئی کلام نہیں کہ تہذیبی و ثقافتی اور علمی سطح پر اٹھارویں صدی کو ہندوستان کی تاریخ کو غیر معمولی طور پر روشن قرار دینا چاہیے۔ جتنا علمی اور فکری سرمایہ خاص کر عربی اور اردو میں اس صدی میں ہمارے ملک میں خلق کیا گیا وہ کسی بھی پچھلی صدی کے کارنامے سے کم نہیں ہے۔ بعض معاملات میں وہ برتر ہی ہو سکتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کیا اٹھارویں صدی کی تہذیب خود اپنے کو زوال آمادہ اور مائل بہ انتشار سمجھتی تھی؟ کیا اس زمانے کے لوگوں کو خیال تھا کہ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب ہندوستان کی تہذیب کم و بیش مٹ جائے گی اور ملک پر فرنگی کا دور دورہ ہو گا؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ کم سے کم اٹھارویں صدی کے آخر تک تو ایسا کوئی احساس ہمیں پھیلتا بلکہ جنم لیتا نظر نہیں آتا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستانیوں کو اچانک اپنی فارسی اور اپنی اردو کے بارے میں طرح طرح کے شک اور شبہات قائم کرنے کی عادت پڑ گئی؟

یہ صحیح ہے کہ شیخ علی حزیں نے اٹھارویں صدی کے وسط میں شک کا ایک چھوٹا سا بیج بویا تھا اور ۰۷۷۱ کی دہائی میں فاخر مکین کا یہ کہنا کہ وہ ہندوستانی فارسی گویوں کو کچھ نہیں سمجھتے تھا، اس بات کا ثبوت ہے کہ شیخ علی حزیں کا بویا ہوا بیج برگ و بار لا رہا تھا۔ لیکن یہ نہ بھولیے کہ یہی فاخر مکین ایرانی اساتذہ کو بھی گھاس نہیں ڈالتے اور انھیں نہ صرف اصلاح دینے کا دعویٰ رکھتے ہیں بلکہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سعدی، رومی، جامی وغیرہ کے بہت سے اشعار مہمل ہیں۔ لہٰذا فاخر مکین اور سودا والے واقعے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا کہ شیخ علی حزیں نے ہندوستانیوں کے تئیں حقارت کا

جو رویہ اختیار کیا تھا اس نے ہندوستانیوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مکین اور سودا کا یہ واقعہ گم نام رہ جاتا اگر سودا نے پہلا رسالہ عبرت الغافلین اپنے کلیات میں درج نہ کر دیا ہوتا اور پھر سودا کے ٹھیک سو برس بعد محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اسے اپنے لاجواب اور لازوال اسلوب میں پیش نہ کیا ہوتا۔

لیکن یہ بات بھی سچ ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر ہوتے ہوتے اردو والوں کے دل میں یہ خیال جڑ پکڑنے لگتا ہے کہ مثلاً دیسی اور فارسی عربی الفاظ کو مرکب نہ کرنا چاہیے، یا فارسی عربی الفاظ کو اسی تلفظ کے ساتھ باندھنا چاہیے جو اصل زبان میں رائج ہیں۔ اس سلسلے میں تھوڑا سا کام شاہ حاتم نے بھی کیا جب انھوں نے دیوان زادہ (۱۷۵۵-۵۶) کے دیباچے میں یہ کہا کہ میں دلی کے مرزاوں اور رندوں کی زبان لکھنا پسند کرتا ہوں اور فارسی عربی کے الفاظ کو صحیح تلفظ کے ساتھ باندھنا ضروری قرار دیتا ہوں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہر گروہ کی زبان، خاص کر دہلی کے اطراف کی بھاکا کے الفاظ، کو شاعری میں نہ لانا چاہیے۔ لیکن انھوں نے یہ بھی کہا ہے کہ فارسی عربی کے وہی الفاظ لائے جائیں جو عام فہم ہوں، اور مروج محاورے کو بہرحال باقی تمام چیزوں پر فوقیت ہے۔(۳۸)

یہ صاف ظاہر ہے کہ شاہ حاتم ایک طرف تو مروج محاورے پر زور دے رہے ہیں اور دوسری طرف عربی فارسی کی حرمت کو بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ ان میں ایک تضاد ہے جس پر میں نے کہیں اور مفصل بحث کی ہے۔ فی الحال یہی کہنا کافی ہے کہ شاہ حاتم کے خیالات میں جو اچھی باتیں تھیں ان پر ہمارے مورخوں نے کم دھیان دیا اور ان کے منفی اشاروں کو بڑھا چڑھا کر اصلاح زبان کی تحریک کا نام دے کر پیش کیا گیا۔ بہرحال ایک فضا تو بن ہی رہی تھی جس میں اردو کو عربی فارسی استعمالات کا محکوم ٹھہرانا ضروری سمجھا جانے لگا تھا۔ انشا نے دریائے لطافت میں بہت سی بنیادی اصولی باتیں کہیں جو ترقی یافتہ زبانوں کے مزاج کے مطابق ہیں، لیکن انھوں نے بھی یہ بیخ لگا دی کہ دیسی الفاظ کو فارسی عربی کے ساتھ مرکب نہ کرنا چاہیے۔

انشا نے بہت زور دے کر اور صاف الفاظ میں لکھا:

> یہ بات پوری طرح سب لوگوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ جو لفظ اردو میں رائج ہو گیا وہ اردو ہے، چاہے اس کی اصل عربی ہو یا فارسی یا ترکی یا سریانی یا

Scanned with CamScanner

> پنجابی یا پوربی- اور وہ اردو کا لفظ ہے، چاہے اسے اصل زبان کے طریقے اور ضوابط کے لحاظ سے استعمال کیا گیا ہو یا نہیں، وہ صحیح ہے- ایسے لفظ کی صحت یا عدم صحت کا فیصلہ اس بات سے کیا جائے گا کہ وہ اردو میں کس طرح مروج ہے- جو کچھ اردو محاورے کے خلاف ہے، وہ غلط ہے اور جو کچھ اردو محاورے کے مطابق ہے وہ صحیح ہے، چاہے وہ اصل زبان کے مطابق ہو یا نہ ہو- اگرچہ یہ بات ہم اس کتاب میں پہلے بھی کہہ چکے ہیں، لیکن یہاں مزید وضاحت سے بیان کر رہے ہیں-

مندرجہ بالا عبارت "دریائے لطافت" کے تقریباً بالکل آخر میں ہے، گویا انشا یہ چاہتے ہوں کہ ان کا یہ نکتہ پڑھنے والوں کے ذہن میں جم جائے- اس کے بعد انھوں اس کی بہت سی مثالیں بھی دیں- لیکن افسوس کہ انھوں نے دیسی اور فارسی الفاظ میں اضافت لگانے کو غلط قرار دیا-(۳۹)

یک دل چسپ بات یہ ہے کہ تقریباً اسی زمانے میں مولانا باقر آگاہ نے بھی دیسی اور فارسی عربی الفاظ کے بیچ اضافت لگانے کو غلط قرار دیا تھا- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی لہر تھی جو شمال تا جنوب دوڑی ہوئی تھی-(۴۰)

سعدی نے لکھا ہے کہ دنیا میں ظلم کی بنیاد پہلے تو ذرا سی تھی، اس کے بعد جو بھی آیا اس میں تھوڑا سا اضافہ ہی کر گیا-(۴۱) انشا اور باقر آگاہ نے جو پابندی دیسی اور عربی فارسی لفظ پر اضافت کے خلاف لگائی تھی وہ چھوٹا سا ظلم نہ تھی اور خود ان کے بنائے ہوئے ضابطوں کی روشنی میں داخلی تضاد کا شکار تھی- لیکن انشا اور شاہ حاتم کے روشن فکر اور عملی طور پر کارآمد ضابطوں کو کسی نے بھی پوچھا نہیں اور ان کے نامناسب اور غیر منطقی پر مبنی مشوروں کو لوگوں نے آنکھوں سے لگایا اور سر پر رکھا-

شروع شروع میں یہ پابندیاں اور جھگڑے چھوٹے پیمانے پر تھے- عربی فارسی الفاظ کو اردو میں کیسے برتا جائے، اس پر پہلا جھگڑا جہاں تک میرا خیال ہے انشا سے ہی شروع ہوا- مصحفی و انشا میں جن الفاظ اور استعمالات کو زیر بحث لایا گیا ان میں سے چند حسب ذیل ہیں:

سقنقور: اس لفظ کو یکے نہیں استعمال کرنا چاہیے بلکہ "ماہی سقنقور" کہنا چاہیے- یہ بھی کہا گیا ہے کہ ماہی سقنقور میں ماہی کی "ی" پر تشدید نہ لگانی چاہیے یعنی ماہی بروزن مفعولن یا بروزن مفعول

Scanned with CamScanner

کے بجاے بروزن فاعل یا بروزن فعل ہونا چاہیے۔

مسکوت: بمعنی وہ جو ساکت ہے، عربی میں نہیں ہے، لہذا غلط ہے۔

حلقہ: عربی میں دائرہ یا گول چیز کے معنی میں ہے، اسے انگوٹھی کے معنی میں نہ استعمال کرنا چاہیے۔

بلور: ل پر تشدید نہیں ہے۔ ی کو مخفف ہونا چاہیے۔ (۴۲)

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، یہ جھگڑا بعد میں بہت بڑھا اور ۱۷۹۷ میں آصف الدولہ کی مداخلت سے ختم ہوا۔ آصف الدولہ اس کے چند دنوں بعد مر بھی گئے۔ لیکن مصحفی اور انشا بھی شاید تھک چکے تھے، اس لیے چپ ہو گئے۔ (۴۳)

مصحفی کا ایک اور واقعہ "خوش معرکہ زیبا" میں یوں درج ہے کہ انھوں نے مفتی غلام حضرت نامی کسی شخص کی تاریخ وفات کہی جس میں لفظ مفتی کی یاے تحتانی دبتی تھی۔ کسی نے ان سے کہا کہ حضرت، عربی فارسی الفاظ کا حرفِ علت دبانا درست نہیں ہے۔ مصحفی نے اٹھارویں صدی والوں کے انداز میں لٹھ سا جواب دیا کہ خود میرے تخلص مصحفی میں یاے تحتانی سو جگہ دبی ہو گی۔ کس کو دماغ ہے کہ ٹھیک کرتا پھرے۔ (۴۴)

۵

لیکن یہ سب تو ذرا ذرا سے واقعات تھے۔ ۲۸-۱۸۲۷ میں ایک پورا طوفان اٹھ کھڑا ہوا جب غالب نے کلکتے میں کسی معترض کو یہ جواب دیا کہ قتیل نے کچھ بھی لکھا ہو، میں قتیل کو سند نہیں مانتا۔ یہ سارا واقعہ سب لوگوں کو مفصل معلوم ہے لہذا میں یہاں مزید تفصیل نہ لکھوں گا۔ صرف اس بات کی طرف توجہ دلانا منظور ہے کہ غالب نے کلکتے میں جو "مثنوی باد مخالف" لکھی تھی اس میں بیدل کی تعریف کی تھی، یعنی انھیں دیگر فارسی گویوں کی طرح حقیر نہ گردانا تھا۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ اس واقعے کے بعد سے غالب نے اپنے کسی شعر میں بیدل کو خراجِ تحسین نہیں پیش کیا، جبکہ اس سے پہلے وہ بیدل کا ذکر بڑی عقیدت کے ساتھ اپنے اشعار میں کرتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ وقت آ گیا جب انھوں نے تیس بتیس سال بعد ۱۸۵۹ میں بیدل کو بھی اپنے خاص

Scanned with CamScanner

ناپسندیدہ فارسی گویوں کے برابر حقیر جانا۔ انھوں نے عبدالغفور سرور کو لکھا:

"ناصر علی اور بیدل اور غنیمت، ان کی فارسی کیا؟ ہر ایک کا کلام بہ نظرِ انصاف دیکھیے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ منت اور کمین اور واقف اور قتیل، یہ اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجیے۔" (۴۵)

غالب نے اسی پر بس نہ کی۔ ان کے خط پڑھیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ خان آرزو، آزاد بلگرامی اور ٹیک چند بہار وغیرہ پر بمشکل ایک صدی بھی نہ گزرنے پائی تھی کہ ہندوستانیوں کا بازار سرد ہو گیا۔ ایک وقت وہ تھا کہ آزاد بلگرامی "خزانۂ عامرہ" میں عرفی اور حزیں وغیرہ پر بے دھڑک اعتراض کرتے تھے۔ (۴۶) آزاد اور ان کے معاصروں کا خیال تھا کہ عرفی، یا کوئی بھی ایرانی ہو، بہرحال انسان ہے اور اس سے غلطی ہو سکتی ہے۔ اس کے برخلاف غالب تمام ایرانیوں کو اور بالخصوص عرفی کو اللہ میاں سے ذرا سا ہی کم سمجھتے تھے۔ احمد علی رام پوری کو لکھتے ہیں:

"عرفی کی زبان سے جو نکل جائے وہ سند ہے۔ ہمارے واسطے وہ ایک قاعدۂ محکم ہے۔ وہ مطاع ہے اور ہم اس کے مقلد اور مطیع ہیں۔" (۴۷)

غالب نے خود اپنے لیے جو راہ فرار یا راہ نجات نکالی وہ یہ تھی کہ انھوں نے کہا کہ مجھے فارسی زبان سے مناسبتِ ازلی ہے، اور پھر یہ کہ انھوں نے فارسی زبان ایک ایرانی استاد سے بھی سیکھی تھی۔ (۴۸) لیکن یہ باتیں ان کے دشمن تو کیا ان کے دوست بھی کہاں ماننے والے تھے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ شبلی نے غالب کو اہلِ زبان کے برابر مستند تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

ہندوستانی فارسی گویوں کا ستارہ دھندلا پڑتا ہی گیا۔ یہاں تک کہ شبلی کی "شعر العجم" کی پانچ جلدیں ۱۹۰۹ سے ۱۹۱۸ تک سامنے آئیں۔ تقریباً بارہ سو صفحات کی اس لاجواب کتاب میں شبلی نے غالب اور بیدل کا بمشکل ایک دو جگہ نام لیا، اور سبکِ ہندی کے بیسیوں عظیم فارسی گویوں کا نام تک اس کتاب میں نہیں ملتا، ان کا تذکرہ تو دور کی بات ہے۔ اس کا ایک بہت بڑا نقصان یہ بھی ہوا کہ ہندوستان میں فارسی مطالعات کی فہرستِ استناد میں ان ہندوستانیوں کے نام شامل نہ ہو سکے جنھیں شبلی نے نظر انداز کیا تھا۔ غالب کا معاملہ تو ذرا دیگر تھا، اور بیدل کا نام غالب اور اقبال کی وجہ سے چمکا۔ ان دو کے علاوہ کوئی ہندوستانی فارسی گو ایسا نہیں جو ہمارے فارسی مطالعات کے فہرستِ استناد میں شامل ہو۔ ایرانیوں نے ہندوستانی شعرا اور سبکِ ہندی کے ایرانی

Scanned with CamScanner

شعرا کو بھی چنداں لائق اعتنا نہ سمجھا تھا۔ ہندوستانیوں نے بھی انھیں بالائے طاق رکھ دیا۔ بے چارے نہ وہاں کے رہے نہ یہاں کے رہے۔

اردو پر اس کا اثر یہ ہوا کہ زبان کا میدان وسیع ہونے کے بجائے تنگ ہو گیا۔ خلاقانہ تصرف کی جگہ کتابی کٹھ ملائیت محترم اور معتبر ٹھہری۔ ہزاروں نہیں تو سیکڑوں الفاظ ٹکسال باہر قرار دیے گئے۔ عام بولنے والے انھیں بولتے رہیں تو کیا ہوا، نام نہاد اساتذہ تو انھیں دیس نکالا دے ہی چکے۔

کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ اردو واحد زبان ہے جس کے ماہرین اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہم نے اتنے الفاظ کو متروک قرار دے دیا یا ترک کر دیا؟ چہ جائے کہ وہ اس بات پر فخر کریں کہ ہم نے اتنے نئے الفاظ یا تراکیب یا استعمالات زبان میں داخل کیے ہیں۔ تمام دنیا میں طریقہ ہے کہ لسان بالقوت (یعنی langue) وہی ہوتی ہے جو لسان بالفعل (یعنی parole) ہے۔ یہاں الٹا معاملہ ہے کہ لسان بالفعل کے چند اجارہ دار ہیں جو لسان بالقوت پر تسلط رکھنے کا گمان رکھتے ہیں۔ آج بھی ایسی فہرستوں کی کمی نہیں جو رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ فلاں فلاں عربی الفاظ کو یوں نہیں بلکہ یوں استعمال کرنا چاہیے تاکہ وہ عربی فارسی کے مطابق ہو جائیں؛ فلاں فلاں الفاظ کا تلفظ جو اردو میں مروج ہے، وہ غلط ہے کیوں کہ وہ عربی فارسی کے مطابق نہیں ہے، وغیرہ۔ ان فہرستوں کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یار لوگ اپنے مخالفوں کی زبان میں کیڑے نکالنے کے لیے ان کا جائز، ناجائز استعمال کرتے رہتے ہیں۔ (۴۹) شاہ حاتم لاکھ کہا کریں کہ محاورے اور روزمرہ کو کتاب پر فوقیت حاصل ہے، لیکن یہاں سنتا کون ہے؟ یہاں تو اب بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو کہتے ہیں کہ "عجز" بہ کسر عین غلط ہے کیوں کہ "عجز" میں "ع" پر زبر ہے۔

شاہ حاتم اور انشا کے اصولوں میں جو گنجائشیں تھیں، ان کا بھی غلط استعمال کیا گیا۔ یعنی یہ طے کر لیا گیا کہ اہل ایران جو اپنی کتابوں میں لکھ گئے ہیں اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اس کے برخلاف خان آرزو نے اپنی معرکہ آرا کتاب "مثمر" میں لکھا ہے:

> کچھ تراکیب ایسی ہیں جو خاص حیثیت رکھتی ہیں اور زبان میں خاص طرح استعمال ہوتی ہیں اور عام لوگوں کو ان کی نزاکتوں اور باریکیوں کا پتا نہیں ہوتا۔ ہندوستان کے کچھ علما نے کسی ایرانی شاعر سے کہا کہ آپ کے

> اساتذہ نے زبان اپنے یہاں کے بوڑھے بوڑھیوں سے سیکھی ہے جبکہ ہم لوگوں نے خاقانی اور انوری جیسے فصحا سے یہ زبان سیکھی ہے۔ ہندوستانی علما کا اس بیان سے مطلب یہی تھا کہ مختلف اور متنوع تراکیب ہیں جو مخصوص اور مختلف جگہوں پر استعمال ہوتی ہیں۔ عام لوگوں کو ان کے اسرار کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ شخص جس نے کسی زبان کے خواص سے تربیت پائی ہے وہ اس سے بہتر ہے جس نے اس زبان کے عوام سے تربیت پائی۔(۵۰)

خان آرزو نے بڑی گہری بات کہی ہے اور اس کا ثبوت ملاحظہ کرنا ہو تو ٹیک چند بہار کی مرتب کردہ "بہار عجم" کا کوئی صفحہ کھول لیجیے۔ لیکن اس سے پہلے خان آرزو کے ذکر کردہ واقعے کو غالب کی زبان سے سنیے اور دیکھیے کہ غالب کا رویہ اور نظریہ کتنا غلامانہ ہے اور خان آرزو کا رویہ اور نظریہ کس قدر عالمانہ اور روشن خیال۔ غالب لکھتے ہیں:

> کیا تو نے سنا نہیں جو عرفی اور فیضی میں گفتگو ہوئی ہے، اور موتمن الدولہ شیخ ابوالفضل کے روبرو ہوئی ہے؟ لغات فارسی اور ترکیب الفاظ میں کلام تھا۔ مولانا جمال الدین عرفی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اور نطق آشنا ہو گیا ہوں، اپنے گھر کی بوڑھیوں سے لغات فارسی اور بھی ترکیبیں سنتا رہتا ہوں۔ فیضی بولا کہ جو کچھ تم نے اپنے گھر کی بوڑھیوں سے سیکھا ہے وہ ہم نے خاقانی اور انوری سے اخذ کیا ہے۔ حضرت عرفی نے فرمایا کہ تقصیر معاف، خاقانی اور انوری کا ماخذ بھی تو مطلق گھر کی پیرزالوں کا ہے۔(۵۱)

آپ خود دیکھ سکتے ہیں کہ خان آرزو کا رویہ ترقی یافتہ ذہن، عالمانہ مزاج اور خود اعتمادی کا رویہ ہے اور غالب کے یہاں ان چیزوں کا نام و نشان نہیں۔ لیکن افسوس یہ کہ بات غالب ہی کی چلی اور خود غالب کو بھی اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا۔

خان آرزو نے اوپر تراکیب و محاورات کا ذکر کیا ہے جن سے صرف پڑھے لکھوں کی زبانیں آشنا ہیں۔ میں نے "بہار عجم" کا ایک حصہ بالکل بے ارادہ کھولا (جلد سوم صفحہ ۴۵۶) تو اس میں

لفظ "گوہ" پر بھی پندرہ تراکیب فقرے اور محاورے نظر پڑے جن کے معنی اور استعمال کی سند کے طور پر ٹیک چند بہار نے مندرجہ ذیل شعرا کے اشعار پیش کیے ہیں، صائب تبریزی، محسن تاثیر، ملا طغرئی، اشرف مازندرانی، شفائی اصفہانی، علی قلی خراسانی، دانش مشہدی، طوقی یزدی، زلالی خوانساری، طالب آملی اور محمد قلی سلیم۔(۵۲)

ان شعرا میں امیر و وزیر بھی ہیں، ملک الشعرا بھی، معلم اور صوفی بھی، طنز نگار بھی اور عشق کو بھی۔ ذرا کوئی مجھے بتا دے کہ وہ کون سا ایسا گھر ہوگا جس کے رہنے والوں نے اس کی بڑھی بوڑھیوں کی زبانی یہ سب فقرے اور محاورے سن لیے ہوں گے؟ ظاہر ہے ان فقروں، محاوروں اور تراکیب سے شناسائی اساتذہ کے کلام سے ہی مل سکتی ہے، گاؤں گھر کی بڑھی بوڑھیوں سے نہیں۔

ایسا نہیں کہ غالب کو یہ فرق معلوم نہیں تھا۔ وہ خوب جانتے تھے کہ پڑھے لکھوں کی بولی اور خاص کر شاعری کی بامحاورہ، انتہائی استعاراتی اور پیچیدہ زبان کچھ اور ہے اور عام لوگوں کی گھریلو بول چال شےؔ دیگر ہے۔ اپنی مخصوص تضاد بیانی کو کام میں لاتے ہوئے انھوں نے قتیل کے بارے میں لکھا: "قتیل کے ماخذ کشمیری، کابلی یا قندھاری یا اکا دکا ایرانی رہے ہوں گے جو سعادت علی خان [زمانۂ حکومت ۱۷۹۸ تا ۱۸۱۴] کے وقت میں گھومتے پھرتے لکھنؤ پہنچے ہوں گے، اور تقریر کچھ اور چیز ہے تحریر کچھ اور چیز۔"(۵۳) یعنی ان لوگوں کی بولی سن کر قتیل کو کوئی فائدہ نہ ہوا ہوگا۔ لیکن یہی بات تو فیضی بھی کہہ رہا تھا اور خان آرزو بھی۔ لیکن غالب ان کی بات کیوں مان جاتے؟ خان آرزو نے تو یہاں تک کہا تھا کہ اگر ایرانیوں کو یہ حق ہے کہ وہ عربی اور ہندی الفاظ پر تصرف کریں تو "صاحب قدرتان ہند" کو بھی فارسی میں تصرف کرنے کا حق کیوں نہ ہو۔(۵۴) لیکن خان آرزو کی بات یہاں بھی نہ سنی گئی اور انیسویں صدی کی الٹی گنگا بہتے بہتے خود غالب اور شبلی کے کنارے آلگی اور ساری ہندوستانی اور فارسی کو آلودہ کر گئی۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اپنے آخری زمانے میں غالب نے بلاوجہ کی ایک بحث "برہان قاطع" کے بارے میں کھڑی کر دی تھی اور یہ بات بھی سب جان گئے ہیں کہ اس بحث سے غالب کی عظمت میں کوئی اضافہ نہ کیا اور نہ ان کی فارسی علمیت کا سکہ لوگوں پر جم سکا۔ لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ "برہانِ قاطع" کا سب سے زیادہ مفصل جواب اور رد مولوی احمد علی نے "موید برہان" کے نام سے ۱۸۶۶ میں چھپوایا۔ غالب کا بنیادی بیان یہ تھا کہ "برہان قاطع" کے مولف محمد

حسین تبریزی کو فارسی میں سند نہ ماننا چاہیے کیوں وہ ہندوستانی تھے۔ مولوی آغا احمد علی نے اپنی کتاب میں غالب کے اعتراضات کو رد کیا۔ اس طرح انھوں نے بالواسطہ طور پر یہ ثابت کر دیا کہ محمد حسین تبریزی ہندوستانی تھے تو کیا ہو، ان کا قول معتبر ہے۔ تقدیر کی ستم ظریفی دیکھیے کہ نقصان بھی غالب کا ہوا اور جیت بھی غالب کی ہوئی۔ نقصان یہ ہوا کہ غالب کو کسی نے اہلِ زبان جیسا مستند فارسی گو نہ مانا اور جیت ان کی یوں ہوئی کہ آغا احمد علی جیسے چند مخالفوں کے باوجود زمانے نے غالب کی ہی بات کو تسلیم کیا کہ ہندوستانی فارسی گو اور ہندوستانی فارسی لغت نگار مستند نہیں ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کا شمار فارسی کے بڑے شاعروں میں ہونا چاہیے، اور ہوتا ہے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ شبلی جیسا فارسی کا زباں شناس اور فارسی شعر کا ذوق رکھنے والا عالم بھی بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ شبلی کی فارسی شاعری ایرانی طرز کی ہے اور انھوں نے بخیال خود ہندوستانی فارسی گویوں کے طور طریقوں سے اجتناب کیا ہے۔ لیکن جس طرح شبلی نے غالب کو مستند نہ مانا، اسی طرح شبلی کی زبان پر بھی یاروں نے اعتراض کیے۔(۵۵) گویا یہ سمجھا کہ کوئی بھی ہندوستانی اہلِ ایران کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ غالب اور بیدل نہیں تو شبلی بھی نہیں۔ اور جب ہندوستان کا فارسی گو اہلِ زبان کا ہم مرتبہ نہیں ہو سکتا تو پھر بے چارہ اردو والا جو ٹوٹی پھوٹی عربی اردو میں لائے گا تو وہ بھلا کیا بھاؤ بکے گا؟

۲

ایرانی فارسی، ہندوستانی فارسی اور اردو کے مراتب میں فرق کب شروع ہوا؟ میرا خیال ہے اس کا جواب میں نے بڑی حد تک دے دیا ہے۔ یہ کیسے ہوا؟ اس کا جواب بھی میں نے دلائل اور قیاس کی روشنی میں بڑی حد تک بیان کر دیا ہے۔ لیکن کیوں ہوا؟ یہ کم سے کم میرے لیے اب تک ایک راز ہے۔

**

Scanned with CamScanner

حواشی

(۱) اس بحث کی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ہماری زبان، نئی دہلی، بابت ۱۹۹۶، کے حسب ذیل شمارے: ۱۵ مارچ، ۲۲ مارچ، ۱۵ مئی، ۶ جون، ۱۵ جون، یکم جولائی، ۸ جولائی، یکم اگست، ۸ اگست، ۱۵ اگست، ۹ ستمبر اور ۱۲ ستمبر۔

(۲) مکتوب مورخہ ۱۳ مئی ۱۸۶۵ بنام ہرگوپال تفتہ۔ خلیق انجم (مرتب) غالب کے خطوط، جلد اول، دہلی، ۱۹۸۳۔ صفحہ ۳۵۳۔

(۳) شبلی نعمانی: "شعر العجم"، جلد اول، علی گڑھ ۱۹۰۹۔ صفحہ ۸۲-۱۸۱۔

(۴) حلیم صدری کمال: دستور الفصحا، لکھنؤ، ۱۸۹۷۔ صفحہ ۳۲۔

(۵) نظم طباطبائی کا مضمون "لفظ نم کی تحقیق"، مطبوعہ اردوئے معلی، علی گڑھ بابت مئی جون ۱۹۱۳۔ ملاحظہ ہو اشرف رفیع (مرتب): مقالات طباطبائی، حیدر آباد، ۱۹۸۳۔ صفحہ ۲۵۱۔ اسی کتاب میں طباطبائی کا ایک اور مضمون ہے (صفحہ ۲۰۷) جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ماہرین فن اس بات کو تسلیم نہ کریں گے کہ بیدل اور فیضی سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ یہ لوگ تو مقلد تھے۔ اہل زبان کبھی بھی "چشم نم" نہ کہے گا۔

(۶) ایضاً۔ صفحہ ۲۰۷۔

(۷) ملاحظہ ہو امیر مینائی کا خط بنام زاہد سہارنپوری۔ مولوی احسن اللہ (مرتب): مکتوبات امیر مینائی، لکھنؤ ۱۹۲۳۔ صفحہ ۱۸۲۔

(۸) خلیق انجم: "غالب کے خطوط"، ایضاً۔ جلد اول۔ صفحہ ۲۳۳۔

(۹) نیاز فتح پوری: مالہ و ماعلیہ، لکھنؤ، ۱۹۳۹۔ صفحہ ۶۰ اور ۷۰۔

(۱۰) شوق نیموی: مع اصلاح و ازاحت الاغلاط، لکھنؤ، ۱۸۹۳۔ صفحہ ۱۵

(۱۱) شوق نیموی: ایضاً۔ صفحہ ۱۵

(۱۲) مکتوب مورخہ ۱۳ مئی ۱۸۶۵ بنام ہرگوپال تفتہ۔ خلیق انجم، ایضاً۔ جلد اول۔ صفحہ ۳۵۲۔

(۱۳) خلیق انجم، ایضاً جلد چہارم، دہلی ۱۹۹۳، صفحہ ۱۳۷۷۔

(۱۴) بحوالہ شعیب اعظمی: "شبلی، مسکینِ غالب"، مطبوعہ جامعہ، غالب نمبر، فروری مارچ ۱۹۶۹۔ صفحہ ۱۶۲۔

(۱۵) مثلاً ملاحظہ ہو شوق سندیلوی کی کتاب "اصلاح سخن"، لکھنؤ، ۱۹۹۶۔ (اول اشاعت ۱۹۳۲ء) میں عبدالستار صدیقی کا نوٹ۔ صفحہ ۲۳۱ تا ۲۳۲، اور سلیمان ندوی کے مضامین مشمولہ "نقوش سلیمانی"، اعظم گڑھ ۱۹۳۹۔ صفحات ۷۷ تا ۱۲۲ اور ۲۸۹ تا ۳۳۹۔

(۱۶) "لباب الالباب" از محمد عوفی، مرتبہ براؤن و قزوینی حصہ دوم، لائیڈن اور لندن ۱۹۰۳۔ صفحہ

۲۳۶ تا ۲۵۲۔

(۱۷) امیر خسرو: دیباچہ غرۃ الکمال، مرتبہ سید علی حیدر، پٹنہ ۱۹۸۸۔ صفحہ ۹۷ تا ۹۸۔

(۱۸) Duncan Forbes *A Dictionary, Part I Hindustani and English, Part II English and Hindustani*, Lucknow 1987 p-28

(۱۹) S W Fallon *A New Hindustani English Dictionary*, Lucknow 1986, p.69

(۲۰) John Platts *A Dictionary of Urdu, Classical Hindi, and English*, Oxford, 1974. p.40

(۲۱) Dr John Gilchrist *The Orient Linguist*, Calcutta. 1802, p.1

(۲۲) Dr John Gilchrist *A Grammar of the Hindustanee Language*, Calcutta, 1796. p.261

(۲۳) "باغ و بہار" از میر امن دہلوی، مرتبہ رشید حسن خان دہلی، ۱۹۹۲، صفحات ۷ تا ۸ (اصل متن)

(۲۴) *Hobson Jobson* by Henry Yule and A C Burnell, Rupa New Delhi, Reprint 1986 (Originally published 1886) p.417

(۲۵) "مقالات حافظ محمود شیرانی"، مرتبہ مظہر محمود شیرانی، جلد اول، لاہور، ۱۹۶۶۔ صفحہ ۳۱۔

(۲۶) "کلیاتِ مصحفی"، حصہ دوم، مرتبہ حفیظ عباسی، دہلی، ۱۹۶۹۔ صفحہ ۵۷۸۔

(۲۷) *Madhava Rao Sindhia* by H H Keene (Rulers of India Series) Oxford, 1891 pp. 174, 178,193

(۲۸) آرزو بلگرامی: خزانۂ عامرہ، نولکشور پریس، کانپور، ۱۸۷۱۔ صفحہ ۱۹۵ تا ۲۰۰۔

(۲۹) ترجم اشباعین پر تھوڑی سی گفتگو کے لیے دیکھیے، نذیر احمد: غالب پر چند تحقیقی مقالے، دہلی، ۱۹۹۶۔ صفحات ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۷۴۔

(۳۰) نبی ہادی *Dictionary of Indo Persian Literature*, Delhi 1995 p.436-437
مزید دیکھیے، "صحف ابراہیم" از علی ابراہیم خان خلیل، مرتبہ عابد رضا بیدار، پٹنہ، ۱۹۷۸۔ صفحہ ۱۷ اور "مجمع النفائس" از خان آرزو، مرتبہ عابد رضا بیدار، پٹنہ، تاریخ ندارد۔ صفحہ ۹۔

(۳۱) شیخ چاند: "سودا"، کراچی۔ ۱۹۶۳۔ صفحہ ۹۵۔ اول اشاعت ۱۹۳۶۔

(۳۲) "کلیاتِ سودا" مرتبہ عبد الباری آسی، جلد دوم، نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۲۔ صفحات ۳۷۵ تا ۳۷۷۔

(۳۳) وارستہ سیالکوٹی: "مصطلحات شعرا"، لکھنؤ، نولکشور پریس، ۱۸۹۸۔ یہ کتاب وارستہ نے ۱۷۶۶ میں اپنی موت سے ذرا پہلے مکمل کی۔

(۳۴) یہ پورا واقعہ سودا نے اپنی ایک طویل نظم میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو "کلیات"، جلد دوم، مرتبہ: عبدالباری آسی، نولکشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۲۔ صفحات ۳۵۸ تا ۳۶۵۔

(۳۵) اگرچہ "دریاے لطافت" کی تصنیف میں قتیل بھی انشا کے ساتھ تھے لیکن زبان اور قواعد سے متعلق تمام ابواب اس کتاب میں انشا کے لکھے ہوئے ہیں، لہٰذا ان بیانات کو انشا کے ہی حوالے سے یاد کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو "دریاے لطافت"، مرشد آباد، ۱۸۵۰۔ صفحہ ۱۱۲۔

(۳۶) ایضاً۔ صفحہ ۱۱۱ تا ۱۱۲، ۱۱۶۔

(۳۷) محمد حسین آزاد: "آب حیات"، کلکتہ، ۱۹۶۷۔ صفحہ ۳۶۷۔ (اول اشاعت ۱۸۸۰) آزاد نے یہ واقعہ جس طرح سے بیان کیا ہے اس سے لگتا ہے کہ وہ آتش کی بات سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوئے۔

(۳۸) دیوان زادہ" از شاہ حاتم، مرتبہ: غلام حسین ذوالفقار، لاہور، ۱۹۷۵۔ صفحہ ۳۹۔

(۳۹) "دریاے لطافت"، ایضاً۔ صفحہ ۳۷۰ تا ۳۷۵۔

(۴۰) ملاحظہ ہو باقر آگاہ کا اپنے اردو دیوان پر دیباچہ، مشمولہ "مولانا باقر آگاہ کے ادبی نوادر"، مرتبہ: علیم صبا نویدی، مدراس، ۱۹۹۴۔ صفحہ ۲۳۔

(۴۱) ملاحظہ ہو "گلستان"، باب اول، مطبوعہ مطبع مجیدی، کانپور، ۱۹۰۹۔ صفحہ ۵۴۔

(۴۲) تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو "خوش معرکۂ زیبا" از سعادت خان ناصر، مرتبہ: مشفق خواجہ/تسیم امروہوی، لکھنؤ، ۱۹۷۱۔ صفحات ۲۷۸ تا ۲۸۷۔

(۴۳) ملاحظہ ہو "کلیات شعر اردو سلیمان شکوہ"، مرتبہ: شاہ عبدالسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۲۔ صفحہ ۳۶۔

(۴۴) "خوش معرکۂ زیبا"، ایضاً۔ صفحہ ۲۷۳۔

(۴۵) خلیق انجم (مرتب): "غالب کے خطوط"، جلد دوم، دہلی، ۱۹۸۵۔ صفحہ ۵۹۴۔

(۴۶) آزاد بلگرامی: "خزانۂ عامرہ"، ایضاً۔ صفحہ ۹۵ اور ۳۱۸۔

(۴۷) خلیق انجم (مرتب): "غالب کے خطوط"، جلد چہارم، دہلی، ۱۹۹۳۔ صفحہ ۱۵۴۴۔

(۴۸) ملاحظہ کیجیے، خلیق انجم، ایضاً، جلد چہارم۔ صفحہ ۱۳۴۷ تا ۱۳۷۷۔ ایرانی استاد کے لیے دیکھیے خلیق انجم، ایضاً، جلد دوم۔ صفحہ ۷۴۳ اور جلد سوم صفحہ ۱۲۰۳۔

(۴۹) مثلاً ملاحظہ ہو، ایک فہرست اس طرح کے الفاظ کی جو نشتر جالندھری نے "ہمایوں"، لاہور، بابت مارچ ۱۹۳۲ء میں شائع کی۔ اسے "ابر"، بدایوں، نے اپنے جولائی دسمبر ۱۹۹۵ کے شمارے میں صفحہ ۷۲ سے ۷۷ تک شائع کیا۔ ماجد الباقری نے اس طرح کی کئی فہرستیں زمانۂ حال میں شائع کیں۔ مثلاً سالنامہ "تحریر"، کراچی، بابت ۱۹۹۵۔ صفحات ۱۷۱ تا ۱۸۲۔

(۵۰) بحوالہ اقبال انصاری: "مرزا غالب کی بے احتیاطیاں"۔ یہ مضمون "زمانہ"، کانپور، کی اشاعت بابت جون ۱۹۳۱ میں پہلی بار چھپا اور اب خدا بخش لائبریری کی مرتب کردہ "زمانہ کی غالبیات" میں پھر چھپا

سب- پٹنہ، ۱۹۹۳ء - صفحہ ۱۱۹-

(۵۱) خلیق انجم: ایضاً، جلد چہارم - صفحہ ۱۳۷۶

(۵۲) بہار عجم، از ٹیک چند بہار، جلد دوم، دہلی، ۱۸۶۶ء - صفحہ ۳۵۶-

(۵۳) خلیق انجم، ایضاً - جلد دوم - صفحہ ۵۸۷-

(۵۴) بحوالہ اقبال انصاری، ایضاً - صفحہ ۱۱۷-

(۵۵) ملاحظہ ہو غلام ربانی عزیز کی تحریر نیاز فتح پوری کی "مالہ و علیہ" میں، لکھنؤ، ۱۹۳۹ء - صفحہ ۱۳۳ تا ۱۵۰-

(بہ شکریہ ماہنامہ "شب خون" الہ آباد، شمارہ ۲۱۰)

اُدے پرکاش

ہندی کے معروف ادیب اور شاعر اُدے پرکاش ۱۹۵۲ میں چھتیس گڑھ انچل کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے جواہرلال نہرو یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کی۔ آج کل ٹائمز آف انڈیا پبلی کیشنز کے ہندی رسالے "دِنمان" کے ادارتی عملے میں شامل ہیں۔ انھیں ۱۹۸۱ میں نظم "تبت" پر بھارت بھوشن اگروال ایوارڈ اور کہانیوں کے مجموعے "دریائی گھوڑا" پر اوم پرکاش ایوارڈ دیا گیا۔ ان کی کہانیوں کے دو اور مجموعے "ترچھ" اور "اور انت میں پرارتھنا" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ نظموں کے مجموعے "سنو کاریگر" اور "ابوتر کبوتر" ہیں۔

آج کے شمارہ ۱۸ (ہندی کہانیاں) میں اُدے پرکاش کی دو کہانیاں "رام سجیون کی پریم کہانی" اور "ترچھ" شائع ہو چکی ہیں۔ علاوہ ازیں شمارہ ۱۹ میں ان کی نظموں کا ایک انتخاب بھی پیش کیا گیا تھا۔ ان کی طویل کہانی "اور انت میں پرارتھنا" شمارہ ۲۲ میں شائع ہوئی تھی۔

آئندہ صفحات میں اُدے پرکاش کی دو کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں جن کا ترجمہ اس شمارے کے لیے خاص طور پر کیا گیا۔

وِجے دان دیتھا

وِجے دان دیتھا راجستھانی زبان کے معروف ادیب ہیں اور ہندی میں بھی ان کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ موجودہ شمارے میں صفحہ ۱۵۳ سے ۱۹۳ تک ان کی طویل کہانی "آدم زاد" کا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے قبل "آج" کے شمارہ ۳ (گرما ۱۹۹۰) میں وِجے دان دیتھا کی کہانی "کُھلتے جنتر" کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

Scanned with CamScanner

اُدے پرکاش

ہندی سے ترجمہ: اجمل کمال

چھپن تولے کا کردھن

رات گھر میں اندھیرا بہت ہوتا تھا۔ دوسرے گھروں سے کہیں زیادہ۔ دیواریں پوری طرح اُس میں ڈوب جاتیں۔ ہَوا بہت بھاری اور گاڑھی ہو جاتی، جس میں کئی طرح کی گندھ گھلی ہوتی۔ کئی بار مجھے لگتا، اس میں کیوڑے کی گندھ ہے، جبکہ آس پاس کہیں بھی، پورے گاؤں میں، کیوڑا نہیں تھا۔ کبھی اس میں ہمارے گاؤں کے باہر کے مچھلیوں سے بھرے تالاب کے پانی کی گندھ ہوتی۔ مچھلیوں کے پسینے سے ہمارے پھیپھڑے بھر جاتے، سانسیں بھاری ہو جاتیں اور ہم ہر جگہ نمی محسوس کرتے۔

اور، ایسا بھی کبھی کبھی ہوتا کہ ہوا میں کسی سڑتی ہوئی چیز کی بُو ایک باریک اور مہین پرت کی طرح سارے گھر میں پھیل جاتی۔ اِس بُو کے پھیلتے ہی یہاں سے وہاں تک ایک نہ دکھائی دینے والے ڈر کی پرچھائیں بھی پسر جاتی۔ اماں کہتیں، "لگتا ہے کہیں کوئی چوہا مر گیا ہے۔" اُن کی آواز میں بے یقینی اور ڈر ایک ساتھ ہوتے۔ پھر وہ دھیرے سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہتیں، "منا، جا کر اندھیاری کوٹھری میں دیکھنا تو، دادی کیا کر رہی ہیں۔"

میں جان جاتا کہ اماں کے بھیتر اُس سڑتی ہوئی بُو کے ساتھ چھایا ہوا ڈر بیٹھ گیا ہے اور انھیں دادی کے بارے میں تشویش ہو رہی ہے۔ ہم سب دادی کو اکثر بھول جاتے تھے اور کبھی کبھی تو مہینوں انھیں نہیں دیکھتے تھے۔ نہ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے کہیں ہوتیں، نہ ہماری یادداشت

Scanned with CamScanner

میں ان کا کوئی وجود رہتا۔

جس کوٹھری میں دادی شیشم کی ایک پرانی کھاٹ پر سوئی رہتی تھیں، اس کوٹھری کا نام اندھیاری کوٹھری رکھ دیا گیا تھا۔ وہ ایک بہت چھوٹا، تنگ اور زمین میں دھنسا ہوا اندھیرا کمرہ تھا جس میں ایک بھی کھڑکی نہیں تھی۔ صرف ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جس کی چوکھٹ اتنی نیچی تھی کہ لگ بھگ بیٹھ کر اس دروازے سے کمرے میں اترنا پڑتا تھا۔ کمرے کا فرش زمین کی سطح سے کم سے کم ڈیڑھ ہتھ نیچے تھا۔ وہاں ہمیشہ اندھیرا ہوتا تھا، دن میں بھی۔ دادی کئی دنوں بعد، یا کبھی کبھی کئی مہینوں بعد، اس کمرے سے باہر نکلتی تھیں۔ وہ شاید کمرے ہی میں کسی کونے میں پیشاب کرتی تھیں کیوں کہ اندھیاری کوٹھری کی بند گاڑھی ہوا میں امونیا کی تیکھی گندھ موجود ہوتی۔ دادی کے شریر سے بھی ایسی ہی گندھ آتی تھی۔

مجھے پورا یقین تھا کہ دادی کمرے کے اندھیرے میں ساری چیزیں صاف صاف دیکھ لیتی ہیں۔ ایک دو بار جب اماں نے سڑتی ہوئی بو سے ڈر کر مجھے دادی کو دیکھنے بھیجا تھا اور جب میں نے اندھیاری کوٹھری اندر جھانک کر دیکھا تو وہاں اندھیرے میں، جدھر دادی کی کھاٹ تھی، ادھر دو جلتی ہوئی کنجی آنکھیں دکھی تھیں۔ اندھیرے میں بلی کی آنکھیں بھی اسی طرح جلتی ہیں۔ میں جب پکارتا، 'دادی، او دادی!' تو کراہتی ہوئی 'ہوں' کی آواز انھیں آنکھوں میں سے آتی۔ میں فوراً اندھیرے میں سے دوڑتا ہوا لوٹتا اور زور سے کہتا، "اماں، دادی تو زندہ ہیں،" تو اماں زوروں سے ڈانٹتیں۔ اگر میں یہ کہتا کہ "اماں، دادی تو نہیں سڑ رہیں، یہ بدبو کسی اور مری ہوئی چیز کی ہے،" شاید تب بھی اماں ڈانٹتیں۔ اس لیے پچھلے کچھ دنوں سے، جب بھی گھر میں رات والی بو پھیلتی اور اماں ڈر کر مجھے اندھیاری کوٹھری میں بھیجتیں، میں جھانکتا دوڑتا ہوا آتا اور گاتا ہوا بتاتا، "دادی ہو ہیں، ہوں!"

لیکن رات میں بلی سے مجھے بہت ڈر لگتا تھا۔ خاص طور سے اس بلی سے جو صرف رات میں آتی، چھپر سے اترتی، پورے گھر میں گھومتی اور کبھی کبھی ہماری کھاٹ کے نیچے بیٹھ جاتی۔ اس کی آنکھیں بھی کنجی اور جلتی آنکھیں تھیں۔ ان کے بھیتر سے ایک مدھم نیلی پیلی روشنی نکلتی رہتی تھی۔ جتنا گاڑھا اندھیرا ہوتا، اتنی ہی صاف وہ چمکتی آنکھیں ہوتیں۔ بلی رات میں ولاپ کرتی اور تب مجھے محسوس ہونے لگتا کہ وہ بلی اور کوئی نہیں، دادی ہی ہے۔ شاید یہی روپ دھار کر وہ سارے

Scanned with CamScanner

گھر میں ڈھو لیتی تھیں۔ ہمارے گاؤں کی عورتیں ایسے کئی قصّے سناتیں جن میں ہوتا کہ کچھ عورتیں جادو ٹونہ سدھ کر کے کسی بھی چیز میں اپنے آپ کو بدل لیتی ہیں۔ ایسی جادوئی عورتوں کو ڈوتنی کہا جاتا اور بلّی اُن کا سب سے پسندیدہ روپ ہوتی تھی کیوں کہ بلّی اندھیرے میں بھی دیکھ سکتی تھی۔

لیکن اُن دنوں دادی ہی نہیں، ہر عورت میرے لیے اچنبھا ہوتی۔ میں لگاتار شک کرتا۔ اس فراق میں رہتا کہ جب یہ عورت کسی اَور چیز میں بدل رہی ہو تب میں اسے ہوتے ہوئے دیکھ لوں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہو پایا۔ دادی بھی کب بلّی میں بدلتیں، میں جان نہ پاتا۔

چاچی، جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اُن کے دل کی جگہ پر لکڑی کا چوکور ٹکڑا لگا ہے جسے نصوں نے چاچا کے بھاگ جانے اور اپنے بچے نہ ہونے پر لگوا رکھا ہے، بہت سخت تھیں۔ وہ گالیاں بھی دے لیتی تھیں۔ انھوں نے ایک بار بتلایا تھا کہ کئی سال پہلے، جب دادی جوان تھیں اور بہت سُندر تھیں، اُن کا میل جول گاؤں کی نائن کے ساتھ ہو گیا تھا۔ نائن ٹونا جانتی تھی اور اس سے تھوڑا بہت دادی نے بھی سیکھ لیا تھا۔ لیکن کسی کسی پر ٹونا اُلٹ بھی جاتا ہے۔ دادی کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ اُن کی سُندر دیہہ، دھوپ میں نکلتے ہی جس پر پھپھولے پڑ جاتے تھے اور جس سے گرمیوں کی رات میں بیلے کی گندھ اُٹھتی تھی، وہی شریر ٹونا اُلٹ جانے سے تانبئی اور پھر کتھئی ہو گیا تھا۔ اُن کے ایک کے بعد ایک، تیرہ بچے ہوئے تھے جن میں سے صرف پتاجی، جٹھی ڈیرہ والی بُوا اور چاچا زندہ بچے تھے۔ چاچی بتلاتی تھیں کہ دادی کا اَدھورا ٹونا ہی اُن کے بچوں کو کھا جاتا تھا۔ یہ دادی کے ٹونے ہی کا اثر تھا کہ پتاجی اور چاچا کبھی گھر میں نہیں ٹِک پاتے تھے۔

ہمارا گھر ایک کمزور، بیمار اور دھیرے دھیرے ختم ہوتا ہوا گھر تھا۔ چھپّر کی ہر لکڑی میں، ہر مِیار، نیم اور شہتیر میں گھُن کے کیڑے لگے تھے جو دن بھر سفید بُرادہ نیچے گراتے رہتے تھے۔ دن بھر میں ہر چیز پر، ہر جگہ برادہ جم جاتا۔ شام کو اماں جھاڑو لگاتیں تو آنگن کے کونے میں بُرادے، گرد اور دیمک کے چُورے کا ڈھیر اکٹھا ہو جاتا۔

اماں اس بات کو جانتی تھیں کہ گھر کی دیواریں بیشتر بیشتر کھوکھلی ہو چکی ہیں اور وہاں پر ایک دوسرا ہی جیون اور سنسار چل رہا ہے۔ یہ سنسار چوہوں، کئی رنگوں کے عجیب کیڑوں اور ایسے جانداروں کا سنسار تھا جنھیں ہم کبھی نہیں دیکھ پاتے تھے۔ وہاں کا اپنا الگ ہی نیتم رہا ہوگا۔ ہمارا باہر کا سنسار، اُس دوسرے سنسار کے لیے کھاد اور ہوا کی طرح تھا۔ ہم سب گھر کے ختم

ہونے کے بارے میں جانتے تھے۔ یہ کسی بھی اچانک چک سکتی تھی۔ رات میں، جب ہر جگہ بالکل سناٹا ہوتا اور جھینگروں کے چیخنے کی بساندھ سے بھری بھاری ہوا میں گھر ڈوب جاتا تو دیوار کے بھیتر کے سنسار کی کچھ عجیب سی باریک آواز سنائی دینے لگتی۔ لگتا وہاں کسی دور کی اجنبی اور انجانی بھاشا میں کوئی دھیرے دھیرے پھسپھسا کر بات کر رہا ہے۔ یہ باتیں ہمارے اپنے سنسار کی تقدیر اور موت کے بارے میں ہوتیں۔ کسی چیزوں کے ٹوٹنے اور بنائے جانے کی کھٹ پٹ سنائی دیتی۔ وہاں کچھ نیا رچا اور گڑھا جا رہا تھا۔ کبھی لگتا کہ گھر کی ساری دیواروں کے کھوکھل میں، یہاں سے لے کر وہاں تک، ایک بہت بڑا اژدگر سویا ہوا ہے جس کی تپتی ہوئی، بھاپ سے بھری سانس ہماری سانسوں اور سپنوں تک پہنچ رہی ہے۔

میں بلی، دادی اور ٹونے ہی سے نہیں، گھر کی دیواروں سے بھی ڈرتا تھا۔ مجھے وشواس تھا کہ اگر کان لگا کر میں دیواروں کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں تو اس دوسرے سنسار کا بہت سارا بھید میرے سامنے کھل جائے گا۔ لیکن ایسا سوچتے ہی میرا دل زوروں سے دھڑکنے لگتا۔ میں اس عجیب، انجانی اور ان دیکھی بھاشا کو سن سکنے کی ہمت ہی اپنے اندر پیدا نہ کر پاتا جو دوسرے سنسار کی بھاشا تھی۔ مجھے لگتا کہ اگر اس بھاشا کا کوئی شبد میں نے سن لیا اور اگر میں اس کا مطلب سمجھ گیا تو میں زندہ بالکل نہیں بچوں گا۔

لیکن دادی کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ نہ صرف یہ بھاشا جانتی ہیں بلکہ اس سنسار میں بہت کچھ انھیں کے اشارے پر ہو رہا ہے۔ ہمارے گھر کو تنگی کی طرف لے جانے والی ہر مصیبت اور ہر حادثے کے نہ دکھائی دینے والے دھاگے انھیں کے ہاتھ کی انگلیوں میں بندھے ہیں۔ اپنی اندھیاری کوٹھری میں مہینوں تک دن رات آخر وہ کیا کرتی رہتی ہیں؟ دادی ہمارے گھر کی دشمن تھیں۔ یہ انھیں بھی پتا تھا، ہمیں تو خیر تھا ہی۔ وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ وہ اپنے (میرے پتا) کے سوا ان کی بات کوئی اور نہیں سمجھ پاتا۔ وہ اسّی سال کی ہو چکی تھیں اور اپنے ساتھ ساتھ ہمارے گھر کو بھی ختم کر ڈالنے کے کسی کھیل یا جادو میں مصروف تھیں۔ اس جادو کے اثر سے ہمارا گھر بھی اسّی سال کا ہو چکا تھا اور ہم سب محسوس کرتے تھے کہ ہمارے پھیپھڑے اور ہڈیاں اسّی سال پرانی ہیں۔ ہم ختم ہونے سے بچنا چاہتے تھے۔

دادی دن بھر میں صرف ایک بار کھانا کھاتی تھیں۔ صبح کا [illegible]

تھا، اُسی میں دال بھات، چٹنی، سوکھی مرچ ڈال دی جاتی اور امّاں اسے اندھیاری کوٹھری کی ڈیوڑھی پر رکھ آتی تھیں۔ کئی کئی بار تو کئی دنوں تک ہر روز سکّونا جوں کا توں بھرا ہوا لوٹ آتا، پھر اس کھانے کو کوئی نہیں کھاتا تھا۔ کئی بار لوگ دادی کے بارے میں بالکل بھول جاتے۔ ان کا کہیں ذکر نہ ہوتا۔ ایسا مہینوں ہوا کرتا۔ پھر کسی دن ہم دیکھتے کہ آنگن کے کونے میں، جہاں امّاں گھر بھر کے کوڑے کا ڈھیر اکٹھا کرتی تھیں، دادی اُسی ڈھیر کے اوپر، سفید میلی دھوتی میں، اپنی ہتھیلیوں میں اپنا ماتھا تھامے بیٹھی ہوئی ہیں۔ چاچی انھیں دیکھتے ہی کہتیں، "نکلی ہے آج بڑھیا پھر سے۔ گھر میں ضرور کوئی نہ کوئی بیمار پڑے گا۔"

دادی کے باہر نکلتے ہی پورے گھر میں ایک عجیب سی تیزی اور ہلچل پیدا ہو جاتی۔ چاچی لگاتار بڑبڑاتیں۔ بُوا دادی کی بغل سے دھم دھم پیر پٹختی ہوئی نکلتیں۔ امّاں سارے گھر میں جھاڑو لگانے لگتیں اور پرانے چیتھڑے، ٹوٹی پھوٹی چیزیں باہر آنگن میں پھینکنے لگتیں۔ ہر کوئی دادی کو نہ دیکھنے کا ڈھونگ کرتا۔ لیکن میں اچھی طرح سے جانتا تھا کہ پورا گھر دادی کے باہر نکلنے کے کارن ہی پانی بھرے کٹورے کی طرح بھیتر سے ہل اُٹھا ہے۔ دادی کے کارن ہی ہر کوئی بے چین ہو گیا ہے۔ بُوا، چاچی اور امّاں کی آوازیں تیز ہو اُٹھی ہیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ دادی کے لیے سب کی دشمنی اور نفرت کا ہی بدلا روپ ہے۔ دادی کے باہر نکلتے ہی پورا گھر کسی ناؤ کی طرح ڈگمگا اٹھتا اور دادی کے خلاف کسی فوج کی طرح اکٹھا ہو جاتا۔

دادی اُسی کوڑے کے ڈھیر پر بوری بچھا کر بیٹھی رہتیں۔ کبھی کبھی کوئی تھیلی سیتی ہوئی دکھتی۔ ایک بار میں نے دیکھا تھا کہ مجھے اپنی طرف تاکتے ہوئے پا کر دادی کے چہرے کی ساری جھرّیاں اچانک سمٹ کر ایک بہت ہی لاچار ہنسی میں بدل گئی تھیں۔ انھوں نے اشارے سے مجھے بُلایا تھا۔ یہ باہر کے سنسار کی جانب دادی کی پہلی اور اکیلی جنبش تھی۔ شاید وہ سوئی میں دھاگا نہیں ڈال پا رہی تھیں، اس لیے۔ لیکن میں ان کے پاس نہیں گیا کیوں کہ مجھے ڈر تھا کہ دادی کہیں میرے شریر میں چپکے سے اپنا ٹونے والا بال نہ چپکا دیں۔ چاچی نے ایک بار بتلایا تھا کہ ٹونے والی عورتیں کبھی کبھی بچوں کے شریر پر اپنا ایک بال چپکا دیتی ہیں۔ پھر بعد میں اُس بال کو ٹونے سے واپس بلا کر جب وہ اسے دودھ بھرے کٹورے میں ڈالتی ہیں تو پورا دودھ خون ہو جاتا ہے۔ یہ سارا خون اُسی بچے کا ہوتا ہے جسے ٹونے والا بال چوس کر اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ میں اس لیے ڈرا۔

Scanned with CamScanner

کہیں میرے ساتھ بھی ایسا ہوا تو میرا شریر کاغذ جیسا سفید ہو جائے گا۔

دادی کسی بوڑھے گدھ کی طرح دکھائی دیتیں جس کے سر اور گردن کے سارے روئیں جھڑ جاتے ہیں اور یک بہ یک، بیمار، جھریوں بھری گردن اور ننگی کھوپڑی ہی رہ جاتی ہے۔ اس کھوپڑی کے اندر کا دماغ اپنے آخری سے کی ساری آوازوں کو دھیرے دھیرے سنتا رہتا ہے۔ مجھے دادی پر ترس بھی آتا، لیکن وہ ہماری دشمن تھیں کیوں کہ ان کے پاس ایک چھٹنی تولے کا سونے کا کردھن تھا جسے انھوں نے گھر میں کہیں، فرش میں، دیوار میں یا پچھواڑے کے کنویں کے پاس یا پھر آس پاس کے کسی پیڑ کے نیچے گاڑ کر چھپا دیا تھا۔

رات میں جب گھر کا سارا کام نبٹ جاتا تو لالٹین کے پاس چاچی، بوا اور اماں بیٹھ جاتیں۔ گھر میں وہی اکیلی لالٹین تھی۔ ماں سب کے کھا چکنے کے بعد برتن وغیرہ دھونے کے کام سے ہٹ کر کھاتی تھیں۔ اپنا کھانا لے کر وہ لالٹین کے پاس بیٹھ جاتیں۔ روٹی کے ہر کور کو وہ دیر تک دیکھتیں، پھر اس میں سے ہر بار کوئی نہ کوئی چیز کھوج کر باہر کرتیں اور دیر تک اسے دھیرے دھیرے چباتی رہتیں۔ ان کا بولنا اس بیچ جاری رہتا۔ بوا کی شادی اڑیسہ کے پاس کسی قصبہ میں ہوئی تھی اور ایک ہی سال میں پھوپھا کی موت کے بعد وہ واپس ہمارے گھر لوٹ آئی تھیں۔ تب سے، دس سال سے، وہ اسی گھر میں تھیں۔ وہ ہر بات کو اچرج کے ساتھ بولتی تھیں، اسی لیے ان کی آنکھیں ہمیشہ پھٹی ہوئی رہتیں۔ انھیں دیکھ کر لگتا کہ سارا سنسار ان کے لیے اچرج بھرا ہے، ہر چیز عجیب ہے۔

چاچی کا قد بہت چھوٹا اور شریر بہت دبلا تھا۔ ان کی عمر پچاس کے آس پاس تھی اور ابھی تک ان کی کوکھ کالی تھی۔ انھوں نے اپنے دل کی جگہ پر لکڑی کا چوکور ٹکڑا لگوا رکھا تھا، اس لیے وہ کٹھور تھیں۔ انھوں نے ایک بار میری بانہہ پر گرم کرچھل داغ دی تھی جس پر اماں کے ساتھ ان کی خوب لڑائی ہوئی تھی۔ شاید اسی دن اماں نے لکڑی کے چوکور ٹکڑے والی بات مجھے بتائی تھی۔

لالٹین کی مٹیالی دھندلی روشنی پورے گھر کے اندھیرے کو ڈھکتے ہوئے بہت کم ہوتی تھی۔ رات میں گھر کی بہت ساری چیزیں بھاری ہوا، پراسرار گندھوں اور اجنبی سرسراہٹوں میں ڈوب جاتیں۔ دیواروں کے کھوکھل کا سنسار ہی اٹھتا اور ہوا کی ان دیکھی ہلچلوں کی آہٹ ہم تک پہنچتی۔ ہم سب لالٹین کے پاس سمٹے بیٹھے رہتے۔ وہ باتیں جو اماں، بوا اور چاچی کے بیچ ہوتیں، ان

Scanned with CamScanner

کا کوئی انت نہ تھا اور وہ کسی بہت بڑی کہانی کے مکالموں کی طرح لگتیں۔ میں چپ چاپ انھیں سنتا رہتا اور سوچتا کہ بڑا ہو کے پر میں اس گھر پر ضرور کہانی لکھوں گا۔

اماں کے منہ میں نوالہ بھرا ہوتا، چہرہ لالٹین کی دھندلی روشنی میں بہت پُر نا، جرجر اور بیمار لگتا اور وہ کہتیں، "اگر ماں جی (دادی) کردھن دے دیں تو یہ گھر اب بھی بچ سکتا ہے۔" چاچی کہتیں، "میری بات گانٹھ باندھ لو، بڑھیا جب مرے گی تو اس کی آنت سے کردھن نکلے گا۔ جیتے جی وہ بتانے سے رہی۔" اماں کا چہرہ کالا پڑ جاتا۔ "بھگوان کسی کو ایسی مایا کا روگ نہ دے کہ وہ کسی کا نہ رہ جائے۔" بُوا کثر چپ رہتیں۔ مجھے تعجب ہوتا کہ دادی اُن کی ماں تھیں۔ لگتا کہ دادی سب کو بھول چکی تھیں ــــ بُوا، راے اور چاچا کو بھی۔ یہ پورا سنسار ان کے لیے اجنبی اور نامعلوم تھا۔ اب شاید انھیں صرف دیور کے بستر والے سنسار کی جادو بھاشا آتی تھی۔ ہماری بھاشا وہ بھول گئی تھیں اس لیے کوئی ان کی بات نہیں سمجھ پاتا تھا۔

صرف پتاجی ایسے تھے کہ جب وہ تین چار مہینے بعد کلکتے سے لوٹ کر آتے تو ہر بار پہلے دن ایک دو گھنٹے دادی کی اندھیاری کوٹھری میں ضرور بیٹھتے۔ وہ دادی سے باتیں کرتے۔ دادی ان کی ماں تھیں۔ انھوں نے ہی پتاجی کو جنم دیا تھا۔

وہ بچپن توتے کا کردھن داداجی لے کر آئے تھے۔ داداجی ہمارے گھر کی کہانی کے نایک تھے۔ انھوں نے سارے سنسار کی یاترا کی تھی اور بڑے بڑے کارنامے کیے تھے۔ مجھے لگتا پوری دنیا اُن کے بارے میں جانتی ہوگی۔ اُن کی ایک دھندلی سی تصویر اماں کی کوٹھری میں ٹنگی ہوئی تھی۔ وہ اکیلی تصویر تھی جو نمی اور سمے کے اثر سے کانچ کے ساتھ چپک کر دھیرے دھیرے گل رہی تھی۔ داداجی کے سر پر مراٹھی پگڑی تھی، ہاتھوں میں بندوق تھمی ہوئی تھی اور بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔

لالٹین کی روشنی میں جب بھی سونے کے کردھن کا ذکر ہوتا، داداجی کی بھی کہانی شروع ہو جاتی۔ اماں بتاتیں کہ دادا کو چڑیاں پالنے کا بڑا شوق تھا۔ گاؤں کے تالاب کی ہر بطخ سے ان کی پہچان تھی اور دادا ہر بطخ کو اس کے الگ نام سے بلاتے تھے۔ کئی کو وہ اپنے ساتھ اپنے گھر لے آتے۔ پھر تو سارے گھر میں بطخیں ہی بطخیں ہوتیں۔ ہر جگہ۔ بڑی آفت ہوتی۔ دادا کو پتا رہتا تھا کہ جنگل کے کس پیڑ کی کس ڈال پر کون سی چڑیا کے بچے کتنے بڑے ہو گئے ہیں۔ وہ صرف بطخوں

جی سے نہیں، کوّوں اور نیولوں سے بھی بات چیت کر سکتے تھے۔ وہ کئی بار چیونٹیوں سے پوچھ کر بالکل صحیح صحیح بتا دیتے کہ پانی برسے گا یا نہیں۔

گاؤں کے اُسی تالاب میں جس میں دادا کی ساری بطخیں، پن ڈُبیاں، پچھے، مشاور، ٹٹہری، بگلے اور جانے کون کون سی چڑیاں رہتی تھیں، انگریز افسر اپنی گوری میم کے ساتھ آ کر بارہ بور کے چھرّے سے بطخوں کو مار کر لے جاتا تھا۔ دادا کبھی کبھی اُداس ہو کر تالاب سے لوٹتے اور بُدبُداتے، آج گورے نے سوہن، ساونت اور ڈوبی کو مار ڈالا۔"

ماں بتاتی ہیں کہ ایک شام دادا آنگن میں کھاٹ پر لیٹے ہوئے چپ چاپ آکاش میں ابھی ابھی اُبھرتے ہرن گرا، دھروو اور شکوا تاروں کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک شام کا نارنجی نیلا آسمان چڑیوں سے بھر گیا۔ سارے سنسار کی چڑیاں وہاں آکاش میں پاگل ہو کر چیخ رہی تھیں۔ دادا کے پیر پر ایک مرغابی گری۔ وہ خون سے تر تھی، سارے شریر میں چھرّے تھے اور گردن آدھی کٹ چکی تھی۔ دادا نے اپنی بندوق کی نال صاف کی، اُس میں کارتوس بھرے، سر پر پگڑی رکھی اور تالاب کی طرف چلے گئے۔

اس کے بعد کہتے ہیں دادا نے تالاب کی دوسری مینڈھ پر کھڑے ہو کر انگریز افسر سے کہا کہ اس تالاب میں چڑیاں مارنا جُرم ہے۔ ساری چڑیاں میری گھریلو اور پالتو ہیں اور تم آج کے بعد سے شکار کھیلنے کے لیے اس تالاب میں مت آنا۔ اُس دن انگریز افسر اکیلا تھا، اس لیے وہ چپ چاپ اپنی میم کے ساتھ چلا گیا۔ لیکن دوسرے دن دادا کے سارے کھیت قرق کر لیے گئے، جانور ہانک لے جائے گئے اور ہمارے گاؤں کو باغی گاؤں قرار دے دیا گیا۔

اب انگریز افسر ہر روز شام کو آتا، تالاب میں بارہ بور کے چھرّوں سے چڑیوں کو مارتا۔ دادا آنگن کی کھاٹ میں لیٹ کر چپ چاپ دیکھتے کہ آکاش چڑیوں سے بھر گیا ہے، لہولہان مرغابیاں، گھایل بطخیں، چیختی ہوئی ٹٹہریاں اور ڈرے ہوئے بگلے۔ ماں بتاتی ہیں کہ جس روز اُس انگریز افسر نے غصے میں پاگل ہو کر دھائیں دھائیں تالاب کی بطخوں پر بندوق داغی تھی، وہ وہی دن تھا جب پنجاب کے جلیاں والا باغ میں گولی چلی تھی

ایک دن دادا نے پھر اپنی بندوق صاف کی اور تالاب کی دوسری مینڈھ پر لگے آم کے پیڑ کی ڈال پر پتوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ انگریز افسر اپنی میم اور کارندوں کے ساتھ آیا تھا۔ وہ سامنے کی

منڈھیر پر آم کی ڈال پر سے مچان پر بیٹھا تھا۔ دادا نے چلا کر دوسری منڈھیر سے آواز دی، "آج سے سب بند لاٹ صاحب، میں تالاب کا مالک، اور چڑیوں کا مالک، تمہیں حکم دیتا ہوں..." لیکن دادا تو آم کے پیڑ میں چھپے ہوئے تھے۔ نہ انھیں انگریز افسر دیکھ پایا نہ اُس کے کارندے۔ سب نے سمجھا اُن کے بھیتر کا ڈر بول رہا ہے۔ انگریز کو غصہ بھی آیا۔ انگریز اُس وقت سارے ہندوستان کے راجا تھے اور یہاں ایک بلغ مارنے پردادا کی آواز مخالفت میں اُٹھ رہی تھی۔

انگریز افسر نے مچان سے مرغابیوں کے جھنڈ پر نشانہ لگایا۔ دھائیں! بندوق چلی اور کارندوں نے دیکھا کہ پورا آسمان چیختی ہوئی چڑیوں سے بھر گیا۔ لیکن تبھی انھوں نے دیکھا کہ اس بار اوپر سے مری ہوئی مرغابی نہیں گری، گری انگریز افسر کی لاش۔

دراصل دو بندوقوں کے گھوڑے یک ساتھ دبے تھے۔ دادا پرلی والی منڈھیر کے نیچے اُترے، اپنی بندوق کی نال کا دھواں صاف کیا، چڑیوں کی اور دیکھ کر مسکرائے، پھر ہاتھ ہلایا اور فرار ہو گئے۔ اماں بتلاتی ہیں کہ پھر پچیس سال تک دادا کا کہیں پتا ہی نہیں چلا۔ کوئی کہتا وہ سادھو ہو گئے ہیں، کوئی کہتا ڈاکو۔ زمین ساری قرق ہو گئی تھی۔ کھانے کے لالے پڑے تھے۔ دادی گھر میں اکیلی تینوں بچوں، یعنی پتاجی، چاچا اور بُوا، کو پالتی رہیں۔ اُس زمانے میں دادا کے بارے میں ہزاروں قصے گھر گھر چلتے کہ دادا جرمنی گئے، پھر روس گئے۔ سمندر میں تیر کر انگریزوں کے جہاز کے پیندے میں چھید کر دیا۔ ٹرین میں ڈکیتی ڈالی۔ کوئی کہتا کہ مڈبھیڑ میں، انھیں مار ڈالا گیا، پھانسی دے دی گئی، کینسر سے مر گئے۔

لیکن دادا پچیسویں سال، برھسپتی وار کی شام، کارتک کے مہینے میں، دیپاولی سے ٹھیک ایک دن پہلے لوٹ آئے۔ وہ بالکل بوڑھے اور دُبلے ہو گئے تھے۔ چہرے پر سفید داڑھی تھی، سر گنجا ہو گیا تھا۔ اور کہتے ہیں، دیوالی کی رات انھوں نے دادی کو چھپن تولے کا کردھنی دیا تھا۔ سونے کا۔

اُسی سال آزادی ملی تھی، اُسی سال دادا لوٹے تھے، لیکن اُسی سال وہ بیمار ہو گئے تھے۔ کہتے ہیں، دادا جب مضبوط تھے تو ایک بار وہ چلتی ہوئی ریل کے انجن کو روک کر اُسے ٹھیلتے ہوئے ڈیڑھ میل تک پیچھے لے گئے تھے، لیکن آزادی کے بعد اُن سے اپنا ٹٹّی والا لوٹا بھی نہیں اٹھتا تھا۔ انھیں دمہ تھا اور وہ ہانپتے رہتے تھے۔ تب تک پتاجی، چاچا اور بُوا خوب بڑے ہو گئے تھے۔ بُوا کہتی ہیں کہ جس سال آزادی ملی، اُس سال سے وہ سارے لوگ بیمار ہو ہو کر مرنے لگے تھے جنھوں نے

Scanned with CamScanner

انگریزوں سے لڑائی لڑی تھی۔ دادا بھی اسّی سال مر گئے۔ آخری دنوں میں اُن کے منہ پر ڈھیر ساری مکھیاں بیٹھی رہتی تھیں اور دادا کا بوڑھا چہرہ گڑ کے ڈھیلے کی طرح چھپتا رہتا تھا۔ دادا بھی بوڑھے گدھ کی طرح لگتے تھے اور وہ چڑیوں کی بھاشا بھول گئے تھے۔ جس دن وہ گھر لوٹے تھے اُسی دن وہ تالاب گئے تھے، لیکن وہاں کسی بھی بطخ نے ان کو نہیں پہچانا تھا۔ ساری پرانی بطخیں ختم ہو چکی تھیں اور ان کی نئی پیڑھی کے لیے دادا بالکل اجنبی تھے۔ وہ بھیتر سے ٹوٹ گئے تھے۔ 'سب بدل گیا،' صرف اتنا انھوں نے کہا تھا۔ ان کا کانسی والا پیتل کا لوٹا اب بھی ہمارے گھر کی اٹاری میں تھا، جسے میں نہیں اُٹھا پاتا تھا۔

اماں، بُوا، چاچی سب کے چہرے لالٹین کی پیلی، بیمار روشنی میں دیمک لگی کسی پرانی کتاب کے پنّوں میں بنے دُھندلے چتروں کی طرح لگتے۔ مچھلیوں کے پسینے سے بھری بھیسر ہوائیں اُن کی آوازیں کچھ دیر تک تیرتیں، پھر سیگ کر کہیں گر جاتیں۔ ہم سب جانتے تھے کہ ہمارا گھر اب دھیرے دھیرے ڈھول میں بدل رہا ہے۔ اماں بھی ڈھول ہو رہی ہیں۔ پتاجی سال میں دو تین بار ہی آ پاتے۔ وہ کلکتے میں کسی مارواڑی سیٹھ کی کپڑے کی دکان کی منیمی کا کام کرتے تھے۔ چاچا پہلے آتے تھے لیکن پچھلے چار سال میں نہیں آئے تھے۔ کبھی کبھی اُن کا پچاس روپے کا منی آرڈر آ جاتا تھا۔

بُوا اور اماں ایک دن آپس میں بات کر رہی تھیں کہ چاچا نے گوہاٹی میں کسی آسامی کنبڑن کو رکھ لیا ہے۔ وہ بڑی خوب صورت ہے اور ٹونا جانتی ہے۔ چاچا جب بھی کبھی گھر لوٹنے کی بات سوچتے ہیں، وہ انھیں بیل بنا کر کھونٹے سے باندھ دیتی ہے۔ بُوا کہتیں کہ اگر چاچی نے بچے پیدا کیے ہوتے تو چاچا ضرور گھر آیا کرتے۔ مگر پتاجی آتے ہیں۔ پتاجی ایک بار مجھے اپنے ساتھ کلکتے لے جانے کی بات کہہ رہے تھے، لیکن وہاں اُن کے پاس جگہ ہی نہیں تھی۔ سیٹھ کی دکان ہی میں پچھلے بارہ سال سے سوتے تھے۔

پتاجی نے بھی دادی سے ایک بار چھپن تولے کے کردھن کے بارے میں پوچھا تھا تو دادی بہت دیر تک چپ رہی تھیں۔ پھر انھوں نے کہا تھا، 'راسے، جب تیرے پتا فرنگی کو مار کر فرار ہوئے تھے، تب میرے پاس دس تولے سونا تھا۔ میں نے اپنے تینوں بچوں کو کس کس طرح پالا پوسا، تم دونوں بھائیوں کو پڑھایا۔ چار تولہ بچا تھا، جسے میں نے دونوں بہوؤں میں برابر برابر

Scanned with CamScanner

باشا۔ اور تس پر بھی تم سب نے مل کر میرے ساتھ جو کیا ہے بیٹا، اُسے بھگوان ہی نہیں، سارا گاؤں دیکھ رہا ہوگا۔' دادی رونے لگی تھیں، پھر کہا تھا، 'ابھی تو بیٹا، بھودال بھات ڈیوڑھی پر رکھ جاتی ہے، کردھن میں نے دے دیا تو پھر کون سی آس رہ جائے گی؟ کردھن ہو کہ نہ ہو، وہ میرے لیے اور تم سب کی آس کے لیے ضروری ہے بیٹا۔'

چاچا اور پتاجی نے تمام گھر چھان مارا تھا۔ جیوتشیوں سے گپت دھن کے بارے میں جنم انگ دکھا کر کئی جگہ کھدائی کی تھی، کٹورا چلوایا تھا، لیکن دادی نے کردھن پتا نہیں کہاں چھپا رکھا تھا۔ ایک بار اماں نے سپنا دیکھا کہ کردھن آنگن میں تُلسی کے چبوترے کے بھیتر، اینٹوں کے بیچ، ایک کانسے کی ہنڈی میں رکھا ہے اور تین سفید سانپ اُس پر پہرہ دے رہے ہیں۔ تُلسی کا چبوترا توڑا گیا۔ ایک بار تیجے کے دن دادی کو کھاٹ سمیت آنگن میں لا کر ڈال دیا گیا۔ بُوا نے سرسوں کے تیل کی مالش کی۔ دادی کی کنگھی کر کے ان کا جُوڑا باندھا گیا۔ حلوا، کھیر، آلو گوبھی کی سبزی اور پوری بنا بنا کر اماں انھیں کھلاتی رہیں۔ اُنھیں پنکھا جھلا گیا۔ بُوا، چاچی اور اماں باتوں کے داؤ پیچ لگا کر دادی سے بھید پانے کے لیے جُوجھتی رہیں۔ اُدھر اسی بیچ اندھیاری کوٹھری کے فرش کو پتاجی سبّل سے جگہ جگہ کھودتے رہے، لیکن کردھن کہیں نہیں ملا۔

ایک بار دادی کو گری لگ گئی تھی۔ وہ کئی دنوں تک اندھیاری کوٹھری کے باہر نہیں نکلیں۔ بس، کراہتی رہتی تھیں۔ چاچی کے دل کی جگہ پر تو لکڑی کا چوکور ٹکڑا تھا، انھوں نے کہا، 'یہی وقت ہے۔ ابھی بُڑھیا بتا دے تو بتا دے، ورنہ پتا نہیں کب یہ سانس چھوڑ کر چل بسے۔' چاچی نے، کہتے ہیں، دادی کو بیماری میں بھی بہت ڈرایا دھمکایا۔ چھُرا چمکاتی رہیں۔ دادی کا گلا دبایا اور ناک اور منھ بند کر کے ان کی سانس بھی دیر تک روکی۔ سانس رُکنے سے دادی کا شریر غبارے کی طرح پھول گیا، لیکن انھوں نے تب بھی نہیں بتایا کہ کردھن کہاں ہے۔ ایک بار ایک مہینے تک دادی کو اَن کا ایک دانہ بھی نہیں دیا گیا۔ اماں، چاچی اور بُوا، اندھیاری کوٹھری کی چوکھٹ کے پاس کھڑی ہو کر دادی کو سُنا کر کہتیں کہ اب تو گھر کی اینٹ بیچنے تک کی نوبت آ گئی ہے۔ کسی کے پیٹ میں دانہ نہیں ہے۔ رامے نے پیسہ دینا بند کر دیا ہے۔ کوئی سونا لے کر سورگ نہیں جا سکتا۔ راستے ہی میں یم دوت چھین کر بھینس کے پیٹ میں ڈال دیتے ہیں یا وہ یہاں رہ جاتا ہے۔ ایسا سونا جس کے رہتے بچے بھوکا مر جائے، وہ گُو ہو جاتا ہے۔ دیمک اُسے کھا جاتے ہیں۔

پتا نہیں دادی یہ سب سنتی بھی تھیں یا نہیں۔ وہ ہماری دشمن تھیں۔ پتاجی کبھی کبھی غصے میں اماں سے کہتے، "تم سب لوگوں نے ماں جی کو دشمن بنایا ہے۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ اگر میں بوڑھا اور بیمار ہو گیا تو اس گھر میں میرے ساتھ کیا کیا جائے گا۔ میں ابھی سے بتا دوں کہ میرے پاس نہیں ہے کوئی دھن۔ اپنا خون بیچ کر میں تم سب کو پال رہا ہوں۔ مجھ پر رحم کرنا۔" ایک دن پتاجی نے کہا تھا، "کوئی کُردھن وردھن نہیں ہے کہیں۔ سب گڑھنت ہے۔ میرے پتا (دادا جی) کہیں رنگون جرمنی نہیں گئے۔ پتا چلتا ہے وہ کلکتے میں اینٹ کے بھٹے میں کام کرتے تھے۔ ماں تو جنم سے تمباکو کھاتی تھیں۔ لت ایسی چیز ہوتی ہے کہ اگر کُردھن ہوتا تو سونا بیچ کر وہ تمباکو منگواتیں۔ سب جھوٹ ہے، کوئی کُردھن نہیں ہے کہیں۔"

اماں اُس رات دیر تک روتی رہیں۔ پھر وہ کئی دنوں تک لگاتار روئیں۔ کھانا بناتے، برتن دھوتے، جھاڑو لگاتے۔ وہ ڈر گئی تھیں۔ ہمارا گھر اگر ریت ہونے سے، ختم ہونے سے بچ سکتا تھا تو صرف چھپن تولے کے کُردھن کے کرشمے سے ہی بچ سکتا تھا۔ پتاجی کا شریر بھی جواب دینے لگ گیا تھا۔ اگر کُردھن نہ ہوتا تو برسوں کی دھول اور گرد، گھُن کے کیڑے اور دیواروں کی کھوکھل کا جادوئی سنسار ہمارے گھر کو کسی پرانے مٹی کے ٹیلے میں بدل دیتے، جس کے بھیتر ہم سب کی ہڈیاں دبی ہوتیں۔ ہمارا آنے والا وقت بھی۔

اُس بار جب پتاجی نے کہا تھا کہ کُردھن کی بات گڑھنت ہے تو پچیس دنوں تک اماں روتی رہیں، پچیس دنوں تک چاچی نے دادی کے کھانے میں دھول اور مٹی ڈالی۔ پتاجی اُسی رات کلکتے لوٹ گئے تھے اور پھر پچیس راتوں تک گھر میں کوئلے سے بھی زیادہ کالا اور گاڑھا اندھیرا بھر گیا تھا۔ لالٹین بھبھک کر بجھ جاتی تھی۔ ہوا میں کسی مری ہوئی چیز کی سڑتی بدبو ہمیشہ موجود رہتی۔ اماں نے ایک دن مجھے اندھیاری کوٹھری میں جھانکنے کے لیے بھیجا تو میں نے دیکھا کہ وہاں دادی کی کنجی آنکھیں جل رہی تھیں اور وہ کراہ رہی تھیں۔ وہاں پیشاب کی گندھ بھری ہوئی تھی۔ ڈیوڑھی پر جستے کا وہی پچکا پچکا بھگونا رکھا تھا جس میں دال بھات تھا اور جس پر چاچی مٹی اور دھول ڈال گئی تھیں۔ ایک خوفناک یُدھ چھڑا ہوا تھا ہمارے گھر میں۔ دادی ایک طرف تھیں اور پورا گھر دوسری طرف تھا۔ میں کدھر تھا، ٹھیک پتا نہیں۔

کالی بلی ساری رات گھر میں ہر کونے میں گھومتی۔ دن بھر چھپر سے گھُن کے کیڑے گرتے

Scanned with CamScanner

کا بُرادہ نیچے گراتے رہتے اور گھر کی ہر چیز دُھول اور بُرادے سے ڈھک جاتی۔ ہم سو کر اٹھتے تو چادر پر، ہمارے بالوں اور ہونٹوں پر بُرادہ جما ہوتا۔ اماں، بُوا، چاچی، سب دن میں کئی بار جھاڑو لگاتیں۔ آنگن کے کونے میں دُھول، بُرادے اور اینٹوں کے چُورے کا خوب اونچا ڈھیر اکٹھا ہو جاتا پھر ایک دن دادا کی تصویر اماں کی کوٹھری سے اپنے آپ گر گئی اور سب نے ڈر اور تعجب سے دیکھا کہ فریم کے بھیتر دادا کا چہرہ نہیں تھا۔ وہاں کئی چھوٹے بڑے کیڑے تھے۔ اُن کی پیٹھ چمکیلے، سنہرے رنگ کی تھی۔ وہ تصویر کا لکڑی کا فریم بھی کھا چکے تھے۔ الماری میں میں نے دیکھا کہ دادا کا لوٹا غائب تھا۔

گاؤں کی عورتیں کہتیں کہ بُڑھیا کو اس کے بیٹے بیٹی اور بہوؤں نے رورَو نرک میں ڈال رکھا ہے۔ بھگوان کسی کو ایسا بڑھاپا دکھنے سے پہلے ہی اٹھا لے۔

مجھے بہت پہلے کی دادی کی ایک دوسری بات بھی یاد تھی۔ تب ہمارے گھر میں یہ لڑائی اتنی تیز نہیں چھڑی تھی اور تب دادی بھی اتنی بوڑھی نہیں ہوئی تھیں۔ انھوں نے ایک دن اپنی تھیلی سے نکال کر مجھے ایک کاغذ کا پھولوں والا ہاتھی دیا تھا اور ایک ربر کی گیند۔ دادی بھجن بھی گاتی تھیں، جس کو سمجھنا مشکل تھا: "ہائے دِت رام۔ ۔ ہائے دِت رام۔۔۔" لیکن یہ یاد بہت دور کی تھی۔ وہ آج والی دادی سے نہیں جُڑتی تھی۔ اب دادی مجھ کو پہچاننا بھول چکی تھیں۔ شاید انھوں نے مجھے بھی دشمن مان کر اپنی یاد سے باہر نکال پھینکا تھا۔ وہ ہر کسی کو بھول گئی تھیں۔ اس سنسار کی بھاشا بھی۔

پہلے دادی چاول بالکل نہیں کھاتی تھیں۔ وہ اُتر والے دیش کی تھیں۔ دادو کے لیے چاول بنتا، تب بھی وہ اپنے لیے روٹی الگ سے بناتی تھیں۔ لیکن میں نے جب بھی بھگونا دیکھا تھا، اُس میں بھات ہی دیکھا تھا۔ اُن کا تمباکو بھی بند ہو چکا تھا۔ اُن کی پسند کی کوئی بھی چیز اب سنسار میں نہیں بچی تھی۔ اگر کہیں تھی بھی تو دادی اُسے پا نہیں سکتی تھیں۔ یُدھ میں سب جائز ہوتا ہے۔ دادی پر ہر ہتھیار آزمایا جا رہا تھا۔ دادی بھی اپنے ٹونے سے، اپنے شراپ سے، ہمارے گھر کو ختم کرنے میں لگی تھیں۔ کبھی کبھی لگنے لگتا کہ جب دادی کی ہار ہو جائے گی اور وہ چھپن تولے کا سونے کا کردھن نکال کر آنگن میں پھینک دیں گی، اِس یُدھ کا فیصلہ ہو جائے گا، لیکن پھر لگنے لگتا کہ دادی تو جیت رہی ہیں۔ ہمارے گھر کو بھیتر بھیتر سے انھوں نے بالکل جرجر اور کھوکھلا کر ڈالا تھا

Scanned with CamScanner

اندھیرا، بلی، ہوا، گھن کے کیڑوں، چوہوں، بیماریوں اور بری خبروں کی ان کی فوج بڑی مستعدی سے اپنی لڑائی میں مشغول تھی۔ پھوپھا مر گئے تھے، چاچا کو آسیب گیرن نے بیل بنا کر کھونٹے سے باندھ رکھا تھا، پتاجی مہینوں گھر نہیں آ پاتے تھے، چاچی بانجھ رہ گئی تھیں، پانی نہیں برستا تھا۔ ہمارے چاروں کھیت بک چکے تھے۔ پچھواڑے کی آخری زمین گروی رکھی تھی۔ دادا کا پیتل والا لوٹا بیچ ڈالا گیا تھا اور ان کی تصویر کو چمکیلے کیڑے کھا گئے تھے۔ دادی یدھ جیت رہی تھیں۔

اس دن، شام کو دادی اندھیاری کوٹھری سے باہر نکلیں۔ انھیں دس دن سے چاچی نے کھانا نہیں دیا تھا۔ وہ دی کسی بیمار نیکن چلتے پھرتے کنکال کی طرح دکھائی دے رہی تھیں اور ان کے شریر سے پیشاب کی گندھ نکل رہی تھی۔ وہ کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھ گئی تھیں، بیمار بوری بچھائے۔ ان کی کھوپڑی ننگی تھی۔ اس پر بال نہیں رہ گئے تھے۔ اس کے نیچے ایک لمبی سی پتلی گردن، جس پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھیں گڈھے میں دھنسی ہوئی تھیں اور وہ باہر کی اور نہیں، اندر دیکھتی لگ رہی تھیں۔

پتلی گردن پر رکھی دادی کی ننگی کھوپڑی کانپ رہی تھی اور ان کی آنکھوں کے گڈھے سے پانی نکل رہا تھا۔ ان کا پورا شریر کانپ رہا تھا۔ ہاتھ ہوا میں پتے کی طرح ہل رہے تھے۔

میں نے دیکھا، ماں ان کو دیکھ کر ڈر گئیں۔ پھر انھوں نے اَمّاں سے کہا، "ماں کو لگتا ہے ملیریا ہو گیا ہے۔ ان کو کپکپی چڑھ رہی ہے۔" اَمّاں نے بھی رسوئی کی کھڑکی سے دادی کو دیکھا۔ آنگن کے کونے میں کوڑے کے ڈھیر پر کسی بوڑھے اور بیمار گدھ کی طرح بیٹھی دادی بخار میں گا رہی تھیں، "ہائے دت رام... ہائے دت رام..."

چاچی نے کہا، "اب بڑھیا بچے گی نہیں۔ عقل سے کام لو، نہیں سب چوپٹ ہو جائے گا۔ یہ آخری موقع ہے۔ بڑھیا نے اگر اب دے دیا تو دے دیا، ورنہ سمجھو یہ گھر ختم۔" میں نے دیکھا، چاچی دادی کے پاس گئیں، انھیں کوڑے کے ڈھیر سے اٹھایا، بانہہ پکڑ کر۔ دادی کی پتلی بانہوں میں صرف ہڈیاں تھیں جن کے اوپر بہت پرانی، چمکیلی پپڑیوں اور جھریوں سے بھری پتلی کھال چڑھی ہوئی تھی۔ وہ لگاتار گائے جا رہی تھیں، ہائے دت رام... ہائے دت رام...

چاچی ان کے کان میں سٹ کر زور زور سے بول رہی تھیں، "او ماں جی، میٹھ جی (میرے پتا) کا تار آیا ہے کہ وہ بہت بیمار ہیں۔ ان کے پیٹ میں ڈیڑھ سیر کی پتھری پڑ گئی ہے۔

Scanned with CamScanner

آپریشن کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ ماں جی، بتا دو کردھن کہاں رکھا ہے، نہیں تو جیٹھ جی مر جائیں گے۔' پھر اماں بھی وہاں آ گئیں۔ انھوں نے بھی دادی کو پکڑ لیا تھا۔ وہ بھی دادی کے کان میں چلا رہی تھیں، "ماں جی، رامے اب بچیں گے نہیں۔ منا کو بھی بیماری ہو گئی ہے۔ وہ بھی نہیں بچے گا۔ کردھن دے دو۔"

لیکن صاف لگ رہا تھا کہ دادی اِس سنسار کی بھاشا بھول چکی ہیں۔ اُن کی ننگی کھوپڑی ہل رہی تھی، گڑھے میں دھنسی آنکھوں سے پانی نکل رہا تھا، ہاتھ سوکھے پتوں کی طرح ہل رہے تھے اور پوپلے منھ سے وہ لگاتار گائے جا رہی تھیں: "ہائے دت رام... ہائے دِت رام۔' انھیں سکتہ ہو گیا تھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھیں۔

تبھی چاچی چلائیں، "بہن جی، ذرا نیچے دیکھنا۔ لگتا ہے ماں جی کو دست لگ رہا ہے۔' سچ مچ دادی کے نیچے کی میلی دھوتی دست سے لتھڑ گئی تھی اور پیلے رنگ کا مل آنگن میں پھیل رہا تھا۔ پیشاب کی تیز گندھ ان کے شریر سے اٹھ رہی تھی۔ پورا گھر مل اور پیشاب کی بدبو سے بھر گیا تھا۔ مجھے اُلٹی آ رہی تھی۔ دادی کا کنکال دست سے لتھڑا، بخار میں کانپ رہا تھا۔ 'ہائے دِت رام... ہائے دِت رام..."

بُوا بالٹی میں پانی بھر کر لائیں اور چاچی نے پورا پانی دادی کے سر میں اُنڈیل دیا۔ دادی کی نٹ میلی دھوتی اِن کے کنکال سے چپک گئی تھی۔ آنگن میں پانی، دست اور پیشاب کا کیچڑ ہو گیا تھا۔ بدبو اور تیز ہو گئی تھی۔ چاچی اُن کے کان میں چلا رہی تھیں، 'ماں جی، سنائی دیتا ہے؟ جیٹھ جی اب بچیں گے نہیں۔ منا بھی مر رہا ہے۔ اب نکال دو۔ دے بھی دو۔ او ماں جی...'

دوسری بالٹی، تیسری بالٹی، پھر چوتھی۔ بالٹی کا پانی بھی دادی کے سر پر انڈیلا گیا۔ لگا ان کے کنکال کا بلن کچھ تھما ہے۔ اُن کی گردن لڑھک رہی تھی۔ گانا بند ہو گیا تھا۔ انھیں اماں اور چاچی سنبھالتی ہوئی اندھیاری کوٹھری میں لے گئیں لیکن وہاں کسی سے رہا نہیں گیا۔ وہاں بھی دست اور پیشاب کی تیز بدبو تھی۔

چاچی نے کہا، 'بڑھیا اپنے آپ کپڑے بدل لے گی۔ دیکھا نہیں بہن جی، اُس کی باڑھ میں اب بھی کتنا زور ہے۔ دو جنوں کے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ بڑھیا امر گھٹی پی کر آئی ہے، اتنی آسانی سے جائے گی نہیں۔' بُوا کا چہرہ پہلی بار میں نے دکھی اور سیاہ دیکھا۔ مگر مجھ کو تو اس

Scanned with CamScanner

بار کچھ دوسری ہی بات لگتی ہے۔ ماں نے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔

اُس رات کالی تلی نہیں دِکھی۔ لالٹین سے زیادہ اُجالا پھوٹ رہا تھا۔ ہوا میں نہ تو بدبو تھی نہ بھینسوں کے پسینے کی بس اندھ۔ بلکہ ایک دو بار تو مجھے لگا کہ اس میں بیلے کی مہک گھلی ہوئی ہے۔ وہ ایک ٹھیک ٹھاک اور کاغذ کی طرح ہلکی رات تھی۔ مجھے خوب گہری نیند آئی۔ دیوروں کے جھینگر کا سنسار بھی آج سو گیا تھا۔ اماں، بُوا اور چاچی باتیں کرتی رہ گئی تھیں اور میں سو گیا تھا۔

سویرے چاچی آنگن میں دوڑتی ہوئی آئیں۔ اُن کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آنگن کے بیچ کھڑی ہو کر انھوں نے اماں کو آواز دی، "بہن جی، جلدی نکلو۔ ماں جی نہیں رہیں۔ میں نے اندھیاری کوٹھری جھانک لی۔"

اماں برتن چھوڑ کر آنگن میں نکل آئیں۔ انھوں نے چولھے میں پانی ڈال دیا تھا۔ پھر بُوا کے رونے کی آواز اٹھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہ تینوں ایک سُر میں رو رہی تھیں۔ کسی سنگیت کی طرح۔ پھر گاؤں کی عورتیں آنے لگیں۔ آنگن بھر گیا۔ پورے گھر میں عورتوں کے رونے کی آواز بھر گئی تھی۔ میں رو رہا تھا اور چپکے چپکے یہ بھی تاڑ رہا تھا کہ اتنی عورتوں میں سے کوئی عورت کسی اور چیز میں اپنے آپ کو بدلتی ہے یا نہیں۔ میری ہمت اندھیاری کوٹھری کی اور جانے کی نہیں ہو رہی تھی۔ حالاں کہ میں ایک بار چوکھٹ سے جھانک کر اندر دیکھنا چاہتا تھا۔ کیا پتا اب بھی وہاں دادی کی کیسی آنکھیں جل رہی ہوں اور میں پوچھوں تو وہ غرّا کر بولیں، "ہُوں ں ں ں!" میں جستے کے اُس کٹورے کو بھی ایک بار دیکھنا چاہتا تھا جس میں دادی کو کھانا جاتا تھا اور جس میں چاچی ڈھول اور مٹی ڈال دیتی تھیں۔

دوپہر تک دادی کو تالاب کے کنارے پر جلا دیا گیا۔ اُس رات پھر اندھیرا زیادہ گہرا نہیں تھا۔ کیوڑے کی مہک بھی ہوا میں تھی۔ دیوار کے جھینگر کا جگر بھاپ جیسی سانس نہیں چھوڑ رہا تھا۔ لیکن مجھے ایک آدھ بار ایسا بھرم ضرور ہوا تھا کہ وہاں سے دادی کے گانے کی دھیمی اور بہت باریک آواز آ رہی تھی: "ہائے دِت رام ... ہائے دت رام۔"

ساتویں دن پتاجی آ گئے۔ چاچا کو بھی تار دیا گیا تھا۔ لیکن نہ تو اُن کا جواب آیا نہ وہ آئے۔ انھیں تو اسپیہ کنیز جن نے بیل بنا رکھا تھا۔

جس دن دادی کا دسواں ہوا، اُسی شام پتاجی اندھیاری کوٹھری میں گھسے تھے۔ دادی کی چھوٹی

Scanned with CamScanner

کُٹھری میں جو چیزیں تھیں، انھیں اب پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ چار پانچ سوکھے ہوئے کالے مرودوں کے ساتھ ایک لکڑی کی کالی گوند بھی تھی جو کئی برس پہلے ربڑ کی رہی ہوگی۔ ایک تھیلی میں کاٹھ کا ایک چھوٹا سا گھوڑا تھا، پہیوں والا، جو اب کوئلے میں بدل چکا تھا۔ ایک پوٹلی میں گڑ کے دو ڈھیلے تھے جو مٹی ہو چکے تھے۔ باقی پھٹے ہوئے کپڑے چیتھڑے تھے۔ یہ دادی کا کل اسباب تھا۔

چاچی نے اندھیاری کوٹھری میں اچھی طرح سے جھاڑو لگا دی تھی۔ دادی کی کھاٹ کو تالاب میں پھینک دیا گیا تھا جہاں سے ڈوم اسے نکال کر لے گیا ہوگا۔ پتاجی سبل سے اندھیاری کوٹھری کا فرش اور دیواریں کھود رہے تھے۔ اماں لکشمی سہسر ستوتر کا جاپ کر رہی تھیں جس سے گردھن مل جائے۔ بُوا تسلے میں اندھیاری کوٹھری سے مٹی نکال نکال کر باہر پھینک رہی تھیں۔ پورے گھر میں اجوائن اور دھوپ جلائی گئی تھی۔ چاچی نے مجھے گود میں اٹھا لیا تھا۔ "اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گھر کا دوکھ پاپ چلا گیا۔ دیکھنا ابھی گردھن مل جائے گا۔"

یعنی اب دادی کا جادو ختم ہونے والا تھا۔ دادی مر چکی تھیں اور اب ہماری جیت ہونے والی تھی۔ اب ہمارا گھر دھول میں نہیں بدلے گا۔ ساری چیزیں بدل دی جائیں گی۔ دیواروں کے کھوکھل میں سیمنٹ گارا بھر دیا جائے گا۔ چاروں کھیت واپس لوٹ آئیں گے۔ پتاجی مارواڑی سیٹھ کی منیمی چھوڑ دیں گے اور گھر میں رہیں گے۔ پچھواڑے کی زمین پھر ہماری ہو جائے گی، چاچا گوہاٹی سے لوٹ آئیں گے اور اسیہ کنیزمن ہمارے گھر کا پانی برتن کرے گی، کھیتوں میں کام کرے گی، میں اسکول جانے لگوں گا، اماں کی بیماری ٹھیک ہو جائے گی، ہواؤں سے کیوڑے کی مہک آئے گی اور ہمارے گھر میں کئی لالٹینیں ہوں گی، ٹارچ بھی ہوگی...

اماں زور زور سے پاٹھ کر رہی تھیں۔ بُوا تسلے میں مٹی اور ڈھیلے اندھیاری کوٹھری سے نکال نکال کر باہر پھینک رہی تھیں۔ وہاں پر مٹی کا ڈھیر لگتا جا رہا تھا۔ رات ہو رہی تھی۔ چاچی میرے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے کب نیند آ گئی، پتا نہیں چلا۔

آدھی رات کو شور اور رونے دھونے کی آوازوں سے میری نیند اچانک کھلی۔ اماں، بُوا رو رہی تھیں، زور زور سے۔ لالٹین آنگن کے بیچ میں رکھی تھی اور اس کی مٹیالی روشنی میں آنگن میں چاروں اور ریت، ڈھیلے اور مٹی کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔ پرلی طرف پتاجی کا شریر بل رہا تھا۔ اُن کے ہاتھ میں کدال تھی۔ وہ اندھیاری کوٹھری کا فرش اور دیواریں کھود چکے تھے اور اب

Scanned with CamScanner

اُس طرف سے گھر کو کھودتے ہوئے آگے بڑھتے آ رہے تھے۔ کسی وِناش کاری پریت کی طرح۔ دھپ، دھپ... ان کی کدال چل رہی تھی۔ میں ڈر گیا۔ پتاجی کو اس طرح میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ مٹی اور دُھول میں لت پت ہوئے تھے۔ ہر بار ان کے گلے سے ہونکار کی آواز نکلتی اور کدال نیچے گرتی۔

میں ڈر گیا تھا اور رونے لگا تھا۔ چاچی نے دھیرے سے کہا، 'پتا نہیں جیٹھ جی کے دماغ کو اچانک کیا ہو گیا۔ بڑھیا نے ضرور اندھیاری کوٹھری میں کوئی ٹونا ٹوٹکا کر رکھا تھا۔ جب سے وہ کوٹھری سے باہر نکلے ہیں، ان کی آنکھیں لال ہیں اور دماغ سنک گیا ہے۔ ہے بھگوان! اب تمہیں رکشک ہو۔'

پتاجی گھر کو کھودتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ لالٹین بھبھک رہی تھی۔ ہوا میں کسی مری ہوئی چیز کی سڑی بد بو تھی۔ دیوار کے بھیتر سے سنسار سے پُراسرار آوازیں اٹھنے لگی تھیں۔ وہاں تیزی سے کھٹ پٹ ہو رہی تھی۔ کچھ چیزیں گر رہی اور کچھ ٹوٹتی جا رہی تھیں۔

میں نے دیکھا کہ چھپر سے گھُن کے کیڑوں نے اتنا بُرادہ گرایا تھا کہ میری چادر، بال، بھنویں ڈھک گئی تھیں۔ چاچی، بُوا، اماں، سب بُرادے سے ڈھک گئے تھے۔ گھر کے فرش پر دُھول اور بُرادہ جمع ہوتا جا رہا تھا۔ لالٹین بھبھک کر بجھ گئی تھی اور جدھر اندھیاری کوٹھری تھی، جدھر سے پتاجی گھر کو توڑتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے، اُدھر اندھیرے میں دو کنجی آنکھیں جل رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد کالی بلی پورے گھر میں گھومنے لگی۔ اماں اور بُوا کے رونے کے ساتھ بیچ بیچ میں وہ بھی وِلاپ کرنے لگتی تھی۔

**

Scanned with CamScanner

اُدے پرکاش

ہندی سے ترجمہ: عبدالعظیم سوہرہ

ٹیپچو

یہاں جو کچھ لکھا ہوا ہے، وہ کہانی نہیں ہے۔ کبھی کبھی سچائی کہانی سے بھی زیادہ حیرت ناک ہوتی ہے۔ ٹیپچو کے بارے میں سب کچھ جان لینے کے بعد آپ کو بھی ایسا ہی لگے گا۔

ٹیپچو کو میں بہت قریب سے جانتا ہوں۔ ہمارا گاؤں مڈز سون ندی کے کنارے ایک دو فرلانگ کے فاصلے پر بسا ہوا ہے۔ دوری شاید کچھ اور کم ہو، کیوں کہ گاؤں کی عورتیں صبح کھیتوں میں جانے سے پہلے اور شام کو وہاں سے لوٹنے کے بعد سون ندی ہی سے گھریلو کام کاج کے لیے پانی بھرتی ہیں۔ یہ عورتیں کچھ ایسی عورتیں ہیں جنھیں میں نے تھکتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا ہے۔ وہ لگاتار کام کرتی جاتی ہیں۔

گاؤں کے لوگ سون ندی ہی میں ڈبکیاں لگا لگا کر نہاتے ہیں۔ ڈبکیاں لگا پانے لائق پانی کھرا کرنے کے لیے ندی کے اندر کوئیاں کھودنی پڑتی ہیں۔ ندی کی بہتی ہوئی دھار کے نیچے بالو کو انجولیوں سے سرکا دیا جائے تو کوئیاں بن جاتی ہیں۔ گرمی کے دنوں میں پانی اتنا کم ہوتا ہے کہ بنا کوئیاں بنائے آدمی کا دھڑ بھی نہیں بھیگتا۔ یہی سون ندی بہار پہنچتے پہنچتے کتنی بڑی ہو گئی ہے، اس کا اندازہ آپ ہمارے گاؤں کے گھاٹ پر کھڑے ہو کر نہیں لگا سکتے۔

ہمارے گاؤں میں دس گیارہ سال پہلے ابی نام کا ایک مسلمان رہتا تھا۔ گاؤں کے باہر جہاں

Scanned with CamScanner

چماروں کی بستی ہے۔ اس سے کچھ ہٹ کر تین چار گھر مسلمانوں کے تھے۔ مسلمان مرغیاں بکریاں پالتے تھے۔ لوگ انھیں چکوا یا کٹوا کہتے تھے۔ وہ بکرے بکریوں کے گوشت کا دھندا بھی کرتے تھے۔ تھوڑی بہت زمین بھی ان کے پاس ہوتی تھی۔

ابی آوارہ اور پھکڑ قسم کا آدمی تھا۔ اس نے دو دو عورتوں کے ساتھ شادی کر رکھی تھی۔ بعد میں ایک عورت، جو خوب صورت تھی، قصبے کے درزی کے گھر جا کر بیٹھ گئی۔ ابی نے غم نہیں کیا۔ پنچایت نے درزی کو جتنی رقم بھرنے کو کہا، اس نے بھر دی۔ ابی نے ان روپیوں سے کچھ دنوں عیش کیا اور پھر ایک ہارمونیم خرید لیا۔ ابی جب بھی ہاٹ جاتا، اس درزی کے گھر رکتا۔ کھاتا پیتا، جشن مناتا، اپنی پرانی بیوی کو پھسلا کر کچھ روپے اینٹھتا اور پھر خریداری کر کے گھر لوٹ جاتا۔

کہتے ہیں ابی خوب صورت تھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی لونائی تھی۔ دبلا پتلا تھا۔ بچپن میں بیمار رہنے اور بعد میں کھانا پینا ٹھیک نہ رکھنے کی وجہ سے اس کا رنگ ہلکا سا ہلدیا ہو گیا تھا۔ وہ گورا دکھتا تھا۔ لگتا تھا، جیسے اس کے بدن نے کبھی کچھ نہ کھایا ہو۔ اندھیرے میں دھوپ اور ہوا سے دور اگنے والے گیہوں کے پیلے پودے کی طرح اس کا رنگ تھا۔ پھر بھی اس میں جانے کیا گن تھا کہ لڑکیاں اس پر فدا ہو جاتی تھیں۔ شاید اس کا ایک سبب یہ رہا ہو کہ دور دراز شہر میں چلنے والے فیشن گاؤں میں اس کی وجہ سے پہنچتے تھے۔ جیسے لنگی، دھوپ چشمہ، جو باہر سے آئینے کی طرح چمکتا تھا لیکن اندر سے آر پار دکھائی دیتا تھا، تولیے جیسے کپڑے کی نمبردار ہیلی بنیان، پنجابی کرتا، ربر کا ہنٹر وغیرہ ایسی چیزیں تھیں، جو ابی شہر سے گاؤں لایا تھا۔

جب سے ابی نے ہارمونیم خریدا تھا، تب سے وہ دن رات چیں پوں چیں پوں کرتا رہتا تھا۔ اس کی جیب میں ایک ایک آنے میں بکنے والی فلمی گانوں کی کتابیں ہوتیں۔ اس نے شہر میں قوالوں کو دیکھا تھا اور اس کی دلی خواہش تھی کہ وہ قوال بن جائے، لیکن جی توڑ کوشش کرنے کے بعد بھی "ہمیں تو لوٹ لیا مل کے حسن والوں نے" کے علاوہ اور کوئی قوالی اسے یاد ہی نہیں ہوئی۔

بعد میں ابی نے اپنی داڑھی مونچھ بالکل صفاچٹ کر دی اور بال بڑھا لیے۔ چہرے پر مرادشکو پوتنے لگا۔ گاؤں میں دھوبی کا لڑکا جیاون اس کے ساتھ ساتھ ڈھول لینے لگا اور دونوں گاؤں گاؤں جا کر گانا بجانا کرنے لگے۔ ابی اس کام کو آرٹ کہتا تھا، لیکن گاؤں کے لوگ کہتے تھے، "مسرا، بھڑوئی کر رہا ہے۔" ابی اتنی کمائی کر لیتا تھا کہ اس کی بیوی کھا پی سکے۔

Scanned with CamScanner

ٹیپو اسی ابی کا لڑکا تھا۔

ٹیپو جب دو سال کا تھا، تبھی ابی کی اچانک موت ہو گئی۔

ابی کی موت بڑی بڑے عجیب و غریب واقعے میں ہوئی۔ آشاڑھ کے دن تھے۔ سون ندی اُمڈ رہی تھی۔ سفید جھاگ اور لکڑی کے سڑے ہوئے ٹکڑے پتھرے دھار میں اتر رہے تھے۔ پانی مٹیلا ہو گیا تھا، چائے کے رنگ جیسا، اور اس میں گہرا کائی، گھاس پھوس بہہ رہے تھے۔ یہ بڑھ جانے والا تھا۔ ابی اور جیاون کو جلدی تھی، اس لیے وہ باڑھ سے پہلے ندی پار کر لینا چاہتے تھے۔ جب تک وہ پار جانے کا فیصلہ کریں اور پانی میں پاؤں دیں تب تک سون میں کمر تک پانی ہو گیا تھا۔ جہاں کہیں گاؤں کے لوگوں نے کوئیاں کھودی تھیں، وہاں چھاتی تک پانی پہنچ گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ جیاون اور ابی بہت اطمینان سے ندی پار کر رہے تھے۔ ندی کے دوسرے تٹ پر گاؤں کی عورتیں کھڑی دیکھ رہی تھیں۔ ابی انہیں دیکھ کر موج میں آ گیا۔ جیاون نے پردیسیا کی لمبی تان کھینچی۔ ابی بھی سر ملانے لگا۔ گیت کچھ گدگدی والا تھا۔ عورتیں خوش تھیں اور کھلکھلا رہی تھیں۔ ابی کچھ مستی میں آ گیا۔ جیاون کے گلے میں گنگوچھے سے بندھا ہارمونیم جھول رہا تھا۔ ابی نے ہارمونیم اس سے لے کر اپنے گلے میں اٹھا لیا اور رس دار سالہو گانے لگا۔ دوسرے کنارے پر کھڑی ہوئی عورتیں کھلکھلا رہی تھیں کہ اس کے گلے سے چیخ نکل گئی۔ جیاون ہکا بکا ہو کر کھڑا ہی رہ گیا۔ ابی کا پیر شاید دھوکے سے کسی کوئیاں یا گڈھے میں پڑ گیا تھا۔ اس بیچ دھار میں گر پڑا۔ گلے میں لٹکے ہوئے ہارمونیم نے اس کو ہاتھ پیر مارنے کا موقع نہ دیا۔ ہوا یہ تھا کہ ابی کسی فلم میں دیکھی ہوئی وجینتی مالا کی اداکاری کی نقل اتارنے میں لگا ہوا تھا اور اس اداکاری کے دوران اس کا پیر کسی کوئیاں میں پڑ گیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ندی میں کچھ "چور بالو" بھی ہوتا ہے۔ اوپر اوپر دیکھنے پر ریت کی سطح برابر لگتی ہے، لیکن اس کے نیچے اتل گہرائی ہوتی ہے۔ پیر رکھتے ہی آدمی اس میں سما سکتا ہے۔

ابی کی لاش اور ہارمونیم دونوں کو ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی گئی۔ ملاحا جیسا مشہور ملاح غوطے لگاتا رہا، لیکن سب بیکار۔ کچھ پتا ہی نہیں چلا۔

ابی کی عورت فیروزہ جوان تھی۔ ابی کے مر جانے کے بعد فیروزہ کے سر پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ وہ گھر گھر جا کر دال چاول پھٹکنے لگی۔ کھیتوں میں مزدوری شروع کی۔ جیسے [illegible]

نگرانی کا کام کرنا شروع کیا، تب کہیں جا کر دو روٹی مل پاتی۔ دن بھر وہ ڈھینکی کوٹتی، سون ندی سے مٹکے بھر بھر کر پانی ڈھوتی، گھر کا سارا کام کاج کرنا پڑتا، رات کھیتوں کی نگرانی میں نکل ہوتی۔ گھر میں ایک بکری تھی، جس کی دیکھ بھال بھی اسے ہی کرنی پڑتی۔ اتنے سارے کاموں کے دوران ٹیپچو اس کے پیٹ پر ایک پرانی ساڑی میں بندھا جو چمگادڑ کی طرح جھولتا رہتا تھا۔

فیروزہ کو اکیلا جان کر گاؤں کے کئی کھاتے پیتے گھرانوں کے چھوکروں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی، لیکن ٹیپچو ہر وقت اپنی ماں کے پاس کوچ کی طرح ہوتا۔ دوسری بات، یہ اتنا گھناؤنا تھا کہ فیروزہ کی جوانی پر گوبر کی طرح لتھڑا ہو لگتا تھا — پتلے پتلے سوکھے ہوئے جھری دار ہاتھ پیر، کدو کی طرح پھولا ہوا پیٹ، پھوڑوں سے بھرا ہوا بدن۔ لوگ ٹیپچو کے مرنے کا انتظار کرتے رہے۔ ایک سال گزرتے گزرتے ہاڑ توڑ محنت نے فیروزہ کی دیہہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ بوڑھا گئی۔ اس کے بال الجھے ہوئے، سوکھے اور گندے رہتے۔ کپڑوں سے بدبو آتی۔ بدن پسینے اور گرد سے چیکٹ رہا کرتا۔ وہ لگاتار کام کرتی رہی۔ لوگوں کو اس سے گھن ہونے لگی۔

ٹیپچو جب سات آٹھ سال کا ہوا، گاؤں کے لوگوں کی دلچسپی اس میں پیدا ہوئی۔

ہمارے گاؤں کے باہر دور تک پھیلے دھان کے کھیتوں کے پار آم کا ایک گھنا باغ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سنبھرانتی کسان گھرانوں، ٹھاکروں برہمنوں کی لڑکیاں اس باغ کے اندھیرے کونوں میں اپنے اپنے یاروں سے ملتیں۔ ہر تیسرے چوتھے سال اس بغیچے کے کسی کونے میں علی الصباح کوئی نوزائیدہ بچہ روتا ہوا لاوارث مل جاتا تھا۔ اس طرح کے زیادہ تر بچے سندر اور گورے ہوا کرتے تھے۔ چھوٹا گاؤں کے باسی کول گونڈوں کے بچے وہ نہیں کہے جاسکتے تھے۔ ہر بار پولیس آتی۔ داروغہ ٹھاکر صاحب کے گھر میں بیٹھا رہتا۔ پوری پولیس پلٹن کا کھانا وہاں پکتا۔ مرغ گاؤں سے پکڑوا لیے جاتے۔ شراب آتی۔ شام کو پان چباتے، مسکراتے اور گاؤں کی لڑکیوں سے چہل بازی کرتے پولیس والے لوٹ جایا کرتے۔ معاملہ ہمیشہ رفع دفع ہو جاتا تھا۔

اس بغیچے کا پرانا نام کھیاجی کا بغیچا تھا۔ برسوں پہلے چودھری بال کرشن سنگھ نے یہ باغیچہ لگایا تھا۔ منشا یہ تھی کہ خالی پڑی ہوئی سرکاری زمین کو دھیرے دھیرے اپنے قبضے میں کر لیا جائے۔ اب تو وہاں آم کے دو ڈھائی سو پیڑ تھے، لیکن اس بغیچے کا نام اب بدل گیا تھا۔ اسے اب لوگ

Scanned with CamScanner

بھُوتی بغیچہ کہتے تھے، کیوں کہ مکھیا ہال کشن سنگھ کا بھوت اس میں بسنے لگا تھا۔ رات برات ادھر جانے والے لوگوں کی گھگھی بندھ جاتی تھی۔ ہال کشن سنگھ کے بڑے بیٹے چودھری کشن پال سنگھ ایک بار ادھر سے جا رہے تھے تو ان کو کسی عورت کے رونے کی آواز سنائی پڑی۔ جا کر دیکھا، جھاڑیوں، جھرمٹوں کو ٹٹولا، تو کچھ نہیں۔ ان کے سر تک کے بال کھڑے ہو گئے، دھوتی کا پھینٹا کھل گیا اور وہ "بھنوان، بھنوان" کرتے بھاگ کھڑے ہوئے۔

تب سے وہاں اکثر رات میں کسی عورت کے کراہنے یا رونے کی آواز سنی جانے لگی۔ دن میں جانوروں کی ہڈیوں، جبڑے یا چوڑیوں کے ٹکڑے وہاں بکھرے دکھائی دیتے۔ گاؤں کے کچھ لفنگوں کا کہنا تھا کہ اس بغیچے میں بھوت اُوت کچھ نہیں رہتا، یہ مکھیا کی طرف سے پھیلائی گئی افواہ ہے۔ سالے نے اس بغیچے کو عیش گاہ بنا رکھا ہے۔

یک بار میں پڑوس کے گاؤں میں شادی کی دعوت پر گیا تھا۔ لوٹتے ہوئے رات ہو گئی۔ بارہ بج گئے ہوں گے۔ سنگ میں رادھے، سنبھرو اور ہال دیو تھے۔ راستا بغیچے کے بیچ سے گزرتا تھا۔ ہم لوگوں نے ہاتھ میں ڈنڈا لے رکھا تھا۔ اچانک ایک طرف سے سوکھے پتوں کی چرمراہٹ سنائی پڑی۔ لگا، جیسے کوئی جنگلی سوز بے فکری سے پتوں کو روندتا ہوا ہماری سمت چلا آ رہا ہے۔ ہم پہلے رک کر آہٹ لینے لگے۔ گرمی کی رات تھی، جیٹھ کا مہینا۔ اچانک آواز جیسے ٹھٹھک گئی۔ سناٹا کھنچ گیا۔ ہم ٹوہ لینے لگے۔ اندر سے ڈر بھی لگ رہا تھا۔ ہال دیو آگے بڑھا، "کون ہے بے؟ چھوہ! چھوہ!" اس نے زمین پر لاٹھی پٹکی، حالاں کہ اس کی سیں ڈھیلی پڑ گئی تھیں۔ کہیں مکھیا کا جن ہوا تو؟ میں نے کسی طرح ہمت جٹائی، "ابے، ہو، ہو!" ہال دیو کو آگے بڑھتا دیکھ کر سنبھرو بھی تیز ہو گیا۔ پلٹوں کی طرح دائیں بائیں، اوپر نیچے لاٹھیاں چلاتا وہ اسی سمت لپکا۔

تبھی یک باریک سی آواز سنائی دی، "ہم ہَن بھیا، ہم۔"

"تو کون ہے بے؟" ہال دیو کڑکا۔

اندھیرے سے باہر نکل کر ٹیپو آیا، "کاکا ہم ہن، ٹیپو!" وہ بغیچے کے گھنے گھٹے اندھیرے میں دُھندھلا سا کھڑا تھا۔ ہاتھ میں تھیلا تھا۔ مجھے تعجب ہوا۔

"اتنی رات کو ادھر کیا کر رہا ہے بے کتوے؟"

Scanned with CamScanner

تھوڑی دیر ٹیپچو چپ رہا، پھر ڈرتا ہوا بولا، 'ماں کو لو لگ گئی ہے۔ دوپہر مکھیا کے کھیت کی نکوائی میں گئی تھی، گھام کھا گئی۔ اس نے کہا کہ کچی امیا کا پانی مل جائے تو جڑا جائے گی۔ بڑا تیز بخار تھا۔"

بھوت ڈائن کا ڈر نہیں لگا تجھے سوتے؟ کسی دن سالے کی لاش ملے گی کسی جھاڑ جھنکاڑ میں، رادھے نے کہا۔ ٹیپچو ہمارے ساتھ ہی گاؤں لوٹا۔ راستے بھر چپ چاپ چلتا رہا۔ جب اس کے گھر جانے والی گلی کا موڑ آیا تو بولا، 'کاکا، مکھیا سے مت کھولنا یہ بات، نہیں تو مار مار کر بھرتا بنا دے گا ہمیں۔'

ٹیپچو کی عمر اس وقت مشکل سے سات آٹھ سال کی رہی ہو گی۔

دوسری بار یوں ہوا کہ ٹیپچو اپنی امی فیروزہ سے لڑ کر گھر سے بھاگ گیا۔ فیروزہ نے اسے جلتی ہوئی چولہے کی لکڑی سے پیٹا تھا۔ ساری دوپہر، چلچلاتی دھوپ میں ٹیپچو جنگل میں ڈھور ڈنگروں کے ساتھ پھرتا رہا۔ پھر کسی پیڑ کے نیچے چھاؤں میں لیٹ گیا۔

نیند کھلی تو آنتوں میں خالی پن تھا۔ پیٹ میں ہلکی سی آنچ تھی، بھوک کی۔ بہت دیر تک وہ یوں ہی پڑا رہا، ٹکر ٹکر آسمان تاکتا۔ پھر بھوک کی آنچ میں جب کان کے لوے تک گرم ہونے لگے تو سست سا اٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا جگاڑ کیا جائے۔ اسے یاد آیا کہ سرئی کے پیڑوں کے پار جنگل کے بیچ ایک میدان ہے۔ وہیں پر پُرنیہا تالاب ہے۔

وہ تالاب پہنچا۔ اس تالاب میں دن میں گاؤں کی بھینسیں اور رات میں جنگلی سؤر لوٹا کرتے تھے۔ پانی سیاہ سبز سا دکھائی دے رہا تھا۔ پوری سطح پر کنول اور کوئی کے پھول اور پورئین پھیلے ہوئے تھے۔

کائی کی موٹی پرت بیچ میں تھی۔ ٹیپچو تالاب میں گھس گیا۔ ایک بتے میں ڈھیر سارے کنول گٹے اس نے کھسوٹ رکھے تھے۔ لوٹنے کے لیے مڑا تو تیرنے میں دقت ہونے لگی۔ جس راستے سے پانی کاٹتا ہوا وہ لوٹنا چاہتا تھا، وہاں پورئین کی گھنی نالیں آپس میں الجھی ہوئی تھیں۔ اس کا پیر نالوں میں الجھ گیا اور تالاب کے ٹھیک بیچ وہ بُک بُک کرنے لگا۔

پرمیسوا جب بھینس کو پانی پلانے ڈبرے پر آیا تو اس نے غڑپ غڑپ کی آواز سنی۔

Scanned with CamScanner

اسے لگا کوئی بہت بڑی سوڑ مچھلی تالاب میں مست ہو کر اینٹھ رہی ہے۔ جیٹھ کے مہینے میں ویسے بھی مچھلیوں میں گرمی چڑھ جاتی ہے۔ اس نے کپڑے اتارے اور پانی میں پل گیا۔ جہاں وہ مچھلی تڑپ رہی تھی وہاں اس نے غوطہ لگا کر مچھلی کے گلپھڑوں کو اپنے پنجوں میں دبوچ لینا چاہا تو اس کے ہاتھ میں ٹھیپو کی گردن آئی۔ وہ پہلے تو ڈرا، پھر سے کھینچ کر باہر نکال لایا۔ ٹھیپو اب مرا ہوا سا پڑا تھا۔ پیٹ غبارے کی طرح پھول گیا تھا اور ناک کان سے پانی کی دھار لگی ہوئی تھی۔ ٹھیپو ننگا تھا اور اس کا پیشاب نکل رہا تھا۔ پرجیسورا نے اس کی ٹانگیں پکڑ کر اسے لٹا کر پیٹ میں ٹھونسا مارا تو "بھل بھل" کر کے پانی منہ سے نکلا۔

ایک بالٹی پانی کی الٹی کرنے کے بعد ٹھیپو مسکرایا۔ اٹھا اور بولا، "کاکا، تھوڑے سے کنول گٹے تالاب سے کھینچ دو گے کیا؟ میں نے اتنا سارا توڑا تھا، سالا سب چھوٹ گیا۔ بڑی بھوک لگی ہے۔"

پرجیسورا نے بھینس ہانکنے والے ڈنڈے سے ٹھیپو کے چوتڑ پر چار پانچ ڈنڈے جمائے اور گالیاں دیتا ہوا لوٹ گیا۔

گاؤں کے باہر قصبے کی طرف جانے والی سڑک کے کنارے سرکاری نرسری تھی۔ وہاں پر پلانٹیشن کا کام چل رہا تھا۔ برلا کے پیپر مل کے لیے بانس، ساگوان اور یوکلپٹس کے پیڑ لگائے گئے تھے۔ اس نرسری میں، کافی اندر، تاڑ کے بھی پیڑ تھے۔ گاؤں میں تاڑی پینے والوں کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ زیادہ تر آدی واسی مزدور جو پی ڈبلیو ڈی میں سڑک بنانے اور راکھڑ گٹی بچھانے کا کام کرتے تھے، دن بھر کی تھکان کے بعد رات میں تاڑی پی کر دُھت ہو جایا کرتے تھے۔ پہلے وہ لوگ سانجھ کا جھٹ پٹا ہوتے ہی مٹکا لے جا کر پیڑ میں باندھ دیتے تھے۔ تاڑ کا پیڑ بالکل سیدھا ہوتا ہے۔ اس پر چڑھنے کی ہمت یا تو چھپکلی کر سکتی ہے یا پھر مزدور۔ صبح تک مٹکے میں تاڑی جمع ہو جاتی۔ لوگ اسے اتار لیتے۔

تاڑ پر چڑھنے کے لیے بانس کی پکھیاں بناتے تھے اور اس پر پیر پھنسا کر چڑھتے تھے۔ اس میں گرنے کا خطرہ کم ہوتا۔ اگر اتنی اونچائی سے کوئی آدمی گر جاتا تو اس کی ہڈیاں بکھر سکتی تھیں۔

اب تاڑ کے ان پیڑوں پر کشن پال سنگھ کی ملکیت ہو گئی تھی۔ پٹواری نے اس سرکاری

نرسری کے اندر بھی اس زمین کو کشن پال سنگھ کے پٹے میں نکال دیا تھا۔ اب تاڑی نکلوانے کا کام وہی کرتے تھے۔ گرام پنچایت بھون کے بیٹھکی والے کمرے میں، جہاں مہاتما گاندھی کی تصویر ٹنگی ہوئی تھی، اس کے نیچے شام کو تاڑی بانٹی جاتی۔ کمرے کے اندر اور باہر تاڑی خور مزدوروں کی اچھی خاصی جماعت اکٹھا ہو جاتی تھی۔ کشن پال سنگھ کو بھاری آمدنی ہوتی تھی۔

ایک بار ٹیپو نے بھی تاڑی چکھنی چاہی۔ اس نے دیکھا کہ جب گاؤں کے لوگ تاڑی پیتے تو ان کی آنکھیں آنند سے بھر جاتیں۔ چہرے سے سکھ ٹپکنے لگتا۔ مسکان کانوں تک چوڑی ہو جاتی۔ مند مند، آنند اور مستی میں ڈوبے لوگ سا لہو دادر گاتے، قہقہے لگاتے، اور ایک دوسرے کی ماں بہن کی ایسی تیسی کرتے۔ کوئی برا نہیں مانتا تھا لگتا تھا جیسے لوگ پیار کے اتھاہ سمندر میں ایک ساتھ تیر رہے ہوں۔

ٹیپو کو لگا کہ تاڑی ضرور کوئی اونچی چیز ہے۔ سوال یہ تھا کہ تاڑی پی کیسے جائے۔ کاکا لوگوں سے مانگنے کا مطلب تھا پٹ جانا۔ پٹنے سے ٹیپو کو سخت نفرت تھی۔ اس نے جگاڑ جمایا ور ایک دن بالکل تڑکے، جب صبح ٹھیک سے ہو بھی نہیں پائی تھی، آسمان میں اکا دکا تارے چھترے ہوئے تھے، وہ جھاڑا پھرنے کے بہانے گھر سے نکل گیا۔

تاڑ کی اونچائی اور اس اونچائی پر ٹنگے ہوئے پکے نیبو کی شکل کے مٹکے اسے ڈرا نہیں رہے تھے بلکہ ان دیکھی انگلیوں سے اشارہ کر کے اسے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ تاڑ کے بنتے ہوئے پتے اسے تاڑی کے ذائقے کے بارے میں سر ہلا ہلا کر بتا رہے تھے۔ ٹیپو کو معلوم تھا چھپرا منڈے کا لٹھ باز مدنا سنگھ تاڑی کی رکھوالی کے لیے تعینات تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مدنا سنگھ، ہی تاڑی کی خماری میں کہیں خراٹے بھر رہا ہوگا ٹیپو کے دماغ میں ڈر کی کہیں ہلکی سی کھرونچ تک نہیں تھی۔

وہ گلہری کی طرح تاڑ کے ایکبار سیدھے تنے سے چمٹ گیا اور اوپر سرکنے لگا۔ پیروں میں نہ تو بانس کی پکسیاں تھیں اور نہ کوئی رسی ہی۔

پنجوں کے سہارے وہ اوپر سرکتا گیا۔ اس نے دیکھا، مدنا سنگھ دور ایک آم کے پیڑ کے نیچے انگوچھا بچھا کر سویا ہوا ہے۔ ٹیپو اب کافی اونچائی پر تھا۔ آم، مہوے، بھیرا اور ساگوان کے پیڑ اسے اور ٹھگنے نظر آ رہے تھے۔ اگر میں گدھ کی طرح اڑ سکتا تو کتنا مزہ آتا، ٹیپو نے سوچا۔ اس نے دیکھا، اس کی کہنی کے پاس ایک لال چیونٹی رینگ رہی تھی۔ سسری، " س نے ایک بھدی

Scanned with CamScanner

گالی بکی اور مٹکے کی طرف سرکنے لگا۔

مدنا سنگھ جمائیاں لینے لگا تھا اور بل ڈال کر جتلا رہا تھا کہ اس کی حد اب ٹوٹنے والی ہے۔ دھندھلکا بھی اب تنا نہیں رہ گیا تھا۔ سارا کام پھرتی سے چٹانا پڑے گا۔ ٹیپو نے مٹکے کو ہلایا۔ تاڑی چوتھائی مٹکے تک اکٹھی ہو گئی تھی۔ اس نے مٹکے میں ہاتھ ڈال کر تاڑی کی تھاہ لینی چاہی۔

اور بس یہیں ساری گڑبڑی ہو گئی۔

مٹکے میں چتیل کریت سانپ گھسا ہوا تھا ــــ اصل ناگ۔ تاڑی پی کر وہ بھی دھت تھا۔ ٹیپو کا ہاتھ اندر گیا تو وہ اس کے بازو میں بوڑ کر لپٹ گیا۔ ٹیپو کا چہرہ راکھ کی طرح سفید ہو گیا۔ گدھ کی طرح اڑنے جیسی حرکت اس نے کی۔ تاڑ کا پیڑ ایک طرف ہو گیا اور اس کے ساتھ ٹیپو درنی پتھر کی طرح نیچے کو جا رہا تھا۔ مٹکا اس کے پیچھے تھا۔

زمین پر ٹیپو گرا تو دھپ کی آواز کے ساتھ ایک مرتے ہوئے آدمی کی آخری کراہ بھی اس میں شامل تھی۔ اس کے بعد مٹکا گرا اور اس کے بچے کھچے بکھر گئے۔ کالا سانپ ایک طرف پڑا ہو اینٹھ رہا تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں۔

مدنا سنگھ دوڑا۔ اس نے آ کر دیکھا تو اس کی ہوا کھسک گئی۔ اس نے تاڑ کی پھنگی سے مٹکے سمیت ٹیپو کو گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اس نے ایک دو بار ٹیپو کو ہلایا ڈلایا۔ پھر گاؤں کی طرف حادثے کی خبر دینے گیا۔

دھاڑ مار مار کر روتی، چھاتی کوٹتی فیروزہ تک بھگ سارے گاؤں کے ساتھ وہاں پہنچی۔ مدنا سنگھ انھیں موقعے کی طرف لے گیا، لیکن مدنا سنگھ بھی رہ گیا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہی تاڑ کا پیڑ تھا، اسی کے نیچے ٹیپو کی لاش تھی۔ اس نے تاڑی کے نشے میں سپنا تو نہیں دیکھا تھا؟ لیکن پھوٹا ہوا مٹکا اب بھی وہیں پڑا ہوا تھا۔ سانپ کا سر کسی نے پتھر کے ٹکڑے سے اچھی طرح بھور دیا تھا۔ لیکن ٹیپو کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ آس پاس کھوج کی گئی لیکن ٹیپو میاں غائب تھے۔

گاؤں والوں کو اس دن یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو ٹیپو سالا جن ہے، وہ کبھی مر نہیں سکتا۔

فیروزہ کی صحت لگاتار بگڑ رہی تھی۔ گلے میں دونوں طرف کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ چھاتیاں سوکھ کر خالی تھیلیوں کی طرح لٹک گئی تھیں۔ پسلیاں گنی جا سکتی تھیں۔ ٹیپو کو وہ بہت زیادہ پیار

کرتی تھی۔ اس کے لیے اس نے دوسرا نکاح نہیں کیا تھا۔

ٹھیپو کی حرکتوں سے فیروزہ کو لگنے لگا کہ کہیں وہ سست اور آوارہ ہو کر نہ رہ جائے۔ اس لیے اس نے ایک دن گاؤں کے پنڈت بھگوان دین کے پیر پکڑے۔ پنڈت بھگوان دین کے گھر دو بھینسیں تھیں اور کھیتی باڑی کے علاوہ دودھ پانی بیچنے کا دھندا بھی کرتے تھے۔ ان کو چرواہے کی ضرورت تھی۔ اس کے لیے پندرہ روپے مہینے اور کھانا خوراک پر ٹھیپو رکھ لیا گیا۔ بھگوان دین اصل کائیاں تھے۔ کھانے کے نام پر رات کا بچا کھچا کھانا، مکئی کی جلی بھنی روٹیاں ٹھیپو کو ملتیں۔ قرار تو یہ تھا کہ صرف بھینسوں کی دیکھ بھال ٹھیپو کو کرنی پڑے گی، لیکن حقیقت میں بھینسوں کے علاوہ ٹھیپو کو پنڈت کے گھر سے لے کر کھیت کھلیان تک کا سارا کام کرنا پڑتا تھا۔ صبح چار بجے اسے جگا دیا جاتا اور رات میں سوتے سوتے بارہ بج جاتے۔ ایک ہی مہینے میں ٹھیپو کی حالت دیکھ کر فیروزہ پگھل گئی۔ چھاتی میں اندر سے رلائی کا زوردار بھبکا اٹھا۔ اس نے ٹھیپو سے کہا کہ "بیٹا، اس پنڈت کا دوار چھوڑ دے۔ کہیں اور دیکھ لیں گے۔ یہ تو مہا قسائی ہے پورا۔" لیکن ٹھیپو نے انکار کر دیا۔

ٹھیپو نے یہاں بھی جگاڑ جما لیا۔ بھینسوں کو جنگل میں لے جا کر وہ چھٹا چھوڑ دیتا اور کسی پیڑ کے نیچے رات کی نیند پوری کرتا۔ اس کے بعد اٹھتا، سون ندی میں بھینسوں کو نہلاتا، کلاوا وغیرہ کرتا۔ پھر ادھر ادھر اچھی طرح سے دیکھ تاک کر ڈالڈا کے خالی ڈبے میں ایک کلو بھینس کا تازہ دودھ دوہ کر چڑھا لیتا۔ اس کی صحت سدھرنے لگی۔

ایک بار پنڈتائن نے اسے کسی بات پر گالی بکی اور کھانے کے لیے سڑا ہوا باسی بھات دے دیا۔ اس دن ٹھیپو کو پنڈت کے کھیت کی نرائی بھی کرنی پڑی تھی اور تھکان اور بھوک سے وہ بے چین تھا۔ بھات کا نوالہ منہ میں رکھتے ہی پہلے تو کھٹاس کا سواد ملا، پھر ابکائی آنے لگی۔ اس نے سارا کھانا بھینسوں کے ناند میں ڈال دیا اور بھینسوں کو ہانک کر جنگل لے گیا۔

شام کو جب بھینس دوہی جانے لگی تو چھٹانک بھر بھی دودھ نہیں نکلا۔ پنڈت بھگوان دین کو شک پڑ گیا اور انھوں نے ٹھیپو کی جوتوں سے پٹائی کی۔ دیر تک مرغا بنائے رکھا، دیوار پر اکڑوں بٹھایا، تھپڑ چلائے اور اسے کام سے نکال دیا۔

اس کے بعد ٹھیپو پی ڈبلیو ڈی میں کام کرنے لگا۔ راکھڑ، مورم، بجری بچھانے کا کام، سڑک پہ ڈامر بچھانے کا کام، بڑے بڑے مردوں کے لائق کام۔ چلچلاتی دھوپ میں۔ فیروزہ کمی کے سے

میں مسالا نمک ڈال کر روٹیاں سینک دیتی۔ ٹیپو کام کے بیچ میں دوپہر انھیں کھا کر دو لوٹا پانی سڑکا لیتا۔

تعجب تھا کہ اتنی کڑی محنت کے باوجود ٹیپو سیجر پک کر مضبوط ہوتا چلا گیا۔ کاٹھی چڑھنے لگی۔ اس کی کلائی کی ہڈیاں چوڑی ہوتی چلی گئیں، پنڈلیوں میں مچھلیاں مچلنے لگیں۔ آنکھوں میں ایک اکھڑ رعب اور غصہ جھلکنے لگا۔ پٹھے لوہے کے موافق کڑے ہوتے چلے گئے۔

ایک دن ٹیپو ایک بھرپور آدمی بن گیا، جوان۔

پسینے، محنت، بھوک، بے عزتی، دُرگھٹناؤں اور مصیبتوں کی وکٹ دھار کو چیر کر نکل آیا تھا۔ کبھی اس کے چہرے پر پست ہونے، ٹوٹنے یا ہار جانے کا غم نہ اُبھرتا۔

اس کی بھنووں کو دیکھ کر ایک چیز ہمیشہ اپنی موجودگی کا احساس کراتی ـــ غصے یا شاید نفرت کی بھربھراتی ہوئی پرت۔

میں نے اس بیچ گاؤں چھوڑ دیا اور بیلاڈلا کے آئرن اور مل میں نوکری کرنے لگا۔ اس بیچ فیروزہ کی موت ہو گئی۔ بال دیو، سنبھیرو اور راوجے کے علاوہ گاؤں کے کئی لوگ بیلاڈلا میں مزدوری کرنے لگے۔ پنڈت بھگوان دین کو ہیضہ ہو گیا اور وہ مر گئے۔ ہاں، کشن پال سنگھ اسی طرح تاڑی اتروانے کا دھندا کرتے رہے۔ وہ کئی سال سے لگاتار سرپنچ بن رہے تھے۔ قصبے میں ان کی پکی حویلی کھڑی ہو گئی اور بعد میں وہ ایم ایل اے ہو گئے۔

لمبا عرصہ گزر گیا۔ ٹیپو کی خبر مجھے بہت دنوں تک نہیں ملی۔ لیکن یہ یقین تھا کہ جن حالات میں ٹیپو کام کر رہا تھا، اپنا خون نچوڑ رہا تھا، اپنی نسوں کی طاقت چٹانوں میں توڑ رہا تھا، وہ حالات کسی کے لیے بھی جان لیوا ہو سکتے تھے۔

ٹیپو سے میری ملاقات تب ہوئی جب وہ بیلاڈلا آیا۔ پتا لگا کہ کشن پال سنگھ نے غنڈوں سے اسے بُری طرح پٹوایا تھا۔ غنڈوں نے اسے مرا ہوا جان کر سون ندی میں پھینک دیا تھا۔ لیکن وہ صحیح سلامت بچ گیا اور اسی رات کشن پال سنگھ کی چوپال میں آگ لگا کر بیلاڈلا آ گیا۔ میں نے اس کی سفارش کی اور اسے مزدوری میں بھرتی کر لیا گیا۔

وہ سن اکہتر کا سال تھا۔

Scanned with CamScanner

ہمارا کارخانہ جاپان کی مدد سے چل رہا تھا۔ ہم جتنا کچا لوہا تیار کرتے، اس کا بہت بڑا حصہ جاپان بھیج دیا جاتا۔ مزدوروں کو دن رات کھدان میں کام کرنا پڑتا۔

ٹیپو اس بیچ اپنے ساتھیوں سے پوری طرح گھل مل گیا تھا۔ لوگ اسے پیار کرنے۔ میں نے ویسا سیلو جرک، نڈر اور مضبوط آدمی اور نہیں دیکھا۔ ایک دن اس نے کہا تھا، "کاکا، میں نے اکیلے لڑائیاں لڑی ہیں۔ ہر بار میں پٹا ہوں۔ ہر بار ہارا ہوں۔ اب اکیلے نہیں، سب کے ساتھ مل کر دیکھوں گا کہ سالوں میں کتنا زور ہے۔"

نہیں دنوں ایک گھٹنا ہوئی۔ جاپان نے ہمارے کارخانے سے لوہا خریدنا بند کر دیا، جس کی وجہ سے سرکاری آدیش مل گیا کہ اب ہمیں کچے لوہے کا استعمال کم کرنا چاہیے۔ مزدوروں میں چھانٹی کرنے کا سرکاری فرمان جاری ہوا۔ مزدوروں کی طرف سے مانگ کی گئی کہ پہلے ان کی نوکری کا کوئی دوسرا بندوبست کیا جائے، تبھی ان کی چھانٹی کی جائے۔ اس مانگ پر بنا دھیان دیے مینیجمنٹ نے چھانٹی پر فوری عمل شروع کر دیا۔ مزدور یونین نے اس کے خلاف ہڑتال کا نعرہ دیا۔ سارے مزدور اپنی جگہوں میں بیٹھ گئے۔ کام پر نہیں گئے۔

چاروں طرف پولیس تعینات کر دی گئی۔ کچھ گشتی گاڑیاں بھی رکھی گئی تھیں جو گھوم پھر کر حالات کو کتوں کی طرح سونگھنے کا کام کرتی تھیں۔ ٹیپو سے میری ملاقات دنوں شیر پنجاب ہوٹل کے سامنے پڑی لکڑی کی بنچ پر بیٹھے ہوئے ہوئی۔ وہ بیڑی پی رہا تھا۔ کالے رنگ کی نکر پر اس نے کھدر کا کرتا پہنا ہوا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا، "سلام کاکا، لال سلام۔" پھر اپنے کتھے چونے میں رنگے میلے دانت نکال کر ہنس پڑا۔ "مینیجمنٹ کی گانڈ میں ہم نے موٹا سا ڈنڈا گھسیڑ رکھا ہے۔ سالے بلبلا رہے ہیں۔ لیکن نکالے نکلتا نہیں۔ کاکا، دس ہزار مزدوروں کو بھوکھڑ بنا کر ڈھوروں کی سوافق ہانک دینا کوئی ہنسی ٹھٹھا نہیں ہے۔ چھانٹی اوپر کی طرف سے ہونی چاہیے۔ جو پچاس مزدوروں کے برابر پگار لیتا ہے، نکالو سب سے پہلے اسے۔ چھانٹو اچاریہ جی صاحب کو پہلے۔"

ٹیپو بہت بدل گیا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ اس کی ہنسی کے پیچھے نفرت، بر توشنا، اور غصے کا وشال سمندر پچھاڑیں مار رہا تھا۔ اس کی چھاتی ادھڑی ہوئی تھی۔ کرتے کے بٹن ٹوٹے ہوئے

Scanned with CamScanner

تھے۔ کارخانے کے پھاٹک کی طرح کھلے ہوئے کرتے کے گلے کے اندر اس کی چھاتی کے بال جل رہے تھے۔ بے شمار مزدوروں کی طرح کارخانے کے مین گیٹ پر بیٹھے ہوئے ٹیپو نے اپنے کاندھے پر لٹکتے جھولے سے پرچے نکالے اور مجھے تھما کر تیر کی طرح چلا گیا۔

کہتے ہیں، تیسری رات یونین آفس پر پولیس نے چھاپا مارا۔ ٹیپو وہیں تھا۔ ساتھ میں اور بھی کئی مزدور تھے۔ یونین آفس شہر سے بالکل باہر دوسری چھور پر تھا۔ آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ اس کے بعد جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ جنگل لگ بھگ دس میل کے علاقے میں پھیلا ہوا تھا۔

مزدوروں نے پولیس کو روکا، لیکن داروغہ کریم بخش تین چار کانسٹیبلوں کے ساتھ زبردستی اندر گھس آیا۔ اس نے فائلوں، رجسٹروں، پرچوں کو بٹورنا شروع کیا۔ تبھی ٹیپو سپاہیوں کو دھکیلتے ہوئے اندر پہنچا اور چیخا، "کاغذ پتر پر ہاتھ مت لگانا داروغہ جی! ہماری ڈیوٹی آج یونین کی نگرانی میں ہے۔ ہم کھڑے دے رہے ہیں۔ آگا پیچھا ہم نہیں دیکھتے، پر تم سوچ لو ٹھیک طرح سے۔"

داروغہ چونکا۔ پھر غصے میں اس کی آنکھیں پھیل سی گئیں، اور نتھنے سانڈ کی طرح پھڑکنے لگے۔ "کون ہے اوے! طوفانی سنگھ، لگاؤ سالے کو دس ڈنڈے۔"

سپاہی طوفانی سنگھ آگے بڑھا تو ٹیپو کی ٹنگڑی نے اسے دروازے سے آدھا باہر اور آدھا اندر مردہ چھپکلی کی طرح زمین پر پسرا دیا۔ داروغہ کریم بخش نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سپاہی مستعد تھے، لیکن کم پڑ رہے تھے۔ انھوں نے اشارہ کیا لیکن تب تک ان کی گردن ٹیپو کی بھجاؤں میں پھنس چکی تھی۔

مزدوروں کا جتھا اندر آ گیا اور تڑاتڑ لاٹھیاں چلنے لگیں۔ کئی سپاہیوں کے سر پھوٹے۔ وہ رو رہے تھے۔ ٹیپو نے داروغہ کو ننگا کر دیا تھا۔

پٹی ہوئی پولیس پلٹن کا جلوس نکالا گیا۔ آگے آگے داروغہ، پھر طوفانی سنگھ، لائن سے پانچ سپاہیوں کے ساتھ۔ پیچھے پیچھے مزدوروں کا ہجوم ٹھہاکے لگاتا ہوا۔ پولیس والوں کی بڑی گت بنی ہوئی تھی۔ یونین آفس سے نکل کر جلوس کارخانے کے گیٹ تک گیا، پھر سپاہیوں کو چھوڑ کر مستی اور فخر میں ڈوبے ہوئے لوگ لوٹ گئے۔ ٹیپو کی گردن اکڑی ہوئی تھی اور وہ سالسوادر گانے لگا تھا۔

Scanned with CamScanner

اگلے دن سویرے ٹیپو اپنی جھگی سے نکل کر ٹٹی کرنے جا رہا تھا کہ پولیس نے اسے گرفتار کر لیا۔ اور بھی بہت سے لوگ پکڑے گئے تھے۔ چاروں طرف گرفتاریاں چل رہی تھیں۔

ٹیپو کو جب پکڑا گیا تو اس نے ٹٹی والا لوٹا کھینچ کر طوفانی سنگھ کو مارا۔ لوٹا ماتھے کے بیچوں بیچ بیٹھا اور گاڑھا گندا خون چھلک آیا۔ ٹیپو نے بھاگنے کی کوشش کی، لیکن گھیر لیا گیا۔ غصے میں پاگل طوفانی سنگھ نے تڑاتڑ ڈنڈے چلائے۔ منہ سے بے تحاشا گالیاں پھوٹ رہی تھیں۔

سپاہیوں نے اسے جوتے سے ٹھوکر ماری، گھونسے لاتیں چلائیں۔ داروغہ کریم بخش بھی جیپ سے نیچے اتر آئے۔ یونین آفس میں ہی گئی اپنی بے عزتی انہیں بھولی نہیں تھی۔

داروغہ کریم بخش نے طوفانی سنگھ سے کہا کہ ٹیپو کو ننگا کیا جائے اور گانڈ میں ایک لکڑی ٹھونک دی جائے۔ طوفانی سنگھ نے یہ کام سپاہی گجادھر شرما کے سپرد کیا۔

گجادھر شرما نے ٹیپو کا کرتا کھینچا تو داروغہ کریم بخش کا چہرہ فق ہو گیا۔ فیروزہ نے ٹیپو کی باقاعدہ ختنہ کرائی تھی۔ ٹیپو داروغہ کا نام تو نہیں جانتا تھا، لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر ضرور جان گیا۔ داروغہ کریم بخش نے ٹیپو کی کنپٹی پر ایک ڈنڈا جمایا، "مادر... نام کیا ہے تیرا؟"

ٹیپو نے کرتا اتار کر پھینک دیا اور مادرزاد برہنہ کھڑا ہو گیا۔ "اللہ بخش ولد عبد اللہ بخش، ساکن مڑا، موضع چندھی، تحصیل سہاگ پور، تھانہ جیتہری، پیشہ مزدوری۔" اس کے بعد اس نے ٹانگیں چوڑی کیں، گھوما اور گجادھر شرما جو نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا، اس کے کندھے پر پیشاب کی دھار چھوڑ دی۔ ضلع شہڈول، حال باشندہ بیلاڈیلا۔"

ٹیپو کو جیپ کے پیچھے رسی سے باندھ کر ڈیڑھ میل تک گھسیٹا گیا۔ سڑک پر پڑی ہوئی بجری اور موروم نے اس کی پیٹھ کی پرت نکال دی۔ لال ٹماٹر کی طرح جگہ جگہ اس کا گوشت باہر جھانکنے لگا۔

جیپ قصبے کے پار آخری چنگی ناکے پر رکی۔ پولیس پلٹن کا چہرہ خونخوار جانوروں کی طرح دمک رہا تھا۔ چنگی ناکے پر ایک ڈھابا تھا۔ پولیس والے وہیں چائے پینے لگے۔

ٹیپو کو بھی چائے پینے کی طلب محسوس ہوئی۔ "ایک چائے ادھر مارنا چھوکرے، کڑک!" وہ چیخا۔ پولیس والے ایک دوسرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھ کر مسکرائے۔ ٹیپو کو چائے پلائی گئی۔ اس کی کنپٹی پر گومڑا اٹھ آیا تھا اور پورا بدن لہولہان ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ سے لہو چھلچھلا رہا تھا۔

Scanned with CamScanner

جیپ ٹنگ جنگ دس میل بعد جنگل کے بیچ رکی۔ جگہ بالکل سنسان تھی۔ ٹھیپو کو نیچے اتارا گیا۔ کچھ دو افسروں نے ایک دو ڈنڈے اور جمائے۔ داروغہ کریم بخش بھی جیپ سے اترا اور اس نے ٹھیپو سے کہا، "اللہ بخش عرف ٹھیپو، تمہیں دس سیکنڈ کا ٹائم دیا جاتا ہے۔ سرکاری حکم ملا ہے کہ تمہیں [illegible] کر دیا جائے۔ سامنے کی طرف سڑک پر تم جتنی جلد دور سے دور بھاگ سکتے ہو، بھاگو۔ ہم دس تک گنتی گنیں گے۔"

ٹھیپو لنگڑاتا، ڈگمگاتا چل پڑا۔ کریم بخش خود گنتی گن رہا تھا۔ "ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ"

لنگڑے ہوئے بیمار بیل کی طرح خون میں نہایا ہوا ٹھیپو اپنے بدن کو گھسیٹ رہا تھا۔ وہ کمر تک سیدھا ہو پا رہا تھا، چلنے اور بھاگنے کی بات تو دور تھی۔

اچانک اس کی گنتی ختم ہو گئی۔ طوفانی سنگھ نے نشانہ باندھ کر پہلا فائر کیا۔ دھائیں۔

گولی ٹھیپو کی کمر میں لگی اور وہ ریت کے بورے کی طرح زمین پر گر پڑا۔ کچھ سپاہی اس کے پاس پہنچے۔ کنپٹی پر بوٹ مارا۔ ٹھیپو کراہ رہا تھا، "حرام زادو!"

کچھ دو افسروں نے داروغہ سے کہا، "صاحب، ابھی تھوڑا بہت باقی ہے۔" داروغہ کریم بخش نے طوفانی سنگھ کی طرف اشارہ کیا۔ طوفانی سنگھ نے قریب جا کر ٹھیپو کے دونوں کندھوں کے پاس، دو دو بیچ دو گولیاں ماریں، بندوق کی نال ٹنگ جنگ سٹا کر۔ نیچے کی زمین تک ادھڑ گئی۔

ٹھیپو دھیمے دھیمے چھٹپٹایا۔ منہ سے خون اور جھاگ کے لتھڑے نکلے۔ زبان باہر نکل آئی۔ آنکھیں ڈھلک گئیں۔ پھر وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

[illegible] کے [illegible] کی ایک [illegible] سے [illegible] لٹکا دیا گیا۔ موقعے کی تصویر لی گئی۔ پولیس نے رپورٹ [illegible] دو گروہوں میں ہتھیار بند لڑائی ہوئی۔ ٹھیپو عرف اللہ بخش کو [illegible] نے مار دیا ہے۔ پولیس نے لاش برآمد کی۔ مجرموں کی تلاش جاری ہے۔

اس کے بعد ٹھیپو کی لاش کو [illegible] دھکیل کر صندوق میں بند کر دیا گیا اور جیپ میں لاد کر پولیس چوکی لایا گیا۔

راستے گاؤں، بستی، محلے، [illegible] سے پولیس کی گاڑیاں [illegible] تھیں۔ [illegible] سے

گشت لگا رہے تھے۔ چاروں طرف دھواں اٹھ رہا تھا۔ جھگیاں جلا دی گئی تھیں۔ پچاسوں مزدور مارے گئے۔ پتا نہیں کیا کیا ہوا تھا۔

صبح ٹیپچو کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلع ہسپتال بھیجا گیا۔ ڈاکٹر ہیڈون برگس آپریشن تھیٹر میں تھے۔ وہ بڑے مذہبی قسم کے عیسائی تھے۔

ٹرالی اسٹریچر میں ٹیپچو کی لاش اندر لائی گئی۔ ڈاکٹر برگس نے لاش کی حالت دیکھی۔ جگہ جگہ تھری ناٹ تھری کی گولیاں گھسی ہوئی تھیں۔ لاش میں ایک سوت جگہ نہیں تھی جہاں چوٹ نہ ہو۔

انھوں نے پہلا ماسک ٹھیک کیا، پھر استرا اٹھایا، جھکے، اور تبھی ٹیپچو نے اپنی آنکھیں کھولیں، دھیرے سے کراہا اور بولا، "ڈاکٹر صاحب یہ ساری گولیاں نکال دو۔ مجھے بچا لو۔ مجھے انھیں کتوں نے مارنے کی کوشش کی ہے۔"

ڈاکٹر برگس کے ہاتھ سے استرا چھوٹ کر گر گیا۔ ایک گھگھیائی ہوئی چیخ ان کے حلق سے نکلی اور وہ آپریشن روم سے باہر کی طرف بھاگے۔

•

آپ کہیں گے کہ میں ایسی انہونی اور ناقابلِ یقین باتیں سنا کر آپ کا وقت خراب کر رہا ہوں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس پوری کہانی میں سوائے سفید جھوٹ کے اور کچھ نہیں ہے۔

میں نے بھی پہلے ہی عرض کیا تھا کہ یہ کہانی سچائی ہے۔ آپ قبول کیوں نہیں کر لیتے کہ جیون کی اصلیت کسی بھی گڑھی ہوئی دیو کہانی سے زیادہ حیرت انگیز ہوتی ہے۔ اور پھر ایسی اصلیت جو کسی مزدور کے جیون سے جڑی ہوئی ہو۔

ہمارے گاؤں مڈر کے علاوہ جتنے بھی لوگ ٹیپچو کو جانتے ہیں، وہ یہ مانتے ہیں کہ ٹیپچو کبھی مرے گا نہیں۔ سالا جن ہے۔

آپ کو اب بھی یقین نہ ہو تو جہاں، جب، جس وقت آپ چاہیں، میں آپ کو ٹیپچو سے ملوا سکتا ہوں۔

••

کتب خانہ

پیپر بیک سیریز

ان کتابوں پر مشتمل پہلا سیٹ شائع ہو گیا ہے

نیر مسعود

طاؤس چمن کی مینا

محمد خالد اختر

لالٹین

اور دوسری کہانیاں

حسن منظر

سوئی بھوک

اسد محمد خاں

غصے کی نئی فصل

نعیم صدری

جوابِ دوست

سعیدالدین

رات

ریشارد کاپوشنسکی

شہنشاہ

صادق ہدایت

بوف کور

آج کی کتابیں
سی ۱۶ ۔ ۱، سمارٹی، ٹمس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر ۔ کراچی ۷۵۲۹۰

ضمیر نیازی

کی معروف اور اہم کتاب

The Press in Chains

کا اردو ترجمہ

صحافتِ پابندِ سلاسل

مجلد ۳۷۵ صفحات   قیمت: ۱۰۰ روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۲، سماری مانشن، بلاک ۱۵، گلستان جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

وجے دان ویتھا

ہندی سے ترجمہ: زیبا علوی

آدم زاد

سرمئی آکاش میں تارے جھلملا رہے تھے۔ ایک ایک تارے کی چمک میری آنکھوں میں اُجالا بھرنے لگی۔ میری پتلیاں سی اجالے سے چاند سورج بن گئیں۔ پتلیوں کی تیز چمک دیکھ کر تاروں کا جھلملانا رک گیا۔ بنا پلک جھپکائے ایک ٹک دمکتے تاروں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ان کے بیچ ایک سفید داڑھی والا بابا ظاہر ہوا اور دھیرے دھیرے نیچے اترنے لگا۔ سورج کی کرنوں جیسی چمکتی داڑھی ایک دم سفید! سفید پگڑی، سفید انگرکھا، دودھ کے جھاگ سی سفید دھوتی۔ فقط دائیں پیر میں چاندی سی چمکتی سفید جوتی۔ دانتوں کی آب، گویا تارے تراش دیے گئے ہوں۔ گلے میں چاندی کی مُورت۔

بابا سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا، گویا جھلملاتے تاروں سے دودھ کی دھاریں پھوٹ رہی ہوں۔ اس مسکان کے ساتھ ہی اس کے منھ سے سفید الفاظ پھوٹ پڑے: پہچانا نہیں؟

آواز سنتے ہی یاد تازہ ہو گئی۔ "تمھیں نہیں پہچانوں گا؟ تمھارے سائے کو بھی پہچان لوں گا۔ اُس برسات کے دن تم نے ہی جنم کی کہانی سنائی تھی۔ وہ کہانی تبھی سے میرے پیچھے پڑا ہے۔ ایک پل کے لیے بھی الگ نہیں ہو پاتا۔"

پھر میں نے مسکراتے ہوئے مذاق کیا، "دیکھ کر تو سبھی پہچانتے ہیں۔ میں تو تمھیں بغیر دیکھے ہی پہچان لوں گا۔"

Scanned with CamScanner

بابا ایک دم اور قریب آ کر کہنے لگا: "تبھی تو میں تاروں کا مقام چھوڑ کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ ایسی کہانی سناؤں گا کہ سنتے ہی کمہار والی کہانی بھول جاؤ گے۔"

"کہانی کے نام سے ہی میری نسیں پھڑکنے لگتی ہیں، پر رام جانے کیوں اس وقت میرے منہ سے یک دم اُلٹے بول نکلے۔ "بابا، آج معاف کرو، کئی راتوں کی جگائی ہے۔ کہانیاں سن سن کر تنگ آ گیا۔ آنکھیں ایسی جل رہی ہیں جیسے اندر مسالے بھن رہے ہوں۔ آج تو خواب میں بھی کہانی نہیں سننا چاہتا۔"

اس نے بالکل بُرا نہیں مانا۔ مسکان کا اُجالا بکھیرتے ہوئے کہنے لگا: "بنا سنائے چلا جاؤں، ایسا کرنے والا میں نہیں۔ پہلے سن لو، پھر بات کرنا۔ اس کے بعد تمہیں کوئی دوسری کہانی لکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔ اس ایک کہانی میں دنیا کی تمام کہانیاں سمائی ہوئی ہیں۔ اب دیر مت کرو۔ تارے اوجھل ہونے سے پہلے ہی پوری کہانی سن لو تو اچھا ہے۔ مہربانی کر کے تُرت اٹھ جاؤ اور میرے ساتھ چلو۔"

میں نے تعجب سے پوچھا، "چلوں کہاں؟ سنانی ہو تو یہیں سنا دو۔"

بابا سر ہلا کر بولا: "نہ، یہ کہانی آدمیوں کی بستی میں نہیں سنائی جا سکتی۔"

بابا کے چہرے پر جڑے تارے جھلملاتے نظر آئے۔ کچھ دیر کے لیے وہ تاروں کا گچھا بن گیا۔

اس کی یہ بات مجھے ذرا کھٹکی۔ ٹوکنا چاہا، پر اس کے چہرے پر تاروں کے گچھے کو چمکتا دیکھ کر شبد میرے گلے میں اٹک کر رہ گئے۔ اس سے اکتا کر میں نے پوچھا، "پھر مجھے کیوں لے جا رہے ہو؟ جو کہانی آدمیوں کی بستی میں نہیں سنائی جا سکتی، اُسے سن کر میں کیا کروں گا؟ میں آدمیوں ہی کے لیے تو کہانیاں لکھتا ہوں۔"

بابا کے ہونٹوں پر معنی خیز ہنسی اُبھر آئی۔ نچلا ہونٹ چباتے ہوئے کہنے لگا: "دل تو کرتا ہے تیری نادانی پر کھل کر ہنسوں، زور سے قہقہہ لگاؤں۔ پر انسان کو اپنی کئی خواہشیں دبانی پڑتی ہیں۔ دھرم، گیان اور نیتی کے شاستروں تلے سچائی کا دم گھُٹ گیا ہے۔ اگر شاستروں میں انسان کے بھلے کی اتنی کالک پتی نہ ہوتی تو شاید انسان میں تھوڑی بہت انسانیت بچ رہتی۔ اچھا، ایک بات بتاؤ۔ ذرا سوچ کر جواب دینا۔ تمہیں انسان کی عقل اور اس کے گیان وگیان پر کتنا بھروسا ہے؟"

میں جلدی سے بولا، "مجھے پورا پورا بھروسا ہے۔ ایسا کوئی کام نہیں جو انسان نہ کر سکے۔"

Scanned with CamScanner

سائنس کی طاقت سے تو وہ سورج کو نیست و نابود کر سکتا ہے اور چاہے تو کوئی اور سورج آسمان میں جوڑ سکتا ہے۔"

وہ پھر تو وہ دن بھی دور نہیں جب گدھے، بھالو، سور، کتے، گیدڑ وغیرہ سبھی جانور انسان کی طرح بول، لکھ اور پڑھ سکیں گے۔ کیا کبھی گدھا بھی کتابوں کے پنے چاٹے گا؟

کیوں نہیں! وہ سویرا اب زیادہ دور نہیں ہے۔

وہ عجیب ہنسی ہنسا، گویا بڑا فلسفہ بگھار رہا ہو۔ ہنستے ہنستے بولا: وہ سویرا تو کب کا ہو چکا۔ انسان کی شکل میں کئی گدھے اور سور کتابیں لکھتے اور پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ پر میں اصل جانوروں کی بات کر رہا تھا۔

اس کے اس طرح ہنسنے سے میرا جوش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ بات کو سنوارتے ہوئے دھیرے سے بولا: میں اصل جانوروں کی ہی بات کر رہا تھا۔ تمھیں تو ہر وقت مذاق سوجھتا ہے۔

تب وہ سنجیدگی سے بولا: تمھارے منھ میں گھی شکر۔ میں اس دن کا انتظار کروں گا جب جانور میری یہ کہانی پڑھیں گے۔

"کیوں؟"

یہ کہانی پڑھ کر وہ نہ تو زندگی پر پچھتائیں گے اور نہ ہی انسان کی زندگی کی کامنا کریں گے۔

یہ سن کر میری آنکھوں کے آگے بجلیاں چمکنے لگیں۔ ان کی تیز چمک میں جھیل نہ سکا۔ ہتھیلیوں سے آنکھوں کے سامنے اوٹ کر لی۔ پر بابا کا چہرہ تب بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا۔ میرا دایاں ہاتھ کھینچتے ہوئے کہنے لگا: اب کاہلی چھوڑو، بڑی دیر ہو رہی ہے۔

تارے پھر جھلملانے لگے۔ ان تک انسان کی نظر پہنچ سکتی ہے، اس کا دل پہنچ سکتا ہے، مگر ساڑھے تین ہاتھ کا یہ جسم وہاں پہنچے تو کیسے؟ میں ہاتھ کھینچتے ہوئے کہنے لگا، "کاہلی نہ بھی کروں تو کیا ان تاروں تک تم مجھے کیسے لے چلو گے؟ میں بھی تو سنوں!

وہ دوبارہ کھلکھلاتے ہوئے بولا: میں تمھیں اندھیرے کی پلکوں پر بٹھا کر تاروں کے اجالے تک لے چلوں گا۔ اندھیرے کی طاقت جاننے سے کہیں بڑھ کر ہے! مجھے اندھیرا سب سے سندر اور پیارا لگتا ہے۔ اجالے کے سہارے سے مجھے سخت نفرت ہے۔

وہاں سے چلنے کے لیے کہا گیا۔ اندھیرے کی پلکوں پر بٹھا کر نظر کی رفتار سے آکاش میں

ڑنے لگا۔ میرے دل میں ڈر سما رہا تھا۔ ڈر مٹانے کے لیے میں یوں ہی بتیانے لگا، "بابا یہ کہانی کتنی پرانی ہے؟"

اچنبھے کی بات کہ بابا کے منہ سے الفاظ کے ساتھ کالے دھوئیں کے بادل نکلنے لگے۔ بولا: کئی چیزیں وقت سے پرے ہوتی ہیں۔ ان کے پہیے پر تینوں کال لپٹے رہتے ہیں۔ اس پر بھی تم جاننا چاہتے ہو تو یہ کہانی ریچ جتنی پرانی اور پھل جتنی نئی ہے۔ سمندر جتنی پرانی اور بادلوں جتنی نئی ہے۔ ڈوبتے سورج جتنی پرانی اور اگتے سورج جتنی نئی ہے۔ سمجھے؟

یہ پہیلیاں میرے بالکل پلے نہیں پڑیں۔ پھر بھی کہا، "ہاں سمجھ گیا۔"

بابا مجھے چٹکیوں میں تاروں کے بیچ لے جا پہنچا۔ وہاں گیارہ جیسی آدمی چپ چاپ بیٹھے تھے۔ بابا کو دیکھ کر وہ بے حد خوش ہوئے۔ میں حیرانی سے ایک ایک کی شکل دیکھنے لگا۔ سبھی چہرے ایک جیسے! ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ ہرے پتوں کا لباس۔ کسی میں بال برابر بھی فرق نہیں تھا۔ جیسے ایک ہی آدمی کے عکس ہوں۔

بابا میرے تیور پہچان گیا۔ کہنے لگا: فرق دیکھنے کی عادی تمہاری نظر کو شاید یہ یکسانیت اچھی نہیں لگی۔ یہ کہانی سنانے کے لیے دنیا کے کونے کونے سے انھیں بلایا ہے۔ ایک سانچے میں ڈھلا آدمی، ایک سے زیادہ کسی میں نہیں ملا۔ مٹی کی یہ خوبی ہے کہ لگاتار سوا کال پڑنے پر بھی وہ اپنی ریچ نہیں کھوتی۔ اتنی حیرانی سے کیا دیکھ رہے ہو؟ یہ واقعی انسان ہیں۔ ایک کے کانٹا چبھتا ہے تو سب کو درد ہوتا ہے۔ ایک کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر سب کی آنکھیں بھر آتی ہیں۔ ایک کی تکلیف سے سب دکھی ہوتے ہیں۔ اپنے جیسی پرائی سمجھتے ہیں۔

یہ کہتے کہتے وہ سب کے بیچ میں جا کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف چمکیلے تاروں کے بیچ چاند کی طرح! پھر بابا کے چاند جیسے منہ سے چاندنی جیسے بول پھوٹنے لگے۔ میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا: چار آدمیوں کی اس کہانی کے بہانے میں آج ہر ایک کی کہانی سنا رہا ہوں۔ دھیان لگا کر سنو!

***

کہیں سوکھا تو کہیں باڑھ، کہیں بوندا باندی تو کہیں موسلادھار۔ کہیں ندیاں تو کہیں نالے

رہے۔ کہیں پھوار تو کہیں اس کا بھی نہار۔ قدرت کے یہ بھید بھاؤ سب جانتے ہیں، پر وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ بادل جب برسنے لگتے ہیں تو کوئی فرق نہیں برتتے۔ وہ باغ بغیچوں اور کھوروں پر ایک ہی طرح سے برستے ہیں۔ کالی گھٹاؤں کی مہر سے نہ بستی بچتی ہے، نہ شمشان، نہ آگ دھتور، نہ ہم، نہ پھول نہ کانٹے، نہ گھاس نہ پتھر، نہ ٹیلے نہ تلیا۔ کالی گھٹاؤں میں چمکتی بجلیوں کے اجالے کے لیے کون چور اور کون ساہوکار! کون راجا اور کون رنک! تو بھگوان بھلے کو بھی اور برے کو بھی دن دے، کہ کسی بھادوں میں ٹھگوں کی ایک بستی پر لگاتار پانچ دن تک برسات ہوتی رہی۔ اوروں کے لیے تو بادلوں سے موتی برس رہے تھے، پر ٹھگوں کے لیے جیسے انگارے برس رہے تھے۔ کوئی راہ گیر آئے تو ٹھگنے کا موقع ملے! ایسی جھما جھم میں کون اپنا گھر چھوڑے گا! بستی کا بچہ بچہ بادلوں کو کوسنے لگا۔ ٹھگوں کا مکھیا بادلوں پر دانت پیسنے لگا ـــ بھگوان تو ٹھگوں کا بھی ٹھگ ہے۔ اس پر بس نہیں چلتا۔ پر کبھی پھندے میں آ گیا تو سارا گرجنا برسنا بھلا دے گا۔ لگاتار پانچ دن سوکھے نکل جائیں تو ٹھگوں کا گزارا کیسے ہوگا؟ اس پر ایسے مینہ میں گھر گھر لوگ جاگتے رہتے ہیں۔

یہ بے بسی مکھیا کے کلیجے کو چیر رہی تھی اور اس کی گھروالی کے من میں گود نہ بھرنے کی آگ سلگ رہی تھی۔ جوں جوں پانی برستا، یہ آگ اور بھڑک اٹھتی۔ برسات میں ساری دھرتی لہلہا اٹھتی ہے۔ چٹانوں کی دراروں سے انکر پھوٹتے ہیں۔ سوکھے پیڑ ہریالی سے لد جاتے ہیں۔ سوکھے ڈنٹھلوں سے بھی جڑیں نکلتی ہیں، پر اس کی کوکھ کی تو جیسے کونپل ہی جل گئی۔ ہر ٹونا ٹوٹکا آزما دیکھا، پر وہی ڈھاک کے تین پات! ست کنوئیوں کا پانی گئو موت کے ساتھ پیا۔ اس سے اشنان کیا۔ ہر منگل کو گڑ گھی کا روٹ ہنومان جی کو چڑھا کر جٹادھاری سادھوؤں کو کھلایا۔ تین بار نگری جلائی۔ سات بار لوگوں کی جھونپڑیوں میں آگ لگائی۔ بچوں کی لاشیں پانی میں دھو کر پیں۔ زچاؤں کے خون سنے کپڑے جلا کر انھیں چرن امرت کی طرح پیا۔ ماہواری کے گندے چیتھڑوں کی کتنی بھسم پھانکی۔ زچاؤں کی آنول دہلیز کے نیچے گاڑ کیں مرتبہ لانگھی۔ نہ جانے کتنی کھیجڑیوں پر لال چیتھڑے باندھے۔ کتنے بکرے چڑھائے۔ معصوم بچوں کے پاؤں تلے کی دھول چاٹی۔ ہے بھگوان، اس کی کوکھ اس قدر بانجھ کیوں رہی؟ اس موسم میں تو قدرت کا ذرہ ذرہ پھول پھول اٹھتا ہے۔ یہ نیم، یہ ببول، یہ بیر، سبھی تو منجریوں سے لدے پڑے ہیں۔

بجلی کی چمک نے دن کے اجالے میں جڑ کر اسے اور روشن کر دیا۔ اس کی کوکھ جیسے دھواں

دُھوں جمنے لگی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ جہاں تک نظر جاتی ہے ہریالی ہی ہریالی۔ باڑھ بھی بیلوں سے اس قدر ڈھک گئی ہے کہ ایک کانٹا تک نظر نہیں آتا۔ املتاس کی بیلوں کی گود میں ان گنت پھول لوٹ رہے ہیں۔ ککڑیوں کی بیلوں کے ننھے پھول تو آنچل چھوڑنا ہی نہیں چاہتے۔ آکھ پھوٹنی کی بیلوں کے گرو گمان کا کیا کہنا! تانتے تانتے پر بے شمار پھول کلکاریاں کر رہے ہیں۔ اس کا پتی آکاش کے تارے توڑ لائے، پر یہ بیرن کوکھ کسی چھل بل سے نہیں ٹھگی جا سکی۔

ٹھنڈی پھوار سے اس کی آنکھوں میں انگارے دہک اٹھے۔ اس کا بس چلے تو بیرن کی کوکھ کو آگ لگا دے۔

پاس ہی کہیں بچہ ہونے کی خوشی میں تھالی بجی۔ بادلوں اور بجلیوں سے بھی اس کی خوشیاں منائیں۔ تھالی کی جھنکار کے ساتھ ہی بادل گرجے اور بجلیاں چھاچھم ناچنے لگیں۔ پر اس کے کانوں میں کانٹے چبھنے لگے۔ برسات کے کھولتے تیل میں وہ بھننے لگی۔ بدحواس سی باڑھ کی طرف جھپٹی۔ دونوں ہاتھوں سے دنادن بیلیں توڑنے لگی۔ ہتھیلیاں لہولہان ہو گئیں۔ ڈھور ڈھور بیلوں کے ڈھیر لگ گئے۔ کانٹوں کی بدلے باڑھ کے زبان ہوتی تو وہ اسے دو بول سناتی۔ پر اس کے ہاتھوں ننگی ہو کر بھی وہ چوں تک نہ کر سکی۔

لیکن اس کی پیروی کرنے کے لیے کھیا کے منہ میں تو زبان تھی۔ پاس آ کر کہنے لگا، "باولی، یہ تو نے کیا کیا؟ ساری باڑھ بدرنگ کر دی۔ بیلوں نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟"

وہ سبک سبک کر رونے لگی۔ پتی نے ہاتھ پکڑ کر پیار سے پوچھا، "بتا تو سہی، بات کیا ہے؟ اچھی خاصی ہری بھری باڑھ کا ستیاناس کر دیا۔"

وہ روتے روتے بولی مانو آخری سانسیں گنتی گائے مرنے کی پیڑا بتا رہی ہو، "بتا بتا کر ہار گئی، پر تمھاری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ گود نہ بھرنے کا درد مرد کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ کیوں جلے پر نمک چھڑکتے ہو؟ بار بار کہنے سے بھی کیا فائدہ؟ کٹار سے پیٹ چیر کر اس میں پتھر رکھ دو تو کچھ شانتی ملے!"

اس کی یہ پانچویں عورت تھی۔ بے حد سُندر۔ روپ اور جوبن سے پھٹتا بدن۔ ہزار سُندریوں کا روپ ایک دیہہ میں سمائے بھی تو کیسے! پر چاہے لاکھ سُندر ہو، اپنی جورُو سے بیٹھا بولتے

Scanned with CamScanner

سے اسے چڑ سی تھی۔ کتّا اور جورو تو دُلارنے سے تلوے چاٹتے ہیں۔ پر اس کے روپ نے سارا غصہ بے دَم کر کے رکھ دیا۔ وہ تیس مہینے میں یاد آنے پر جبراً اٹھنے کا سوانگ رچانا پڑتا۔ بچھلا شغل کیے ہوئے ابھی ایک پکھواڑا ہی گزرا تھا، اس لیے شہد گھلے لہجے میں بولا، "پاگل کہیں کی! اس طرح برسات میں بھیگنے سے کیا ہوگا؟ بیلوں کی طرح عورتوں کی کوکھ پانی سے نہیں پھلتی۔ بھگوان کا لکھا کوئی نہیں مٹا سکتا۔ یہ روپ آنند بھوگنے کے لیے ملا ہے۔ ایسا موسم ہمیشہ نہیں آتا۔

اس نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑایا۔ بولی، "میری کوکھ میں تو آگ لگی ہے اور تمھیں آنند کی پڑی ہے۔ لگتا ہے اب میں پاگل ہو جاؤں گی۔ علاقے کے مانے ہوئے ٹھگ ہو، یہ چھوٹا سا کام بھی نہیں کر سکتے! لعنت ہے تم پر۔"

وہ چھیڑتے ہوئے بولا، "اس میں مَیں نے کوئی کسر رکھی ہو تو بتاؤ۔ پتھر پر بیج اور پانی ڈالنے سے اگر اس کی کوکھ نہ پھلے تو اس میں بیج اور پانی کا کیا قصور؟ پچھلی چاروں کی گود بھری تو ضرور تھی مگر پھلی نہیں۔ کوئی بچہ پانچ برس سے زیادہ نہیں جیا۔ میں گیارہ بچوں کا صدمہ جھیل کر بھی زندہ ہوں۔ بزرگوں کا علم بیٹوں کو سونپے بِنا ہی مرنا پڑے گا۔ تُو کیا سمجھتی ہے، مجھے اس کا کوئی دکھ نہیں؟ قسمت میں بدا ہوتا تو کوئی تو زندہ رہتا۔ تیرے روپ کے مارے تجھے چھوڑتے بھی تو نہیں بنتا۔ تیسری کو چھوڑنے کی بات کی تو جانتی ہے اس نے کیا جواب دیا؟ کہا کہ اس گھر میں اس کی ڈولی آئی ہے اور ارتھی ہی وہاں اٹھے گی۔ جیتے جی اپنے پاؤں سے چلی جاؤں گی یہ سپنے میں بھی مت سوچنا!

پانچ سال پہلے کی بات یاد کر کے بھی اس کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ آواز ذرا تیز ہو گئی۔ بولا، "پیچھے آئی عورت کی زبان سے ایسے بول بھلا کیسے سہتا! اس جیسی منہ پھٹ رانڈ کا اپنے پیروں چل کر جانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے اسی رات اٹھک رلی منا کر پوچھا: "بتا، شرافت سے چلی جائے گی یا ارتھی کا انتظام کروں؟

اس نے سمجھا میں مذاق کر رہا ہوں۔ مسکرا کر بولی کہ اب تو یہاں سے ارتھی ہی اٹھے گی۔ اس سے پہلے وہ ہرگز نہیں جائے گی۔ عورتوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ سوا اس کے بعد مرد ان کا زر خرید غلام ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ مسکان ایسی لگی جیسے کوئی ناگن مسکرا رہی ہو۔ فوراً پلنگ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ تلوار کی چمک دیکھ کر بھی وہ بے حرکت لیٹی رہی۔ سوچا ہوگا ابھی ابھی ہاتھوں سے چھوٹا

آدمی اس پر تلوار کیسے چلائے گا۔ اس کے اس وشواس سے میں ایک دم مدعا ہو گیا۔ سر ایک ہی جھٹکے میں گلا چاک کر دیا۔ سارا بستر خون سے بھیگ گیا۔ میں نے پھر پوچھا: بول، اپنے پاؤں چل کر جائے گی یا ارتھی پر؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ دھڑ سے الگ ہوا سر کبھی نہیں بول سکتا، میں نے صاف صاف سنا کہ وہ جائے گی ارتھی پر ہی۔ شاید وہ میرا بھرم تھا۔ سویرے وہ ارتھی پر ہی گئی۔ آدمی اپنی عورت کی اتنی بات رکھ لے، یہی بہت ہے۔

آسمان پر زوردار بجلی کڑکی۔ شگنی نے پتی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ اس کے سفید دانتوں کی ہنسی بھی بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔ چمکتے چہرے پر شور شور بارش کی بوندیں۔ اسے پتی کی صورت اور بھی سہانی لگی۔

وہ اس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنے لگا، جیسے بنا جانوروں کے کھونٹے اچھے نہیں لگتے، اسی طرح بنا عورت کے سیج بھی سونی سونی لگتی ہے۔ وہ شیطان کی خالہ ارتھی میں گئی تو میں اسی دن شام تک دوسری عورت ڈولی میں لے آیا۔ ایک رات بھی بے کار نہیں جانے دی۔

اس گاؤں میں آم کے درختوں کی قطار تھی۔ ان پر بیٹھی کوئلیں میٹھی آواز میں کوکنے لگیں۔ برسات کی جھڑی ویسے ہی لگی تھی۔ زمین پر بکھری بیلوں پر پیلے پھول اسی طرح چھٹا بکھیر رہے تھے۔ بدرنگ باڑھ میں برسات کا پانی بھر رہا تھا۔ بلتی ہوئی دھرتی مینڈکوں کے بہانے فضا میں ٹرٹر کی مٹھاس گھول رہی تھی۔

روپ جوبن کی طرح اس شگنی کے گلے کی مٹھاس بھی بے مثال تھی۔ مثل کے بنا جن میں بات سمجھنے کا مادہ نہیں، انھیں سمجھانا پڑے گا کہ اس کی آواز سن کر نمک مصری میں بدل جاتا تھا۔ اسے اپنے پتی کی ہوشیاری اور طاقت پر ناز تھا۔ وہ نمک میں مٹھاس بھر دے ایسے سُر میں بولی، "ابھی ابھی میرے من میں ایک بات آئی ہے۔ اسے پار لگا دو تو میرا آدھا جیون سپھل ہو جائے۔ کہیں سے ایک پیارا سا بچہ تو لا دو!"

"بچوں کا کیا! تو کہے جتنے لا دوں۔"

"پر بچہ ایک پکھواڑے سے زیادہ بڑا نہ ہو۔"

"اس کی چنتا مت کر۔ کہے تو ماں کے پیٹ سے بچہ نکال لاؤں۔ اس میں کیا جوکھم! ایک جادو ٹونا اور سہی۔ شاید چھوٹے بچے کا خون پینے سے کوکھ پھل جائے۔ اس دو سال کے بچے کو مارنا

Scanned with CamScanner

تو بالکل بے کار گیا۔ کمبخت تھا تو بیٹے بھر کا، پر چھڑی دیکھ کر کتنا رویا تھا۔"

کونپلیں پھر کوکیں۔ ہیدڑیں پھر تڑائے۔ وہ ان کی مٹھاس جذب کرتے ہوئے بولی، "اس دفعہ کسی ٹونے ٹوٹکے کے لیے میں نے بچہ نہیں مانگا ہے۔ جنتر منتر تو سب دیکھ لیے۔ مجھے گود بھرنے کی اب کوئی امید نہیں۔ کسی چھوٹے بچے کو پال پوس کر ماں کا سکھ پانا چاہتی ہوں۔ خود کے جائے کو بڑا کرنے اور پالنے کا سکھ شاید میرے بھاگ میں نہیں۔ اب تو دوسرے کے بچے ہی سے دل بہلانا پڑے گا!"

"تو جو کہے کرنے کو تیار ہوں، پر اتنا چھوٹا بچہ ماں کے دودھ بنا رہے گا کیسے؟"

"جتنا تمہیں اپنی عقل پر بھروسا ہے اتنا ہی مجھے اپنے ست پر بھروسا ہے۔ ایک کی جگہ تین بچے لے آؤ تو بھی میرے دودھ کی کمی نہیں ہوگی۔ بچوں کے ہونٹوں کا لمس پاتے ہی میری چھاتیوں میں دودھ نہ آئے تو میرا یقین مت کرنا۔ یہ میرے ست کی اگنی پریکشا ہی سہی!"

وہ ہنس کر بولا، "میں بھگوان رام جیسا مورکھ نہیں ہوں جو اپنی سیتا کے ست پر شک کروں۔ مجھے تو تیرے سچ پر ویسے ہی پورا پورا بھروسا ہے۔"

منہ کی بات کو وہیں ختم کر وہ پنجوں کے بل اچک اچک کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نظر اور سونگھنے کی طاقت گدھ سے بھی زیادہ تیز تھی۔ اچرج سے کہنے لگا، "اجنبی عورت کی گندھ کہاں سے آ رہی ہے؟ ایسی برسات میں کون ابھاگن راہ روند رہی ہے؟"

یہ کہہ کر وہ فوراً چھت پر چڑھا۔ وہ تھی اُتر سے ایک عورت نیلی اوڑھنی اوڑھے چلی آ رہی تھی۔ وہ اسی پھرتی سے نیچے اتر آیا۔ بیوی سے کہا، "میں اس عورت کے پاس جا رہا ہوں۔ ایسے موسم میں باہر نکلی ہے تو ضرور گھر سے جھگڑ کر آئی ہوگی۔ بھگوان کی مہر! میں ابھی اسے بہلا پھسلا کر یہاں لاتا ہوں۔ کافی مال ہاتھ لگے گا۔"

باہر نکلتے ہی کافی نیچے اڑتے بگلوں کی قطار اس کے اوپر سے نکلی۔ ان کے ڈینوں کی ہوا ٹھیک زمین تک آئی۔ اس نے اوپر دیکھا۔ کالی گھٹاؤں تلے اڑتے سفید بگلے! وہ دیکھتا رہ گیا۔ وہ قطار اڑتی ہوئی اس عورت کے سر سے بھی گزری، پر وہ اسی طرح اپنی دھن میں چلتی رہی۔ شاید اسے اس کا پتا ہی نہ چلا ہو۔

وہ عورت تھوڑی جھکی ہوئی، ڈگمگاتے قدموں سے بمشکل چل پا رہی تھی۔ نیلی اوڑھنی کا کچا

Scanned with CamScanner

رنگ نچوڑ رہا تھا۔ سر کا پلا کندھوں پر آ گرا تھا۔ کھلے ہوئے کالے بالوں سے پانی رس رس کر اوڑھنی پر آ رہا تھا۔ کیچڑ میں دھنسنے کے کارن جوتیاں ہاتھ میں لے رکھی تھیں۔ زیور کے نام پر سیس پھول، لونگ اور بالیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کسی کو آتے دیکھ کر بھی وہ ڈری نہیں۔ اسی طرح چلتی رہی۔ اس نے پاس آ کر پوچھا، "بہن، ایسی برسات میں کہاں جا رہی ہو؟ راستا تو نہیں بھٹک گئیں؟ ایسی کیا مصیبت آ گئی جو اتنی برسات میں گھر چھوڑنا پڑا؟"

وہ ہر موقعے کی بولی جانتا تھا۔ اس کی میٹھی بولی سن کر وہ رک گئی۔ اسے وہ بھگوان کا بھیجا ہوا دُوت نظر آیا۔ ڈر کی بجائے الٹے ڈھارس بندھی۔ پھر بھی اُس کی ہمدردی سے اس کے آنسو نکل آئے۔

اسے اس طرح روتے دیکھ کر اسے پورا یقین ہو گیا کہ یہ ضرور کسی آفت کی ماری ہے۔ آسانی سے جال میں پھنسے گی۔ دکھی انسان شیر کا بھی بھروسا کر لیتا ہے۔ کوئی دکھ موت سے بھی بدتر ہوتا ہے، پر اس قسمت کے دھنی سے موت بھی کتراتی تھی۔ یہ سب باتیں سمجھیا جاتا تھا۔

عورت نے ڈبڈباتی آنکھوں سے اس دیودُوت کو دیکھا — تربوز کی طرح گول چہرہ، تانبئی رنگ، بڑی بڑی آنکھیں، گھنی بھنویں، کانوں پر بالوں کی لچھیاں، آبنوسی بھری بھری داڑھی، لمبی اور تیکھی ناک، سر پر بندھی پگڑی سے چمکتا کیسریا رنگ۔ تربوز کی طرح اس کا کلیجا بھی میٹھا ہونا چاہیے، تبھی تو اسے روتے دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

وہ رُندھے گلے سے بولا، "بہن، تمھارے دکھ کا تو مجھے پتا نہیں، پر تمھیں روتے دیکھ کر میری آنکھیں بھی سُوکھی نہ رہیں۔ ایسی برسات میں جانور بھی اپنا ٹھکانا نہیں چھوڑتے۔ تم اکیلی عورت اس وقت کہاں جا رہی ہو؟ سسرال یا میکے؟ راستا بھٹک گئی ہو تو جہاں کہو گی پہنچا دوں گا۔"

وہ روتے روتے بولی، "سسرال سے دُکاری ہوئی کو میکے میں بھی آسرا کہاں؟ خود مرا نہیں جاتا اور موت آتی نہیں۔ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اب تو جہاں تقدیر لے جائے وہیں جانا ہے۔ اب بھیا، تمھیں کیا بتاؤں۔ مجھ پر جو گزری، وہ میں ہی جانتی ہوں۔ یہ اوپر والا بھی شاید نہیں جانتا۔ جانتا ہوتا تو آج میری یہ حالت نہ ہوتی۔"

وہ تھوڑا اور قریب آ کر بولا، "ذرا صاف صاف کہو، بات کیا ہے۔ کیے معلوم آدمی کے روپ میں میں ہی بھگوان ہوں۔ ڈرو نہیں، مجھے پوری بات بتاؤ۔ بیاہ ہوئے تو ابھی کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔

ایسی حالت میں تم نے گھر کیوں چھوڑا؟"

اس کی حیرانی کا اور چھور نہ رہا۔ اس نے یہ کیسے جانا؟ کہیں یہ ساکشات بھگوان ہی تو نہیں؟ اسے پتا نہ تھا کہ یہ ٹھگ ہے، اور ٹھگ کسی بھگوان سے کم نہیں ہوتا۔ زچہ کے شریر کی گندھ تو اس نے کافی دور ہی سے محسوس کر لی تھی ـــــ روکھے اور سوکھے بال، پیلی دیہہ، اور پِھر پستانوں سے ٹپکتا دودھ۔ اُسے سو لہ آنے یقین ہو گیا کہ وہ ابھی ابھی ماں بنی ہے۔

ادھر اس عورت کو بھی پکا وشواس ہو گیا کہ بھگوان نے اس کی سن لی۔ اس وشواس کے ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نیچے جھک کر اس کے پاؤں پکڑ کر کہنے لگی، "اب تم ہی میرے بھگوان ہو۔ پندرہ دن کے بچے کو گھر چھوڑ کر آئی ہوں۔ میرا من ابھی بھی اس کے آس پاس بھٹک رہا ہے۔ اپنی لوتھ کو گھسیٹتی، بڑی مشکل سے یہاں پہنچی ہوں۔ کسی طرح میرے بچے کو واپس دلا دو۔ اس کے بعد تو میں اس گھر کا پانی بھی نہیں پینا چاہتی۔"

مکھیا نے اسے باہوں سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ تسلی دیتے ہوئے بولا، "مجھے پوری بات بتاؤ۔ میں ضرور کچھ نہ کچھ کروں گا۔ میرا کہا مانو، میرے ساتھ چلو، تمھیں گھر پہنچا دوں۔ پتی کا گھر چھوڑنے پر تو موت بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ پتی کے ہاتھ کا زہر بھی اوروں کے امرت سے اچھا ہوتا ہے۔"

وہ آنکھیں مسل کر بولی، "میں اُن قسائیوں کے سامنے بہت گڑگڑائی کہ منے کے پاؤں پر چلنے تک مجھے یہاں رہنے دو، پھر جو وہ کہیں گے وہی کروں گی۔ بہت مارا تو بھی میں گھر سے جانے کو راضی نہیں ہوئی۔ مارتے مارتے تھک گئے تو انھوں نے نئی ترکیب سوچی۔ سنتے ہی میرا خون جم گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اب بھی وہاں سے نہیں گئی تو وہ منے کا گلا گھونٹ دیں گے۔ اپنے شریر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے پر بھی میں وہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی، جو یہ سن کر خود ہی اتنی دور آ گئی۔ جس کے کارن اتنا دکھ سہا، اسی کی زبان سے یہ بول سن کر یک بارگی وشواس نہیں ہوا۔ بہت چاہا کہ ایک دفعہ دیکھوں تو سہی، وہ کس سے، کیا کہہ رہا ہے۔ پر مجھ سے سر بھی نہیں اٹھایا گیا۔ اس کے باھوں کی مار سے بھی زیادہ اس کے یہ بول برے لگے۔ جیسے میں پہاڑ کے نیچے دب گئی ہوں۔ پھر اس کے ہاتھ پکڑتے ہی میں چپ چاپ گھر سے نکل گئی۔ مجھ سے اس وقت رویا بھی نہیں گیا۔ لگا جیسے موت اسی کو کہتے ہیں، ورنہ اتنی دیر منے سے الگ کیسے رہتی! تمھیں دیکھ کر احساس ہوا کہ میں ابھی مری نہیں۔ میرا تو کچھ نہیں، پر میرے بچے کا میرے بغیر کیا حال ہوگا!

مجھے سب باولی کہتے ہیں۔ کیا بولتی ہوں، مجھے خود دھیان نہیں رہتا۔ جانے کیا انٹ سنٹ بک گئی۔ تم تو بنا کہے سمجھنے والے ہو، پھر اتنا بتانے پر تو سب سمجھ گئے ہو گے۔

وہ اتنی دیر سننے سے زیادہ سمجھنے ہی کی کوشش کر رہا تھا۔ بولا، "نہیں، تم ہو تو بالکل بھولی ہی۔ جب اس دُشٹ نے تمہارے ساتھ گھات کیا تو تم نے سب کو اس کا نام کیوں نہیں بتا دیا؟ ساری اکڑ نکل جاتی۔ بھید کھل جانے کے ڈر ہی سے تو وہ تمہیں گھر میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔"

"یہی تو رونا ہے۔ اس نے مجھ سے وچن لے لیا تھا کہ میں یہ بات کبھی کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ اس نے دھوکا دیا تو کیا، میں دھوکا کیسے دیتی! توڑنا ہوتا تو وچن دیتی ہی کیوں!"

یہ کہہ کر وہ زور زور سے رونے لگی۔ "میرا منا بھی رو رو کر بے حال ہو گیا ہو گا۔"

بار بار اپنے بچے کے رونے کی بات کہتی جاتی اور خود روتی جاتی۔ اس نے جانے کیا سوچ کر اسے رونے سے روکا نہیں۔ شاید وہ دل ہی دل میں کوئی جگت بھڑا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اس نے آپ ہی رونا بند کر دیا اور بنا پوچھے ہی آپ بیتی سنانے لگی کہ ماں باپ نے اچھے کھاتے پیتے گھر میں اس کی شادی کی ــــ پتھر کی پانچ حویلیاں، ٹھسا ٹھس بھری تجوریاں، دودھ دہی کی فراوانی، سندر پتی۔ پر سسرال پہنچتے ہی اس کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔

سہاگ رات کو حویلی میں گھی کے دیے جل رہے تھے۔ خوشبوؤں سے ہوا مہک رہی تھی۔ اس کے شوہر نے تین سیر موتیوں کے تھال زیوروں سے سجا کر اس کے سامنے رکھے۔ ایک ایک گہنے کو ہاتھ میں لے کر اس کی قیمت بتاتے ہوئے کہنے لگا، "آس پاس کے علاقوں میں کسی کے پاس اتنا گہنا مل جائے تو اپنا نام بدل دوں۔ یہاں سورگ کے ٹھاٹھ ہیں۔ وہاں کوئی کمی ہو تو یہاں ہو۔"

دیے کی روشنی میں گہنے دمک رہے تھے۔ دلہن کے من میں بھی دمک کم نہیں تھی۔ کاروبار اور دھن دولت کا حساب دینے کے بعد اس نے ایک چھوٹی سی بات بتائی کہ وہ سویرے ہی دساور کے لیے نکل جائے گا۔ پتا نہیں لوٹنا کب ہو۔

یہ سنتے ہی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ گلا رُندھ گیا۔ پتی کے چہرے کی طرف ٹکر ٹکر دیکھتی بڑی مشکل سے یوں بولی، "جب آپ ہی یہاں نہ ہوں گے تو یہ گہنا میرے کس کام کا؟"

Scanned with CamScanner

یہاں رہ کر بھی یہ گہنا نہیں تو پہننے سے رہا! پہنو گی تو تم ہی۔ رات دن پہنے رہو تو بھی میں منع نہیں کروں گا۔ بیاہ کی وجہ سے کاروبار تو چھوڑا نہیں جا سکتا۔ اور یہاں رہا تب بھی دس برس تک تم سے الگ سوؤں گا۔ میں برنگ بلی کے منتر کی سادھنا کر رہا ہوں۔ دس برس تک تو میں عورت کے سائے کو بھی نہیں چھو سکتا۔"

اس نے سوچا، سب شرم کرنا بہت مہنگا پڑے گا۔ ایک ایک لفظ کو بڑی مشکل سے ادا کرتے ہوئے بولی، "منتر ہی سادھنا تھا تو بیاہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"تم تو بالکل بھولی ہو۔ بنا بیاہ کے وچن کو کیسے پورا کرتا؟"

بھولی دلہن سے پھر کوئی جواب دیتے نہیں بنا۔ یہ بات سن کر پتھر کی مورت میں بھی حرکت آ جاتی مگر وہ تو اُلٹے پتھر کی طرح خاموش ہو گئی

گہنوں کو حفاظت سے رکھ کر وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا، "نہ وچن سے ہٹوں گا نہ کاروبار کے لیے جانے سے رکوں گا۔ یہ سن کر تو تمھیں خوش ہونا چاہیے۔ تمھیں مجھ سے زیادہ بہت رکھنی ہے۔ اگر ذرا سا بھی پیر پھسلا تو پھر مجھ سا بُرا کوئی نہ ہوگا۔ کوئی ایسی ویسی بات سنی تو جان سے مارے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ اس گھر کی لاج اب تمھارے ہاتھ ہے۔"

وہ تُنک کر بولی، "مجھے مار ہی کیوں نہیں جاتے؟"

"تم سمجھیں نہیں۔ بے قصور کو تو قسائی مارتے ہیں۔ پر قصور ہونے پر میں بھی معاف کرنے والا نہیں۔"

ساری رات دلہن کو اچھی طرح سمجھا کر وہ سویرے ہی دساور کے لیے چل پڑا۔ پتی نے اتنا سمجھایا تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ سمجھی ہو گی، پر ساتھ ہی ساتھ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو بھی سمجھا جاتا تو اچھا ہوتا۔ باڑھ ہی جب کھیت کو کھانے لگے تو رکھوالی کون کرے۔ پہلے تو بھولی بھاوج کچھ سمجھی نہیں، پر جب سمجھی تو اس نے واپس سمجھانے کی بہت کوشش کی، پر دیور کچھ ماننے کو تیار نہ ہوا۔ دساور گئے پتی کی ساری نصیحتیں بتا کر کہا کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو وہ خود زہر کھا کر اپنی جان دے دے گی، پتی کے ہاتھوں مرنے کا انتظار نہیں کرے گی۔

بھابی کی بے رُخی اور ضد کے آگے دیور کا کوئی بس نہیں چلا۔ تب اس نے آخری پانسا پھینکا۔

اماوس کی رات کو وہ یوں ہی چھت پر کھڑی تھی۔ دیور کے آنے کا اسے کوئی احساس نہیں ہوا۔ تھوڑی دیر تو چپ چاپ کھڑا رہا، پھر اس کے بالکل قریب جا کر کہا، "ایک خاص بات تو بھول ہی گیا۔"

اس کے منہ سے وہ 'خاص' بات سن کر پہلے تو اس کی آنکھوں کے آگے اماوس کا اندھیرا بجلی کی طرح جل اٹھا اور پھر پہلے سے بھی دگنا اندھیرا چھا گیا۔ تارے اوجھل ہو گئے۔ شاید اس وقت اسے دکھائی دینا بالکل بند ہو گیا تھا۔ سہاگ رات کی طرح وہ پھر بالکل بت بن گئی۔

دیور نے خلاصہ کیا، "جنم سے تو کوئی خامی نہیں تھی، پر بچپن میں ایک حادثے سے ایسا ہو گیا۔ نگ سونے کے وچن کا تو فقط بہانہ ہے۔"

جیسے کسی منتر کے زور سے مورت بولی ہو، "گھر والوں نے سب جانتے بوجھتے یہ بیاہ کیوں کیا؟"

"گھر کی عزت رکھنے کے لیے بیاہ تو کرنا ہی تھا۔ لکھ پتی سیٹھ کا لڑکا کنوارا کیسے رہتا؟ اتنا تو تم بھی جانتی ہو۔"

پھر اس نے ہمت کر کے بھابی سے کہہ ہی دیا، "میرے رہتے تمھاری زندگی برباد کیسے ہو سکتی ہے! تم نہ مانو تو میں بھی کیا کروں!"

مورت میں واپس جان آئی، پر دل ہمیشہ کے لیے پتھر ہو گیا۔ سنی اماوس کی رات اس کے لیے پونم کا چاند اگ آیا۔

پر سویرے سورج اُگنے پر اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ دیور سے پوچھا، "پر تمھارے جیٹھ نے گھر کی عزت بچانے کے لیے جو ہدایت دی تھی اُس کا کیا ہو گا؟"

وہ بولا، "لکھ پتیوں کی عزت یوں آسانی سے نہیں جاتی۔ تم فکر مت کرو۔"

پل، گھڑی، پہر اور دن بیتتے بیتتے پورا برس بیت گیا۔ گھر میں دیور کے بیاہ کی بات چلنے لگی تو ایک دن اس نے پوچھا، "یہ میں کیا سن رہی ہوں؟ تمھیں بیاہ ہی کرنا تھا تو میرے ساتھ یہ کھیل کیوں کیا؟"

"گھر کی عزت کے لیے بیاہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ پہلے گھر کی عزت، پھر کچھ اور! تم بیکار فکر

Scanned with CamScanner

مت کرو، پہلے ٹھنڈے دل سے اس پر غور کرو۔'

اس نے کافی سوچا، پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ تب اس نے سوچنا ہی بند کر دیا۔ دیور ہی ٹھیک کہتا ہوگا۔

دیور کے بیاہ پر بھی اس کا پتی نہیں آیا۔ دھندے کے ساتھ ساتھ وچن بھی نبھانا تھا۔ بڑی دھوم دھام سے بیاہ ہو گیا۔ بہت سا جہیز ملا۔ اچھا کھانا پینا؛ کوئی کمی نہیں تھی۔ گھر کی عزت کا خیال کر کے مشتاق نے نئی بہو کو بہت پیار اور جوش سے بدھایا۔ بھابھی کی اس عقل مندی پر دیور بہت خوش ہوا۔

پر تین مہینے بعد اس نے بھابھی کو بہت سمجھایا، بہت سمجھایا، پر اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ وہ پہلی دفعہ بھابھی پر ناراض ہوا۔ غصے سے منہ سے جھاگ نکالتے ہوئے بولا، "خود کی عقل کام کرتی نہیں اور دوسرے کی بات مانتیں نہیں۔ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟ پڑوسی شک کرنے لگے ہیں۔ کیوں گھر کی عزت دھول میں ملانے پر تلی ہو؟ ابھی تک تو بات دبائی جا سکتی ہے۔"

جب دیورانی کے امید سے ہونے پر گھر کی عزت نہیں جاتی تو میرے امید سے ہونے پر گھر کی عزت کیسے جائے گی؟"

دیور نے سر پیٹ لیا۔ تمہیں اتنا بیوقوف نہیں سمجھتا تھا۔ سمجھا سمجھا کر تھک گیا، پر تمہاری کھوپڑی میں کچھ نہیں گھستا۔ اس میں اور تم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بھائی دساور بیٹھے ہیں اور یہاں تمہارے بچہ ہوگا تو خاندان کی ناک نہیں کٹے گی؟ عزت رکھنا کوئی بچوں کا کھیل ہے؟ میرا کہا مانو اور دائی کا کاڑھا پی لو۔ میں تمہیں غلط راستے تھوڑے ہی دوں گا۔'

سچ مچ وہ تو زہری مور کر نکلی۔ طیش میں بولی، 'اس رات تمہاری سمجھ کہاں چلی گئی تھی؟ یوں بات بات پر گھر کی عزت جاتی ہے تو جائے۔ دوبارہ یہ صلاح دی تو ٹھیک نہیں ہوگا۔'

اس کی ہمت کے سامنے وہ ایک دم پست ہو گیا۔ چکر سے آنے لگے۔ نڈھال ہو کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد پیشانی سے پسینا پونچھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ غصے سے ہکلاتے ہوئے کہنے لگا، 'یہ ضد بہت مہنگی پڑے گی۔ کہے دے رہا ہوں۔ اب بھی مان جاؤ تو اچھا ہے۔'

اسے نہ دیور کی باتیں سمجھ میں آئیں نہ اس کا غصہ۔ دھیرے سے پر مضبوط لہجے میں بولی،

میری سمجھ میں کچھ آئے تو مانوں! تمہاری یک بات رانی، وہی بہت ہے۔ تمہاری اس سمجھ کا اس دن پتا ہوتا تو میں باتوں میں آتی بھلا! آج معلوم ہوا کہ تم کیوں اس دن قسم دلانے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ پر اب ہو ہی کیا سکتا ہے۔

دیور بڑبڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا، پر تھوڑی دیر میں دیورانی نے آ کر جو بول سنائے انہیں میں سر گز دہرا نہیں سکتا! بابا میری طرف رکھتے تھوک نگل کر کہنے لگا: میں تو کیا، سانپ بھی بولنا سیکھ جائے تو ویسے شبد اپنی زبان سے نہیں نکال سکتا۔ بے چاری جٹھانی سر جھکائے سنتی رہی۔ دیورانی کی زبان کا سارا زہر چپ چاپ دل میں اتار لیا۔ اور وہ کر ہی کیا سکتی تھی! گالیوں کی بوچھار برساتی دیورانی نے جب دائی کے کاڑھے کی بات کی تو اس نے صاف انکار کر دیا۔

اس دن سے دیور کا رخ بدل گیا۔ خود اس نے بھابھی کو بہت لعنت ملامت کی۔ بہت سخت سست کہا۔ پتھر کے سینے میں دل ہوتا تو وہ بھی چیخ اٹھتا۔ پر وہ تو بالکل جیسے بہری ہو گئی ہو۔ یہ دیکھ کر دیور کو بالکل یقین ہو گیا کہ وہ مر کر بھی اپنے وچن سے نہیں پھرے گی۔ جب بھابھی اس طرح بالکل گونگی بہری ہو گئی تو وہ غصے میں بالکل اندھا ہو گیا۔ ایک دن اپنے بھائی کو چٹھی لکھی: 'آپ کی گائے دوسرے کے کھیتوں میں منہ مارنے لگی ہے۔ لوگ شکایتیں کرتے ہیں۔ ہمیشہ کھونٹا اکھاڑ دیتی ہے۔ کم اصل ہمارا بس ہی نہیں چلنے دیتی۔ آپ جیسا کہیں ویسا کریں۔'

بھائی کا فوری جواب آیا: "ایسی بدمعاش گائے کو ایک دن بھی اپنے یہاں مت رکھو۔ لوگوں کو شکایت کا موقع دینا ٹھیک نہیں۔

بھائی کا جواب پا کر اس نے گائے کو بہت ٹالنے کی کوشش کی، پر وہ گئی نہیں۔ اس نے ہار کر پھر لکھا: 'گائے بہت زیادہ شیطان نکلی۔ نہ کھونٹے پر بندھی رہتی ہے، نہ اوروں کے یہاں منہ مارنے سے باز آتی ہے اور نہ دھکے دینے پر بھی باہر نکلتی ہے۔ اب کیا کریں؟ بہت تنگ آ چکا ہوں۔ تمہاری مرضی کی گائے کو پٹا بھی کیسے جا سکتا ہے۔"

دساور سے فوراً جواب آیا: 'لوگوں کے یہاں منہ مارنے کے بعد وہ میرے من سے اتر چکی ہے۔ جو مرضی ہو کرو۔ تمہاری ہمت نہ پڑے تو میں آؤں۔'

فوراً آنے کا لکھنے پر بھی وہ جلدی نکل نہیں سکا۔ دھندا کس کے بھروسے چھوڑے! آج کل آج کل میں پانچ مہینے گزر گئے۔ اب وہ وہاں پہنچا تو گائے کو بیائے ایک بچھوڑا بیت چکا تھا۔

Scanned with CamScanner

ساری برادری میں ناک کٹ گئی۔ اس سے ایک دن پہلے ہی دیورانی کے بچہ ہوا تھا۔ خوب خوشیاں منائی گئیں۔ پر چنڈال جٹھانی نے اپنی ہٹ سے ساری خوشی پر پانی پھیر دیا۔ سارے خاندان کی عزت مٹی میں ملا دی۔ جب بُری ہونی ہونی ہے تو کسی سے پوچھ کر نہیں ہوتی۔ وہ دساور سے پہنچا تو اس سے ایک دن پہلے چھوٹے بھائی کا بچہ چل بسا۔ رو دھو کر صبر کیا۔ ہونی پر کس کا بس چلا ہے۔ پر مرنے والے بچے کی بہ نسبت اس زندہ کا دکھ بہت زیادہ تھا۔ غصے سے تڑپ کر کمرے میں سوری گھر والی کے پیٹ پر لات ماری۔ بولا، رنڈی، تجھے اتنا سمجھایا تب بھی تُو اپنے لچھنوں سے باز نہیں آئی۔ بتا کس کے کھیت میں منہ مارا؟"

لات کی چوٹ سے وہ دوہری ہو گئی۔ کافی دیر سانس ہی نہیں آئی۔ من میں آیا کہ صاف صاف کہہ دے کہ اس نے دوسرے کے کھیتوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ پر دھنی کی بات یاد آتے ہی اس کے ہونٹ سل گئے۔ وہ پوچھ پوچھ کر تھک گیا، پر اس نے بھید ہونٹوں پر نہیں آنے دیا۔ پھر دیور کے غصے کا کیا کہنا۔ دونوں بھائیوں نے باری باری جی بھر کر منت کی، پر گائے نے زبان نہیں کھولی۔ دونوں نے ہار کر اکیلے میں وچار کیا کہ بچہ تو دیورانی کا دودھ پی کر بڑا ہو جائے گا۔ پر اتنی دُھنائی کے بعد بھی چھناں یہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں ہوئی۔ اب تو ایک ہی ترکیب ہے، بیٹے کی موت کے ڈر سے شاید وہ ہتھے چڑھ جائے۔ یہ ترکیب چھوٹے بھائی کو سوجھی تھی۔ وہ نڈر ہو کر بھابھی کے پاس گیا اور اس کے بچے کو گلا گھونٹ کر مارنے کی دھمکی دی۔ یہ سنتے ہی ماں کا خون جم گیا۔

پر یہ ساری بات سن کر مکھیا کا خون کھول اٹھا۔ اس کی سرخی اور بڑھ گئی۔ سوچا، بھگوان سچ مچ من کا بھید جاننے والا ہے۔ دیا کا ساگر! تن کی آن میں خواہش پوری ہوئی۔ بیوی نے ایک پکھواڑے کے بچے کی بات کی اور وہ حاضر، جیسے بھگوان ہی نے بھیجا ہو۔ اب تو اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالے گا۔ آج ہی بھیروں کو بکرا چڑھائے گا۔ ایسی پاپن کا برسات میں تو کیا، آگ میں بھی کچھ نہیں بگڑے۔ چھناں کو کتنے سوانگ آتے ہیں۔ اس برسات میں کسی یار کی تلاش میں نکلی ہے اور اس کے سامنے اپنے مٹے کا رونا رو رہی ہے۔ خود بھگوان بھی چاہے تو عورت کے من کو نہیں سمجھ سکتا۔ گھر والی کی خواہش کے ساتھ ساتھ ترلو کی ناتھ نے اس کا بھی کتنا خیال رکھا! برسات میں بھیگی ہوئی اور زچہ خانے سے اٹھی ہوئی عورت کے ساتھ عیش کرنے کا بھی الگ ہی سرور ہے۔ اس

Scanned with CamScanner

کیفیت سے وہ اور بھی سرشار ہو اٹھا۔ اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔ پر چہرے سے شک کے من کا پتا چل جانے تو وہ شک ہی کیا۔ ایک گہری آہ بھر کر بولا، "سب بھگوان کی لیلا ہے۔ کل رات مجھے ہو بہو یہی سپنا آیا تھا۔ ہم پچھلے جنم میں پتی پتنی تھے۔ فقط ایک دوسرے کو پانے کے لیے ہی تمہیں اتنی مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ اگر بھگوان خواب میں درشن نہ دیتے تو میں اس برسات میں باہر کیوں نکلتا! مجھے تمہارے بے ہونے کا پتا کیسے چلتا؟ اور تمہیں میں ہی کیوں ملا؟ دنیا میں اور بھی تو بہت ہیں!"

اس نے تھوڑی ہی دیر میں اس کے من میں یہ بٹھا دیا کہ پچھلے جنم میں وہ پتی پتنی تھے، بھگوان نے اس لیلا کے بہانے انہیں ایک دوسرے سے ملایا ہے۔ بھولی سیٹھانی کی جلن ما نو دودھ سے دھل گئی۔ پر بیٹے کے لیے اس کا من اُسی طرح بے چین تھا۔ من کے لیے اس نے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ بولا، "تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں، میں سب سمجھتا ہوں۔ بیٹے کی فکر مت کرو۔ اسے تمہاری گود میں سونپ کر ہی دم لوں گا۔"

یہ سن کر اس کے دل میں ذرہ برابر بھی شک نہیں رہا۔ اب تو وہ خود انکار کرے تو بھی وہ یہ ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں کہ وہ پچھلے جنم میں پتی پتنی نہیں تھے۔

پھر بہلا پھسلا کر اس نے سیٹھانی سے دھن دولت اور لال بیٹے کی ساری باتیں جان لیں۔ منے کو لانے کے لیے جانے سے پہلے اس نے اس کے سامنے ایک ایسی مانگ رکھی، جسے بنا کہے ہی تم سب جانتے ہو۔ جب وہ تھوڑی آنا کانی کرتے ہوئے بولی، "ایک بار اپنے منے کو آنکھوں سے دیکھ لوں، پھر میاں بیوی ہونے کے ناتے یہ سب تو کرنا ہی ہے۔"

پر وہ نہیں مانا۔ کہا، "میں نے ہاں کر دی تو منا تمہاری گود میں آ ہی گیا سمجھو۔ یہ میری منشا تھوڑے ہی ہے، یہ تو بھگوان کا آدیش ہے۔"

تھکان اور کمزوری کی اُس حالت میں بھی بھگوان کے آدیش کو وہ کیسے ٹالتی! بے چارے انسان کی کیا ہستی کہ وہ بھگوان کی لیلا کا مقابلہ کرے! سسرال والوں کے لیے اس کی نفرت ایک دم ختم ہو گئی۔ دیور اس کے ساتھ گھات نہ کرتا تو یہ ملن کیسے ہوتا۔ بھگوان کے آدیش کا پالن کر کے مکھیا اسے اپنے گھر لایا۔ شاروں اشاروں میں پتنی کو ساری باتیں بتا کر منے کو لانے چل پڑا۔

بارش ابھی بھی جاری تھی دھرتی اسی طرح مینڈکوں کی ٹرٹر کے بہانے ہوا میں مٹھاس گھول

Scanned with CamScanner

رہی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں سے کوپلوں کا کوکنا بھی بدستور جاری تھا۔ ہر باڑے میں بکھری پڑی ببلوں کے پیلے پیلے پھول کچھ کچھ مرجھانے لگے تھے۔

ماں اپنا بیٹا پا کر کتنی خوش ہوئی یہ تو وہ خود بھی نہیں بتا سکتی، پھر میری کیا بساط! کوئی مرد ہزار سال تک منزماری کر کے بھی اس کی تھاہ نہیں پا سکتا۔ یہ گیان اور عقل کی بات نہیں ہے جو شبدوں میں بیان کی جا سکے۔ سیتھانی کو یک دم جیسے یقین ہی نہیں آیا کہ جسے وہ اپنا دودھ پلا رہی ہے وہ اس کا اپنا بیٹا ہے! کیا خواب فقط نیند میں ہی آتے ہیں؟ کھلی آنکھوں کوئی خواب آئے تو اسے کون روک سکتا ہے! چند لمحوں تک وہ ایک لفظ نہ بول سکی۔ اس کی بات اس آدمی جیسی ہو گئی جو اپنی موت کے تیرھویں دن پھر زندہ ہو جانے کی خوشی میں گونگا ہو گیا ہو۔ وہ بیٹے کی آنکھوں میں ایک ٹک دیکھتی رہی۔ وہ آنکھوں کی اصل روشنی تھی۔ فقط آنکھوں سے دکھائی دیتا ہی تو روشنی نہیں ہے۔ جن آنکھوں کو ایسی روشنی نصیب نہیں ہوتی وہ نظر ہوتے ہوئے بھی اندھی ہیں۔ دو گھڑی کے بعد وہ ٹھگیا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی، "کیا سچ مچ تم میرے بیٹے کو لے آئے؟ کہیں یہ میرا بھرم تو نہیں؟"

ٹھگ اور ٹھگنی اس پر زور سے ہنسے۔ ٹھگنی ہنستے ہنستے ہی بولی، "واہ! تمھارا بھی جواب نہیں۔ اپنے بیٹے کو اتنی دیر سے اپنا دودھ پلا رہی ہو اور ہم سے پوچھتی ہو کہ وہ واپس آیا کہ نہیں۔ ہم کہیں کہ وہ بھی تک وہیں ہے تو تم مان لو گی؟"

"کیوں نہیں۔ تمھارے کہنے کو جھوٹ کیسے مانوں! کسی بات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ سکوں اتنی مجھ میں عقل کہاں۔ تبھی تو سب مجھے بھولی اور مور کہ کہتے ہیں۔ بھولوں کی نظر کا کیا بھروسا۔ ہو سکتا ہے یہ میرا بھرم ہو۔ تم سمجھ دار ہو، تم کہو گے تو مجھے پورا یقین ہو جائے گا۔"

اور وہ تبھی ان کے کہنے سے اسے یقین ہو گیا کہ اس کا بیٹا اس کی گود میں ہے۔ اس یقین سے ماں کو پہلے سے بھی زیادہ خوشی ہوئی۔ کہنے لگی، "میں ہزار جنم بھی تمھارا احسان بھلا نہیں سکتی۔ اس خوشی میں کچھ نہ کچھ دینا چاہتی ہوں، پر میرے پاس کچھ ہے بھی تو نہیں۔ سونے کے سو پہاڑ دے دوں تب بھی کم ہے۔"

پھر وہ ایک دم اچھل پڑی۔ کہنے لگی، "آپ وہاں سے جو گہنے وغیرہ میرے لیے لائے ہیں

سب بڑی بی کو دے دیجیے۔ میں اپنے ہاتھ سے انھیں پہناؤں گی۔ یہ سیس پھول، لونگ اور بالیاں بھی میرے کس کام کے ہیں، یہ بھی تم لے لو۔ اس سے منے کا احسان تو نہیں اترے گا پر میرے من کو شانتی ملے گی۔"

یہ کہہ کر اس نے سچ مچ سیس پھول، لونگ اور بالیاں اتار کر دے دیں۔ پھر مکھیا کی طرف دیکھ کر بولی، "ان کھونوں سے تم منے کو لائے کیسے؟ انھوں نے کوئی حیل حجت نہیں کی؟ میں کتنی گڑگڑائی تھی پر وہ نہیں مانے۔ کیا انھوں نے خوشی خوشی یہ گہنے اور دولت سونپ دی؟ مجھے تو انھوں نے ان تین چیروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں لانے دیا، اور تم میرے نام سے یہ سب لے آئے؟ مجھے ٹھیک سے مانگنا بھی تو نہیں آتا!

ٹنٹ ٹنٹی مسکرائے۔ جیسے دودھ بنتا ہو! اسے ان کی مسکراہٹ بہت پیاری لگی۔

ٹنٹ بولا، "ابھی تو میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔ شام کو لوٹ کر بتاؤں گا کہ کیسے منے کو لایا اور کیسے اتنا مال ہاتھ لگا۔"

پھر بات بدل کر کہنے لگا، "تمہارے اتنا کہنے ہی سے میں نے سب کچھ پا لیا۔ تمہارا ہو یا میرا، ایک ہی بات ہے۔ سب دن ایک سے نہیں رہتے۔ میں تمہارے لیے ہی یہ سب لایا ہوں۔ میرے لیے تو یہ مٹی برابر ہے۔ اسے سنبھال کر رکھو۔ پر ہاں، تمہارے سسرال والوں کا نام تو بہت ہے۔ ان کے پاس بس اتنا ہی مال ہے؟"

بھولی سیٹھانی نے سب بتا دیا کہ کہاں کیا کیا چھپا ہے۔

ٹنٹی کی چھاتیوں میں واقعی دودھ آ گیا تھا۔ سیٹھانی نہانے گئی تھی۔ چھاتیاں کھول کر منہ میں دیتے ہی وہ ململا کر دودھ پینے لگا۔ اس کا درکنار روپ اور کسمساتا جوبن کچھ سار ٹھنک ہو۔ اس کا یہ سکھ بھی گوارا تھا۔

مکھیا جب جانے لگا تو وہ اسے باہر تک چھوڑنے گئی۔ یہ جتنی بھولی لگتی ہے اتنی ہے نہیں۔ اس کے جھانسے میں مت آنا۔ ایسی پاپن کا منہ دیکھنے سے ہی پاپ لگتا ہے۔ میرا کہا مانو، آج رات ہی کو اس کا کام تمام کر دو۔ اس منحوس کے آنے سے کہیں اپنے گھر کوئی انہونی نہ ہو جائے۔ جو اپنے پھوٹے بھاگ سے لکھپتیوں کے گھر بھی آرام سے نہ رہ سکی، وہ ہمیں کیا نہال

کرے گی؟ پھوٹے گھڑے کے لاکھ لگتی ہے پر پھوٹے جاگ کے نہیں۔"

وہ مسکرایا۔ "تجھے تو سے کار وہم ہوتا ہے۔ اس ابھاگی کے آنے سے ہمارے پو بارہ نہیں ہو گئے ہیں؟ تیری خواہش کہتے ہی پوری بھی ہو گئی۔ سنا مال ہاتھ لگا اور لگتا ہی جا رہا ہے۔ سارے مال کا سراغ لگ گیا۔ اب میں ان بجڑوں کے پاس کیا چھوڑوں، سیدھا وہیں جا رہا ہوں۔ شام کو پھر اتنا ہی مال لے کر آؤں گا۔ یہ برسات تو خوب ہوئی۔ سات پیڑھیوں کا انتظام کر گئی۔ ابھی کمبخت سے کالی باتیں معدوم کرنی ہیں۔ تو جلدی مت کر۔"

"یہ کیوں نہیں کہتے کہ تم اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانا چاہتے ہو۔ مجھ سے من بھر گیا ہو تو صاف کہہ دو۔"

اس کی ٹھوڑی کو ذرا اوپر اٹھا کر وہ کہنے لگا، "کیا بات کرتی ہے! باؤلی، بھلا تجھ سے بھی کسی کا من بھر سکتا ہے؟ تیرا روپ چھوڑ کر بھلا اس لوندے سے لپٹوں گا! وقت موجب سوانگ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ ٹھکانے تو لگانا ہی ہے۔ اس میں کہنے کی کیا ضرورت؟"

اس نے منے کو دودھ پلاتے پلاتے سوچا، اب انھیں کیسے سمجھاؤں کہ اس کے کھانے کی کتنی ضرورت ہے۔ سوئی نہاتے ہی منے کو لے گئی۔ اب اس سے ایک پل بھی دور نہیں رہا جاتا۔

اس معصوم بچے کو کچھ پتا نہیں کہ اسے لے کر کیا کیا گزری ہے۔ پتا ہوتا تو وہ ماں کی کوکھ ہی میں بھسم ہو جاتا۔ اگر جنم کے بعد ہی کسی کو یہ الہام ہو جائے کہ وہ بڑا ہو کر کیا کیا کارنامے کرے گا تو کبھی بڑا نہ ہو۔ پر جب وہ کارنامے کرنے لگتا ہے تو اسے کچھ خیال نہیں رہتا۔

سیٹھانی نہا کر آئی تو اس نے پوچھا، "منے کو میں کھلاؤں؟" وہ بالوں سے پانی جھٹکتے ہوئے بولی، "بھلا اس میں پوچھنا کیا! تمھارا ہی بیٹا ہے۔ خوب کھلاؤ۔ مجھ میں اور تم میں کیا فرق۔ تم بھی تو اس کی ماں ہو۔"

نگوڑی کو اپنے جائے کا اتنا گھمنڈ ہے۔ لاج شرم سے تو واسطہ ہی نہیں۔ مرد دیور کے ساتھ عیش کرتے شرم آئی نہ اس گھر کی مالکن بنتے۔ جیسے سات پھیرے کھا کر آئی ہو۔ منتی ایسے ہے جیسے کچھ سمجھتی ہی نہیں۔ چھنال کے لچھن ہی عجب ہیں۔ ان سے کہہ کر آج ہی ٹھکانے لگوا دوں تو اچھا ہے۔ وہ پتی کی راہ دیکھنے لگی۔

Scanned with CamScanner

دوسرے دن وہ گھڑی رات ڈھلے مکھیا کافی لمبا ہاتھ مار کر لوٹا۔ سیٹھانی کے سامنے گٹھری کھول کر بولا، "مجھے اب بھی ان نالائقوں پر بھروسا نہیں۔ اچھی طرح دیکھ کر بتاؤ، پیچھے کچھ رہ تو نہیں گیا۔ میں جانتا ہوں دھن کا لوبھ اتنی آسانی سے نہیں چھوٹتا۔"

اس نے اچھی طرح دیکھ بھال کر کے کہا، "تم نے تو پیچھے کچھ بھی نہیں چھوڑا! اب ان کا گزارا کیسے ہوگا؟ میں اتنے دھن کا کیا کروں گی۔ میرے لیے تم نے اتنی جوکھم اٹھائی۔ میرا کہا مانو یہ گٹھری لوٹا دو۔ میں نے تو بیٹے کو پا کر سب کچھ پا لیا۔ انھیں دھن دولت کا موہ ہے بھی بہت۔ ان کی تو جان نکل گئی ہوگی۔"

"میں نے تو تمھارے لیے اتنی جوکھم اٹھائی اور تم ابھی تک اُنھیں کا رونا رو رہی ہو۔"
شنّی منہ بگاڑ کر بولی، "بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں۔ تمھیں کیا پڑی تھی۔ تمھیں کچھ ہو جاتا تو میرا کیا ہوتا۔"

وہ بغلیں جھانکنے لگی۔ بولی، "مجھے بولنے کا شعور نہیں۔ تبھی تو میں باؤلی کہلاتی ہوں۔ میرے کہے کا کچھ برا مت ماننا۔ میں نے تو یوں ہی کہا تھا۔ برا لگا ہو تو معافی چاہتی ہوں۔"
شنّی نے سوچا، حرام زادی کتنی چالیں جانتی ہے۔ جس کے من میں جتنا پاپ ہوتا ہے اس کی زبان اتنی ہی میٹھی ہوتی ہے۔

مکھیا نے شنّی کو دارو لانے کا اشارہ کیا۔ چوبارے کی دارو سونگھتے ہی ناک اور آنکھوں میں پانی آ جاتا ہے، پر وہ ایک ہی سانس میں پورا پیالہ خالی کر گیا۔ ایک کے بعد ایک تین پیالے چڑھانے سے وہ سرور میں آیا۔ پر کتنے ہی نشے میں ہو، آپے سے باہر نہیں ہوتا تھا۔ اُلٹے عقل کچھ زیادہ تیز ہو جاتی تھی۔ ہاں، آنکھیں ضرور کچھ سرخ ہو جاتیں اور زبان لڑکھڑانے لگتی۔

دارو کا ایک بڑا گھونٹ بھر کر وہ سیٹھانی سے کہنے لگا، "تمھیں بتاتا ہوں کہ مثال اور اتنا مال میں کیسے لایا۔ دنیا کا دستور ہے کہ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا پہلے میں نے شرافت سے بات کی، پر دونوں بھائی اُلٹے مجھ پر سوار ہو گئے۔ دھمکی دی کہ میں نے پھر بیٹے کا نام لیا تو زبان کھینچ لیں گے۔ مجھے دیکھتے ہی چھوٹا بھائی واویلا کرنے لگا: یہی آدمی ہے اس کا یار! بھلا پاپ کہیں چھپ سکتا ہے! اس نے نام نہیں بتایا تو کیا، وہ خود چل کر سامنے آ گیا۔ خود کا داؤ نہیں لگا تو اپنے یار کو آگے

Scanned with CamScanner

کر دیا۔ یا تو جیسے آیا ہے ویسے ہی چلتا بن، ورنہ چھٹی کا دودھ یاد دلا دیں گے۔ یہاں کیا ہاتھوں میں چوڑیاں پہن رکھی ہیں؟"

ایک اور بڑا گھونٹ بھر کر وہ آگے کہنے لگا، "مجھے بھی تاؤ آ گیا۔ غصہ تو اتنا آیا کہ دل ہوا کہ سالوں کو جوتے مار مار کر کھوپڑی گنجی کر دوں۔ پر تمہارا پتی اور دیور ہونے کی وجہ سے غم کھا گیا۔ ہاتھ پکڑ کر تمہارے دیور کو ایک طرف لے گیا اور حقیقت بتائی تو وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ جیسے ایک ہی سانس میں کسی نے منتر پھونک کر اس کے سارے جسم کا خون ہی چوس لیا ہو۔ چہرہ زرد ہو گیا۔ بڑی مشکل سے اتنا بولا: بینے کو لے جاؤ۔ میری مناہی نہیں۔ تمہارے پاؤں پڑتا ہوں، بھیا کو کچھ مت بتانا۔ اسے وہیں کانپتے چھوڑ میں بڑے بھائی کے پاس گیا اور کہا: سالے گیدڑ کی اولاد! تیرے بھی دانت نکل آئے۔ ہیجڑوں کو بھی عورت چاہیے! عورت کو روکنے کے لیے پیسے کا نہیں ٹانگوں کا زور چاہیے۔ وہ بھی تھر تھر کانپنے لگا۔ فوراً بینے کو لے جانے کی اجازت دے دی۔ میں مال متے اور گہنوں کی بات کی تو دونوں صاف مکر گئے۔ بولے، ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ دو پیسوں کی مجوری کر کے بڑی مشکل سے پیٹ پالتے ہیں۔ پر دو جوتے پڑتے ہی سالوں کی عقل ٹھکانے آ گئی۔ مار کے آگے تو بھوت بھی بھاگتے ہیں۔ پھر بھی دیتے وقت حرام زادوں کی نانی مر رہی تھی۔"

سیٹھانی نے گھبرا کر پوچھا، "سب کے سامنے تو وہ بھید نہیں کھول دیا؟"

"میں اتنا بے وقوف نہیں۔ ایک بار پردہ فاش ہونے کے بعد اپنے پاس کیا رہتا ہے۔ ضرورت ہوئی تو اس سے بھی پیچھے نہیں مٹوں گا۔ ابھی تو اس کی دھمکی ہی سے کام چل رہا ہے۔ تم اس کی چنتا مت کرو۔"

اس نے ایک دو باتیں اور پوچھیں تو وہ بولا، "اب باقی باتیں اکیلے میں ہوں گی۔ کئی باتیں سب کے سامنے کہنے کی نہیں ہوتیں۔"

اس کا ہاتھ تھام کر جب وہ جانے لگا تب شگنی بتی کو ہدایت دینے کے لیے سیٹھانی سے کہنے لگی، "آج نہیں نشہ زیادہ ہو گیا ہے۔ ذرا خیال رکھنا۔"

سیٹھانی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا، پر وہ اس کا اشارہ تُرنت سمجھ گیا۔

Scanned with CamScanner

رنگ رلیوں کے بعد وہ پلنگ سے اٹھا اور کھونٹی سے ننگی تلوار کی موٹھ پکڑ کر دہکتی آواز میں بولا، "جس نے اپنے پتی کو دھوکا دیا، وہ مجھ سے کیا نبھائے گی؟ نہ تو اتنی نادان ہے نہ میں۔"

ننگی تلوار کی چمک دیکھ کر وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔ بولی، "تم تمھارے سر پر ابھی شیطان سوار ہے۔ تبھی بڑی بی نے تمھارا خیال رکھنے کو کہا تھا۔ ویسے تم مارنا چاہتے ہو تو مجھے تمھارے ہاتھوں مرنا ہی ہے۔"

پہلے تو وہ سمجھی وہ یوں ہی نشے میں بہک رہا ہے۔ پر دوسرے ہی پل اسے اپنے ساہوریا کی آنکھوں میں یمراج تانڈو نرت کرتا نظر آیا۔ آنکھوں کے عین سامنے تلوار کی چمک میں موت ناچ رہی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی، "ایک بار بیٹے کا چہرہ ..."

گردن کے ساتھ بات بھی کٹ گئی۔ ایک ہی جھٹکے میں سر دور جا پڑا۔

س وقت منا ٹھگنی کی چھاتی سے لگا دودھ پی رہا تھا۔

پنے بیٹے کا چہرہ دیکھنے کی آرزو دل میں لے کر وہ سہاگن ماں سورگ گئی یا نرک، یہ کون کہہ سکتا ہے۔ بیٹے کو تو ماں کے مرنے کا بھی دھیان نہیں تھا۔ کہاں جنم اور کہاں پلا، اس لوتھ کو کچھ علم نہیں تھا۔ پر رفتہ رفتہ اس اَبوجھ پن میں سمجھ کا اضافہ ہونے لگا۔ وہ دن بدن دُوج کے چاند کی طرح بڑھنے لگا۔ نئے ماں باپ دن میں دس بار اس کی نظر اتارتے، کئی جادو ٹونے کرتے۔

انسان کے لائق۔ انسان کی اصلی عمر فقط دو برس کی ہوتی ہے۔ انسان کی طرح بولنا سیکھتے ہی وہ دنیاداری کے لچھن سیکھنے لگتا ہے۔ ان لچھنوں کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ انسانیت گھٹنے لگتی ہے۔ اس لیے انسان دو برس سے کم جیے تو برا اور زیادہ جیے تو بھی برا۔ دو برس کی پوری عمر پا لے، بس، اتنے ہی میں اس کا جینا سپھل ہو جائے۔ پر وہ تو ہزار برس جینے کی آرزو کرتا ہے۔

بابا اپنے تلوے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آگے کہنے لگا: مجھ سے پوچھو تو انسان جتنا کم جیے، اتنی اس کی زندگی لمبی ہوگی، اور جتنا زیادہ جیے اتنی ہی اس کی زندگی چھوٹی ہوگی۔ ایک اچرج کی بات اور، کہ جانور تو ایک ہی جُون جیتا ہے پر انسان اپنے گیان کے بوتے پر کئی جُون ایک ساتھ جیتا ہے۔ سانپ کی، گدھے کی، کتے کی، شیر کی، سیار کی، بھالو کی، لومڑی کی، اجگر کی، چوہے کی،

نیولے کی، چھپکلی کی، بچھو کی، کوّے کی، عقاب کی، باز کی، کبوتر کی، بگلے کی، گدھ کی، چمگادڑ کی۔ کیا کیا گنواؤں۔ سب جانوروں کی مکاری، برائیاں اور درندگی اس اکیلے انسان میں ہے۔ موت کے نام سے انسان خوف کھاتا ہے، پر میرے خیال میں موت انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت ہے۔ مر کر سورگ یا نرک تو کس نے دیکھا، پر اسے کوئی دکھ تو نہیں اٹھانا پڑتا۔ موت کے بعد اسے اچھے یا برے کرم کرنے کا موقع نہیں ملتا، یہ کیا کم بات ہے۔ اگر میں کہیں کا راجا بن جاؤں تو انسان کا قتل کرنے والے کو بھرپور انعام دوں اور بے چارے کا علاج کرنے والے وید حکیم کو پھانسی۔

سیٹھ جی کا گلا چاک کرنے والے بھیا پر تم قطعی غصہ مت کرنا۔ درصل اس نے اس کے دکھوں کا ہمیشہ سے خاتمہ کر دیا۔ اس کا سنا دو برس بعد نہیں رہا، بلکہ دنوں دن اس کی سمجھ اور عمر بڑھنے لگی۔ ٹھگوں کے گاؤں کی آبادی میں پہلے اس نے انساں کی بولی سنی، اور کبھی اور پھر توتلی زبان میں بولنے لگا۔ بولنا سیکھنے کے ساتھ ہی اس کی سمجھ تیزی سے بڑھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے وہ سولہ برس کا ہو گیا۔ عمر چھوٹی ہوتے ہوئے بھی وہ ہر بات میں سب سے آگے تھا۔ بارہ برس تک وہ فقط دودھ پر پلا۔ اناج کا دانہ بھی منہ میں نہیں ڈالا۔ اس کے بعد ماس پر۔ وہ لڑکپن ہی میں بھرپور جوبن دکھائی دینے لگا۔ اپنے برابر والوں کو سامنے ٹکنے ہی نہ دے۔ دھکا دے تو ہاتھی کو گرا دے۔ ماں باپ اسے دیکھ کر پھولے نہ سماتے۔ سوچتے ملک میں یہ گاؤں کا نام روشن کرے گا۔ گاؤں کے بزرگ بھی اس سے وقت بےوقت صلاح مشورہ کرتے۔ گاؤں میں نئی جوانی آئی۔

ایک دن کندھے پر تیر کمان اور ہاتھ میں تلوار لیے وہ ماں باپ کے پاس آ کر کہنے لگا، "بابا، میں نے اپنی پشتینی ٹھگ وِدیا تو اچھی طرح سے سیکھ لی۔ اس میں کوئی دم نہیں میں تو ڈاکے ڈالوں گا۔ اس بزدلی کے دھندے میں میرا من نہیں لگتا۔ ٹھگ کا تو نام ہی برا۔ یا تو نامی ڈاکو بنوں گا یا راجا۔"

باپ اہستہ مرد تھا، سن کر دل تو ضرور بیٹھا پر جیسے تیسے ضبط کر گیا، لیکن ماں پر جیسے بجلی گری۔ کلیجا نکالنے پر بھی شاید اتنا درد نہ ہوتا، جتنا اپنے بیٹے کے یہ بول سن کر ہوا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر باپ نے کہا، "کیا یہ دن دیکھنے کے لیے تجھے پال پوس کر اتنا بڑا کیا تھا؟

جب سن کر ہی ہماری یہ حالت ہو گئی تو تیرے جانے پر کیا گزرے گی؟ کبھی سوچا ہے؟"

وہ جیسے اس کے لیے تیار ہی تھا۔ فوراً جواب دیا، "میں تو پہلے ہی سے یہ سب سوچے بیٹھا ہوں۔ اس طرح سوچنے لگیں تو اس دنیا کا کاروبار ایک پل بھی نہیں چل سکتا۔ جنھیں ہم ٹھگتے ہیں ان کے من کی سوچیں تو ہم ٹھگائی کر سکتے ہیں؟ سوچنا سمجھنا سب اپنے اپنے مطلب سے ہے۔ ایسی اُول جلول باتیں اگر شیر سوچنے لگے تو کیا وہ شکار کر سکتا ہے؟ سانپ کسی کو ڈس سکتا ہے؟ چور چوری کر سکتا ہے؟ کوئی انسان دوسرے کو ستا سکتا ہے؟ مار سکتا ہے؟ تم نے کبھی کسی کو دکھ نہ پہنچایا ہوتا تو میں تمھاری بات ضرور مانتا۔ اپنے سکھ دکھ کا دھیان تم خود ہی رکھو۔ مجھے تو اپنے سکھ دکھ کے آگے کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

اتنی دیر بعد ماں کا منہ کھلا۔ "اپنا خون ہوتا تو آج یہ بول نہ سننے پڑتے۔ پرائے خون پر بے کار آس لگائی۔"

یہ سن کر بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ سورج جیسی ہنسی ہنستے ہوئے بولا، "یہ تو تمھیں جانتے ہو میں تمھارا خون ہوں یا پرایا۔ میں نے تو آج تک تمھیں اپنے سگے ماں باپ ہی سمجھا۔ اپنی اولاد کو تو سبھی پالتے ہیں۔ پر تم نے ایک پرائے بچے کی پرورش کی، یہ بہت بڑی بات ہے۔"

ٹھگوں نے سوچا یہ تیر نشانے پر لگا۔ ٹھگیا نے ساری بات تفصیل سے اسے بتائی کہ کیسے اس کی ماں اسے ملی اور کیسے اس نے اس کو ٹھگا اور اس کے ساتھ عیش کرنے کے بعد کیسے اس چھنال کا گلا کاٹ دیا۔ اپنے بیٹے کا منہ دیکھنے کی خواہش پاپن کے من ہی میں رہ گئی۔ اپنے ہاتھوں پال پوس کر بڑے کیے بیٹے سے اس نے کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ پر سن کر بیٹے کا دماغ گھوم گیا۔ دانت پیستے ہوئے اُس نے فقط یک بات پوچھی، "کیا سچ مچ عیش کرنے کے بعد تم نے میری ماں کا گلا کاٹا؟"

ماں بیچ ہی میں ہمت کر کے بولی، "تو کیا تیرے باپو جھوٹ بولتے ہیں؟"

وہ غصے کے مارے سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا۔ کانپتے ہاتھوں میان سے تلوار نکالی۔ کانپتی آواز سے بولا، "جس ماں کو دیکھ تک نہیں اس کا بدلہ تو تم سے کیا لوں۔ پر سب جان جانے کے بعد تمھیں معاف کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ مارنے سے تو تمھارا کلیان ہو جائے گا۔ اس پاپ کو زندہ رہ کر بھگتنا ہی تمھاری سزا ہے۔"

پھر اس نے ان کے ہاتھ پیروں کی انگلیاں، ناک، کان اور ہونٹ کاٹ ڈالے۔ گھر کا تمام گہنا روپیا پیسا لے کر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گاؤں چھوڑ گیا۔

شام کا گلابی ویلا۔ ڈوبتے سورج کے چاروں اور کس نے اتنا گلال برسایا۔ گھونسلوں میں ماں کی راہ دیکھتے پرندے چیں چیں کرتے تیزی سے آجا رہے تھے۔ چراگاہ سے لوٹتے ڈھور ڈنگروں کے کھروں سے اڑتی دھول آسمان میں چھانے، گلاب کو دھندلانے لگی۔ ڈکارتی گائیں بستی کی اور تیزی سے لوٹ رہی تھیں۔ برسوں تک رات دن دھما چوکڑی اور اچھل کود کرنے والے ساتھی پیچھے رہ گئے۔ کبڈی، ستولیہ، جھرنی، آنکھ مچولی، سولہ ساری، چربھر اور چوپڑ کی میٹھی یادیں چھوڑ کر وہ ایک انجانی منزل کی طرف ایک ایک قدم آگے بڑھتا گیا۔ بستی سے باہر نکلتے ہی بائیں بازو پر کوئل کوکی۔ شگون تو بڑھیا ہوا۔ تھوڑا آگے جانے پر سامنے سے دو سوہنی آتی دکھی۔ اسے میں بار تلوار سے چھو کر وہ آگے بڑھ گیا۔ ریاست فتح کرنے جیسا جوش ہے۔ اس کے من میں کسی طرح کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔

شگون ماننے والو شگون مانو اور نہ ماننے والو بالکل مت مانو۔ میں تو تمھیں جو ہوا وہ بتاتا ہوں کہ کچھ دنوں میں اس یتیم لڑکے کی ایسی دھاک جمی کہ بڑے بڑے تیس مار خاں اس کے نام سے کانپنے لگے۔ اس کی سن گن ہی سے جنگل میں چوکڑی بھرتے ہرن لنگڑے ہو جاتے۔ شریر بچوں کی مائیں اس کا نام لے کر ڈراتیں۔ ایک سو آٹھ آدمیوں کا جتھا لے کر وہ جدھر کوچ کرتا ادھر کہرام مچ جاتا۔ گھر گھر میں رونا پیٹنا اور چیخ پکار مچ جاتی۔ جان بچانے کے لیے بڑی مونچھوں والے سورما پہلے ہی اس کے چرنوں میں دستوری چڑھا دیتے۔ وہ نہ چھوٹے کو چھوڑتا نہ بڑے کو، نہ غریب کو نہ امیر کو۔ اس کی تلوار ہر دن نیا خون چکھتی ـــ بوڑھوں کا، بچوں کا، جوانوں کا۔ انسان کے نام ہی سے اسے نفرت تھی۔ ڈاکوں کے لیے کیسا رشتہ، کیسی رعایت۔ وہ اپنے علاقے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ پیچھے خزانے میں بے شمار دولت جمع ہو گئی۔ وہ اپنی ریاست قائم کرنے کی سوچنے لگا۔ دو ایک برس اور ڈاکے ڈال لے، پھر اس کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوگا۔ راجا بننے کی خواہش نے اس کے دل سے رحم کا نام و نشان مٹا دیا۔ تلوار اندھی ہو گئی۔ اراولی پہاڑیوں کی ایک انجانی گپھا میں اس کا خزانہ بڑھنے

Scanned with CamScanner

گا۔ فقط سات بھروسے کے آدمیوں کو اس خزانے کا علم تھا۔ پانچ سات دن کے بعد وہ خود اپنے ہاتھوں سے خزانہ سنبھال لیتا۔ سبھی ساتھی اس کے ایک اشارے پر اپنا سر کٹانے کو تیار رہتے۔

ایک دن وہ اپنے خاص اعتماد کے ساتھیوں کے ساتھ خزانے کا تخمینہ کر رہا تھا۔ ایک نولکھا ہار ہاتھ میں لے کر وہ کہنے لگا، اس ہار کے لیے اس سیٹھانی نے کتنی حجت کی تھی۔ سارے بنیوں کو لالچ ہوتا ہی ست ہے۔ چمڑی بھلے ہی جائے، پر دمڑی نہیں دیں گے۔ میں نے پہلے انسانیت کے ناتے نرمی برتی کہ حاملہ عورت کو ہاتھ لگانا اچھا نہیں۔ خود ہار کھول کر دے دے۔ پر جیسے اپنے ہاتھ سے ہار دیں بھلا! جب وہ شرافت سے نہیں مانی تو میں نے چار کوڑے لگائے۔ پر رنڈی نے کوڑوں کی بھی پروا نہ کی، ویسے ہی بیٹھی رہی۔ ہار اور کس کر پکڑ لیا۔ عورت سے کون ہاتھا پائی کرے۔ میں نے پھر سمجھایا، اس ناقص ہار کے لیے کیوں جان گنوا رہی ہے۔ مجھے بھی دو جانوں کی ہتیا کا پاپ لگے گا۔ اس نے سسکتے ہوئے جواب دیا کہ اس کے جیتے جی وہ ہار نہیں لے سکے گا۔ لوگ تو موت کے بنا سمجھتے ہی نہیں۔ پر جب اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تو مجھے کیا پڑی تھی۔ اس کے بڑھے ہوئے پیٹ سے مجھے یوں ہی گھن آ رہی تھی۔ ہاتھ کی ننگی تلوار اس کا خون پینے کے لیے مچل رہی تھی۔ پھولے ہوئے پیٹ کو ہاتھ بھر چیر ڈالا۔ کوکھ کا بچہ بھی ککڑی کی طرح آدھا کٹ گیا۔ فرش خون سے رنگ گیا۔ تب بھی ہار اس کی مٹھیوں میں کسا ہوا تھا۔ حرام زادی ہار کے لوبھ میں خود بھی مری اور کوکھ کے بچے کو بھی لے ڈوبی۔ اس خزانے کے ہر نگینے کے ساتھ ایسے قصے جڑے ہیں۔ لوگوں کو دھن دولت کا اتنا موہ نہ ہو تو ہمیں اتنی زحمت کیوں اٹھانی پڑے۔ بغیر جھاڑے تو دھول بھی نہیں جھڑتی، پھر آدمی اتنی آسانی سے کیسے دولت سونپے۔

پھر ایک کلش کی مہروں کا معائنہ کرتے ہوئے بولا، اور اس بیوہ سنارن نے تنا مارنے پر بھی نہیں بتایا کہ پتیلا کہاں گڑا ہوا ہے۔ مہریں وہ ساتھ لے کر تو مرنے سے رہی۔ انسان کو دولت کی بھوک پیٹ کی بھوک سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ رنڈی سوکھ کر کانٹا ہو رہی تھی۔ دو وقت پیٹ بھر کھانا بھی نہیں کھاتی ہوگی، پر تھی کتنی مضبوط۔ اتنا ستانے پر تو شیر بھی سچ اگل دیتا، پر اس نے ایک بار انکار کے بعد پھر ہاں نہیں کی۔ سر کے بال اور ناخن اکھاڑے، دانت توڑے، کہنیوں اور ٹخنوں کی خوب مرمت کی، پر وہ سچ بول ہی نہیں۔ آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ میرا اشارہ پا کر پاس کھڑے ساتھی گھر میں ادھر ادھر بھاگے جیسے چھپے ہوئے گھڑے کا پتا لگا رہے ہوں۔ تب وہ پگلی

Scanned with CamScanner

سی اکھڑتی ہوئی پیچھے دوڑی۔ باورچی خانے میں چکر کھا کر دھڑام سے گر پڑی۔ اسے ایک طرف گھسیٹ کر فرش کھودا تب یہ گھڑا ملا۔ میری مہریں، میری مہریں! بڑبڑتی وہیں ڈھیر ہو گئی چولہے کی راکھ بھی ساتھ نہیں چلی۔"

خزانے کو واپس حفاظت سے چھپا کر وہ ساتھیوں کی پیٹھ ٹھونک کر کہنے لگا، "یارو، اب تو کچھ ہی دنوں کی بات ہے۔ بس تھوڑا صبر اور رکھو۔ ریاست قائم کرنے کے بعد تم میرے ٹھاٹھ دیکھنا۔ ان بازوؤں کے بل پر سب کو بری کا راجا بنا کر ہی تلوار میان میں ڈالوں گا۔"

پر دوسرے دن کا سورج اس کے لیے اداسی کا اندھیرا لے کر آیا۔ اس کے ساتھیوں نے بالا ہی بالا لگ الگ جال گوندھا۔ چپ چپ وہ سارا خزانہ لے اڑے اور ایک کمزور ریاست پر ہلہ بول دیا۔ راجا دم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ان میں سے ایک وہاں کا راجا بن گیا اور ان سب کا سرغنہ ایک پیپل کے درخت کے نیچے بخار میں بھنتا بڑبڑاتا رہا۔ جمع پونجی کے نام پر فقط ایک تلوار، ایک تیر کمان اور ایک بھالا اس کے پاس رہ گیا۔ راجا بننے کا خواب بھی نیند میں ہی ٹوٹ گیا۔

پانچویں روز راجا نے اس کے ساتھی سے قاصد کے ہاتھ جو پیغامات بھجوائے انھیں وہ سر جھکائے چپ چاپ سنتا رہا۔ قاصد نے کہا، "آپ کی طاقت اور آپ کے حوصلے پر راجا کو اب بھی بھروسا ہے۔ پر ان کی ریاست میں ڈاکے ڈالے تو خیر نہیں۔ آس پاس کی دوسری ریاستوں میں ڈاکے کی پوری چھوٹ ہے۔ ایمان داری سے ہمارے راجا کو چوتھائی سونپ دینا۔ پھر کوئی آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔"

قاصد، سنا کر لوٹ گیا اور وہ سارے دن اسی طرح سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اٹھنے کی طاقت ہی کہاں تھی۔ سورج ڈھلنے تک اسے کچھ نظر نہیں آیا۔ جدھر دیکھے ادھر اندھیرا ہی اندھیرا، گھور اندھیرا۔ آدھی رات ڈھلتے اس کی آنکھوں کے سامنے اچانک روشنی چمکی۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سوچا، گاؤں چھوڑا تب بھی تو اکیلا تھا۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ جب تک بازوؤں میں طاقت ہے اور ہاتھ میں تلوار ہے، ڈر کس بات کا؟ کیسی بے بسی؟ مایوسی کیوں؟ وہ ہار نہیں مانے گا۔

توپ، تلوار، اور بھالوں کی بہ نسبت امید کی طاقت ہزار گنا ہوتی ہے۔ راجا بننے کا خواب ٹوٹا تو کیا، ابھی امید کی جڑ ہری ہے۔ کتنے لوگوں کے قتل سے وہ خزانہ جوڑا اور اس کے جیتے جی ہی غدار

سارا لے اُڑے۔ پر امید کی دولت کون لے جا سکتا ہے! جب تک سانس تب تک آس۔ امید امر ہے۔ امید ہی سے رائی جیسا بیج وِشال برگد بن جاتا ہے۔ وہ آشا کے اس انکھوے میں پھر سے نئے خواب دیکھنے لگا۔ اتنے میں اسے ایک جٹا دھاری سادھو آتا دکھائی دیا۔ اتفاق کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ سادھو کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا، پر سادھو تیر کمان والے آدمی کے ہاتھ میں ننگی تلوار دیکھ کر ڈر گیا۔ تب اس نے اسے اپنا نام بتا کر اس کی ڈھارس بندھائی۔ پر اس کا نام سنتے ہی اس کے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا۔ سر کی گٹھری نیچے آ گری۔ پاؤں پکڑ کر گڑگڑایا، یہ ساری دولت آپ لے لیں۔ میں نے ایک چھدام بھی اپنے پاس رکھا ہو تو بھلے مہادیو دیکھیں۔ چاہیں تو تلاشی لے لیں، پر میری جان بخش دیں۔ میں آپ کا چیلا بننے کو تیار ہوں۔"

اس نے گٹھری کھول کر دیکھی ـــــ ہیرے، موتی اور مُہریں۔ سوئی کا لی تپیسّی تھے۔ شگون تو آپ چل کر آ گیا۔ اس ملک پر ایک دن راج نہ کروں تو لعنت ہے مجھ پر۔ کچھ ہی دنوں میں پہلے سے بھی بیس گنا خزانہ اکٹھا کر کے دکھا دوں گا۔ وہ سادھو کو تسلی دے کر کہنے لگا، "ڈرو نہیں، اپنی خواہش کے مطابق تھوڑی مہریں اس میں سے نکال لو۔ آگے تمہاری اور کیا اچھا ہے مجھے سیدھے سیدھے بتاؤ۔ سمجھ میں نہیں آیا، سادھو کے پاس اتنا دھن کہاں سے آیا۔"

اس نے بھی کھول دیا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا، "میں اس بھیس سے تنگ آ گیا ہوں۔ اب اس جنجال میں میرا من نہیں لگتا۔ ڈاکے ڈالنے کے ارادے سے شیو مندر چھوڑ کر آیا ہوں۔ اچانک آپ سے ملاقات ہو گئی۔ بھولے مہادیو کو برسوں دھوکا دیا ہے، پر آدمی کی اولاد ہوں تو آپ سے کبھی دغا نہیں کروں گا۔"

سردار نے کہا، بھگتی جیسا آسان کام بھی تم سے نہیں ہوا، پھر ڈکیتی کیسے کرو گے؟ تمہارا یقین کرنے سے پہلے تمہاری پچھلی زندگی جاننا چاہتا ہوں۔"

تب اس نے پوری آپ بیتی سنائی اور وہ دھیان سے سنتا رہا۔

اس کے گاؤں کے بیچوں بیچ ایک شیو مندر ہے۔ بزرگ کہتے ہیں کہ یہ مندر بہت پرانا ہے، گاؤں بسنے سے بھی پہلے کا۔ گاؤں پر شنکر کی کافی مہر رہی۔ ہر سال کوئی نہ کوئی نیا چمتکار ضرور ہوتا۔ ستر برس کا ایک بوڑھا پجاری آٹھوں پہر مندر میں رہتا۔ تڑکے چار بجے سے آدھی رات تک بھگتوں کا تانتا لگا رہتا۔ کبھی کوئی ایسی ویسی بات نہیں سنی گئی۔

ایک رات مندر میں پجاری کو ایک بچے کا رونا سنائی دیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ قریب ہی گدڑی میں لپٹا ایک بچہ پڑا تھا۔ اس نے اسے اٹھایا اور چپ کرانے لگا۔

صبح سارے گاؤں میں خبر پھیل گئی کہ مہادیو نے مندر میں آکاش سے بچہ بھیجا ہے۔ کیا پتا، بوڑھا پجاری کب تک جیے۔ گھاٹ گھاٹ کے باسی کو سب چالیں آتی ہیں۔ پجاری نے خود لوگوں کو بتایا کہ پہلے آکاش میں بِنا بادلوں کے بجلی کڑکی۔ پھر ایک جوت ظاہر ہوئی جو آکاش سے سیدھی مندر میں اتری۔ وہ جوت نندی (مورتی) تک آکر اوجھل ہو گئی۔ اسی پل بچے کا رونا سنائی دیا۔ یہ شنکر بھگوان کا نیا چمتکار تھا۔

یہ جٹادھاری سادھو ہی وہ چمتکاری بچہ ہے۔ بچہ گیارہ سال کا ہوا تب وہ بوڑھا پجاری بھگوان شنکر کی پناہ میں چلا گیا۔ پر پوجا میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ بالک جیسے شنکر کا اوتار تھا۔ سارے وید، پُران اور اُپنشد اسے حفظ تھے۔ رامائن اور مہابھارت تو اس کی زبان پر بسے تھے۔ رات دن بھگتی میں لگا رہتا۔ سارے علاقے میں مندر کا نام ہو گیا۔ دور دور سے بھگت درشن کے لیے آنے لگے۔ پوجا میں آنے والا چڑھاوا بڑھتا ہی گیا۔ دیوالی کے دن راجا کے کارندے آکر سارا چڑھاوا لے جاتے۔

وہ گاؤں والوں سے کہتا، "میں تمھیں سمجھا سمجھا کر تھک گیا، پر تمھارے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ تمھارا چڑھایا ہوا یہ روپیا پیسا نہ شنکر بھگوان کے کام کا ہے اور نہ میرے۔ تم گرھستیوں کا پیسے کے بنا کام نہیں چلتا، پر مندر کو کیوں بھرشٹ کرتے ہو؟ تم سے ہاتھ جوڑ کر اتنا ہی کہنا ہے کہ جی بھر کے درشن کرو، بھگتی کرو، پوجا کرو، پر چڑھاوے کے نام پر پیسا مت چڑھاؤ۔ ویسے ہی یہ سارا چڑھاوا راجا کے خزانے میں جاتا ہے۔ مجھے دو وقت کی روٹی کے سوا کچھ چاہیے نہیں اور وہ مجھے بستی سے مل ہی جاتی ہے۔"

پر نصیحت کا الٹا ہی اثر ہوا۔ دھیرے دھیرے اسے پتا چلا کہ پیسا سو گنا بڑھانے کے لیے ہی لوگ چڑھاوا چڑھاتے ہیں۔ پیسا چڑھائے بنا انھیں وِشواس ہی نہیں ہوتا کہ ان کی پوجا قبول ہو گی۔ دھیرے دھیرے بھگتی کے علاوہ بھی اس کے دماغ میں کئی نئی نئی باتیں جڑنے لگیں۔ ان نئی باتوں سے اس کے گیان دھیان میں کچھ رکاوٹ پڑنے لگی۔

پر کچھ دنوں بعد ایک انوکھی واقعے سے اس کا پورا مانس بدل گیا۔ ایک دن پچاس برس کی ایک ودھوا ڈوکری کاشی سے اس کے مندر میں آئی۔ اسے دیکھتے ہی وہ زار زار رونے لگی۔ اس نے

Scanned with CamScanner

سمجھا وہ بھگتی میں مگن ہو گئی ہے۔ کہا، "جی، مہادیو کی مورت تو بہتر ہے۔ میں تو ان کا بھی پجاری ہوں۔"

پر وہ ویسی کھڑی رہی۔ بولی، "بیٹے، ایسے پتھر کے بھگوان میں نے بہت دیکھے۔ میں اس کے لیے اتنی دور سے نہیں آئی۔ میرے لیے تو تو ہی مہادیو ہے۔ میں فقط تجھے ایک نظر دیکھنے کے لیے آئی ہوں۔ اُس دن تو جنم دے کر بھی تیری صورت نہیں دیکھ پائی۔ تیرے جنم سے دو گھڑی پہلے لُکتی چھپتی یہاں آئی، تجھے جنم دے کر چپ چاپ واپس کاشی چلی گئی۔ میرے من کی اُس اُتھل پتھل کو بھگوان بھی نہیں سمجھ سکتا۔ پر اب گڑے مُردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ۔ تو جان کر کیا کرے گا۔ بس اتنا جان لے کہ میں اسی گاؤں میں بیاہی تھی۔ بیوہ ہونے کے دو برس کے بعد پتی چل بسا تو سسرال والوں نے مجھے مندر کے حوالے کر دیا۔ دن رات مالا جپنے سے بھی میری جوانی بس میں نہیں رہی۔ پہلے والے پجاری نے مجھے بھگتی کے علاوہ کئی دوسرے گیان بھی سکھائے۔ تو اسی گیان کا پھل ہے۔ پیر بھاری ہونے کے دوسرے مہینے مجھے پتا چلا۔ پنڈت جی سے کہا تو انھوں نے کاشی جانے کی صلاح دی۔ اس کے لیے انھوں نے سسرال والوں کو راضی کر لیا۔ مجھے مجبوراً جانا پڑا۔ کاشی کے دیوتاؤں کے ٹھاٹھ کا کیا کہنا۔ بتانے سے کہیں میری زبان نہ کٹ جائے۔ میرا تو پرمیشور، بھگوان اور شنکر تو ہی ہے۔

تو ڈر مت۔ تجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے کی۔ یہ راز یہاں کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ اسے تو جانتا ہے یا میں۔ تیسرے پنڈت جی جانتے تھے جو رام کو پیارے ہو چکے۔ کاشی کے بھگتوں میں میرا اصلی کاشی نام ہے۔ پر تجھے دیکھے بنا من نہیں مانا۔ میں سمجھتی تھی کہ تو اب بھی ننھا ہی ہوگا۔ اسی طرح ہواں ہواں رو رہا ہوگا۔ پر وہ میرا پاگل پن تھا۔ تو تو بانس برابر لمبا ہو گیا ہے۔ ساتویں دن یہاں سے چلی جاؤں گی۔ پھر شاید کبھی ادھر آنا نہ ہو۔ آخر میری پوجا بے کار نہیں گئی۔ میرے بھگوان کے درشن ہو گئے۔ سات دن تک مجھے اپنی صورت جی بھر کر دیکھ لینے دے۔ ایسے پتھر کے بھگوان تو جہاں قدم رکھوں وہیں پیدا کر دوں۔ مجھ سے ان کی پول کیوں کھلواتا ہے۔ بھگوان اور بھگت، دونوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ بیوہ نہ ہوتی تو شاید اتنا نہ جانتی۔ اب لگتا ہے پتی کا مرنا ٹھیک ہی ہوا۔"

پھر وہ بیٹے کے گلے لگ کر خوب روئی۔ وہ ماں کی باتیں سن کر دنگ رہ گیا۔ اس شام اس کا

آرتی میں من نہیں لگا۔ پھر تو اس پاکھنڈ سے اس کا جی بالکل اچٹ گیا۔ پر دکھانے کے لیے اس کی بھگتی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

آہستہ آہستہ اسے سو آنے یقین ہو گیا کہ پیسے ہی کا دوسرا نام بھگوان ہے۔ پیسا ہی چاند سورج ہے، پیسا ہی دیوتا ہے۔ ہاں، اسے پانے کے راستے ضرور الگ الگ ہیں۔ کوئی بھگتی کے بہانے اس کی مالا جپتا ہے، کوئی کاروبار کرکے لچھمی کو حاصل کرتا ہے، کوئی کھیتی کر کے اس دیوتا کو پاتا ہے، کوئی محنت مزدوری کر کے دیوتا کے درشن کرتا ہے، کوئی راج کے ذریعے اس دیوتا کو زر کر کے خزانے میں قید کرتا ہے، کوئی ٹھگی اور چوری سے اسے ہتھیاتا ہے تو کوئی ڈاکے ڈال کر اس کے لیے جان کی بازی لگاتا ہے۔ اس کے تینتیس کروڑ روپ ہیں۔ کہیں نراکار تو کہیں ساکار۔ گھٹ گھٹ کا باسی اور انتریامی ہے۔

اس کے بعد وہ بھولے شنکر کے اوتار "دیوتا" کی بھگتی میں ایسا ڈوبا کہ اسے اس کے آگے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ مندر کے کارندوں سے مل کر وہ چڑھاوے کا ایک بڑا حصہ ہڑپ کرنے لگا۔ چڑھاوا بڑھانے کے لیے روز نئے نئے چمتکار دکھانے لگا۔ بھگوان کے مندر سے بڑھ کر مایا اور بھوگ کا اڈا کیا ہوگا! گھر گرہستی کا سوچا سکھ آنند دیوتاؤں کی چھترچھایا میں بانٹ لگتا ہے۔ اس پر جھنجھٹ اور مصیبت رتی بھر نہیں۔ یہاں نہ بوڑھے ماں باپ کی آفت ہے نہ بچوں کی فکر نہ برادری کی بندش۔ جس دھن کے لیے لوگ چوری کرتے ہیں، ڈاکے ڈالتے ہیں، سیندھ لگاتے ہیں، رات دن خون پسینا ایک کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں دھوکا دیتے ہیں اور راج کرتے ہیں، اسی دھن کو چڑھاوے میں چڑھا کر سیس نواتے ہیں۔ یہاں نہ لوٹ کھسوٹ کا ڈر ہے نہ جان کا جوکھم۔ بھولے گرہستی سنتوں کے پیر چھوتے ہیں، انھیں پلکوں پر بٹھاتے ہیں۔ عورتیں طرح طرح کا پکوان رچ رچ کر پکاتی اور کھلاتی ہیں۔ نہ دنیاداری کی بائے توبہ، نہ آٹے دال کی فکر، نہ پیسے کوڑی کی ماتھا پچی، نہ کمانے کا چکر، نہ پیسے کا رونا اور نہ کوئی لوٹا۔ بھوجن اور سیج کے چسکے باز ان سادھوؤں مہاتماؤں سے سکھی بھلا اور کون ہوگا۔

کنہیا کی صورت والے اس پجاری کے لیے گوپیوں کی کمی نہیں تھی۔ پوجا بھگتی میں اندھے لوگوں کو کبھی اس پر شک تک نہ ہوا۔ جال میں پھنسی بھولی عورتوں کو بہلا پھسلا کر اس نے کالی دھن اکٹھا کر لیا۔

Scanned with CamScanner

پر اُس گٹھری کا زیادہ دھن یک سیٹھانی کا تھا۔ اُس سیٹھانی کی ساس نے اپنا آخری وقت جان کر اسے بلایا اور کہا، "بہو، دروازہ بند کر کے جلدی میرے پاس آ۔ اب میں کچھ ہی پلوں کی مہمان ہوں۔"

بہو کنڈی لگا کر آئی تو وہ لڑکھڑاتی آواز میں کہنے لگی، 'اپنی سات پیڑھیوں سے یہ بھید ہمیشہ اسی سے فقط بڑی بہو کے سامنے ظاہر ہوتا آیا ہے۔ تو بھی مرنے سے پہلے کسی کو مت بتانا۔ اپنے پتی کو بھی نہیں۔ آفت آنے پر مروا سے چھیڑے بغیر ہرگز نہ مانیں گے۔'

بڑی بہو کو چھپا ہوا سارا دھن سنبھلا کر اس نے آخری سانس لی۔ سات بیٹوں کی ماں گھرانے کی رسم نبھا کر پرلوک چلی گئی۔ پر اس بھید کو جان کر بڑی بہو کے سارے شریر میں جگہ جگہ پھوڑے نکل آئے۔ بھید پچانا مشکل ہو گیا۔ پتی کو بتانے پر وہ ساتوں بھائیوں میں بانٹ بُونٹ دے تو؟ کوئی راستا نظر نہیں آیا۔ اس بھید کو کچھ دن اور دبا کر رکھا تو اس کا پیٹ پھٹ جائے گا۔

وہ پرلے درجے کی کنجوس تھی۔ شنکر کے پجاری کو تی سی تو اس نے خوشی سے سونپ دیا۔ پر اپنی ہر چند کوشش کے باوجود وہ اس سے ایک کوڑی بھی نہیں نکلوا پایا۔ اس بھید کو جاننے کے بعد جس دن اس کی باری آئی تو اس کا من ٹھکانے پر نہ دیکھ کر پجاری نے پوچھا، "کیا بات ہے؟ تیرا من کہاں بھٹک رہا ہے؟ آنکھیں اس طرح کھوئی کھوئی کیوں ہیں؟"

تب حد درجہ لاچار ہو کر اسے بھید ظاہر کرنا ہی پڑا۔ یہ سوچ کر کہ پجاری کو اس سے کیا سروکار، پیڑھیوں سے چھپا بھید آپ ہی گلے سے باہر آ گیا۔

پجاری آنکھیں بند کر کے ایک دم سپاٹ لہجہ میں بولا، 'باپ کے دھن میں سبھی بیٹوں کا حصہ ہوتا ہے اس لیے ساجھے کے گھر میں رکھنا تو خطرے سے خالی نہیں۔ جانے کب بھید کھل جائے۔ ساتوں بھائی الگ نہ ہوں، تب تک تو یہ دھن مہادیو کو سونپ دے۔ سپنے میں بھی کوئی اندیشہ اپنے جی میں مت لانا۔ جب تیرا پتی الگ ہو کر اپنا کاروبار جما لے، تب سارا دھن تو واپس لے جانا۔ میرا کہا مانے تو پھر پتی سے بھی کچھ مت چھپانا۔'

سیٹھانی کو بات سو فیصد جچ گئی۔ تھوڑا تھوڑا کر کے سارا دھن اس کے حوالے کر دیا۔ پھر پردے کے پیچھے کی بھگتی میں اسے کبھی اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی یا روکھی نظر نہیں آئیں۔ کافی عرصے کے بعد ایک دن اس نے اس سے پوچھا، "آپ کا آدیش ہو تو اب سیٹھ جی کو سارا بھید بتا

دوں؟ اب الگ ہونے کے بعد دھندے میں یہ دھن بہت کام آئے گا۔ یوں لوگوں کو مایا کا بھرم بھی بہت ہے۔ کوئی شک نہیں کرے گا۔"

سن کر پہلے تو سنت کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے، پھر موت تانڈو کرنے لگی۔ چھاتیوں سے ہٹ کر دونوں ہاتھ سیدھے گلے پر جا پہنچے۔ انھیں ہاتھوں سے اس کی بہاتت لکھی تھی سو کیسے بچتی۔

اس وقت مندر میں چار پانچ دوسرے بھگت بھی بھگتی میں مگن تھے۔ چور کی داڑھی میں تنکا، اسے لگا انھیں پتا چل گیا۔ مارے ڈر کے وہ مہادیو سے پوچھے بنا ہی گٹھری لے کر چھپت ہو گیا۔

اس کے بعد جٹادھاری سادھو آخر میں بولا، "پیسا آسانی سے مل جائے تو اسے جوڑنے کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ خطرہ اٹھا کر حاصل ہو تو کچھ زعم بھی ہو۔ جس پیسے کے لیے لوگ اتنا جھنجھٹ کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، اٹھاپٹک کرتے ہیں، مرتے مارتے ہیں، وہ چڑھاوے میں اتنی آسانی سے ملنے لگا تو من میں کمزوری آگئی۔ یہ تو بنا کچھ کیے دھرے، آپ جڑتا جا رہا ہے۔ لوگوں کو مار مایا اکٹھی کروں تو مردانگی ہے۔ آپ کا نام تو بہت سنا، پر اس طرح ملنا ہوگا یہ نہیں سوچا تھا۔ مجھے پہلے کے ساتھیوں کی طرح مت سمجھنا۔ آپ کے پسینے کی جگہ میرا خون نہ گرے تو میرے منھ پر تھوک دینا۔ سر مونڈ کر چیلا بنائیں چاہے سر کاٹ کر۔'

سردار سوچ کر بولا، "یوں تو مجھے اپنے شریر پر بھی بھروسا نہیں۔ جانے کب ساتھ چھوڑ دے۔ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ اسی لیے میں نے تمھاری پچھلی زندگی کے بارے میں پوچھا۔ کچھ دن اور تمھاری پرکھ کرنی ہوگی۔ آج سے تم مجھے سردار کہو گے، اور میں تمھیں مہاتما۔ جٹا ایسی ہی رکھنی ہے۔ دو میں تب تک کسی نئے طریقے سے کام چلانا ہوگا۔ کچھ دنوں بعد اپنے آپ لوگ آملیں گے۔"

پھر اس نے کافی دور جا کر مہاتما کی گٹھری چھپا دی۔ لوٹ کر اسے نیا طریقہ سمجھایا، "تم اسی بھیس میں فلاں گاؤں جاؤ۔ وہاں آٹھ دس لکھ پتی بنیے ہیں۔ کسی بنیے کے لونڈے کو تالاب تک لے آؤ۔ پھر اسے اپنے ٹھکانے تک لانے کا ذمہ میرا۔ ڈر کی کوئی بات نہیں۔ تیز سے تیز گھوڑا بھی مجھے نہیں پکڑ سکتا۔"

نئے چیلے کو اس نے نئے نئے گر سکھائے۔ کئی تجربے کی باتیں بتائیں۔ مہاتما کی عقل اور

Scanned with CamScanner

ہوشیاری دیکھ کر سردار بہت خوش ہوا۔

تیسرے دن سردار کے کہنے کے مطابق وہ ایک بنیے کے لڑکے کو اٹھا لایا۔ ساتھ ہی اس کے باپ کو خبر بھی کر دی کہ شام تک اگر فلاں فلاں جگہ پر مہریں نہ پہنچیں تو بیٹے سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ لڑکے کی ماں یہ سنتے ہی بے ہوش ہو گئی۔ ہوش میں آتے ہی پتی سے پوچھا، "مہریں پہنچائیں کہ نہیں؟"

سیٹھ نے بگلاتے ہوئے کہا، "مہریں کیا چھوکٹ میں آتی ہیں جو کہتے ہی بھجوا دوں؟ بیٹا ساری زندگی محنت کر کے بھی اتنی مہریں نہیں کما سکتا۔ ہم سمجھیں گے کہ بیٹا ہوا ہی نہیں۔ ویسے بھگوان کی مہر ہے۔ ٹھیک سے بیوپار کریں تو پانچ بیٹے ہی بہت ہیں۔ موت آ ہی جائے تو اسے روکنا کسی کے بس کی بات تھوڑے ہی ہے۔"

سیٹھانی سسکتے سسکتے کہنے لگی، "پر ابھی تو یہ اپنے بس میں ہے۔ مہریں دینے ہی سے بیٹے کی جان بچتی ہے۔ تمہارے منہ سے میں یہ کیا سن رہی ہوں! تم ماں ہوتے تو بیٹے کے مرنے کی پیڑا سمجھتے۔"

سیٹھ کا چہرہ کالا سیاہ پڑ گیا۔ آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ پھر جی کو تھوڑا کڑا کیا۔ بولا، "کیا میں اس درد کو نہیں سمجھتا؟ سب سمجھتا ہوں۔ میں کوئی پتھر نہیں۔ تو نے کبھی خود نہیں کمایا اس لیے تو دھن گنوانے کی پیڑا نہیں سمجھتی۔ میں بھی تیری طرح پیسے کی فکر نہ کرتا تو آج یہ سب اکٹھا ہو پاتا بھلا؟ ڈاکوؤں کی زبان کا کیا بھروسا؟ مہریں پا کر ان کا لالچ اور بڑھے گا۔ میں ان کے کارنامے اچھی طرح جانتا ہوں۔"

سیٹھانی گڑگڑائی، بہت منتیں کیں، پر سیٹھ نہیں پسیجا۔ پتی کی ہٹ دیکھ کر وہ پھر بے ہوش ہو گئی۔ سیٹھ نے اسی بیچ واپس خبر کروا دی، "ہزار مہریں تو بہت بڑی بات ہے، وہ ایک کوڑی بھی نہیں دے گا۔"

سنتے ہی سردار آگ بگولا ہو گیا۔ غم کھانے سے تو اس کا سارا دبدبہ ختم ہو جائے گا۔ اس کی دہشت مٹ جائے گی۔ لوگ اس کا نام بھول گئے تو کیا ہو گا۔ کیا انہیں ساتھیوں کی غداری کا پتا چل گیا؟ دہشت تو پہلے سے ہی چوگنی پھیلائی ہے۔ وہ ننگی تلوار لے کر ساتھ کے ساتھ لڑکے کے پاس گیا۔ لڑکا ایک دم گورا، پندرہ برس کا، دیکھنے میں امیر، معصوم۔ سانپ بھی ڈسنے سے پہلے ایک بار

Scanned with CamScanner

سوچتا۔ بڑی بڑی چنچل آنکھیں، پتلے گلابی ہونٹ۔

ننگی تلوار دیکھ کر وہ کانپ گیا۔ مہاتما بولا، "تیرے باپ نے تو صاف انکار کر دیا، پر ہم اپنے قول سے نہیں مکریں گے۔ بیٹے کی خون سے لت پت منڈی دیکھ کر عقل ٹھکانے آئے گی۔"

لڑکا ہاتھ جوڑ کر بولا، "ایک بار میری ماں کو پھر خبر کر دو۔ وہ تمہارا کہا نہیں ٹالے گی۔ مجھے موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ ماں کہتی ہے، موت آئے بنا کوئی نہیں مر سکتا۔ پھر بنا موت آئے تم مجھے کیسے مارو گے؟"

مہاتما نے جواب دیا، "تیری موت اس تلوار میں چھپی ہے۔ تو اس کی فکر مت کر۔ ہم کہاں خبر کرتے پھریں! تیری موت سے ہمارے کئی کام آسان ہو جائیں گے۔"

کچھ کہنے کے لیے لڑکے کے ہونٹ کھلے ہی تھے کہ سردار گرجا، "بنیے کی اولاد کا یہ حوصلہ! کب سے بک بک کیے جا رہا ہے!"

وہ ننگی تلوار لے کر اس کی طرف جھپٹا۔ لڑکا زور سے چلایا اور دونوں ہاتھ گردن پر رکھ کر نیچے بیٹھ گیا۔ پر تلوار کے جھٹکے میں سردار کا ہاتھ بہت صاف تھا۔ انگلیوں کو کاٹتی ہوئی وہ سڑاک گردن کے پار ہو گئی۔ کھوپڑی سامنے ایک چٹان سے ٹکرا کر واپس ادھر آ گری۔ کھوپڑی کی آنکھوں کے سامنے دھڑ پڑا تھا۔ ہونٹ تھوڑے سے کھلے ہوئے — جیسے کچھ کہنا باقی رہ گیا ہو۔

دوسرے دن سیٹھ باڑے میں لٹکے ہوئے گھڑے میں پانی ڈالنے گیا تو چاروں طرف کوے منڈلا رہے تھے۔ گھڑے کی رسی سے بندھی ایک کھوپڑی لٹک رہی تھی۔ پاس جا کر دیکھا — اس کے لڑکے کی کھوپڑی! ہاتھوں سے پانی کی مشکی نیچے گر پڑی۔ بیٹے کا نام لے کر زور سے چیخا۔ اس دن سے ہی سیٹھانی پاگل ہو گئی۔ سنتے ہی گاؤں والوں کی سانس جہاں کا تہاں رہ گیا۔ پھر اس گاؤں سے کسی کا بیٹا اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ باقی سیٹھوں نے آپ ہی سردار کے پاس ہزار ہزار مہریں پہنچا دیں۔

سردار نے قہقہہ لگایا۔ "دیکھا میرا کرشمہ! مجھے بنا پڑت کہاں! ایک ہی کھوپڑی میں سب سیدھے ہو گئے۔ وہ مر کر بھی ہمارا بیڑا پار لگا گیا۔"

اس کا دبدبہ پھر جمنے لگا۔ دونوں بہادر ننگی تلوار لے کر جس گاؤں میں گھس جاتے وہاں سناٹا

Scanned with CamScanner

پچھا جاتا۔ کسی مائی کے لال میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ان کا سامنا کرتا۔ چار پانچ بار، تیں لوٹنے سے کافی مال ہاتھ لگا۔

ایک دن وہ ایک گاؤں لوٹ کر واپس آ رہے تھے۔ سامنے سے ایک آدمی تلوار لیے آتا دکھائی دیا۔ سردار دیکھتے ہی اس کی طرف جھپٹا۔ وہ آدمی مسکرا کر بولا، "آپ کے ہاتھوں مرنے سے اچھا بھاگ اور کیا ہوگا۔ پر پہلے میری بات تو سن لیں۔"

وہ کچھ ٹھنڈا پڑا۔ پوچھا، "تو کون ہے اور کیوں آیا ہے؟ بغیر آزمائے میں کسی کا اعتبار نہیں کرتا۔ جھوٹ کی مجھے فوراً بو آتی ہے۔ ایک لفظ بھی جھوٹ بولا تو ٹکڑے ٹکڑے کر کے گدھوں کوؤں کو ڈال دوں گا۔ سچ سچ بتا، یہاں آنے کے پیچھے کیا چال ہے؟

وہ اس کے قدموں میں تلوار رکھ کر بولا، "ایسے طعنوں سے تو مرنا اچھا۔ میں تو کافی آس لے کر آپ کے چرنوں میں آیا تھا۔"

سردار کو جب کچھ بھروسا ہوا تو وہ آگے کہنے لگا، "میں سنار ہوں۔ ہم دو بھائی ہیں۔ باپ کے رہتے ہی ہم نے اپنی دکانیں الگ کر لیں۔ باپ چھوٹے بھائی کے ساتھ رہا۔ جانے کیوں میری دکان چھوٹے بھائی جیسی نہیں چلی۔ یہ مجھ سے سہا نہ گیا۔ اور زیادہ ملاوٹ کرنے لگا۔ لوگ تو موقع ملنے پر مٹی میں بھی ملاوٹ کرنے سے نہیں چوکتے، پھر میں سونے چاندی میں ملاوٹ کیے بنا کیسے رہتا۔ میرا لالچ ڈھیر سے ڈھیر بڑھتا ہی گیا۔ میں خالص چاندی پر سونے کے پانی سے کام چلانے لگا۔ پر زیادہ دن یہ چل نہ سکا۔ میرے بھائی نے ہی ساری قلعی کھول دی۔ گاہک اپنا اپنا مال لے کر واپس آنے لگے۔ میں کہاں تک ساوحت چکاتا۔ ساری ساکھ دھول میں مل گئی۔ سوچا اب تو کوئی راستہ لے کر بھی میری دکان پر نہیں آئے گا۔ بھوکوں مرنے سے تو بہادری کی موت بہتر ہے۔ جس گھر میں وبھیشن پیدا ہو جائے اسے بھگوان بھی نہیں بچا سکتا۔ جب بھائی نے بھید کھول کر میرا دھندا چوپٹ کر دیا تو میں اسے کیسے چھوڑتا۔ بے ایمانی کے اس دھندے سے مجھے نفرت ہونے لگی۔ ملاوٹ کر کے سونا بچانے سے تو ڈاکے ڈال کر سونا لوٹنا کہیں اچھا ہے۔ آپ کا کافی نام سنا تھا، سو بھائی کو مار کر سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔ اب آپ کی جو مرضی ہو کریں۔ آپ کے ایک اشارے پر جان دینے کو تیار ہوں۔"

گروہ میں جتنے زیادہ لوگ ہوں اتنا ہی اچھا۔ گھر آئی قسمت کو ٹھوکر کیوں ماریں! یہ سوچ کر

Scanned with CamScanner

سردار نے اسے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اس کے جڑنے سے دو تین ڈکیتیوں میں کافی مال ہاتھ لگا۔ سردار اس پر مہربان ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد اس گروہ میں ایک راجکمار اور آ ملا۔ وہ تین راجکماروں میں سب سے چھوٹا تھا۔ گدی کے لالچ میں اس نے باپ کا کام تمام کر، دونوں بھائیوں کو مارنے کی کوشش کی، پر ناکام رہا۔ عین وقت پر سازش کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ سارے سامنت اور فوج راجکمار کے پیچھے تھی۔ اسے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ سب دن یک سے نہیں رہتے۔ گڈھوں کے ٹیلے اور ٹیلوں کے گڈھے بننے میں کیا وقت لگتا ہے۔ ابھی بُرے ستاروں کا پھیر ہے۔ اس نے سردار سے اپنی منشا صاف کہہ ڈالی۔ کہا، "راجا بنوں تب تک آپ کے ساتھ ڈاکے ڈالوں گا۔ اور کوئی چارہ نہیں۔ رانی کا دودھ پیا ہے تو کبھی آپ کے ساتھ گھات نہیں کروں گا۔ جب تک دونوں بھائیوں کو مار کر سنگھاسن پر نہ بیٹھوں، چین کی سانس نہیں لوں گا۔ بس میرا یہی مقصد ہے۔"

سردار نے سوچا، جو اپنے باپ اور سگے بھائیوں کا نہیں ہوا وہ کسی سے کیا مروت کرے گا۔ پر آج آفت کا مارا ساتھ جڑتا ہے تو کیا برا ہے۔ بڑا کام زیادہ آدمیوں ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ اس کے ملنے سے گروہ کی طاقت کچھ تو بڑھے گی۔ جیسے بھی ساتھی ہیں، اسے انھیں سے اپنا سپنا پورا کرنا ہے۔ جب تک اس کے ساتھ فریب کر کے راجا بننے والے اس حرام زادے کو مار نہ دے، اسے چین نہیں ملے گا۔ ایک سے چار ہوئے۔ چار سے سو ہوتے کتنی دیر لگتی ہے۔

چار کا جتھا ہوتے ہی انھوں نے چپکے اُڑانے کا ہلکا طریقہ چھوڑ دیا۔ للکار کر دھاوا بولتے۔ گھر سوئے لوگوں کو اس کے نام سے پسینا آنے لگا۔ اس کے خیال سے ہی لوگوں کے دل دہل جاتے۔ دو آدمی گاؤں کے خاص راستے کی ناکا بندی کرتے اور دو آدمی گھروں میں گھس کر اندھا دھند تلوار چلاتے۔ جو بھی نظر آتا اس کا صفایا کر دیتے۔ سردار کا یہ خاص گُر تھا۔ زیادہ خون خرابہ کیے بنا دھاک نہیں جمتی۔ ایک مرتبہ زوردار دھاک جم جائے، پھر تو چار ہی کافی ہیں۔

ایک بار انھیں یہ پکی خبر ملی کہ فلاں گاؤں کا ایک سیٹھ دساور سے ہیرے موتی اور مہروں کی سات گاڑیاں بھر کر لایا ہے۔ خبر دینے والے نائی کو اس نے پانچ مہریں انعام میں دیں۔ اسی رات چاروں نے بیٹھ کر وچار کیا کہ اس دھن کو کیسے لوٹا جائے۔ پانچواں ساتھی شراب تھی۔ اس کے بنا ایسی بڑی باتوں پر وچار کیسے کیا جا سکتا ہے! چار پانچ پیالے پینے تک انھوں نے پورا طریقہ

سوچ لیا۔ تب دولت ہتھیانے سے پہلے ہی نہیں دولت کا نشہ چڑھ گیا۔ شراب کے ساتھ دولت کا نشہ جڑنے سے وہ چاند تاروں کے بیچ پہنچ گئے۔

وہ چودھویں کی چاندنی کے لہراتے سمندر میں غوطے لگانے لگے۔ وہ پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے تھے۔ دنیا کے باشندوں سے کافی اوپر۔ بڑے گھونٹ سے سردار کو کھانسی آگئی۔ کھانسی رکنے پر کہنے لگا، "میں آج تک یہ نہیں سمجھ پایا کہ لوگ اتنے ڈرپوک کیوں ہوتے ہیں۔ موت کا ڈر اور دولت کا لالچ۔ بس، اس کے علاوہ وہ کچھ جانتے ہی نہیں۔ ان کا تو ایک ہی علاج ہے۔ مار یا موت۔ اگر پہلے ہی سارا مال سونپ دیں تو ہمیں اتنی سختی کرنی ہی نہ پڑے۔ کیوں، میں نے کچھ غلط کہا؟"

سُنار اور راجکمار اس کی تائید کرتے ہوئے بولے، "آپ کا کہنا ایک دم درست ہے۔ بیٹے روپے پیسے سے ایسے چمٹتے ہیں جیسے گڑ سے چیونٹیاں۔"

پرمہاتما کے گلے سے یہ بات نہیں اتری۔ سرُور میں نہ ہوتا تو شاید اسے بھی یہ بات درست لگتی، لیکن نشے کی جھک میں وید، اُپنشد اور گیتا کا گیان پھر سے سر اٹھانے لگا۔ نشے میں وہ ہمیشہ شاستروں کی بڑی بڑی باتیں ہانکتا۔ تینوں اس کی باتوں کا مزا لیتے۔ اس کا مخول اڑاتے۔ اسے نشہ بھی سب سے پہلے چڑھتا تھا۔ نشے میں جھومتا کہنے لگا، "نہیں، نہیں۔ یہ غلط ہے۔ مارنے سے تو نہیں، پر مرنے سے تو ہم بھی ڈرتے ہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جو خود موت سے گھبراتا ہے وہ اوروں کی جان لینے کی جرات کیسے کرتا ہے؟ جو مرنے سے ڈرتا ہے اسے مارنے سے بھی ڈرنا چاہیے۔ گر من کے ترازو میں دونوں ڈر برابر برابر ہوں تو آدمی کو آدمی سے ڈرنے کی قطعی ضرورت نہ رہے۔ دھن کے لوبھ میں کوئی ہتیا کرتا ہے تو کوئی لوبھ میں جان گنوا دیتا ہے۔ جو جتنا موت سے گھبراتا ہے وہ اُتنا ہی زیادہ خون خرابہ کرتا ہے۔ خیر یہ گیان کی اونچی باتیں تمہارے پلّے نہیں پڑیں گی۔"

تینوں ایک ساتھ زور سے ہنسے۔ ہنستے ہنستے ہی بولے، "تمہاری باتیں ہمارے پلّے نہیں پڑتیں تو ہماری باتیں بھی تمہارے پلّے کہاں پڑتی ہیں۔ ہماری باتیں تمہارے گیان سے بہت اونچی ہیں۔ دنیا کی ہر چیز ستاروں تک کہ تارے، سورج، چاند، بادل اور پہاڑ بھی ان سے نیچے ہیں۔"

پھر سردار سنجیدگی سے بولا، "کل اس بنیے کا دھن لوٹ کر لائیں تو پھر کچھ آگے کی سوچیں۔ میرے دل میں تو ایسی ایسی باتیں ہیں کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ یہ مال ہاتھ لگ جائے تو پھر کسی کمزور

Scanned with CamScanner

ریاست کی کھوج کریں۔ راجا بنتے ہی تاروں جتنی فوج کھڑی کروں گا۔"

پھر اوپر آکاش کی اور دیکھ کر کہنے لگا، "چاندنی رات میں تاروں جتنی نہیں، اماوس کی رات میں تاروں جتنی بڑی۔ سمجھے! پھر ایک ایک کر کے سبھی راجاؤں اور بادشاہوں کو فتح کروں گا۔ دنیا کی ساری دولت اپنے قبضے میں کروں گا۔ ہمالیہ میں ایک ہزار بڑی بڑی گپھائیں کھدوا کر کافی دھن وہاں چھپا کر رکھوں گا۔ باقی انھیں آراولی پہاڑیوں میں۔ تمھارے سوا کسی پر بھی بھروسا نہیں کروں گا۔"

تینوں کے دماغ میں سردار کی باتیں ایک دم بیٹھ گئیں۔ رنجکمار نے کہا، "میں نے راج گھرانے میں جنم لیا ہے۔ میں بغیر راج کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایک بڑی ریاست میرے حوالے کرنی پڑے گی، پہلے کہے دیتا ہوں۔ اسی امید سے آپ کے پاس آیا تھا۔"

سردار نے کہا، "بس اسی بات پر مجھے غصہ آتا ہے۔ راجا تو میرے علاوہ کوئی رہ ہی نہیں سکتا۔ باقی تم جو کہو کرنے کو تیار ہوں۔ تم تینوں کو اپنا خاص دیوان بناؤں گا۔"

پھر تبھی ہی اس کے دماغ میں یہ بات کوندی کہ ابھی سے خواہ مخواہ کیوں اس کے لیے جھگڑا کھڑا کیا جائے۔ بولا، "اس پر میں پھر اطمینان سے سوچوں گا۔ تم لوگوں کو تو میں ضرور راجا بنانا چاہتا ہوں۔"

سن کو تینوں بہت خوش ہوئے۔ ساتھ ہی بہت زیادہ پی کر راجا بننے کے خواب دیکھتے وہیں لڑھک گئے۔

سویرے گھڑی دو گھڑی دن بڑھے تک نشے کے ساتھ ساتھ ان کے راج بھی جاتے رہے۔ پیچھے بچا رہ گیا فقط شراب کا خمار۔ سب کو سنگھاسن چھن جانے کا بے حد افسوس ہوا۔ اصلی سلطنت چھن جانے سے بھی زیادہ۔ سردار آواز میں جوش بھر کر کہنے لگا، "یارو، آج ڈکیتی میں اپنا فیصلہ ہونا ہے۔ اس پار یا اُس پار۔ یا تو مر جائیں گے یا نہال ہو جائیں گے۔"

تینوں بانہیں ٹھونک کر بولے، "ہم کیوں مرنے لگے۔ مرنے کے لیے ساری دنیا پڑی ہے۔ چاہے ساری دنیا کا بیڑا غرق ہو جائے، ہمارا بیڑا تو ہمیشہ پار ہی لگے گا۔"

سنگھاسن گیا تو گیا، پر لوٹ کے حصے میں لحاظ کیسا! ہوشیاری اپنی اپنی ہے، کسی کے باپ کی نہیں۔ سر پر کفن باندھ کر چاروں برابر کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ پھر سردار کی من مانی کیوں؟ جانے

سارا مال کہاں زمین دوز کر آتا ہے۔ جھنک کب تک چلے گی؟ کیا اسان سے کر گھر بار چھوڑا اور کیا گزری۔ وہ کئی دنوں سے چپکے چپکے اس پر صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ اس ڈاکے سے پہلے ہی سارا معاملہ صاف ہو جانا چاہیے۔ پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔ سار نے ہمت کر کے دل کی بات کہی، "آپ کے ساتھ ہم بھی اتنے دنوں سے جان ہتھیلی پر لے کر ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ بھول سے بھی کبھی آپ کا کہا نہیں ٹالا۔ ریاست تو آپ کی مرضی ہو تو دینا، پر لوٹ کا بٹوارا برابر برابر ہونا چاہیے۔ گھوڑا گھاس سے یاری کرے تو کھائے کیا! آپ کو بنا کہے ہی یہ سمجھ لینا چاہیے تھا۔'

سردار کو غصہ تو بہت آیا لیکن اس وقت خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔ یہ چلے گئے تو آج کے ڈاکے کا کیا ہوگا؟ بعد میں ایک ایک کو دیکھ لے گا۔ پھر بھی وہ اپنے غصے کو پوری طرح نہیں دبا سکا۔ لہجے کو نرم میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے اتنا تو پوچھا ہی، 'کیا تم سب کی یہی مرضی ہے؟"

تک کے وقت ماتھا پیچھے کر لیا تو تا زندگی پچھتانا پڑے گا۔ ساری بات صاف ہو جانی چاہیے۔ بولے، "ہمارے پیٹ بھی آپ کی طرح خالی ہیں۔ جان کے جوکھم میں کمی بیشی نہیں تو پھر بٹوارے میں کیوں؟ خون کی آخری بوند تک آپ کے لیے بہانے کو تیار ہیں۔ ہمارا کوئی قصور ہو تو بتائیں۔"

وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ قہقہہ مار کر بولا، 'میں تو تم لوگوں کے کہنے کا انتظار کر رہا تھا۔ رتی بھر بھی وہم مت کرنا۔ ایک دم برابر بٹوارا ہوگا۔ آج کا یہ ڈاکا کامیاب ہو جائے تو پہل تم دونوں کی۔ اپنے ہاتھ سے بٹوارا کر لینا۔"

انھیں سردار کی بات سے پوری تسلی ہو گئی۔ تھان پر بکرا چڑھا کر پکایا کھایا اور تھوڑے دیر آرام کرنے کے بعد اچھا شگون دیکھ کر وہاں سے کوچ کیا۔

جب وہ اس دولت مند سیٹھ کے گاؤں پہنچے، تب آدھی رات ڈھل چکی تھی۔ گاؤں میں ایک دم سناٹا چھایا تھا۔ قسمت کی خوبی کہ کہیں ایک کتا تک نہیں بھونکا اور نہ حویلی میں گھسنے کا کسی کو پتا چلا۔ حویلی میں گھس کر چاروں الگ ہو گئے۔

مہاتما کی نظر ایک کھلے دروازے پر پڑی۔ اندر دیا ٹمٹما رہا تھا۔ جوتے وہیں اتار کر وہ پنجوں کے بل اس طرف بڑھا۔ سیٹھ برسوں بعد دساور سے آیا تھا۔ سیٹھانی ملن کی خوشی میں بڑی امنگ

سے سنگھار کر رہی تھی۔ سونے سے لدی شیشے میں دیکھ کر بندیا لگا رہی تھی کہ اپنے پیچھے ننگی تلوار کا عکس نظر آیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا ــــ سادھو کے بھیس میں سامنے موت کھڑی تھی۔ شیشہ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ چلانے کے لیے منہ کھولا، پر ڈر کے مارے آواز نہیں نکلی۔ مہاتما نے تلوار اوپر اٹھائی تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے کچھ پتا نہیں چلا کہ آگے کیا ہوا کیا نہیں۔

اس سیٹھ کے فقط ایک ہی لڑکا تھا۔ پچھلے برس ہی اس کی شادی ہوئی تھی۔ چاندی کے پلنگ پر میاں بیوی بے خبر سوئے تھے۔ ہیرے موتیوں سے مانگ بھرے ہم آغوشی کے نشے سے چور بہو پتی کی باہوں پر سر رکھے سپنوں میں کھوئی تھی۔ سنار نے ایسا کرارا وار کیا کہ ایک ہی جھٹکے میں دونوں کا سر دھڑ سے جدا ہو گیا۔ ان کے منہ سے چوں تک نہیں نکلی۔ شاید ان کی نیند ہی نہیں کھلی۔

سردار سیٹھ کی خلوت میں پہنچا۔ وہ سیٹھانی کے انتظار میں کروٹیں بدل رہا تھا۔ دروازے کے کھلنے کا کھٹکا سن کر بولا، "بہت دیر کر دی؟"

اس نے ہنس کر جواب دیا، "یم راج کی آگیا سے پہلے کیسے آتا۔"

یہ سن کر سیٹھ کو کتنے من ڈر لگا، یا اس کا کلیجا کتنے گز بیٹھا، یہ ناپنے تولنے کے لیے ابھی تک کوئی ترازو نہیں بنا اور اگر بنا ہو بھی تو ناپنے تولنے کا وقت ہی کہاں تھا۔ وہ ہڑبڑا کر پلنگ سے اٹھا۔ تب تک سر کٹ کر نیچے غالیچے پر جا گرا۔ دھڑ واپس پلنگ پر لڑھک گیا۔ سردار کو پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا کہ بنا سر کا آدمی پلنگ پر لوٹتا ہوا کتنا بھدا لگتا ہے۔

راجکمار کے حصے میں سیٹھ کے بوڑھے ماں باپ آئے۔ وہ اتنی رات گئے بھی باتیں کر رہے تھے۔ بڑھیا کی آواز سنائی دی، "پوتے کے بیاہ پر سو گاؤں نیوتے، پر پڑپوتے کے بیاہ پر دو سو گاؤں نیوتوں گی۔ بیٹا اتنی کمائی کر کے لایا ہے کہ ساری دنیا کو دس برس تک چھتیس پکوان کھلاؤں تب بھی ختم نہ ہو۔ تم کیا کہتے ہو؟"

بوڑھے نے جواب دیا، "نہ، نہ، دو سو گاؤں بہت ہیں۔ ہاں ناتے رشتے اور برادری میں کسی کو بھی پیچھے نہیں..."

بڑھیا کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ شوہر نے بات بیچ میں ہی کیوں چھوڑ دی۔ اس نے پوچھنا چاہا، پر اس کا سوال گلے ہی میں اٹک گیا۔

Scanned with CamScanner

شگون اور جوگ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔ ان کی مراد پوری ہوئی۔ ہر ایک نے اونٹ کی طاقت سے بھی زیادہ وزن بڑی آسانی سے اٹھا لیا۔ جس کی بھگوان مدد کرتا ہے، اس کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ جانے کہاں سے ان میں چالیس بھوتوں کی طاقت آ گئی۔ جوں جوں زیادہ وزن اٹھاتے توں توں انہیں بھار کم محسوس ہوتا۔ حویلی اٹھانے کی نہیں سوجھی، ورنہ اسے بھی اٹھا لے جاتے۔

گٹھریاں سر پر دھرے وہ دوڑتے ہی گئے، دوڑتے ہی گئے۔ چودھویں کا چاند ان کے ساتھ دوڑ رہا تھا، گویا چاندنی چھٹکا کر انہیں راہ دکھا رہا ہو۔ ان کے ساتھ دوڑتے دوڑتے شاید چاند بھی تھک گیا ہوگا، پر وہ نہیں تھکے۔

فقط دو گھڑی رات باقی تھی۔ ایک جگہ پیپل کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سن کر سردار ٹھٹکا۔ چاندنی میں درخت کا پتا پتا سونے کی طرح چمک رہا تھا۔ سونے کا پیپل!

پیپل کو دیکھ کر اسے ذرا تھکن محسوس ہوئی۔ اس کا حکم پا کر سب پیپل تلے بیٹھ گئے۔ اب معلوم ہوا کہ رواں رواں تھکن سے چور تھا۔

چاندنی کا اُجالا دھیرے دھیرے کم ہونے لگا۔ ایک ایک کر کے تارے گل ہونے لگے۔ فیروزی آکاش میں چاند سونے کے گولے جیسا لگ رہا تھا۔ اِدھر چاندنی کا سمندر سمٹا اور اُدھر پورب میں سورج کے اُجالے کا سمندر لہرانے لگا۔

آہستہ آہستہ سفید ہوتے چاند کی طرف دیکھ کر سنار بولا، "سالا بھگوان بھی مجھے سنار لگتا ہے۔ یہ چاند تو خالص چاندی کا ہے۔ اوپر سونے کا پانی چڑھایا ہوا۔ سورج کی روشنی میں ساری قلعی کھل گئی۔"

سنار کی بات سن کر سب کو دھیان آیا کہ وہ سنسان جنگل میں ایک پیپل تلے بسرام کر رہے ہیں۔ سردار کو یہ جگہ کافی جانی پہچانی لگی۔ ذرا غور کیا تو اس جگہ کی یاد اُس کی آنکھوں کے سامنے چتر کی طرح صاف اُبھر آئی۔ بخار میں تپتا وہ یہاں اکیلا پڑا تھا۔ اپنے ہی ساتھی دغا دے گئے تھے۔ وہ تین دن تک بھوکا پیاسا موت سے جُوجھتا رہا تھا۔ اور آج وہی پیپل ہے۔ وہی سردار ہے۔ اتنی دولت کا مالک۔ اس دولت کی چکاچوند کے سامنے سورج کی آنکھیں بھی چندھیاتی ہیں۔

اچانک اسے سنائی پڑا، "بہت دیر کر دی۔"

وہ اتنے زور سے ہنسا کہ دونوں چونک پڑے۔ پھر اس نے ہنستے ہنستے ہی ساتھیوں کو ساری بات بتاتے ہوئے کہا، "آدمی ڈھلنے پر بھی سیٹھ کو نیند نہیں آئی۔ عورت کی اتنی ہی بھوک تھی تو دساور گیا ہی کیوں تھا؟"

تھوڑا رک کر بولا، 'اس کا دھڑ پلنگ پر نہ گرتا تو اس کی جگہ میں سو جاتا۔ اس وقت مجھے دھن سے بھی زیادہ عورت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پر حرام زادے نے پلنگ پر لڑھک کر سارا مزا کرکرا کر دیا۔ اب تمہیں کیا بتاؤں، پلنگ پر بنا سر کا آدمی دیکھ کر کتنی گھن آتی ہے۔'

سنت بیچ ہی میں کھی کھی ہنسا۔ تالی بجاتے ہوئے کہنے لگا، "سیٹھانی کے انتظار میں پلنگ پر سوتے رہتے تو وہ اگلے جنم میں ہی تمہیں ملتی۔ اس وقت سولہ سنگار کیے سجی دھجی سیٹھانی کو دیکھ کر بچھا تو میری بھی ہوئی، پر میری تلوار مجھ سے زیادہ بے تاب تھی۔ تم سے کیا چھپاؤں، ایک بار تو مری ہوئی سیٹھانی کے لیے بھی طلب جاگی، پر خون کے فوارے پر نظر پڑتے ہی سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ زندہ عورتوں کا سواد تو خوب چکھا، پر عورت کی لاش کے ساتھ رنگ رلیوں کی تو ابھی من میں ہی ہے۔ کوئی ایسی جادوئی تلوار ہو جس سے گلا کٹنے پر بھی خون نہ نکلے تب کچھ بات بنے۔"

بابا کے منہ سے یہ سن کر ہم سب کے چہرے اتر گئے۔ کچھ کہنے کی کوشش کی، پر ہونٹ نہیں ہلے۔ بابا انگرکھے کا بند کھولتے ہوئے آگے کہنے لگا۔ اس چھیل کے سلسلے جو بات سنار نے شان سے بتائی، اسے سن کر وہ چھیل ضرور سوکھ گیا ہوگا، پر اس کے ساتھیوں کو اس سے رشک ہوا۔ مارنے کے بعد پوری حفاظت سے اس نے اس کے سارے گہنے اتارے۔ خون میں سنا نولکھا ہار بھی نہیں چھوڑا۔ پر چھیل کو سکھانے والی بات یہ نہیں تھی۔ اگر تم نے اس کے بارے میں سوچنے کی جرأت کی تو سر میں کیڑے پڑ جائیں گے۔

اب راجکمار کیوں پیچھے رہ جاتا۔ کہنے لگا، "آدمی جیسا اندھا اور مورکھ جیو اور کوئی نہیں ہوگا۔ اگلے پل کا بھی پتا نہیں، پھر بھی ہزار برسوں کے خواب دیکھتا ہے۔ بڈھو اور بڑھیا کے سر پر موت ناچ رہی تھی، پر وہ پڑپوتے کی شادی میں دو سو گاؤں نیوتنے کے سپنے دیکھ رہے تھے۔ پڑپوتا جننے والی ہی جب دو مہینے کی امید لیے مر گئی، تب کیا وہ آکاش سے ٹپکے گا۔ پر پھر بھی بے چاری کے من میں نہیں رہی۔ نہ پڑپوتا جنم لے پایا نہ دو سو گاؤں بلانے پڑے اور نہ بتیس پکوان کی بربادی ہوئی۔"

Scanned with CamScanner

سردار کسمیں اور خیالوں میں کھویا ہوا تھا، پر بتیس پکوان کے نام پر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ موتی چور کے لڈو اسے بے حد پسند تھے۔ کہنے لگا، "یارو، اس وقت کھانا تو کچھ اور چاہتا تھا، پر راجکمار کے منہ سے بتیس پکوان کی بات سن کر بات ہوا ہو گئی۔ اب تو موتی چور کے لڈو ہی کھا کر دماغ واپس ٹھکانے آنے لگا۔ میری اس لت کو تو تم جانتے ہی ہو۔ اب تو مجھے ان موتیوں سے بھی موتی چور کے دانے زیادہ قیمتی لگ رہے ہیں۔ پانچ من لڈو لے کر آؤ۔ آج کی کامیابی کی خوشی میں پچیس من منگواؤں تب بھی کم ہیں۔ لڈو آنے پر ہی یہاں سے چلیں گے۔ مر گیا تو من میں رہ جائے گی۔"

تینوں نے سوچا، لڈو لانے پر سردار کافی مہربان ہو جائے گا۔ پھر بٹوارے میں زیادہ جھنجھٹ نہیں ہوگا۔ خوش ہونے پر سردار کا ہاتھ کھل جاتا ہے۔ موقعے پر اسے یہ خوب سوجھی۔ پر کسی ایک کو پیچھے رہنا ہی ہوگا۔ اکیلے میں سردار پر کوئی خبط سوار ہو گیا تو لڈو بہت مہنگے پڑیں گے۔ البتہ راجکمار سردار کے جوڑ کا ہے۔ مہاتما اور سنار یہ سوچ کر لڈو لانے کے لیے فوراً تیار ہو گئے۔ کہا، "آپ دونوں یہاں آرام کریں۔ ہم ابھی لے کر آتے ہیں۔ سردار کہے تو سورج توڑ لائیں۔"

جانے کیوں ایک گہری آہ بھر کر سردار کہنے لگا، "لوٹنے پر کچھ ایسا ہی کام کرنا ہے۔ آج تو اپنے پیروں میں بے شمار دھن پڑا ہے، پر ایک دن میں راجا بنتے بنتے رہ گیا تھا اور اسی پیپل تلے تین دن بخار میں تپتا رہا تھا۔ کوئی پانی پلانے والا بھی نہیں تھا۔ مجھ پر جو بیتی وہ میں ہی جانتا ہوں۔ پر وقت ٹھیک ہونے پر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ آج ہم چاہیں تو کیا نہیں کر سکتے! جاؤ، پر جلدی لوٹنا، جیسے یہیں تھے۔ پھر چاروں بیٹھ کر وچار کریں گے۔"

جٹادھاری مہاتما اور سنار طوفان کی سی تیزی سے لڈو لانے چل پڑے۔ راجکمار انھیں تب تک دیکھتا رہا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئے۔ پھر بولا، "سردار آپ کی اجازت ہو تو ایک بات کہوں؟"

سردار بے صبری سے بولا، "میں بھی تمھیں ایک خاص بات بتانا چاہتا تھا، پر پہلے تمھاری بات سن لوں، میں پھر کہوں گا۔"

راجکمار کہنے لگا، "اوروں کے ٹکڑوں پر پلا یہ پھکڑ دھن کا کیا کرے گا۔ پھر بھی ہے کتنا لالچی! کھوٹ اور بے ایمانی کا دھندا کرنے والے سنار کے گھر کا تو پانی بھی حرام ہے۔ آپ نے انھیں

Scanned with CamScanner

سب کارستو لگا رکھا ہے۔ یہ مردود ہمیں کیا نہال کریں گے۔ بھروسا کرنے کا زمانہ نہیں ہے۔ ان کا آپ سے کیا معاہدہ! آپ دنیا پر حکومت کرنے کی خواہش رکھیں، تب بھی کم ہے۔ میں نے بھی راج گھرانے میں جنم لیا ہے۔ بغیر راج کے جینے بھی شرم آتی ہے۔ ہماری شان دھن سے ہے اور دھن کی شان ہم سے۔ خواہ مخواہ ان کنگلوں کو کیوں حصہ دیں! آپ کا نشانہ بے چوک ہے۔ دور سے ہی مار گراؤ تو پاپ کٹے۔ یہ سارا دھن ہم دونوں کے پاس ہی رہ جائے تو کتنا اچھا ہو۔ آگے آپ کی مرضی۔"

سردار اس کی پیٹھ ٹھونک کر بولا، "تم نے تو میرے منہ کی بات چھین لی۔ سامنے والے ٹیلے سے اترتے ہی ٹھکانے نہ لگا دوں تو کہنا۔ میں نے تمہاری رائے جاننے کے لیے ہی لڈوؤں کا بہانہ کیا تھا۔"

اور ادھر ان دونوں کو بھی یہی چال سوجھی۔ رستے میں دونوں صلاح مشورہ کرنے لگے۔ مہاتما نے کہا، "یہ دونوں ہم سے تگڑے ہیں ان سے جھگڑا کر کے ہم جیت نہیں سکتے۔ دیکھ لینا یہ ہمیں ایک کوڑی بھی نہیں دیں گے۔ پھر ان کے پیچھے کیوں تباہ ہوں۔ انھیں تو راج چاہیے۔ سورگ کا راج کرنے کے لیے انھیں وہیں نہ بھیج دیں۔ فوراً حکم فرما دیا کہ پانچ من لڈو لے آؤ۔ جیسے ان کے باپ کے غلام ہوں۔ پانچ سیر ہی بہت ہیں۔ اس سے زیادہ میں سنکھیا نہیں ملا سکتے۔ کھاتے ہی ڈھیر ہو جائیں تو ٹھیک ہے، ورنہ یہ یم دوت مرتے مرتے بھی ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔"

سنار نے کہا، "تم چنتا مت کرو۔ میرے پاس ایسا زہر ہے کہ کھاتے ہی ہاتھی ٹھنڈا ہو جائے۔ میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ تمہاری سمجھ کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔

عقل ہی عقل سے ٹکر لے سکتی ہے۔ حلوائی کو پانچ مہریں دے کر انھوں نے لڈوؤں میں زہر ملوا دیا۔ ان کی خوشی کا کہیں اور چھور نہ تھا۔ خیالی پہاڑوں کو ٹھوکر سے اڑاتے وہ تیزی سے واپس چل پڑے۔

سردار اور راج کمار تب سے ایک ٹک ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی راجکمار بولا، "ہاں، اب دیکھ کیا رہے ہو!"

"اب تو انھیں ٹیلے سے لڑھکتے ہی دیکھنا ہے۔"

سردار نے کان تک کھینچ کر کمان چھوڑ دی۔ ہوا کو چیرتا ہوا تیر سیدھا مہاتما کی چھاتی میں

گھس گیا۔ اس کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکلی۔ بولا "خبیث ہمارے بھی استاد نکلے۔"

دوسرا تیر سنار کے گلے کو پار کرتا پیچھے پیڑ میں دھنس گیا۔ پھر بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ رینگتے رینگتے بھی تیزی سے دوڑے۔ پیپل تلے مایا کا اتنا بڑا ڈھیر چھوڑ کر ذرا بھی کیسے جا سکتا تھا۔ موت کے کندھے پر بیٹھ کر وہ ڈھیر کے نزدیک آنے لگے۔"

سردار نے دو تیر اور چھوڑے۔ دونوں ان کی پیشانی کو چیر کر کھوپڑی میں گھس گئے۔ تب بھی انھوں نے ہار نہیں مانی۔ موت کو بھی ان پر ترس آیا، پر اس کا کوئی بس نہیں چلا۔ نہ انھیں بچا سکی اور نہ مایا کا وہ ڈھیر ان کے حوالے کر سکی۔ موت کی آنکھوں سے زار زار آنسو بہنے لگے۔

اپنے ہاتھوں لوٹی ہوئی دولت سے کوئی بیس قدم دور وہ لڑکھڑا کر دھڑام سے گر پڑے۔

دونوں کو ایک ایک ٹھوکر لگا کر سردار لڈوؤں کی گٹھری لینے کے لیے چلا تو جیسے آسمان سورج سمیت اس کے پاؤں تلے بچھ گیا ہو۔ پیپل کی چھاؤں میں آ کر گچھے کی گانٹھ کھولتے ہوئے بولا "کتوں کو برابر کا حصہ چاہیے!"

پھر اس نے لڈوؤں کی طرف للچائی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، "خوشبو تو بڑھیا ہے۔ ایک ایک لڈو ان کے منہ میں بھی ڈال دوں گے۔ بے چارے اتنی دور سے لائے ہیں۔"

دونوں ہنستے ہنستے دو دو، دو دو لڈو نگل گئے۔ کلیجے میں آگ سی لگ گئی۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ سردار بڑی مشکل سے بولا، "حرام خور، ہم سے بھی نہیں چوکے۔ اب بچنا ناممکن ہے۔ مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہوا جاتا۔ کرم کر کے یہ گٹھریاں میری پیٹھ پر رکھ دو۔ یم لوک تک تھامے جاؤں گا۔"

راج کمار وہاں بیٹھے بیٹھے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ہچکتے ہوئے دبی دبی آواز میں بولا، "تم ہی لے سکو تو یہ گٹھریاں مجھ پر رکھ دو۔ مجھ سے تو اب جا بھی نہیں جاتا۔"

دونوں کچھ دیر تک جانے کیا بڑبڑاتے رہے۔ آخر تھوڑی دیر بعد آپ ہی شانت ہو لیے۔ سارا بدن نیلا پڑ گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ بتیسی جڑ گئی۔ ہونٹوں پر جھاگوں کے بلبلے پھیل گئے۔

ہیرے موتی اور مہروں کی چاروں گٹھریاں کھلی پڑی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد گدھ، کوے اور چیلیں منڈرانے لگیں۔ انھوں نے لڈو، ہیرے موتی اور مہروں کو دیکھا تک نہیں۔ سردار اور راج کمار کو بھی انھوں نے لاوارث چھوڑ دیا۔ پر مہاتما اور سنار کی لاشوں پر وہ کس قدر ٹوٹ کر پڑے کہ

Scanned with CamScanner

دیکھتے ہی دیکھتے ان کا حلیہ بگاڑ دیا۔ رات کو سیار اور گیدڑ آئے جو بچا ہوا گوشت صاف کر گئے۔ صبح تک فقط ان کے ڈھانچے باقی بچے تھے۔ مصرور اور رجکار کی لاشیں دھیرے دھیرے کالی پڑنے لگیں۔

تاروں کی چھاؤں میں بیٹھے ہم سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ جیسے دنیا کے مرے ہوئے، زندہ اور پیدا ہونے والے سارے انسان ایک دم ننگے ہو گئے ہوں۔ پر کرتے بھی کیا! شرم سے آنکھیں جھکانے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ بابا آگے کہنے لگا: کچھ دنوں بعد ایک آدمی اُدھر سے گزرا۔ پہلے اس کی نظر کھلی ہوئی چاروں گٹھریوں پر پڑی۔ وہ سیدھا اُدھر ہی لپکا۔ بے شمار موتی اور مہریں چمچما رہی تھیں۔ بھگوان جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ بیس پیڑھیاں عیش کریں گی۔ پھر اس نے پاس ہی سڑتی لاشوں کی طرف دیکھا۔ تب تک اسے بدبو بھی نہیں آئی تھی۔ لاشوں نے اپنی پہچان تک کھو دی تھی۔ وہ ناک بند کر کے دل ہی دل میں بولا، "حرام زادوں نے ساری ہوا ہی خراب کر دی۔"

پھر اس کی نظر دو کھڑکھڑاتے ڈھانچوں پر پڑی۔ یہ پنجر بھی انسان کے ہیں! تو یہ چاروں گٹھریاں یہی اٹھا کر یہاں لائے۔ اس نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ کہیں بھی اونٹ یا گاڑی کے نشان نظر نہیں آئے۔ پٹھوں میں غضب کی شکتی تھی۔ دس اونٹوں کا وزن چار جنے اٹھا کر لے آئے۔ شاباش ہے! جیسے میرے لیے ہی اتنی بیگار کی تھی۔ بے چارے۔ اس کی خوشی کہیں آسمان میں بھی نہ سمائی۔ اس خوشی میں اسے نہ تو بدبو آئی نہ لاشیں نظر آئیں اور نہ ہی ڈھانچے۔ ایک ایک موتی ایک ایک سورج کی طرح چمک رہا تھا۔ ایک ایک مہر ایک ایک چاند کی طرح چاندنی چھٹکا رہی تھی۔ اسیم آکاش کبھی کبھی یوں آدمی کی مٹھی میں سما جاتا ہے۔ ایک گٹھری سر پر رکھی۔ پھر دوسری۔ وہ چاہے تو باقی گٹھریاں بھی اٹھا لے۔ تیسری گٹھری کو دھرنے لگا تو ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ ڈگمگا کر گر پڑا۔ تینوں گٹھریاں ان سڑتی لاشوں پر گر پڑیں۔ وہ دوسرے ہی پل پھر اپنے پاؤں پر کھڑا تھا۔ ایک گٹھری اٹھائی۔ دوسری اٹھائی۔ تیسری اٹھا کر چوتھی اٹھانے لگا تو مجھ سے رہا نہیں گیا۔ زور سے چلایا: سنو، اس ملک میں لکھنے سے گزارا نہیں ہوتا۔ ایک گٹھری مجھے دے جاؤ۔ تمھاری جیونی لکھ دوں گا۔"

میں جھجک کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا — کہیں کچھ نہ تھا۔ نہ بابا، نہ تاروں

Scanned with CamScanner

کی چھاؤں، نہ مایا کی گٹھریاں، نہ لاشیں اور نہ ڈھانچے۔ صاف ستھرا اسویرا۔ بغل میں سوتی بیوی جانے کب اٹھ گئی تھی۔ جھر رَھرر جھر رَھرر دودھ بلو رہی تھی۔ اس کی جگہ میلی چادر میں سلوٹیں پڑی تھیں۔ اس نے بڑبڑا کر بلونا بند کیا اور پاس آ کر پوچھا، "کیا ہوا؟ تم چونکے کیوں؟ کسے آواز دے رہے تھے؟"

میں نے جمائی لی۔ زور سے انگڑائی لیتے ہوئے بولا، "کچھ نہیں۔ سپنے میں ایک کہانی سن رہا تھا۔"

اس نے سر پیٹ لیا۔ بولی، "رات دن کہانیوں کی ہی لگی رہتی ہے۔ نیند میں بھی چین نہیں پڑتا۔"

وہ واپس پیڑھے پر بیٹھ گئی۔ ہمیشہ کی طرح بلونے کے ساتھ ساتھ شکایتوں کی بوچھار بھی چالو تھی۔ "پانچ دن سے بلوتے بلوتے چلا رہی ہوں، پر تم سے کہا اور دیوار سے کہا برابر ہے۔ یوں نہیں تو ڈھور رکھتے کیوں ہو؟ بغیر بانٹا چنی کے تمہاری ماں کوڈی ہے۔ آج بھی پیر کچل دیتی۔ بیچ دو تو پنڈ چھوٹے۔ خالی بلوتے بلوتے میرے ہاتھ ٹوٹنے لگتے ہیں۔ بنا بانٹے کے مکھن آئے بھی تو کیسے۔ تمہاری ان کہانیوں سے بانٹا بھی پورا نہیں پڑتا تو یہ لشکر کیسے چلے گا۔ ہمیشہ بک بک کرتی رہتی ہوں پر میری کون سنے؟ ان قصے کہانیوں کو آگ لگاؤ اور کمائی کا کچھ جتن کرو، ورنہ ساری عمر پچھتاؤ گے، پہلے کہے دیتی ہوں۔"

کہ اتنے میں سب سے چھوٹا لڑکا مسند پاؤں سے لپٹ کر بولا، "پتاجی، پیسے دو۔ آپ نے کل کہا تھا نا کہ چھٹے کروا کر دوں گا۔ کب سے آپ کے اٹھنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ آج اتنی دیر سے کیوں اٹھے؟"

بات دوسری اور مڑنے سے کہیں پیسے کی بات درگزر نہ ہو جائے، یہ سوچ کر وہ ضد کرتے ہوئے بولا، "جلدی دو ماں! دیکھو، کتنا دن چڑھ گیا۔ مجھے اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔"

Scanned with CamScanner

فہمیدہ ریاض

وہ چلی گئی

نہ جانے یہ کوئی کہانی ہے بھی کہ نہیں۔ لڑکیاں تو چلی ہی جاتی ہیں۔ سیکڑوں برسوں سے ایک دن وہ چلی جاتی ہیں۔ اور مائیں روتی چھٹپٹاتی رہ جاتی ہیں۔

ایک دن آمنہ نے بھی ماں کا گھر چھوڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں مہندی لگی تھی۔ سرخ اور سنہرا جوڑا اور لمبا سا گھونگھٹ — سر جھکائے، مہمانوں کے ہجوم میں وہ جب رخصت ہوئی تھی تو دوسرے دن، اسے بہنوں نے بتایا تھا، اس کی ماں روتے روتے بے ہوش ہو گئی تھی۔ حالاں کہ دوسرے ہی دن انھیں پھر ملنا تھا — دو محلے پار تو گھر تھا دولہا کا۔

لیکن اس طرح بیٹیاں کہاں جاتی ہیں جیسے پارو گئی۔ پورے گھر پر ایک مُردنی سی طاری تھی۔ پروین نے (جسے سب نے کتنے لاڈ اور پیار سے پارو کا نام دیا تھا) اپنی ضد پوری کر کے چھوڑی تھی۔

آمنہ اور جمال نے بیٹی کو قید کر کے تو نہ رکھا تھا۔ آمنہ خود ایک متوسط طبقے کی پڑھی لکھی عورت تھی، علم اور ادب کی رسیا۔ وہ ایک کالج میں ادب پڑھاتی تھی۔ لیکن پھر بھی، ماں آخر ماں ہوتی ہے، اور پھر ایک بیٹی کی ماں۔ بیٹی، جسے دیکھ کر وہ حالی کے اشعار یاد کرتی تھی:

آتی ہو اکثر بے طلب
دنیا میں جب آتی ہو تم
پر موہنی سے اپنے یاں
گھر بھر پہ چھا جاتی ہو تم

پارو بھی تو چھا گئی تھی گھر بھر پر۔ کیسی ذہین اور سمجھ دار بچی! پارو نے سچ مچ ماں کو کبھی دکھ نہ دیا تھا۔ بچپن ہی سے اسے پڑھائی کا شوق تھا۔ اپنے بھائی کے مقابلے میں وہ کہیں زیادہ ذمےدار بھی تھی۔ عمر بڑھنے کے ساتھ اس کا تعلیم کا شوق بھی بڑھتا گیا تھا۔ دوسری نوجوان لڑکیوں جیسے اس نے کبھی کوئی مطالبات نہ کیے تھے — نہ زیور کپڑے کے، نہ سنگھار کی چیزوں کے۔ جب انٹر پاس کر کے پارو نے میڈیکل کالج میں داخلہ لے لیا تھا تو خوشی اور تشکر سے آمنہ کے آنسو نکل آئے تھے۔ کتنی پیاری اور سمجھ دار ہے میری بیٹی! آمنہ اور جمال ایسی بیٹی پر نثار رہتے تھے جو از خود ہی سب درست کام کرتی تھی۔ اس کے لیے یہ کہنا صحیح نہ ہوتا کہ وہ ماں باپ کا کہنا مانتی تھی۔ چھوٹی سی عمر میں وہ اتنی سمجھ دار تھی کہ ماں باپ کو سوچنا پڑتا تھا کہ وہ اس کا کہنا مانتے ہیں یا نہیں۔

صبح صبح کالج جانے سے پہلے وہ آمنہ کو حکم دیتی:

"امی، ناشتہ ٹھیک سے کیجیے۔ ایک گلاس دودھ ضرور پیجیے۔ اس عمر میں جسم میں کیلشیم کم ہو جاتی ہے۔"

پھر وہ جمال کو گھورتی۔

"ابو، آپ سگریٹ پینا فوراً چھوڑ دیجیے۔ بس آج سے یہ منحوس چیزیں اپنے گھر میں نہ دیکھوں۔" وہ میز سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھا کر مسلتے ہوئے ردی کی ٹوکری میں پھینک کر چلی جاتی۔ جمال کتنی دیر تک چپکے چپکے ردی کی ٹوکری سے ٹوٹے ہوئے سگریٹ نکالتا رہتا۔ آخر کار اس نے سگریٹ پینا سچ مچ چھوڑ دیا تھا۔

ہاں بس ایک بار آمنہ اور جمال نے متحدہ محاذ بنا کر اسے کچھ کرنے سے روکا تھا۔

ایک دن کالج سے لوٹ کر کھانا کھاتے ہوئے اس نے کہا تھا:

"ابو، امی، کل 'ٹرمینیٹر' دیکھنے جاؤں گی۔ پلیز بکنگ کرا دیجیے۔"

"اکیلی ہی جاؤ گی؟" جمال نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر پوچھا تھا۔

"نہیں، ایک دوست بھی ہے،" پارو نے کہا تھا۔

جمال نے دوسرے دن فلم کے چھ بجے والے شو کی بکنگ کرا دی تھی۔

پارو کالج سے آئی تو باپ نے ٹکٹ تھما دیے۔

"تھینک یو ابو!" وہ جمال سے لپٹ گئی۔

"مگر تمہاری دوسری دوست کہاں ہے؟ چلو میں تم دونوں کو چھوڑ آؤں۔ پھر واپسی پر بھی لینے آجاؤں گا۔ زمانہ ایسا خراب ہو گیا ہے کہ دو لڑکیوں کو بھی رات گئے اکیلے نہیں آنا چاہیے۔"

"لڑکیاں!" پارو نے قہقہہ لگا کر کہا تھا۔ "نہیں بھئی، میرا دوست تو لڑکا ہے۔ میرا کلاس فیلو۔"

"کیا؟" جمال اور آمنہ نے بیک وقت کہا اور ساتھ ساتھ ہاتھ بڑھا کر ٹکٹ پارو کے ہاتھ سے واپس لے لیے۔ ایک ٹکٹ آمنہ کے ہاتھ آیا اور ایک جمال کے۔

"کون ہے وہ؟" آمنہ نے پوچھا۔

"پہلے ہم سے تو ملاؤ" جمال نے کہا۔

"کیا تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟" آمنہ کا سوال۔

"اس کے ماں باپ، خاندان، گھرانہ۔" جمال نے دور اندیشی دکھائی۔

پارو باری باری ماں اور باپ کی طرف کل کی گڑیا کی طرح گردن گھما گھما کر دیکھ رہی تھی۔ آخر اس نے کہا:

"امی، ابو، یہ آپ لوگ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کہاں کی شادی؟ کیسی شادی؟ کیسا خاندان؟ ہم دونوں تو صرف 'ٹرمینیٹر' دیکھنا چاہتے ہیں۔"

آمنہ اور جمال نے غور سے پہلے اس کی طرف اور پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں اپنی بیٹی کی بات پر فوراً یقین آ گیا تھا۔ پارو کو چوں کہ ابھی تک جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی اس لیے اسے صرف سچ بولنا آتا تھا۔

تب آمنہ نے پیار سے بیٹی کا منہ چوم کر کہا تھا:

"ناں بیٹی ناں! اکیلے کسی لڑکے کے ساتھ فلم دیکھنے نہیں جاتے۔"

"تم بہت نیک ہو، لیکن زمانہ بہت خراب ہے،" جمال نے انگلی اٹھا کر کہا۔

"لڑکے اور لڑکی کا اکیلے ساتھ ہونا ایسا ہے جیسے آگ اور کپاس کا ساتھ" آمنہ نے کہا، اور سوچا کہ یہ بات تو اس کی ماں کہتی تھیں، اسے کیسے یاد رہ گئی؟ کیا وہ اس کے ذہن کے کسی حرام میں زندہ دفن تھی اور آج اچانک آزاد ہو کر اس کے ہونٹوں پر آ گئی تھی؟ جب ماں کہتی تھیں تو آمنہ

کو کتنا غصہ آتا تھا۔ آگ اور کپاس! ہونہہ، نانی شاید مجھے کپاس سمجھتی ہیں!

لیکن پارو کو غصہ نہیں آیا۔ آنکھیں پھاڑ کر بولی:

"لیکن میں تو لڑکوں کے ساتھ پڑھتی ہوں۔ ہم لڑکے اور لڑکیاں سارا دن ساتھ رہتے ہیں۔ ساتھ ساتھ مُردوں کی چیر پھاڑ کرتے ہیں وہاں ہم"

"وہ دوسری بات ہے،" آمنہ نے کہا۔

"ہاں وہ دوسری بات ہے،" جمال نے کہا۔

"وہاں تو بہت سے لڑکے اور بہت سی لڑکیاں ہوتی ہیں،" آمنہ نے کہا۔

"اب اگر تمہارا کوئی گروپ جا رہا ہوتا" جمال نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں اگر تمہارا کوئی گروپ جا رہا ہوتا" آمنہ نے ذرا سی گہری سوچ میں پڑ کر کہا، "تو ہم تمہیں ضرور جانے دیتے۔"

"ہاں" جمال نے کہا۔

پارو پل بھر سوچتی رہی۔ کچھ بسورنے کی کوشش کی۔ مگر پھر حیرت انگیز طور پر مان گئی۔ وہ اتنی سمجھدار ہو چکی تھی۔ شاید سمجھ گئی کہ ماں اور باپ، جو زیادہ تر گھر چلانے میں مصروف رہتے ہیں، کس طرح زمانے سے جوجھ رہے ہیں — کبھی زمانے کا ساتھ دینے کی کوشش کرتے ہیں اور کبھی پریشان ہو جاتے ہیں! ایک قدم آگے اور ایک قدم پیچھے رکھتے ہیں۔ مگر وہ جانتی تھی کہ دونوں سے کتنا چاہتے ہیں۔ مگر کیا وہ یہ بھی جان گئی تھی کہ یہ مضحکہ خیز سا لگے بولتے ماں باپ خود کو تجربہ کار تو کہتے ہیں، مگر بیٹی پالنے کا وسیع تجربہ انہیں بھی کہاں تھا — اور وہ بھی بدلتے ہوئے وقت میں۔ پہلی ہی بار تو پال رہے تھے وہ بیٹی۔ کیا کریں اور کیا نہ کریں، وہ بالکل نہیں جانتے تھے۔ زیادہ تر وہی کچھ کرنے کی کوشش کرتے جو پڑوس میں ہوتا تھا۔

پارو نے ٹیلی فون پر نمبر ملا کر لڑکے کو منع کر دیا۔

"امی اور ابو اجازت نہیں دے رہے،" اس نے بے فکری سے کہا۔ پھر ہمیشہ کی طرح گھر پر حکم چلانے لگی۔ آمنہ اور جمال کی جان میں جان آئی۔ ایسی ہی تو تھی وہ۔ ماں باپ کی آنکھ کا تارا۔ اس چھوٹے سے گھر کی، جسے سفیدی اور چھوٹی موٹی مرمت کی عرصے سے ضرورت تھی، نٹ کھٹ راج کماری۔ وہ اس کے راج میں کتنے خوش تھے۔ آمنہ کے لیے تو وہ جیسے خود اس کا نیا جنم تھی۔

Scanned with CamScanner

ماں کو بیٹی کے روپ میں اپنا بچپن، نوجوانی، سب کچھ ہی دوبارہ مل جاتا ہے۔ وہ اسے کنول کی طرح ہاتھوں میں رکھتی تھی۔ مگر بیٹی پھر بھی عورت ذات ہوتی ہے۔ آمنہ آتے جاتے کبھی اس کے اٹھتے وجود پر نظر ڈالتی۔ کبھی کبھی وہ اسے دنیا کی اونچ نیچ سمجھانا چاہتی۔ لڑکی ہونے کا عورت ہونے کا مطلب کیا ہوتا ہے، کبھی کبھی وہ اسے سمجھانا چاہتی۔ گھٹا گھٹا کر سمجھنے سے کیا فائدہ! وہ سوچتی۔ ساری ماؤں کی طرح اپنی بیٹی کے مستقبل کے خیال سے کبھی کبھی اس کا دل لرزنے لگتا تھا۔ ایک لڑکی کی منھ زور آرزوؤں سے... اور دنیا سے... زندگی سے۔ جو طمانچے مار مار کر عورت کو عورت ہونے کا مطلب بتاتی ہے۔ ایک قدم کی اونچ نیچ اور زندگی بھر کے تلخ پچھتاوے۔

ہمیں اس کی شادی کی فکر کرنی چاہیے۔ اس رات آمنہ نے جمال سے کہا تھا۔ جمال اپنی بیٹی پر بہت نازاں تھا۔ لاپروائی سے بولا:

"ہونہہ۔ ابھی سے کیوں فکر کریں۔ ارے زمانہ بدل گیا ہے۔ آمنہ ابھی تو پارو ڈاکٹر بنے گی۔ پھر سوچیں گے۔"

مگر۔ آمنہ نے فکرمندی سے کہا تھا، کچھ ضدی بھی تو ہے۔

وہ ضدی نہیں ہے۔ تم ابھی تک اسے بالکل بچی سمجھتی ہو۔ جبکہ وہ تو دراصل بہت پیاری بچی ہے،" جمال نے ایک جملے میں تین مرتبہ خود اپنی بات کی تردید کرتے ہوئے کہا (حسبِ معمول)، ابھی جمال نے جو نب سو لٹائے بیٹھا تھا۔ چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

وہ چلی گئی۔

وہ چلی گئی۔

وہ چلی گئی۔

پارو کے بغیر گھر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ پارو نے اپنی ضد پوری کر کے چھوڑی... ضد، جسے وہ اپنی آتما کی آرزو سمجھ بیٹھی تھی۔ لڑکیوں کی آرزوئیں۔ لڑکیوں کی آرزوئیں تو بس کچھ بھی ہو سکتی ہیں۔ وہ تو ہاتھ بڑھا کر ستارے توڑ لینا چاہتی ہیں۔ تو کیا سچ مچ وہ ایسا کر سکتی ہیں؟ ایک لڑکی اور ستاروں کے بیچ میں ایک بھیانک خلا ہے۔ پارو... پارو۔ تو سمجھتی کیوں نہیں!

ایک رات پڑھائی ختم کر کے وہ اس کے ساتھ آلیٹی تھی۔ اس کی گود میں گھسی ہوئی۔

"امی، وہ لاڈ سے بولی تھی۔ جانتی ہیں میرا کیا دل چاہتا ہے؟"

"کیا؟" آمنہ نے اس کے بال سہلاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میرا دل چاہتا ہے۔" اس نے کھڑکی سے جھانکتے چاند پر نظریں جما کر کہا تھا، "کہ ایک بہت اونچے بہت ہی بلند پہاڑ پر چڑھتی چلی جاؤں۔ اور چڑھتے چڑھتے چوٹی تک جا پہنچوں۔ اور وہاں زور سے سانس لوں اور آواز دوں: امی ی ی ی"

آمنہ کی نظریں بھی چاند پر ٹکی تھیں۔ اس نے ٹھنڈے زرد چاند کی سطح پر اپنی بیٹی کو ایک برفیلے پہاڑ پر چڑھتے دیکھا۔ اس کا دل کانپنے لگا۔ "نہیں!" اس نے پارو کو زور سے بھینچ کر کہا۔

"کیا نہیں؟" پارو نے منہ اٹھا کر پوچھا۔

"چوٹی تک پہنچیں تو ضرور نیچے گر پڑو گی۔" آمنہ نے کہا۔ اتنی بلندی کا سوچ کر ہی اس کا سر چکرانے لگا تھا۔

پارو قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ اس سے لپٹ گئی۔ پھر اس کی گردن میں منہ گھسا کر بولی، "امی آپ بالکل بدھو ہیں۔"

آمنہ نے اسے پرے دھکیلا۔ "چل ہٹ! ماں کو بدھو کہتی ہے۔"

"اوہ نہیں۔ سوری سوری!" پارو نے فوراً معافی مانگ لی۔

آمنہ نے اسے معاف کر دیا تھا۔ اور آج... آج وہ پچھتا رہی تھی کہ پارو کو اس نے ایک فرماں بردار لڑکی کیوں نہ بنایا۔ اسے کیا خبر تھی۔ وہ کہاں جانتی تھی کہ مذاق ہی مذاق میں بات اتنی بڑھ جائے گی! چھ مہینے پہلے اپنے ساتھ پارو کو اسلام آباد لے جانا غضب ہو جائے گا۔ اکیلی ہی سیر سپاٹے کو نکل جاتی تھی۔ وہیں کسی سے ملی۔ کب ملی؟ کہاں گئی؟ بالا ہی بالا کیا طے ہوا؟ ایسا بھلا کبھی ہو سکتا ہے؟ اس کے اپنے خاندان میں تو ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ لڑکیاں...

گول کمرے میں وہ تینوں منہ لٹکائے بیٹھے تھے۔ آمنہ، جمال اور پارو کا چھوٹا بھائی جو بددلی سے ان کے اداس، فکرمند چہروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آخر کار جھنجھلا کر بولا:

"ارے بھئی چلی گئی تو چلی گئی۔ اب اتنی بڑی تو وہ ہو گئی ہے۔ اپنے فیصلے خود نہیں کرے گی تو کیا آپ لوگ کریں گے؟" وہ غصے میں اٹھ کر نکل گیا اور اپنے کمرے میں پنچنگ بیگ پر گھونسے مارنے لگا۔

"آپ ہی نے اسے خراب کیا تھا۔" آمنہ نے روکھی آواز میں کہا۔ "ہر جا و بے جا بات پر

اس کی طرف داری کرتے تھے۔ دیکھ لیا نا اس کا نتیجہ!'

جمال کا دل ڈوبا ہوا سا، مگر خود پر الزام آتے دیکھ کر ٹھنے سے بولا:

'ہاں ہاں کرتا تھا اس کی حمایت۔ یہ تمہاری بے جا سختیوں کا نتیجہ ہے۔ وہ ٹہلنے بھی جانا چاہتی تو تم منع کر دیتی تھیں...'

رات کے گیارہ بجے؟ آمنہ گھٹی گھٹی آواز میں چلائی۔

پارو کہتی تھی، 'ہمیں اپنی گلی میں تو ٹہلوں گی میں...'

آمنہ اسے پیار سے سمجھاتی تھی، "اتنی رات گئے نہیں ٹہلتیں لڑکیاں۔ لوگ ایسی ویسی سمجھتے ہیں۔ پھر اس کی ضد پر کہتی، چلو میں خود چلتی ہوں تمہارے ساتھ..."

یک رات وہ اس کے ساتھ گئی تھی۔ جیسا کہ آمنہ کو اندیشہ تھا، پانچ منٹ میں دو مرد کار میں ان کا پیچھا کرنے لگے تھے۔ جدھر وہ مڑتیں اُدھر ہی چیونٹی کی رفتار سے کار چلاتے وہ بھی مڑ جاتے۔ اوپر سے کراچی کی لوڈشیڈنگ... آدھے محلّے کی سڑکوں کی بتیاں گل۔ آمنہ کا خون کھول رہا تھا۔ آخر ایک ذرا روشن سڑک پر اس نے زمین پر پڑا ایک بڑا سا پتھر اٹھا لیا اور مڑ کر انھیں للکارا۔

اب ہمارے پیچھے آئے تو تمہاری کار کے شیشے کی خیر نہیں...'

وہ کار بھگا کر نکل گئے۔ عین سامنے ایک مکان کی سیڑھی پر بجلی کے بلب کی زرد، ملگجی روشنی کے دائرے میں ایک بڑے میاں سفید کرتا پاجامہ پہنے، دوپلی ٹوپی لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے پاس دو جوان لڑکے کھڑے گپ کر رہے تھے۔ آمنہ نے اپنی سہم مٹانے کے لیے ان سے مخاطب ہو کر کہا:

یہ اندھیر ہے کہ نہیں! آدمی اپنے محلے میں چل پھر نہیں سکتا۔ اب ہماری گلیاں بھی اتنی غیر محفوظ ہو گئی ہیں۔"

وہ تینوں بڑے تجسس سے انھیں دیکھتے رہے۔ آخر بڑے میاں بولے، 'کون ہیں آپ؟ کہاں رہتی ہیں؟"

"ہمیں تو۔ اسی پچھلی گلی میں۔"

اچھا! وہاں تو ہم نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔"

کیا؟ آمنہ نے حیرت سے کہا۔ پھر گھبراہٹ میں اس نے اپنے مکان کا نمبر دُہرایا۔

اچھا چھا بڑے میاں نے کہا۔ پھر لڑکوں سے مخاطب ہو کر بولے، سبھی نیک ہی نکلیں تمہیں یہ خوشی ہیں! پھر وہ آمنہ سے کہنے لگے، مگر بیگم صاحبہ، وہ بچی کا خیال خود ہی رکھیے۔ اب اس وقت آپ کو ان سڑکوں پر کوئی عورت ذات نظر آ رہی ہے؟ آپ وہاں کریں گی تو یوں تو ہو گا ہی..."

گھر آ کر اس نے تقریباً پارو کی ٹھکائی کر دی تھی۔ ذلیل خوار کر کے! چڑیل

پارو کوفت سے دانت پیس رہی تھی۔ کیا ضرورت تھی کہ آپ کو یہیں کرمیٹ کرنے کی؟ چلے جاتے وہ لوگ۔ کیا کر لیتے ہمارا

آمنہ کا دل چاہ رہا تھا کہ اپنے بال نوچ ڈالے۔ بیٹھی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ آخر پارو سمجھ گئی۔

ٹھیک ہے نی رات کو ٹھنڈے کا آئیڈیا اس نے انگلی ہلائی۔ ڈرپ!

پھر آمنہ نے سے گلے لگایا تھا۔ دیر تک پیار کرتی رہی تھی۔ بھائی کو بھیج کر اسے آئس کریم منگا دی تھی۔ آئس کریم، جیسے وہ بچی بچی ہی تو تھی۔ اس نے کیوں نہ سمجھا، کیوں نہ جانا، کہ اب وہ بچی نہیں رہی۔ وہ تو اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ اس کی نظریں کہیں دور ہی جا ٹکیں

کچھ سن گن سی تو تھی آمنہ کو لیکن وہ تو یہ سب مذاق میں ٹال رہی تھی۔ اسے اپنی پارو پر پورا بھروسا تھا۔ وہ ماں باپ کی مرضی کے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔ نادان ماں! بھول گئی تھی کہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ جوان لڑکی کے دل میں کچھ سما جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ وہ سوچتی تھی کہ ایسا تو بس کہانیوں میں ہوتا ہے۔ اصل زندگی میں لڑکیاں اپنی حدیں پہچانتی ہیں۔ یہ چین اس دن چکنا چور ہو گیا تھا جب آمنہ نے پارو کی میز پر یک فارم پڑا دیکھا تھا۔ میڈیکل چیک اپ، بلڈ گروپ آمنہ کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ پورا فارم پڑھا تو اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

شام کو لڑکی کالج سے آئی تو آمنہ نے منہ در منہ بات کی۔

"کب سے چل رہا ہے یہ سلسلہ؟"

پارو تیکھی نظروں سے مسکرائی۔ وہ اسلام آباد، اور نہ جانے کیا کیا۔

"تو ہمیں کیوں نہ بتایا...؟"

بتادیتی جانے سے دو دن پہلے۔ بتا سے ہی دل تھی کل آپ کو

'یہ بتانا ہوا؟ تمہیں فوراً اطلاع دینی چاہیے تھی۔

پارو اکڑ کر تختہ سی ہو گئی۔

'آپ پریشان جو ہو جاتیں لیکن اب... اب جب آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہے تو اب آپ مجھے مت روکیے۔ خوشی سے اجازت دے دیجیے ممی

ورنہ؟'

'ورنہ میں یوں ہی چلی جاؤں گی۔ اب میں نہیں رک سکتی۔ جب سب کچھ طے ہو چکا ہے اب اس اسٹیج پر۔ پلیز۔ پلیز امی! مجھے نہ روکیے۔

پریشانی اور غصے سے آمنہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس نے ایک نظر بیٹی کے سراپا پر ڈالی تھی۔ وہ جس کے رونگٹے پر بھی آنچ نہ آنے کی منتیں مانی تھیں اس نے اتنی ضدی، ایسی خودسر نکلے گی... ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

سمجھا بجھا کر روک لو، حسن نے بھاری دل سے کہا تھا۔

وہ اس سے زیادہ پریشان تھا، لیکن جوان بیٹی سے تکرار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

آمنہ ٹوٹی ہوئی بستر پر جا بیٹھی تھی۔ اکیلی وہ پارو سے کیا کچھ کہنا چاہتی تھی... پارو! مت جاؤ باہر طوفانی ہوائیں چلتی ہیں۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ میں سب کچھ خود سنبھال لوں گی... جس سے بات کرنی ہو کر لوں گی۔ میں خود فون پر اسلام آباد سے بات کروں گی لاؤ مجھے وہ نمبر

پارو نے اسے نمبر دے دیا۔

ٹیلی فون پر ایک بھاری، سنجیدہ آواز...

'جیسی آپ کی بیٹی ویسی ہماری ہم اس کا پورا خیال رکھیں گے۔ آپ کو کوئی شکایت نہ ہو گی۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں بیگم صاحبہ

آمنہ نے فون بند کر دیا تھا۔ سب کچھ پہلا ہی طے کر کے آئی تھی پارو۔ اس نے پہلے کیوں نہ سوچا۔ پہلے کیوں نہ سوچا، کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

اس رات ایک بے چین نیند میں ماں نے اپنے آپ کو نوجوان پایا تھا۔ وہ کسی ٹرین میں سفر کر رہی تھی اور کھڑکی کے پار گھنے جنگل گزر رہے تھے۔ کبھی اس نے ان جنگلوں میں جانا چاہا تھا

ان کے گرم سانسوں سے نکلتی سگندھ کو اپنے وجود میں بھر لینا۔ اس نے سمندر کے کھلے پانیوں میں تیرنا چاہا تھا۔ نیلے زمردیں پانیوں میں۔ مچھلی کی طرح تیرتی ہوئی، اس پار سے اس پار تک... وہ جو عورت تھی، یک لڑکی تھی کبھی وہ بھی۔ وقت نے اسے دہلیز سے باہر سنبھل کر قدم رکھنا سکھایا تھا — بارش میں سڑک پر نہ رکنا، بھیگے کپڑوں میں جلتی ہوئی نظروں کے سامنے نہ آنا۔

اور اب، بیٹی کی ماں بن کر، وہ اس تک وہی کچھ پہنچانا چاہتی تھی۔ ایک اضطراری کیفیت میں اپنی بانہوں کے حلقے میں محفوظ رکھنا چاہتی تھی اسے۔ پاگل خواہشوں کی رو میں بہہ نہ جاؤ... وہ اسے جھنجھوڑ کر بتانا چاہتی تھی... تم لڑکی ہو۔ عورت ذات!

اگر پارو کی جگہ اس کا سائی بھی سب کچھ کرتا تو وہ اتنی مضطرب ہوتی؟ دل کے چور نے پوچھا تھا۔ نہیں اتنی تو نہیں... اس نے دل سے کہا تھا۔ لیکن وجہ صاف ظاہر ہے۔ پارو تو لڑکی ہے۔ آمنہ کے دماغ کی گتھیوں میں سینکڑوں نسلوں کی سوچ الجھی ہوئی تھی دماغ کے ریشوں سے۔ اور وہ بھی جو دنیا کے سارے ودوانوں نے سمجھایا تھا۔ وہ کوئی جاہل عورت نہ تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہی تو، جب چاند گرہن ہوا تھا... پورا چاند اور پورا گرہن۔ وہ اپنی چھت پر بیٹھی وسیع آسمان پر تیرتے چاند کو چمکیلی ہتھیلیوں سے گرہن کے شکم میں جاتا دیکھتی رہی تھی۔

چاند۔ جو سمندر کی لہروں اور عورت کے خون کو ستاتا ہے۔ اس کے ذہن میں اس کے پسندیدہ مصنف بیدی کی سطریں تیرتی ہوئی آئی تھیں۔ اسے "گرہن" یاد آیا تھا، بیدی کی کہانی۔ کیشو اور راہو۔ چھوڑ دو، پکڑ لو کی آوازیں... ایک ناؤ میں پورے حمل سے ایک عورت... جو چلی گئی تھی... گھر چھوڑ کر نکل پڑی تھی، اور جس کے ساتھ نہ جانے کیا کچھ ہو رہا تھا۔ جو بے بس تھی۔ اپنی نسائیت سے بے بس۔ جس کے ساتھ گھر سے باہر کی دنیا کچھ بھی کر سکتی تھی۔

"چلی جانے والیاں..." آمنہ نے ٹھٹھرتا ہوا سانس لے کر کہا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے تک اس نے چاند کو رتی رتی گرہن میں جاتا دیکھا تھا، اور پھر نیچے چلی آئی تھی۔

تولیہ اٹھا کر آمنہ تھکے قدموں سے نہانے کے لیے غسل خانے میں جانے لگی تو پارو کے کمرے سے گزری۔ جلدی میں سمیٹا ہوا سامان چھوٹے سوٹ کیس میں بھر کر لے گئی شاید۔ بڑا سوٹ کیس کھلا پڑا تھا۔ پارو کے بستر پر لاپروائی سے پھینکا ہوا دوپٹہ دیکھا تو آمنہ کے دل میں ہوک اٹھی۔ پھر اس پر غصہ غالب آ گیا۔

چلی گئی۔ ان سے سختی سے دل سے کہا تھا، اب اس کے ساتھ جو ہو سو ہو۔

دوسری صبح بچی سسرال کی پڑوسن نے کھڑکی سے جھانک کر اسے دفتر جاتے جاتے آواز دے کر روک لیا۔

کیا بات ہے، آپ کچھ پریشان دکھائی پڑ رہی ہیں؟ انھوں نے تکلف سے پوچھا۔ کل سے بارو کی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ کیا گھر میں نہیں ہے؟

تبسم کا جی جل کر رہ گیا۔ جیسے کچھ جانتی ہی نہیں! ایک ایک آواز تو نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے جاتی ہے۔ کبھی بسنت کے نئے پرانے مکان، جلدی میں کرائے پر اٹھانے کے لیے بنائے ہوئے۔ پڑوسیوں سے کسی قسم کی رازداری رکھنے کے لیے وضع نہیں کیے گئے تھے۔ دو دن سے ماں بیٹی میں جو تکرار چل رہی تھی، جس میں کبھی کبھی باپ کی بھاری مضطرب آواز بھی شامل ہو جاتی تھی، کہاں تک نہ پہنچی ہوگی؟ پھر بھی اس نے مختصر سا جواب دیا۔

وہ نہیں ہے۔ گئی ہوئی ہے کہیں اپنی سہیلیوں کے ساتھ

تبسم نے صریحاً جھوٹ بولا۔ جھوٹ بولنے کی اسے بھی کوئی خاص عادت نہ تھی۔ آخری جملہ بھی مشکل سے منہ سے نکلا۔ لڑکی ذات۔ بیٹی کی ماں ہونا۔ بیٹی کی ماں ہونے کا مطلب کیا ہوتا ہے یا ہو تو مجھے یہ مطلب سکھا گئی! اس نے دانت پیس کر سوچا اور جلدی سے گیٹ کھول کر باہر نکل گئی۔

کالج کلاس، نیو ٹوریل۔ وہ کھوئی کھوئی سی اسٹاف روم میں آ بیٹھی۔ کسی نے بات بھی کی تو ہوں ہاں میں جواب دے دیا۔ اب کسی کو کیا بتاتی کہ اس کی بیٹی

ایک لڑکا ہوم ورک بک لیے آیا۔ بے خیالی میں جھولے میں سے اس کی کاپی نکال کر اس کے سامنے کی۔ لڑکے نے کھول کر دیکھی۔ انگریزی کے اپنے مضمون کے اوپر جانے کس وقت پھول چنتے سوچتے تبسم نے اردو میں کچھ لکھ دیا تھا۔ عینک کے شیشوں سے جھانکتے ہوئے لڑکے نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا:

کیا ہوا میم۔ کون چلی گئی؟

تبسم نے کاپی تقریباً جھپٹ کر دیکھی۔ لکھا تھا: وہ چلی گئی!

یہ وہ کہہ رہی تھی۔ یہ تو ایک کہانی ہے، ڈی ایچ لارنس کی۔ وہی جس کا نام

ہے: شی روڈ اوے۔ وہ سوار ہو کر چلی گئی، تو بس اس کا سوچ رہی تھی۔ ہمارے ایک دوست نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔۔۔"

اچھا؟ لڑکے نے کہا اور بلائے ناگہانی کی طرح ٹل گیا۔

آمنہ پنسل سے میز بجاتی رہی۔ وہ دو دن سے واقعی اس کہانی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ عورت۔ وہ جو چلی گئی تھی، بس یوں ہی منہ اٹھا کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا پکڑا جا، وہ غار۔ عورت کے کل وجود کی علامت۔ اس میں داخل ہوتی ہوئی پہلی کرن۔ اور بلند ہوتی ہوئی کلہاڑی۔ ایک پُرتشدد، خون میں لت پت تکمیل۔ عورت کی؟ نسائیت کی؟ نسائیت کا مقسوم؟

چلی جانے والیاں۔ اس نے ٹھٹھرتی ہوئی سانس سے سوچا تھا۔ اور ان کا انجام۔ علامتی اور حقیقی۔ جو دنیا کے بہترین مصنفوں نے صاف صاف لکھ دیا تھا۔

کبھی کبھی اس کے دل کا چور پوچھتا تو تھا کہ عورتوں ہی کی علامتیں کیوں؟ مردوں کی کیوں نہیں؟ مردوں کے وجود کی علامتیں — ہتھیار، تلوار، بھالے، برچھے، تیر وغیرہ، یہ سب کبھی کبھی ادب میں استعمال ہوتے تو تھے مگر ان کا انجام تباہ، پُرتشدد یا خراب نہیں ہوتا تھا۔ ایسا کم ہی لکھا گیا تھا کہ ہتھیار ٹوٹ گیا، یا ٹیڑھا ہو گیا یا تلوار ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی، یا کھٹل ہو گئی۔

پھر وہ سوچتی، اس میں بھی کوئی راز ہو گا۔ کوئی راز جو اس سے اس کا دھک دھک کرتا ہوا دل جاننا بھی نہ چاہتا تھا۔ جب کہ اس کی بیٹی چلی گئی تھی۔ جانے اس وقت، اس نے مشکل سے سوچا تھا، وہ کہاں ہو گی! مشکل سے۔ کیوں کہ وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

تین دن بعد آمنہ کو کالج کے کسی کام سے لاہور جانا تھا۔ وہ تین دن اس نے کس طرح گزارے، کچھ اس کا ہی دل جانتا تھا۔ اس نے پارو کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ بس چلی گئی تو چلی گئی، اس نے دل کو سختی سے سمجھا لیا تھا۔ وہ لاہور جانے کے خیال سے خوش تھی کہ مصروفیت میں کسی طرح وقت گزر جائے گا۔ بس اسی طرح وقت گزرتا جائے اور وہ پارو کے بارے میں، اس کے انجام کے بارے میں، سوچ بھی نہ سکے۔

لاہور میں سات دن اس نے گھر ٹیلی فون تک نہیں کیا۔ آنے سے ایک دن پہلے اس نے کانپتے دل سے اپنے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف جمال تھا۔ دو منٹ تک وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی۔ دوسرے دن کی فلائٹ کا نمبر بتایا۔ ہمت ہی نہ پڑتی تھی کہ کچھ اور پوچھے۔ آخر کانپتے

دل سے کہا:

"اور... پارو؟"

اسے اپنی آواز خود بہت دور سے آتی سنائی دے رہی تھی۔

واپس آ گئی ہے پرسوں،" جمال کی آواز آئی۔ پارو کا دل زور سے اچھلا اور پھر بیٹھنے لگا۔

ٹھیک تو ہے؟ ہڈی پسلی تو نہیں ٹوٹی؟ اس نے ہنسنے اور رونے کی کسی درمیانی کیفیت میں کہا۔

بالکل ٹھیک ہے!" جمال کا مسرت بھرا قہقہہ بالکل پاس سے آتا سنائی دے رہا تھا۔

آمنہ نے ریسور رکھ دیا۔ تین منٹ کے ٹیلی فون میں دنیا بدل چکی تھی۔

ٹھیک ہے چڑیل... تو چلو... خیر...

ماں اتنی تیزی سے گھر پہنچی تھی کہ شاید اسے لانے والا ہوائی جہاز اس سے پیچھے رہ گیا ہو۔ سامنے کھڑی تھی پارو۔ بے حیائی سے دانت نکالے ہنستی ہوئی — سے اتنا پریشان کر کے کالی کلوٹی ہو کر آئی تھی دس دنوں میں۔

اور آمنہ — آمنہ اسے تک رہی تھی... چھو رہی تھی... سن رہی تھی اس کی میٹھی آواز۔ مسحور مبہوت۔

امی، مجھے اتنا مزہ آیا۔ اتنا مزہ! ہم بلتستان سے بھی بہت آگے پنو گلیشیر پر گئے تھے۔

دھیرے دھیرے آمنہ بستر پر لیٹ گئی۔ کھلی کھڑکی سے رات کی ٹھنڈی ہوا کا سگندھ بھرا جھونکا آیا۔ پچھلے مکان کے بغیچے میں رات کی رانی بڑی مہک رہی تھی۔ میز پر حلوے کی پلیٹ... نچلی منزل کی پڑوسن نے بھیجا تھا، پارو کے لیے۔ کتنی اچھی تھیں وہ... پارو سے سچ مچ بہت محبت کرتی تھیں۔

میں گاگلز لاتی تھی... امی، گلیشیر پر چڑھتے وقت ضروری ہوتے ہیں۔ ورنہ برف کی روشنی سے آنکھیں چندھیانے لگتی ہیں۔ اور جوتے بھی خاص قسم کے ہوتے ہیں۔ میں سب سے اوپر تک پہنچی تھی! بارہ شوقیہ کوہ پیماؤں میں مجھ کو اول قرار دیا گیا۔ یہ دیکھیے میرا سرٹیفکیٹ... اس نے ایک چھپا ہوا کاغذ اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ آمنہ نے کاغذ پر اپنی بیٹی کا نام پڑھا:

پاروتی۔ گریڈ فرسٹ۔

"اتنے اوپر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس نے فکرمندی سے کہا۔ "تم گریں نہیں؟" اس نے خالی خالی آواز سے پوچھا۔

"ہاں ہاں! کئی بار گری۔"

"کیا!" آمنہ خوف سے چیخی۔

پارو کی ہنسی شوخ نوجوان بےفکر۔ "ارے سب گرتے ہیں امی۔ بھئی چاروں طرف رسیاں بندھی ہوتی ہیں کوئی نیچے تھوڑا ہی گرتے ہیں۔ اور اس سے پہلے دو دن ہم نے برف کی خندقوں سے رینگ کر نکلنے کی مشق بھی کی تھی۔ اس میں بھی میں اول آئی تھی۔ لڑکیوں کا بدن زیادہ لچکیلا ہوتا ہے نا، اس لیے۔ ہم گلیشیئر پر میخیں گاڑ گاڑ کر چڑھتے تھے۔ صرف بازوؤں کے بل پر پورے بدن کو اوپر کھینچنا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی میرے بازو کے مسلز کانپنے لگتے اور میخ سے ہاتھ پھسل جاتا لیکن اب دیکھیے، میں کتنی مضبوط ہو کر آئی ہوں۔"

"دبلی تو ہو گئی دس دن میں۔ مضبوط کہاں!"

"ارے یہ مسلز ہیں امی! چربی گھل جاتی ہے اور پٹھے مضبوط ہو جاتے ہیں۔ اور ہم نے یاک دیکھے امی۔ یاک!"

"وہی جن کی تصویریں ہوتی ہیں؟ کیا وہ سچ مچ ہوتے ہیں؟"

"ارے ہاں ہاں امی، اتنے پیارے۔ اتنی بڑی بڑی کالی کالی آنکھیں۔ بالکل گھومے سینگ! اور اتنا ڈھیر سارا فر جیسے ٹیڈی بیئر۔ دل چاہتا تھا گود میں لے لوں۔ مگر وہ تو اتنے بڑے تھے۔ گائے کے برابر۔ ایسے مزے سے منہ بند کیے ڈکار رہے تھے۔ سوری۔ ہوووں! ہم نے یاک پر سواری بھی کی۔ راستے میں ہم نے دریائے سندھ بنتے دیکھا۔ گلگت سے آگے، چھوٹی چھوٹی دھارائیں مل کر بناتی ہیں۔ دریا کا پانی تو گدلا تھا۔ کیوں کہ سیڈی منٹ بہت تھا۔ لیکن وہ دھارائیں کوئی نیلی، کوئی سبز اور کوئی تو کاسنی لگ رہی تھی۔ میں نے اتنے رنگ کبھی نہیں دیکھے تھے۔ پانی کے اور برف کے اتنے رنگ۔"

"اور طوفانی ہوائیں؟ وہ نہیں چلیں؟"

"خوب چلیں۔ ایک رات ہمارے خیمے اکھڑنے لگے تھے۔ تنا مزہ آ رہا تھا، ریت جیسی برف میری آنکھوں اور منہ میں گھسی جا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے خیمے دوبارہ گاڑے۔"

اپنی باتوں کی لوری سناتی پارو کو آمنہ نے نیند بھری آنکھوں سے دیکھا۔ کھڑکی میں چاند کی اب آدھی چوڑی سی رہ گئی تھی، جو پارو کے سر پر چمک رہی تھی۔ چاند نکل گیا تھا۔ چاند کے کنارے اسے پارو کا چہرہ سایہ جیسا دکھائی پڑا۔ اسے خیال آیا کہ گرہن والی رات اس نے چاند کو پورے گرہن میں جاتے دیکھا تھا، گرہن سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ جانے کیوں؟ شاید یہ سوچ کر کہ ڈیڑھ گھنٹا اور کون بیٹھ کر انتظار کرے۔ شاید بیدی جی نے بھی نہ دیکھا ہو، اس نے سوچا اور پارو کو اپنے پیٹ کے ساتھ بھینچ لیا۔ پارو بھی گٹھری سی بنی اس سے لپٹی جا رہی تھی، جیسے دوبارہ اس کی کوکھ میں واپس جانا چاہتی ہو۔

"لیکن میں وہاں بھی بہت گلٹی فیل کر رہی تھی۔ کہ میں نے آپ کی بات نہیں مانی لیکن اب تو آپ نے مجھے معاف کر دیا نا؟" پارو نے آمنہ کے بدن سے منہ رگڑتے ہوئے کہا۔

آمنہ جیسے اپنی ہی پرچھائیں رہ گئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی جیسے خلا میں تیر رہی ہو۔ شاید سفر سے تھک کر اب وہ آرام سے سونا چاہتی تھی۔ اس نے پارو کے سوال کے جواب میں کہا، "نہیں۔"

"نہیں معاف کیا؟" پارو نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں،" آمنہ نے کہا، "کیوں کہ میں تو بہت خوش ہوں۔"

"میں صحیح سلامت واپس آگئی اس لیے؟"

آمنہ نے نفی میں گردن ہلائی۔

"نہیں۔۔ اس لیے کہ۔۔۔ تم چلی گئیں!"

**

Scanned with CamScanner

خالدہ حسین

یارِ من بیا

معلوم نہیں اسے لال کوٹھی کیوں کہتے تھے، حالاں کہ وہ سر تا سر سفید تھی۔ ہاں، جب الاٹمنٹ ہوئی تب کہیں سرخ رہی ہو گی، مگر اب سفید تھی۔ یہ نام، لال کوٹھی، کبھی اس نے اسمل کی زبانی سنا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی ساس اسے واپس گھر لے جانے پر صرف اس شرط پر راضی ہوئی تھی کہ وہ کبھی لال کوٹھی نہ جائے گی؛ نہ وہاں جانے کی ضد کرے گی نہ ہی اس کا ذکر۔ اس کے شوہر نے بھی گلے کی رگیں پھلا پھلا اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں نکال نکال کر یہی کہا تھا کہ اگر کبھی لال کوٹھی کا ذکر اس کی زبان پر آیا تو وہ چھری سے اس کی زبان کاٹ ڈالے گا۔ مگر اس نے یہ سب داستان آ کر اماں کو سنا دی تھی اور اماں نے فوراً کہا، ''اسمل تو یہاں کیوں آئی ہے۔ جا جلدی گھر چلی جا۔ اب وہی تیرا گھر ہے۔'' مگر اسمل نے جھر جھر آنسو بہاتے ہوئے کہا تھا کہ اُسے اس گھر سے بدبو آتی ہے۔ وہاں گھر کے اندر نالی بہتی ہے جس میں گھر بھر کی غلاظت بھی رہتی ہے۔ اس میں ڈاٹ لگ جاتا ہے اور اُسے ہر دوسرے تیسرے دن یہ ڈاٹ کھولنا پڑتا ہے۔ پھر اس نے یہ بھی بتایا کہ گھر بھر کے لیے صرف ایک تولیہ ہے اور باری باری سب وہی استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کے شوہر کے منہ سے خوفناک بدبو آتی ہے اور مسوڑوں سے خون بہتا رہتا ہے۔ مگر اماں نے اس کو برقع تھمانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''کچھ بھی ہو، اب وہی تمھارا گھر ہے۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اور یہ کہ وہ اسٹور کی الماری میں سے اپنے لیے تولیہ لے جائے۔ آخر کلثوم بھی

تو اسی گھر میں رہتی ہے، وہ تو کبھی اس طرح واویلا کرتی ادھر نہیں آئی، حالاں کہ اس کا زیادہ نزدیکی کا رشتہ بنتا ہے اس گھر کے ساتھ، اور یہ کہ وہ ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی اور اس کا باپ شہر کا رئیس اور بڑا مانا ہوا بزرگ تھا، اور بچپن میں وہ فارسی بولتی تھی۔

تب اس نے پہلی بار کلثوم کا نام سنا تھا۔ اس نام سے کوئی صورت اس کے ذہن میں نہ آتی تھی۔ ویں تو یہ نام ہی بڑا عجیب سا تھا۔ اس کے آس پاس تو سیدھے سادے ناموں والوں رہتے تھے جن کے نام اکثر ہ پر ختم ہوتے — ریحانہ، عابدہ، فریدہ، وغیرہ۔ اور اس روز تو وہ اور بھی الجھ گئی جب اسے پتا چلا کہ یہ نام دراصل اُم کلثوم ہے۔ اُم کلثوم تو ایک شان دار مصری گلوکارہ تھی اور گلیمر کی چکاچوند میں اس پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔ یہ کیسی اُم کلثوم ہے کہ اسٹل کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتی ہے، اور اس گھر کے اندر ایک بدرو بہتی ہے، اور پورے خاندان کے لیے صرف ایک ہی تولیہ ہے۔

تب غریب رشتہ داروں کا کافی رواج تھا۔ ان مشکوک اور موہوم لوگوں کے ساتھ کبھی بڑے پُراسرار رشتوں کا انکشاف ہوتا۔ مگر بزرگ یہ سب کچھ نوجوانوں سے دور دور ہی رکھنے کی کوشش کرتے، اور کبھی کبھی محفلوں میں چارلس لیمب کے معرکہ آرا مضمون کا حوالہ دیتے جس میں اس نے غریب رشتہ داروں کی نازیبا حرکات کا ذکر کیا ہے، اور پھر ذرا دیر ہنسا کرتے اور موضوع کو رفع دفع کرنے کے لیے کہا جاتا۔

"بھئی ہر گھر کی الماری میں کوئی نہ کوئی ڈھانچا ہے — بابابا!"

الماری میں سے ڈھانچے کا برآمد ہونا خاصا دہشت ناک منظر ہو سکتا ہے، مگر وارڈ روبز میں ڈھانچے چھپانا خوف سے زیادہ بدمذاقی کی علامت ہے، وہ سوچتی۔ اور پھر اسے اسٹل اور اُم کلثوم اور غفورا اور مقبول اور ماسی سب کے سب ڈھانچے نظر آنے لگتے جو کسی نہ کسی وارڈ روب میں کپڑے کے پیچھے چھپے کھڑے تھے اور الماری کھلنے پر اچانک برآمد ہو کر اپنے آہنی پنجوں سے گردن دبوچ سکتے تھے۔

وہ ان لوگوں سے کم کم ہی آشنا تھی، کیوں کہ جب بھی ماسی اپنا شٹل کاک برقع اوڑھے اور سارے کا سارا برقع پیچھے سے لپیٹ کر بغل میں دابے مقبول کے ساتھ وارد ہوتی تو سارا گھر بے حد ٹینس ہو جاتا۔ ماسی کے پاؤں میں پھٹی جوتی ہوتی اور بدرنگ کرتے شلوار سادوپٹا اور اس سے گھسی

گھٹی بُو کے بھبکے اُٹھتے۔ مگر وہ خشک پپڑی جمے ہونٹوں کے ساتھ ہر آتے جاتے بچے کو داب کر پیار ضرور کرتی۔ اماں فوراً ہی مہمانوں کے حسبِ رتبہ چائے کا انتظام کرتیں اور اس کے بعد ایک لمبی چوڑی نشست ہوتی۔ ماسی کی شکایتوں کا دفتر کھل جاتا۔ کمرے کے دروازے بند کر دیے جاتے اور ابا کے ماتھے کی تیوری اور بھی گہری ہو جاتی۔

بس اتنا سمجھ میں آتا کہ ماسی کی دونوں بہویں انتہائی نالائق اور بیہودہ ہیں اور بیٹے اس سے بھی زیادہ ناکارہ۔ اور بہوئیں کون؟ ایک تو وہی اصغر جو اسی گھر میں پلی بڑھی تھی اور دوسری وہ بدراسر ام کلثوم جسے اس نے آج تک نہ دیکھا تھا۔ اور اس سب صورتِ حال کی ذمے داری ابا اور اس پورے گھر پر عائد ہوتی تھی کیوں کہ خدا اور رسول کے حکم کے مطابق وہ صلہ رحمی کرنے میں قطعی ناکارہ ثابت ہوئے تھے۔

اور یہ بھی محض اتفاق تھا کہ جب بھی ماسی اپنے پھٹے پرانے کپڑوں کے ساتھ وارد ہوتی، کوئی نہ کوئی تکلف دار مہمان ضرور آن ٹپکتا اور سیدھا دالان میں داخل ہوتا کیوں کہ یہی سٹنگ روم تھا۔ یہاں پر قرمزی رنگ کا فیل پا قالین اور تخت پر میرُون رنگ کا جھالردار تخت پوش اور اس پر زرد اور سرخ رنگ کے گاؤ تکیے دھرے رہتے، اور مونج کے موڑھے جن کے اوپر سُوسی کے غلاف چڑھے گدیاں، اور کارنس پر صدر کے ساتھ ابا کی تصویر اور پیتل کے گلدان میں موسم کے تازہ پھول اور کمرے کے کونے میں پیتل کے بہت بڑے جگمگاتے بادیے میں یوکلپٹس کی لمبی لمبی شاخیں۔ تو مہمان ماسی کو دیکھ کر پہلے تو بہت حیران اور پھر محظوظ ہوتے۔ اور ایسے میں ماسی اپنا تعارف کرانے سے نہ چوکتی اور ان کا بیٹا مقبول، جو عرفِ عام میں کولا کہلاتا تھا، بات بات پر گلے کی رگیں پھلا کر بمشکل آواز نکالتا۔

آنے والے عزت دار مہمان زیرِ لب مسکراتے۔ دل ہی دل میں خوش ہوتے، ماسی کے ساتھ ہمدردی کرتے۔ اور بڑی آپا کمروں اور برآمدوں میں ٹہلتی چارلس لیمب کا مضمون "پوور ریلیشنز" یاد کرتی رہتیں۔

ایک نہایت سرد صبح اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ معلوم ہوا غفورا آیا ہے۔ غفورا! اماں چونکی ہو گئیں۔ ابا حسبِ معمول اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ جالی کے دروازے کے ساتھ لگ کر اماں نے آنے والے سے بات کی۔ وہ دھاروں دھار رونے لگا۔ اس نے پہلی بار کسی مرد کو

دھاڑیں مار کر رونے سنا تھا۔ کچھ عجب سا اس کے گلے میں آن پھنسا اور ہاتھ پاؤں سرد ہونے لگے۔

او جی، حاجی جی۔ میرا بچہ... مر گیا جی... ابھی ابھی۔ کیا کروں۔ لاعلاجا... مگر اب اس کے کفن دفن کے لیے تو... ہائے اوئے ربا!" پھر دھاڑیں۔

"اچھا اچھا، اللہ کو یہی منظور تھا۔" نانی سٹور میں گھس گئیں۔ کالے صندوق میں سے کچھ رقم نکال کر عبدل کے ہاتھ بھجوا دی۔

غفور تیز تیز قدم اٹھاتا چلا گیا۔ اس نے جالی کے دروازے ہی سے دیکھا ——— لمبا قد، گٹھا ہوا جسم، موٹی گردن، سیاہ رنگ، چھوٹے چھوٹے بال اور سفید شلوار قمیص۔ شلوار کے سارے جل پیچھے کو جس سے اس کو عجب نفرت بھری دہشت ہوتی تھی۔ یہ اُم کلثوم کا شوہر تھا۔

اتفاق سے ماسی مشتری ادھر آ نکلیں اور اُن سے انھیں اچھرے جانے کا حکم دیا۔

"مشتری، جا دیکھ کے آ کیا ہوا ہے۔"

وہ بھی گاڑی میں جا گھسی۔ اچھرے کا نام اُسے کتنا عجیب لگتا تھا۔ اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ وہ اکثر سوچتی، مگر اس کے ذہن میں فوراً "چھرا" ہی آتا اور دل پر ایک بوجھ سا آن پڑتا۔ ڈرائیور عظیم اچھرے سے بہت گھبراتا تھا کیوں کہ اس طرف بقول اس کے تانگوں، ریڑھیوں اور رنگلوں جنوں کی بھرمار تھی۔ بے چاری چھوٹی سی مورس مائینر گھسی بھیڑ میں اپنا رستہ بناتی رینگتی چلی جاتی۔

اب تنگ گلیوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ جگہ جگہ نالیاں جن میں سیاہی مائل رطوبت بہنے کی ناکام کوشش میں اور جابجا ان پر بیٹھے ننگے بچے۔ ایک دوسرے پر سایہ کرتے مکان۔ چھجوں میں سوکھتے گدلے کپڑے اور کہیں کہیں کھڑکیوں میں کھڑی عورتیں۔ باریک کرتوں میں سے جسم جھلکاتی، نیچے گلی میں آنے جانے والوں کو دیکھتیں اور دندا سے مل مل کے تھوکتیں، اور بچوں کو پکارتیں۔ ہر بچے کے نام سے پہلے "مر جانیا" کا سابقہ۔ اور چارپائیاں سر پر رکھے کالے را جاس اور سبزی بیچنے ناکافی تہبندوں میں خوانچے والے۔ دائیں بائیں تھوکتے تھاکتے۔ دروازوں پر ٹاٹ کے پردوں سے جھانکتا کوئی شاداب چہرہ ——— ناک میں سونے کی کیل، گوری بانہوں میں سرخ سنہری چوڑیاں۔ خوانچے والا فوراً آواز لگاتا۔

"کالے را! کالے را!"

Scanned with CamScanner

اب بھاؤ تاؤ ہوتا۔ چارپائی زمین پر رکھ کے ہرے ہرے شاداب پتوں پر سجے سیاہ بھرے بھرے جامن۔ ترازو سیدھی ہوئی۔ زنجیروں کی کھڑکھڑاہٹ میں ایک پلڑے میں باٹ رکھتے ہوئے جامن فروش کبھی گھٹنا کبھی ران کھجانے میں مصروف ہو گیا۔ پھر ترازو سیدھی ہوئی۔ پھر جامن تولتے ہوئے اس نے بہت دفعہ ناکافی تہبند کو کھجایا۔ پھر سر پر ہاتھ دھرا، پھر گردن کا تعویذ ٹٹولا۔ پھر بالوں پر ہاتھ پھیر کے مٹی کے کجے میں کالے ڈال کر ان پر چٹکی سے نمک چھڑکا، پھر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کے ان کو خوب ہلایا، خوب ملایا، اور ایسے میں اس کے دانتوں اور آنکھوں میں گیلی گیلی وحشت آ گئی۔ گورے ہاتھوں نے بڑھ کر ہرے پتے پر پڑے جامن لے لیے۔ پیسے دیے۔ کرخت چوکور، ہاتھوں کے سامنے وہ کومل ہاتھ۔ سرخ سنہری چوڑیاں۔ جامن فروش نے چارپائی اٹھاتے ہوئے پھر کھجایا۔ "کالے را! کالے را!" عظیم ڈرائیور نے بمشکل اس کو بچایا اور اپنی محبوب گالی دی۔ پھر خواتین کی موجودگی کا احساس کر کے اس چہرہ سرخ ہو گیا۔ مگر مائی مشتری منہ پر دوپٹا رکھے ہنس ہنس کے دوہری ہو رہی تھیں۔

گاڑی ایک تنگ گلی میں جا رکی۔ بہت سے ننگ دھڑنگ بچے ایک قافلے کی صورت پیچھے پیچھے بھاگتے پہنچے اور پھر گاڑی سے کچھ دور کھڑے ہو گئے۔

"وہ سامنے والا دروازہ ہے،" عظیم ڈرائیور نے اشارہ کیا۔ اب باری باری ارد گرد کے گھروں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلنا شروع ہوئے اور ایک ایک کر کے عورتیں جھانکنے لگیں۔ اچانک اصل نمودار ہوئی۔

"آؤ آؤ، پھپھی!" پھر اس نے کھڑکیوں سے جھانکنے والیوں کو دیکھا۔

"بھتیجی ہے میری، اور میری ای۔ لال کوٹھی والے۔ اچھا اب چلو سب۔ بھاگو۔ خبردار جو کسی گاڑی کو ہاتھ لگایا۔" اس نے بچوں کو ہنکایا۔ "میں کرسی لاتی ہوں چاچا تمہارے لیے،" وہ عظیم ڈرائیور سے بولی۔

اندر ایک تاریک ڈیوڑھی کے بیچوں بیچ واقعی نالی بہتی تھی۔ سامنے ایک اور دروازہ، اور اس کے پار ایک صحن، کافی کشادہ۔ ڈیوڑھی کی تاریکی کے بعد کھلے صحن کی روشنی آنکھوں کو چندھیا گئی۔ اس لیے مائی اچانک ہی سامنے کھڑی بھوت کی طرح نظر آئی۔

"مگر یہاں تو۔ یہاں تو..." مائی مشتری کچھ سوچ کر حیران ہونے لگیں۔

"آؤ، آؤ۔ وہ بشیٰ نہیں آئی؟" ماسی ایک چھڑی کے سہارے چل رہی تھی۔

"نہیں،" اس نے کہا۔

"آجاؤ۔ ماسی جی، آؤ۔" استل ماسی کو نظر انداز کر کے انہیں تقریباً دھکیلتی ہوئی صحن کے پار اپنے کمرے میں لے گئی۔ بلب کی مدھم روشنی میں سامنے دیوار کے ساتھ لگا پلنگ، اس پر پھولوں کی ٹوکریاں کڑھائی کی ہوئی دوسوتی کی چادر اس نے فوراً پہچان لی۔ اماں لمبی سنسان دوپہروں میں استل کو اس کڑھائی پر لگائے رکھتی تھیں۔ اور وہی پلنگ اور دو کرسیاں۔ پلنگ کے سرھانے میں لگے آئینے اور رنگین لکڑی کا کام۔ یہ استل کا کمرہ تھا۔ سامنے کارنس پر رحل اور اس پر زری کے جزدان میں لپٹا قرآن پاک۔

"بیٹھو بیٹھو،" اس نے پلنگ کی اچھی بھلی چادر کو ہاتھوں سے برابر کیا۔

"وہ کلثوم؟ غفورا آیا تھا آج کوٹھی۔"

"اچھا؟ اس کا تو یہی کام ہے۔ ٹھہرو میں ابھی آئی۔" استل کے اندر بجلی سی بھر گئی تھی۔ پھر وہ ٹھنڈی بوتلیں اور گلاس لے کر آ گئی۔

"نہیں کاکی، یہ رہنے دے۔ کلثوم کے پاس لے چل۔ وہ غفورا آیا تھا آج۔ ہائے ہائے" ماسی مشتری نے کہنا شروع کیا۔ اب ماسی بھی چھڑی ٹیکتی آ گئی۔

"تو کون سی قیامت آ گئی۔ غفورا آیا تھا! کچھ رشتہ داری ہے، کچھ لگتا ہے تو گیا تھا۔ وہاں تو کتا کمین سمجھتے ہیں سب کو۔ پر یہ سن لیں، کلانور کی جائیداد سب کی سانجھی تھی۔ اس کے کلیم میں اکیلے ہی کوٹھی لے کے بیٹھ گئے ہیں۔ دوسروں کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ او نے ہر کوئی بادشاہ ہے اپنے گھر۔"

"چلو پھر شروع ہو گئی۔ آؤ کلثوم کے پاس،" استل نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھا۔ دیکھا اس ڈائن کو۔ یہی عقل مت دی ہے اس کو وہ بشیٰ نے!"

"بس بس ماسی، بھابی جی کا نام نہ لینا۔"

"اچھا، نام نہ لوں! آ لینے دے کوسے کو۔" ماسی نے منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر چھڑی بغل میں داب ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر دوسرے کا مکا بنا کر مارتے ہوئے اشارہ کرنے لگی۔

برابر کا کمرہ بھی ویسا ہی تھا۔ مگر سامنے بچھی چارپائی پر کوئی پڑا تھا۔ اس کا دل دھک دھک

کرے گا۔ کمیں سے موت کی مہیب لہر کمرے میں داخل ہوئی۔ جب آنکھیں ذرا اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو سامنے سلنگی چارپائی پر پڑی کلثوم کا ہیولا ہولے ہولے ابھرنے لگا۔

"باجی جمیلہ آئی ہے اور ماسی مشتری۔"

"آؤ آؤ، بسم اللہ،" وہ کلثوم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ گلابی دوپٹا سر پر سیدھا کیا۔ تب اس نے غور سے دیکھا۔ زرد چہرے پر رخساروں کی بے تحاشا اُبھری ہڈیاں، ستواں ناک اور بے حد نمایاں جبڑا۔ آنکھیں، لمبی گہری صنوبری بادامی شکل کی آنکھیں، جن پر بے حد گھنی پلکیں جھالر کی طرح اٹھتی گرتی۔ اور سر پر شاید مہندی رنگے بال، آدھے کالے آدھے سرخی مائل۔ ہاتھ ہڈیوں بھرے میلے۔ گردن لمبی بنسلی کے گڑھے میں سیدھی گڑی اور درمیان سے اُبھرتی ہوئی۔ اُم کلثوم۔۔ وہ حیرت سے اسے دیکھتی رہی۔

"آؤ آؤ، بیٹھو!" وہ بمشکل چارپائی سے ہلی۔

"بیٹھی رہو باجی! امثل نے اُسے روک کر کونے میں رکھی دو کرسیاں سامنے لا کر رکھ دیں۔

"آج آپ نے کیسے مہربانی کی،" شیریں آواز۔ لفظ منہ میں گھلتے چلے جا رہے تھے۔ "ادھر میرے پاس آؤ سیمہ!" اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

مگر اب کمرے سے عجب طرح کی بُو آ رہی تھی، جیسے قسائی کی دکان سے آتی ہے۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ کھڑکی بھی بند تھی اور اس پر ڈوری میں پرویا چھلنا پردہ لٹک رہا تھا جس پر جالے چپکے تھے۔ ب اتنی دیر کے بعد اُسے چارپائی کی پائنتی رکھا وہ پانا نظر آیا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔

"آج غفور آیا تھا۔ یہاں تو کچھ بھی نہیں۔" ماسی نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"عبدالغفور صاحب!" کلثوم نے کہا۔

"ہاں۔ وہ تو کہتا تھا۔۔۔ وہ پیسے وغیرہ لے گیا تھا بچے کے کفن دفن کے لیے۔۔۔"

"ہیں؟" امثل حیران ہوئی۔ پھر قہقہہ لگا کر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ "ضرور ضرور۔ بھا غفور اُدھر بھی گیا ہوگا۔ کتنے گھروں سے پیسے اکٹھے کر کے لے گیا ہے کہ بچہ مر گیا۔ رات کو آجائے گا چرس قرضے کما کے۔"

"ہیں؟" ماسی مشتری کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کلثوم کا چہرہ اذیت اور شرمندگی کے مارے

Scanned with CamScanner

صبح ہو گیا۔

’ہاں، غفور صاحب... معلوم نہیں ایسا کیوں کرتے ہیں... ویسے میں تو بیمار تھی۔‘

امتل نے ماسی کے کان میں کچھ کہا، اور ماسی بھڑک گئیں۔

’لعنت ہے خدا کی! ارے پانچ تو باہر گلی میں کھیل رہے ہوں گے۔ ایک جھولے میں پڑا ہے۔ اب تو اس غریب کی جان چھوڑے۔‘‘

’بس ماسی جی، خون ہی خون۔ خون کی بالٹیاں۔

’اٹھو سلیمہ، چلو اب!‘ ماسی ایک دم کھڑی ہو گئیں۔ کلثوم نے اٹھنے کی کوشش کی مگر پھر چارپائی پکڑ کے رہ گئی۔

’’بیٹھو تو سہی۔ قربانت شوم۔ قربانت شوم۔‘‘

اسی وقت دھاڑ سے دروازہ کھلا۔ اور وہ، کالا مضبوط جسم، سفید کپڑے، شلوار کے سارے بل پیچھے کی طرف، پورے دروازے میں کھڑا تھا۔

’کیا بکواس کر رہی ہے کمینی! پھر وہی بانیاں بول رہی ہے، اپنی عربی فارسی۔ اچھا اچھا۔ ابھی پوچھتا ہوں۔ تیری زبان میں۔ ابھی خبر لیتا ہوں تیری۔ گھی کا ڈبا اتنا نیچے کیسے ہو گیا؟ ہیں؟‘‘

’وہ جی غفور صاحب، قربانت شوم۔ وہ آج امتل نے اصرار کر کے ایک چھوٹا سا پراٹھا بنا دیا تھا میرے لیے۔ دس دن سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ کپڑوں کا ڈھیر پڑا ہے دھلنے والا۔‘

’’ہوں، پراٹھا! اور یہ امتل وِشل پیری کون ہوتی ہے...‘‘

’’چلو چلو سلیمہ، نکلو‘‘ ماسی اُسے گھسیٹتی ہوئی باہر لے چلیں۔

باہر سورس ماسٹر ننگ دھڑنگ بچوں کے ہجوم میں گھری تھی اور عظیم ڈرائیور پچھلی سیٹ پر مزے سے خراٹے لے رہا تھا۔

آج، برسوں بعد، جب کہ وہ دساور سے جبر و قدر کی گتھیاں سلجھا کر اپنی یونیورسٹی واپس لوٹی تھی، سب کچھ بدل چکا تھا۔ بہت سے لوگ دنیا خالی کر چکے تھے۔ اماں، ابا، امتل، عظیم ڈرائیور۔ اور جتنے لوگ جگہ خالی کرتے ہیں شاید ان سے چوگنے ان کی جگہ لینے لپکتے چلے آتے ہیں۔ اور بالکل وہی کچھ کرتے ہیں جو اگلے کر چکے ہیں، مگر ان کے لیے یہ پرانی باتیں کتنی نئی ہوتی ہیں۔ اس نے خوب

صورت جلد میں بندھا اپنا ڈاکٹریٹ کا تھیسس احتیاط سے پلاسٹک کے لفافے میں رکھا۔ اس کی کل متاع حیات بس یہی کچھ تھا ــــ ان بے بضاعت کاغذوں میں چند حروف جو اس نے زندگی بھر میں سمیٹے تھے۔ شاید یہ کبھی کتابی صورت میں چھپ جائے، اس نے سوچا، اور اس کی کوئی مستقل صورت بن جائے۔ یہ شہر کس قدر گنجان ہو چکا تھا۔ کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا۔ ایسے میں کتاب کے کیا معنی بنتے ہیں۔ اس نے آس پاس دیکھا ــــ اتنا ہجوم۔ گاڑی لے کر نکلنا کسی مہم سے کم نہ تھا۔ اور یہ سارے راستے بھی کتنے بدل چکے تھے۔ ہر جگہ بلند و بالا عمارتیں، مارکیٹیں، ہوٹل، شوروم۔ بہاول پور روڈ پر جی او آر کا پوش علاقہ اب پسماندہ علاقوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ سامنے ٹریفک جام تھا۔ وہ رک گئی۔

پھر ایک بھولی بسری صدا اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"کالے را، کالے را، جامن۔"

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ خوانچے میں سے بھرے بھرے پتے جھانک رہے تھے۔ ان پر کالے رس بھرے جامن۔ جگہ جگہ سے زخمی۔ ان سے کاسنی رس ٹپکتا۔ زوم سے اس کی آنکھوں کے سامنے وہ تنگ گلی آ گئی۔ عورتیں کھڑکیوں سے جھانک رہی ہیں۔ نیم تاریک کمرے میں قسائی کی دکان ایسی بُو۔

قربانت شوم۔ قربانت شوم۔

اس نے گاڑی موڑ لی۔ وہ گلی کتنی بدل چکی تھی۔ نسبتاً نئے مکان، دو منزلہ سہ منزلہ۔ بہت سے دکانوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ تین چاروں گھروں کے سامنے گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس نے کچھ کوشش کے بعد مکان پہچان لیا۔ دروازے پر ایک نوجوان ــــ ہلکی ہلکی مونچھیں، گلے میں سونے کی زنجیر، سفید شلوار قمیص، شلوار کے سارے بل پیچھے کی طرف۔ ایک جھرجھری اس کے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ نوجوان نے اسے ناپسندیدگی سے گھورا۔ پھر اس کی نظریں اس کی چھوٹی سی گاڑی پر ٹک گئیں۔ پھر وہ بدمزگی سے گلی میں اتر گیا اور بغیر سائیلنسر کے اسکوٹر پر فراٹے بھرتا غائب ہو گیا۔

وہ آگے بڑھی۔ ڈیوڑھی ویسی ہی نیم تاریک۔ مگر وہ بدرو غائب تھی۔ اندر کمروں کے اوپر کمرے بن چکے تھے۔ سامنے صحن میں موڑھے پر کوئی بیٹھا تھا، ساکت، بالکل ساکت۔ وہ بالکل

قریب جا رُکی۔ ماسی... دو بری ہوئی جھریوں بھری گٹھری۔ وہ اسی طرح ساکت بیٹھی رہی، پلکیں جھپکائے بغیر۔

"نابینا ہیں،" اچانک آواز آئی۔ اس نے مڑ کے دیکھا۔ چھوٹا آم کلثوم۔

"بیا! چشمِ ما روشن دل ما شاد! تشریف لائیے۔"

وہی چہرہ۔ ہڈیاں مزید نمایاں اور زردی میں بھی اضافہ۔ مگر قد و قامت میں عجب راستی، وقار۔

"میں سلیمہ ہوں۔"

"جی۔ ی شناسم۔ قربانت شوم۔ آج برسوں بعد راستا بھول گئیں۔ آؤ!"

"میں یہاں نہیں تھی۔ دو ماہ ہوئے لوٹی ہوں۔"

"ہاں، سنا تھا۔"

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔ برسوں پہلے اماں نے اُسے بتایا تھا، کلثوم ان کے دور کے ماموں کی اکلوتی اولاد تھی۔ اور ماموں کا شمار شہر کے رئیسوں میں ہوتا تھا؛ نہ صرف رئیس بلکہ وہ اپنے روحانی مدارج اور کمالات سے مرجعِ خلائق تھے۔ دور دراز کے لوگ ان کے آستانے پر حاضری دیتے تھے۔ اس زمانے میں کلثوم کو عربی فارسی کی تعلیم دینے اساتذہ گھر پر آتے تھے۔ گھر میں فارسی بولی جاتی تھی۔ مگر توکل بھی ایک عجیب تصوّر اور مرحلہ ہے سلیمہ بیٹی،" اماں نے کہا تھا۔ "معلوم نہیں اس کا مطلب کیا ہے۔ ہماری سمجھ سے تو بالاتر ہے۔ مگر ماموں سے ان کے ایک مرید نے بیٹے کے لیے کلثوم کا رشتہ مانگا تو رضائے الٰہی کہہ کر ہاں کر گئے۔ جب لوگوں نے روکا تو کہا کہ اس کی رضا یہی ہے، ہم تم روکنے والے کون ہیں۔ اگر یہ مٹی ہے تو اس کے حکم سے سونا ہو جائے گا اور اگر نہیں تو پھر سونا بھی مٹی ہو سکتا ہے۔ یہ ظہورا تو تم نے دیکھ ہی ہے۔"

"اور خود ماموں؟ یہ سب کچھ دیکھنے کو زندہ رہے؟"

"کون جانے۔ کہتے ہیں راتوں رات کوئی الہام ہوا۔ اٹھ کر چل دیے۔ کچھ معلوم نہیں۔ کلثوم کو اب تک امید ہے، بلکہ یقین ہے کہ کسی دن وہ آ نکلیں گے۔"

ہاں تب اماں نے ہی بتایا تھا۔

"سلیمہ بی بی، چائے پیش کروں یا کوئی مشروب؟"

اس چار دیواری میں یہ نرم و نازک، میٹھی بولی۔ شہد میں ڈوبا ہوا لہجہ۔ اس کے کان سننا

Scanned with CamScanner

اٹھے۔

"کچھ نہیں، شکریہ۔ اب آپ کی صحت کیسی ہے؟" اس نے ڈھانچے پر منڈھی کھال سے پوچھا۔

"کون ہے؟ کون ہے کلثوم ہے؟" اس نے چھڑی اپنے گرد زمین پر گھماتے ہوئے کہا۔

"سلیمہ ہے سلیمہ۔"

"اچھا اچھا، لال کوٹھی والوں کی چھوٹی گڑیا۔ یہ کہاں سے راستہ بھول گئی! ارے سب کوچ کر گئے یہ کوٹھی والے۔ اور ڈکار تک نہیں لی آدم خوروں نے۔"

"آؤ بی بی، ادھر کمرے میں۔ خالہ تو اب بس ۔ دماغ چل چل ہے۔ ابھی ہیں۔ خود فراموشی بھی اس قادرِ مطلق کی بہت بڑی نعمت ہے۔ یہ اصل مرحومہ کا کمرہ۔ وہ دونوں باری باری ملکِ عدم کو سدھارے۔ مگر میں بیٹھی ہوں منتظر۔ تم تو باہر چلی گئیں تھیں۔ کیا کرے؟"

"پڑھنے۔"

"کیا پڑھا۔ ابنِ قتیبہ، عُرفی، نظیری؟"

اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ "نہیں، میں نے مقالہ لکھا ہے جبر و قدر پر۔"

"جبر و قدر۔ حقیقت درمیانِ جبر و قدر است۔" ایک شستہ لہجہ۔ بہت کچھ اس کے گلے میں آن اٹکا۔

"نہیں، حقیقت صرف قدر ہے۔ لوگ اسے جبر بنا دیتے ہیں،" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ "جس طرح ماموں ابا نے..."

"بابا جان،" ہڈیوں پر منڈھی کھال میں اچانک روشنی آ گئی۔ وہ ضربتی آنکھیں موتی چور روشنی سے جگمگانے لگیں۔ "ہاں وہ تو آئیں گے اپنا جواب پانے کے لیے۔ مجھے تو صرف اُنھی کا انتظار ہے۔"

انتظار... اس نے لرز کر سوچا۔ اُم کلثوم یہ بھی نہیں جانتی کہ لوگ سو برس کے اوپر نہیں جیا کرتے! اور اسے رضائے الٰہی کی دار پر چڑھانے والے کی عمر تو اب سوا صدی ہونی چاہیے۔

"ہاں آئیں گے ضرور۔ ابھی تو عرفی شروع ہی کیا تھا۔ وہ بیدل کے بہت عاشق تھے۔ کہتے تھے جس نے بیدل نہیں پڑھا اس نے کچھ بھی نہیں پڑھا۔ حضرت امیر خسرو آسان ہیں، مگر ان کو

Scanned with CamScanner

برداشت کرنا بہت مشکل۔"

پھر برتن ٹوٹنے کی آواز نے درودیوار لرزا دیے۔

"او پاگل عورت! کس کے ساتھ بکواس کر رہی ہے؟ کنجری! او ئے تیرے پیچھے سے تیرے یہ یار غرفی شرفی لگے نہیں ابھی! آج میں نکالوں گا۔ آج تو نکال کے چھوڑوں گا۔"

"اچھا کلثوم باجی، میں چلتی ہوں۔" اس نے اس کے بخار سے تپتے ہاتھ کو ہاتھ میں لیا۔ ہڈیوں کا بنج شاخہ اس کے ہاتھ میں کھب گیا۔

"اچھا بہت خوشی ہوئی۔ پھر کبھی آنا۔ تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں..." وہ نڈھال سی پلنگ پر لیٹ گئی۔ بڑی بڑی آنکھیں پوری طرح کھلی، ساکت، معلوم نہیں کس طرف دیکھ رہی تھیں۔

"اچھا خدا حافظ!" وہ تیزی سے دروازے کی طرف مڑی۔ اور اس کے پیچھے... "یہ لبم رسید جانم تو بیا کہ زندہ مانم۔ پس ازاں کہ من نہ مانم بہ چہ کار خواہی آمد..." ایک آسیب زدہ شیریں لہجہ۔ پیچھے سے گردن دبوچنے والا۔ "بیا... یار من بیا..." وہ بے تحاشا گاڑی کی طرف بھاگی۔ "بیا بیا یار من..." وہ بےسدھ گاڑی کی سیٹ میں گری، اور پیچھا کرتی ہوئی آواز کو دفن کرنے کے لیے اس نے ڈھانچے سمیت الماری کو مضبوطی سے مقفل کر دیا۔

**

استان سیسر (Stan Sesser)

استان سیسر ایک امریکی صحافی ہیں اور رسالہ "نیو یارکر" میں جنوب مشرقی ایشیا کے مختلف ممالک کے بارے میں تفصیل سے لکھتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے "وال اسٹریٹ جرنل" کے لیے رپورٹنگ بھی کی ہے۔ وہ یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، برکلے، کے گریجویٹ اسکول آف جرنلزم میں ستاد بھی رہے ہیں۔

جنوب مشرقی ایشیا کے ملک لاؤس کے بارے میں استان سیسر کے جس مضمون کا ترجمہ اگلے صفحات میں "ایک فراموش کردہ ملک" کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے، وہ *Lands of Charm and Cruelty: Travels in Southeast Asia* نامی کتاب سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب، جس میں برما، سنگاپور، لاؤس، کمبوڈیا اور بورنیو کے متعلق مضامین شامل ہیں، ۱۹۹۳ میں شائع ہوئی۔ برما سے متعلق سیسر کا مضمون "برما کی کہانی" کے عنوان سے "آج" کے شمارہ ۲۲ میں شائع ہوا تھا۔

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

اسٹان سیسر

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

ایک فراموش کردہ ملک

امریکی سڑکوں کے عادی کسی شخص کے لیے جنوبی لاؤس کی ۱۲۰ میل کی چوڑائی کو کاٹتی ہوئی سڑک نمبر ۹ پر مشرق کی سمت سفر کرنا ہڈیاں کڑکڑا دینے والا تجربہ ہے۔ یہ سڑک جب دریاے میکانگ کے کنارے واقع ساحلی شہر سواناکھیت سے نکلتی ہے تو اس پر سے تارکول کی تہہ ختم ہو جاتی ہے اور آس پاس سے گزرنے ٹرکوں کے پہیوں سے اڑتی دھول کے بادل منظر کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ چند میل بعد سڑک دوبارہ ہموار ہو جاتی ہے، لیکن اس کی سطح سوئمنگ پول میں چھلانگ لگانے والے تختے کی طرح لہریں لیتی ہے اور اس پر بے شمار گڑھے ہیں۔ اس کے باوجود یہ تنگ، دو لین کی سڑک، جسے ریاست ہاے متحدہ کے کسی مقام پر مضحکہ خیز حد تک غیر موزوں سمجھا جائے گا، لاؤس کے لیے کسی سپر ہائی وے کی سی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر کوئی سڑک اس سے بھی بڑھ کر اس ملک کی نمائندہ کہی جا سکتی ہے تو وہ سڑک نمبر ۱۳ ہے جو دارالحکومت وینتیان (Vientiane) سے ۱۲۰ میل شمال میں واقع قدیم شاہی زمانے کے صدر مقام لوانگ پرابانگ کی طرف لے جاتی ہے۔ سڑک نمبر ۱۳ کا بیشتر حصہ پہاڑوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے ایک کچے راستے سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے، اور یہ راستا اس قدر خراب ہے کہ ان دونوں شہروں کے درمیان، جو ملک کے اہم ترین شہر ہیں، بس کی سروس نہیں چلتی۔ تاہم، سڑک نمبر ۱۳ کو ملک کے ٹرانسپورٹ کے مسائل کے بدترین نقطے کا نمائندہ نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب ایک ... یہاں

Scanned with CamScanner

بیوی ڈیوڈ مرچنٹ اور لوئس فوبرنگ، جو جسونائٹ چرچ کی امدادی اور ترقیاتی تنظیم جسونائٹ سنٹرل کمیٹی کی جانب سے لاؤس میں ایک امدادی پروجیکٹ کے لیے کام کر رہے ہیں، چین کی سرحد کے قریب لاؤس کے شمالی صوبے پھونگ سالی کا دورہ کرتے ہیں تو نہیں ساڑھے تین دن تک کشتی کے ذریعے سفر کرنا پڑتا ہے تب ان کی ملاقات صوبائی حکام سے ہوتی ہے جو انہیں ایک فوروہیل ٹرک میں سوار کر کے پہاڑ کے پہلو کی جانب سے اوپر لے جاتے ہیں اور یہ ایک نہائی جھٹکوں بھرا سفر ہوتا ہے۔ خود یہ ٹرک یہاں دو حصوں میں کشتی میں سوار کرا کے لایا گیا تھا۔ سال کے آٹھ مہینوں میں پھونگ سالی صوبے تک رسائی صرف ہیلی کاپٹر کے ذریعے سے ممکن ہے کیوں کہ ان آٹھ مہینوں میں پانی کی سطح اتنی نیچی ہو جاتی ہے کہ اس میں کشتی نہیں چل سکتی۔

سڑک نمبر ۹ پر کم سے کم ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اسے ۱۹۷۸ میں شروع کر کے دس برس کی مدت میں مکمل کیا گیا اور اس کے زیادہ تر اخراجات، ایک امدادی منصوبے کے طور پر، حکومت ویت نام نے برداشت کیے، جب کہ ہنگری، چیکوسلوواکیا اور سوویت یونین نے سڑک پر مختلف مقامات پر آنے والے پل فراہم کیے اور مزدوروں کی خاصی تعداد لاؤس کے ایک اصلاحی کیمپ کے قیدیوں پر مشتمل تھی۔ جب میں چار دروازوں والے ایک جاپانی ساخت کے ٹرک میں سوار، ایک ڈرائیور اور چار سرکاری اہلکاروں کی معیت میں، اس سڑک کے پہلے سو میل کے ٹکڑے سے گزر رہا تھا تو مجھے ایک ایسا منظر دکھائی دیا جو ایشیا سے مخصوص ہے اور صدیوں کے گزرنے نے جس پر ذرا بھی فرق نہیں ڈالا ہے ـــ دھان کے کھیتوں اور قدیم گاؤوں کا ایک طویل سلسلہ جن میں لکڑی، بانس اور چھپر کے بنے مکان برساتی باڑھ سے بچانے کے لیے بانس کے کھمبوں پر کھڑے تھے۔ پھر ہم انامائٹ پہاڑی سلسلے کی ابتدا تک پہنچے، جو لاؤس اور ویت نام کی سرحد کے ساتھ ساتھ واقع ہے، اور تب منظر رفتہ رفتہ تبدیل ہونا شروع ہوا۔ اب پشتوں سے گھرے دھان کے کھیتوں کی جگہ خودرو سبزے سے ڈھکی، پتھریلی زمین نے لے لی تھی۔ اور تب ہی میرے لاؤسی ترجمان نے سڑک کے کنارے پر بمباری سے پڑنے والے بڑے بڑے گڑھوں کی نشان دہی شروع کی جن میں سے بعض بیس اور تیس فٹ تک گہرے تھے۔ چند انتہائی افلاس زدہ گاؤں، جہاں کے لوگ بل ڈوزروں کی خدمات حاصل کرنے کی استطاعت نہ رکھتے تھے، ان گڑھوں کے ایک سمندر پر پھیلے ہوئے تھے اور وہ ان کے ایک مکان سے دوسرے تک جانے کے لیے گڑھے

Scanned with CamScanner

کا پورا چکر کاٹ کر جانا پڑتا تھا۔ زیپون نامی بستی میں، جس کی آبادی پانچ ہزار ہے اور جو ضلعے کا صدر مقام ہے، سڑک سے چند گز دور، اور ایک مکان کے بالکل صدر دروازے پر، بمباری کا ایک گڑھا تھا جس کی تہہ میں دھات کی ایک بہت بڑی سی زنگ آلود چیز پڑی تھی — یہ ایک بم تھا جو پھٹ نہیں سکا تھا۔

زیپون سے چند منٹ کی دوری پر بان ڈونگ نامی گاؤں واقع ہے جہاں سے ویت نامی سرحد صرف اکیس میل کے فاصلے پر ہے۔ بان ڈونگ گویا جنگ کے ملبے سے تعمیر کیا گیا ہے۔ ہوائی جہازوں کے ٹکڑے اور بموں کے خول مکانوں میں شہتیروں اور ستونوں کی جگہ جڑے ہوئے ہیں، قریبی دریا کی سطح پر کشتیوں کی طرح تیرتے ہیں، اور یہاں تک کہ کھانے کے برتنوں کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ ایک مکان کے مالک نے بمباری کے گڑھے کو ایک آراستہ تالاب کی شکل دے دی ہے جس کی ڈھلانیں نفاست سے ترتیب دیے ہوئے توپ کے کھوکھلے گولوں سے سجی ہوئی ہیں۔ کلسٹر بموں کے خولوں کو ایک سایہ دار درخت کے گرد حفاظتی حلقے کی صورت میں لگا دیا گیا ہے۔ اس قسم کے دو بھاری خول لکڑی کے ایک لٹھ کے دونوں سروں پر جڑ کر ویٹ لفٹنگ کا ورزشی سامان بنا لیا گیا ہے۔ اور گاؤں کے مرکز میں لگے جنگی ملبے کے ڈھیر پر بچے بیٹھے کھیلا کرتے ہیں۔ دھات کا یہ انبار، جو اس علاقے کی واحد فروختنی "فصل" ہے، بہت جلد سونا کھیت لے جایا جائے گا اور تھائی لینڈ کے کباڑی بازار کے ہاتھ بیچ دیا جائے گا۔ بان ڈونگ پہنچ کر ہم نے اپنا ٹرک ایک کنارے کھڑا کر دیا اور سڑک نمبر ۹ کو کاٹتے ہوئے ایک سنکرے کچے پگڈنڈی نما راستے پر چلنے لگے۔ اس راستے پر کوئی شناختی تختی نہیں لگی تھی؛ کوئی نشان نہ تھا جس سے معلوم ہو سکے کہ یہ راستا اناماٹ پہاڑوں پر مختلف سمتوں سے چڑھنے والے بے شمار راستوں سے کسی بھی طرح مختلف ہے۔ لیکن درحقیقت یہ تنگ راستا دنیا کی معروف ترین سڑکوں میں سے ایک ہے: یہ اُس پہاڑی راستے کا مرکزی حصہ ہے جسے "ہوچی منہ ٹریل" کہا جاتا تھا۔

ہوچی منہ ٹریل، اور خاص طور پر زیپون کے قریب وہ مقام جہاں یہ بڑی سڑک سے ملتا ہے، لاؤس میں امریکا کی نو برس لمبی خفیہ جنگ کا مرکز تھا جس کا آغاز سی آئی اے نے کرایا تھا اور جس کی نگرانی وینتیان میں امریکی سفارت خانے سے کی جاتی تھی۔ اگرچہ سی آئی اے نے اس میں لڑنے کے لیے تیس ہزار کرائے کے سپاہی بھرتی کیے تھے، جو لاؤس کے پہاڑی علاقوں میں رہنے

Scanned with CamScanner

والی ایک نسلی اقلیت ہمونگ سے تعلق رکھتے تھے، اور اس کے دوران سیکڑوں امریکی ہوا باز بھی ہلاک ہوئے تھے۔ لیکن اس آپریشن کی اطلاع ۱۹۶۳ سے ۱۹۷۳ تک کے عرصے میں امریکی عوام سے نہایت کامیابی سے چھپائی گئی۔ بہت سی تفصیلات ۱۹۸۷ تک سامنے نہ آسکیں جب برطانوی خبر نگار کرسٹوفر روبنز نے اس خفیہ جنگ کے بارے میں The Ravens کے عنوان سے ایک کتاب لکھی جس کی بنیاد اس جنگ میں حصہ لینے والے متعدد امریکی پائلٹوں سے بات چیت پر تھی۔ یہ پائلٹ اس جنگ کے لیے Ravens کا کوڈ ورڈ استعمال کرتے تھے۔ "ایک اور جنگ بھی تھی جو ویت نام کی جنگ سے کہیں زیادہ بھیانک تھی، اور اتنی خفیہ کہ جس ملک میں یہ جنگ لڑی جا رہی تھی اس کا نام تک خفیہ اطلاعات کی فہرست میں شامل تھا،" روبنز نے لکھا۔ "واقفِ حال لوگوں کی باہمی گفتگو میں اس کا ذکر محض 'دوسرا محاذ' کے نام سے کیا جاتا تھا۔ جن افراد نے اس جنگ میں شریک ہونے پر رضامندی ظاہر کی وہ احتیاط سے چنے ہوئے والنٹیئر تھے، اور وہاں کے دورے پر جانے والا شخص گویا دنیا کے نقشے سے غائب ہو جاتا تھا۔ دوسرے محاذ پر جانے والے پائلٹ یوں تو فوج ہی کے افراد تھے لیکن جنگ میں شہری لباس پہن کر حصہ لیتے تھے ـــــ ڈینم کی پتلون، ٹی شرٹ، کاؤبوائے ہیٹ اور سیاہ چشمہ۔"

اس جنگ سے امریکا کے دو مقصد تھے: ایک، ہوچی منہ ٹریل پر شمالی ویت نام سے جنوبی ویت نام کی سمت آنے والے افراد اور جنگی سامان کا راستا قطع کرنا، اور دوسرا، شمال کے علاقے میں پلین آف جارز (پیالوں کی سطحِ مرتفع) سے ہو کر گزرنے والے راستے کو ختم کرنا جسے لاؤس کی کمیونسٹ فوج، پاتھٹ لاؤ، ویت نامی سرحد کے قریب واقع اپنے مورچوں سے دارالحکومت وینتیان کی جانب پیش قدمی کرنے کے لیے ممکنہ طور پر استعمال کر سکتی تھی۔ یہ جنگ زیادہ تر بموں کے ذریعے سے لڑی گئی ـــــ بموں کی ایک ایسی برسات کے ذریعے جس کی اس سے پہلے مثال نہیں ملتی۔ ۱۹۷۳ میں اس بمباری کا خاتمہ ہونے تک امریکی طیارے لاؤس پر بیس لاکھ ترانوے ہزار ایک سو تین بم برسا چکے تھے؛ یہ مقدار ان امریکی بموں کے وزن سے ایک تہائی زیادہ تھی جن کے ذریعے دوسری جنگِ عظیم میں نازی جرمنی کو تباہ کر دیا گیا تھا، اور ان بموں کی مقدار کا تین گنا جو کوریا کی جنگ میں استعمال ہوئے۔ جنگ کے اس عرصے میں بمبار طیاروں نے کل ۵۸۰،۹۴۴ پروازیں کیں، جس کا مطلب ہے ہر روز ۱۷۷ پروازیں، یا نو سال تک ہر روز، دن

دست، ہر آٹھویں منٹ ایک جہاز بھر بموں کا گرایا جاتا۔ اس بمباری پر آنے والا کل خرچ ۷.۲ بلین ڈالر تھا یعنی بیس لاکھ ڈالر یومیہ۔ (بمباری پر ہر روز خرچ کی جانے والی یہ رقم اس کل رقم کے برابر ہے جو لاؤس کو — جہاں کے باشندوں کی اوسط طبعی عمر صرف پینتالیس سال ہے — ۱۹۸۸ کے پورے سال میں تعلیم اور صحت کے سلسلے میں چلائے جانے والے ۷۷ منصوبوں کا خرچ اٹھانے کے لیے بیرونی ملکوں، اقوام متحدہ کے پروگرام اور غیر سرکاری امدادی گروپوں نے مل کر فراہم کی۔) تاہم، امریکی بمباری اپنے دونوں میں سے کوئی بھی مقصد حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ ہوچی منہ ٹریل آمدورفت کے لیے سال بہ سال بہتر ہوتا گیا، یہاں تک کہ اس پر تیل کی ایک پائپ لائن اور گاڑیوں کی مرمت کے لیے زیرزمین ورک شاپس بھی قائم ہو گئیں، اور یہ سڑک کسی بھی بڑے سے بڑے ٹینک یا ٹرک کے چلنے کے قابل ہو گئی۔ ۱۹۷۱ تک شمالی ویت نام اس راستے کو استعمال کر کے ہی چھ لاکھ تیس ہزار کی نفری کو جنوبی ویت نام پہنچا چکا تھا اور انہیں اسلحہ اور رسد بھی اسی راستے سے پہنچائی جا رہی تھی۔ اور دوسری جانب یہ بمباری پاتھٹ لاؤ کے اپنی طاقت کو بڑھانے کے عمل میں ذرا بھی مزاحم نہ ہو سکی: امریکی بمباری سے بے گھر ہونے والے کسان آسانی سے اس کی فوج میں شامل ہوتے گئے، اور ۱۹۷۵ میں پاتھٹ لاؤ کی فوج ایک گولی چلائے بغیر فاتحانہ طور پر دارالحکومت وینتیان میں داخل ہو گئی۔ اس سال ۲ دسمبر کو وینتیان کے سابق امریکی سکول کے جمنازیم میں منعقد ہونے والے اجلاس میں پاتھٹ لاؤ نے بادشاہت کے خاتمے اور لاؤ پیپلز ڈیموکریٹک ریپبلک کے قیام کا اعلان کر دیا اور یوں ایک ایسی قوم کی حکمرانی سنبھال لی جس کی معیشت تباہ ہو چکی تھی۔

بہت کم امریکیوں کو یہ موقع ملا ہے کہ وہ ہوچی منہ ٹریل پر سفر کر کے بمباری کے اثرات کا مشاہدہ کر سکیں جو اب تک باقی ہیں۔ لیکن اس عمل کے امکان نے مجھ میں جو گھبراہٹ پیدا کی تھی وہ گرم جوشی کے اس مظاہرے نے ہوا میں تحلیل کر دی جس سے میرا خیر مقدم کیا گیا۔ جن افراد نے بمباری کا پورا عرصہ وہاں رہ کر گزارا تھا، اور یہاں تک وہ لوگ بھی جنھوں نے اس بمباری سے جسمانی زخم اٹھائے تھے، مجھ سے نہایت خوش خلقی اور خوش دلی کے ساتھ پیش آئے۔ سڑک نمبر ۹ پر سفر کے دوران میرے ترجمان نے، جو وزارت خارجہ کا ملازم تھا، تجویز پیش کی تھی کہ ہمیں زیپون پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی، اس لیے ہمیں راستے سے کھانے کے لیے کچھ لے لیں

چاہیے؛ چناں چہ ہم نے رک کر سڑک کے کنارے بنی ہوئی ایک دکان سے، مکھیوں کا غلاف ہٹا کر، بھنی ہوئی مرغی اور تلے ہوئے خستہ ونڈنگ خریدے۔ لیکن جب ہم زیہون پہنچے، جہاں ہمیں ضلعی حاکم کے مکان پر رات گزارنی تھی، تو ہمیں معلوم ہوا کہ اس نے مقامی ریستوراں میں ہمارے لیے ایک خصوصی دعوت کا اہتمام کر رکھا ہے۔ یہ ڈنر کم از کم بارہ کورسوں پر مشتمل تھا، اور اس پر بھی میزبان بار بار معذرت کر رہا تھا کہ اگر اسے کچھ زیادہ مہلت مل جاتی تو وہ کچھ بہتر بندوبست کر سکتا تھا۔ میرے اعزاز میں دعوت کے اختتام پر ایک ایسی چیز پیش کی گئی جو ہمسایہ ملک تھائی لینڈ سے شاذ و نادر ہی لاؤس پہنچتی ہے، یعنی ٹین میں بند اسپام گوشت سے بھری ایک قاب۔

ضلعی حاکم، جو لاہون ماپانگ وونگ نامی چالیس سالہ خوش مزاج شخص تھا، برستے ہوئے بموں کے درمیان گزرے اپنے دنوں کا حال سنانے لگا۔ "زمین پر کھڑی ہوئی کوئی بھی شے سلامت نہیں رہی تھی،" اس نے ترجمان کے توسط سے مجھے بتایا۔ "تمام عمارتیں تباہ ہو گئیں۔ ہم سب کو پہاڑوں پر جا کر غاروں میں رہنا پڑا یا جنگل میں پناہ لینی پڑی۔ میں اور میرے گھر والے ۱۹۶۴ سے ۱۹۷۲ تک آٹھ برس زیہون سے اٹھارہ میل دور جنگل میں رہے۔ ہم نے زمین میں ایک گڑھا کھود کر سونے کی جگہ بنائی تھی اور اسے لکڑی کے لٹھوں اور گھاس پھوس سے ڈھانپ دیا تھا۔ اپنے کھانے کے لیے دھان ہم خود اگاتے تھے اور نمک اور دوسری ضروری چیزیں شمالی ویت نامی فوجیوں سے مانگتے تھے۔ سب سے بھاری بمباری ۱۹۶۵ اور ۱۹۶۶ میں ہوئی۔ اس دوران جہازوں سے کیے جانے والے سبزہ کش دواؤں کے چھڑکاؤ کے باعث بہت سی زمین بالکل بنجر ہو گئی۔ اس زہریلے چھڑکاؤ کے دوران یوں لگتا تھا جیسے سب کچھ آگ میں جل گیا ہو؛ ہر درخت کا ہر پتا جھڑ گیا تھا۔ یہ زہریلی دوائیں پینے کے پانی اور سبزیوں میں بھی داخل ہو گئی تھیں، اور اس سے بھی بہت سے لوگ ہلاک ہوئے۔ متلی اور جلدی امراض کی شکایت عام ہو گئی اور بہت سے لوگ کچھ بھی حلق سے اتارنے کے قابل نہ رہے۔" یہ بات بمباری کے انکشاف کے بعد بھی بہت دنوں تک پوشیدہ رہی کہ اس جنگ میں سبزہ کش زہریلی دواؤں کا چھڑکاؤ بھی کیا گیا تھا۔ کہیں ۱۹۸۲ میں امریکی ایئرفورس نے جنگ مخالف گروہوں کے لگائے ہوئے اس الزام کی تصدیق کی کہ اس نے ۱۹۶۵ اور ۱۹۶۶ میں لاؤس پر دو لاکھ گیلن ہربی سائیڈ یا سبزہ کش زہریلی دواؤں کا چھڑکاؤ کیا تھا۔

میں نے لاہون سے (لاؤس میں لوگوں کو ان کے خاندانی نام سے نہیں بلکہ پہلے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے، اُس وقت بھی جب اس کے ساتھ احترام کے القاب استعمال کیے جا رہے ہوں) وہ سوال کیا جو ویت نام کی جنگ کے بارے میں میرے لیے سب سے بڑا معمّا رہا تھا: ہوچی منہ ٹریل پر کی جانے والی بمباری ۔۔۔ وہ بمباری جس کی فی مربع میل گرائے جانے والے بموں کی مقدار کے لحاظ سے پوری تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی ۔۔۔ شمالی ویت نامی فوج کی رسد کا سلسلہ کاٹنے میں کیوں ناکام رہی؟ میں نے اسے Jane's Defence Weekly کے ایشیا اور بحرالکاہل کے علاقے کے ایڈیٹر اور دفاعی حکمتِ عملی کے ایک تجربہ کار تجزیہ نگار رابرٹ کارنیول کے اس انٹرویو کے بارے میں بتایا جو میں نے بینکاک میں لیا تھا۔ کارنیول نے کہا تھا کہ جنگل میں لڑی جانے والی گوریلا جنگ میں استعمال کرنے کے لیے بم نہایت غیر موزوں ہتھیار ہیں۔ "بنیادی طور پر بمباری کا اثر صرف اتنا ہوتا ہے کہ زمین میں کچھ گڑھے پڑ جاتے ہیں جنھیں بعد میں بھر لیا جاتا ہے،" اس نے مجھے بتایا تھا۔ "یا چند ٹرک تباہ ہو جاتے ہیں جن کی جگہ دوسرے ٹرک آ جاتے ہیں۔ یا کچھ افراد مر جاتے ہیں، اور ان کی جگہ بھی دوسرے لوگ لے لیتے ہیں۔ بمباری سے کچھ مشکلات تو یقیناً پیدا ہوتی ہیں، لیکن لوگوں کو روک پانا ہوائی جہازوں کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے علاقے کو باقاعدہ اپنے قبضے میں لینا ضروری ہوتا ہے۔"

لاہون نے سر ہلا کر اس بات سے اتفاق کا اظہار کیا، اور پھر وہ باتیں بتائیں جن کا اس نے بمباری کے دوران مشاہدہ کیا تھا: "جس وقت بمباری بہت شدید ہو جاتی اور ٹرکوں کی آمد و رفت ممکن نہ رہتی تو سپاہی سامان کو بانس کے دونوں سروں پر اٹھا لیتے۔ پھر وہ ان بانسوں کے وسطی حصے کو بائیسکل کی گدی پر رکھ لیتے اور بائیسکل کے ہینڈل کو تھام کر جنگل کی اوٹ میں پتلی پگڈنڈیوں سے ہو کر نکل جاتے۔ ہوائی جہاز تو ان کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ ویت نامیوں کی لاری تو بہت ضائع ہوتی لیکن ان کی رسد میں کبھی خلل نہ پڑا۔"

پھر لاہون نے مجھے بتایا کہ بمباری کے ختم ہونے کے بعد بھی مصائب ختم نہیں ہوئے۔ امریکا نے ہوچی منہ ٹریل، پلین آف جارز اور لاؤس کے دوسرے علاقوں کو کلسٹر بم یونٹوں (CBUs) سے پوری طرح ڈھانپ دیا تھا۔ اس میں ایک بڑا سا "مدر بومب" ہوتا ہے جس کی شکل کسی بڑی سی پھلی کی سی ہوتی ہے، گرتے گرتے ایک خاص اونچائی پر پہنچ کر وہ کھل جاتا ہے اور اس

میں سے ٹینس کی گیندوں جتنے درجنوں چھوٹے بم نکل کر پانچ ہزار مربع گز کے علاقے میں بکھر جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر چھوٹے بم کے اندر، جو عسکری اصطلاح میں anti-personnel bomblet اور لاؤس کے لوگوں کی زبان میں "بومبی" کہلاتا ہے، تقریباً دو سو پچاس فولادی گولیاں (pellets) ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض چھوٹے بم زمین سے ٹکراتے ہی پھٹ جاتے اور آس پاس موجود تمام انسان اور حیوان ان کی فولادی گولیوں کی زد میں آجاتے۔ لیکن بعض بم زمین کے اندر دھنس جاتے اور صرف اس وقت پھٹتے جب کوئی چیز ان سے ٹکراتی۔ ایسے ہزاروں ہزار بم اب بھی زمین کے اندر دھنسے پڑے ہیں اور آج بھی کسی کسان کے ہل یا درانتی کی ضرب لگنے سے پھٹ جاتے ہیں۔ "بومبی" سے جب کوئی چیز ٹکراتی ہے تو اس میں موجود بارود پھٹ جاتا ہے اور فولادی گولیاں نہایت تیز رفتار سے نکل کر اردگرد کے چھ سے آٹھ فٹ تک کے علاقے میں پھیل جاتی ہیں۔ یہ بات مجھے ژاکی شانیوں نے بتائی جو لاؤس میں امریکن فرینڈز سروس کمیٹی کے لیے کام کر رہا تھا اور جس سے مجھے "بومبیوں" کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ چناں چہ اگر بچے اپنے ماں باپ کے آس پاس کھیل رہے ہوں تو وہ بھی ہلاک یا زخمی ہو جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں ہم پلین آف جارز کے علاقے میں ایک ٹیچرز ٹریننگ اسکول قائم کرنے کے لیے دو فٹ بال گراؤنڈ کے برابر ایک میدان کی جھل ڈیٹیکٹروں کی مدد سے صفائی کر رہے تھے۔ اس میدان سے اٹھارہ بوبیاں، پھٹ نہ سکنے والے دو درمیانہ سائز کے بم، اور ایک بڑا بم برآمد ہوا جو ناک کے بل زمین میں دھنسا ہوا تھا جس کے باعث اسے وہیں فیوز نہ کیا جا سکا۔ ہمیں اس بم کو جوں کا توں دفن کرنا پڑا۔ اسی خطے کے زیانگ کھوانگ صوبے میں ہر مہینے پانچ سے دس افراد بوبیوں کی زد میں آکر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ زخمی ہونے والے، اگر وہ صوبے کے صدر مقام کے آس پاس ہوں تو صوبے کے واحد اسپتال میں طبی امداد حاصل کر سکتے ہیں جو منگولیا نے تعمیر کرایا تھا۔ یہاں جنرل اینستھیزیا، خون روکنے کے جدید طریقوں اور صدمے سے بحال کرنے کی سہولتوں کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

اگلے روز صبح سویرے لابون اپنے پڑوس میں رہنے والی ایک عورت سے، جس کی ایک ہی ٹانگ تھی، بات کر رہا تھا۔ میں نے اس عورت سے پوچھا کہ کیا وہ مجھے اپنی آپ بیتی سنانا پسند کرے گی۔ وہ فوراً تیار ہو گئی اور بڑی خوش مزاجی اور اطمینان سے بات کرنے لگی، حالاں کہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ میرا تعلق امریکا سے ہے۔ اس نے بتایا کہ ۱۹۶۸ میں، جب اس کی عمر انیس

Scanned with CamScanner

سال تھی، جنگل میں دھان کے کھیت پر کام کے بعد لوٹتے ہوئے اس کا پاؤں ایک بوسیی پر پڑ گیا تھا۔ مقامی کاشتکار اسے اٹھا کر اس عارضی اسپتال میں لے گئے تھے جسے جنگل میں گڑھا کھود کر قائم کیا گیا تھا اور ایک شمالی ویت نامی ڈاکٹر نے اس کی شکستہ ٹانگ کو کاٹ کر الگ کر دیا تھا۔ اس ٹانگ کی جگہ بعد میں ایک بیساکھی نے لے لی جسے ایک امریکی جہاز کے ملبے سے نکالی ہوئی دوربین کی لمبی نلکی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔

"ابھی ہفتہ بھر پہلے قریبی گاؤں کے تین کم عمر لڑکے ایک باغ میں کھدائی کرتے ہوئے بوسیی کی زد میں آ گئے،" لاسون نے بتایا۔ "ان میں سے ایک پندرہ سالہ لڑکا دو دن بعد مر گیا کیوں کہ ایک فولادی گولی اس کے مغز میں گھس گئی تھی۔ باقی دو بچ گئے لیکن آپریشن کر کے ان کے جسموں سے گولیاں نکالنی پڑیں گی۔"

ناشتے کے بعد میں اور ایک سرکاری اہلکار اپنے ٹرک میں سوار ہو کر علاقے کا دورہ کرنے نکل گئے۔ ہوائی جہازوں کے ملبے اور بموں کے خولوں کو نہ صرف زندگی کی ضروری اشیا میں ڈھال لیا گیا تھا — جیسے تلواروں سے ہل بنا لیے گئے ہوں — بلکہ دھاتی ملبے کی کباڑیوں کے ہاتھ فروخت سے ان گاؤوں کی از سرِ نو تعمیر کے لیے رقم فراہم ہوئی جو بمباری سے تباہ ہو گئے تھے۔ تاہم صرف ایک مقام پر پڑے ہوئے ملبے کے انبار کو چھوئے بغیر چھوڑ دیا گیا تھا۔ بان ڈونگ کے نزدیک دو جنوبی ویت نامی ٹینکوں کے ملبے کو ۱۹۷۱ میں ہونے والی ایک لڑائی کی یادگار بنا دیا گیا تھا؛ یہ لڑائی، جسے لیمسن ۷۱۹ کا کوڈ نام دیا گیا تھا، ویت نام کی جنگ کا سب سے تباہ کن حربہ تھی۔ بے نتیجہ بمباری کے چھ سال گزرنے کے بعد لیمسن حکمت عملی کی ایک تبدیلی کی نشان دہی کرتی تھی جس کے ذریعے زیپون کے قریب ہوچی منہ ٹریل کے ایک عسکری طور پر اہم حصے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ حملے کا منصوبہ امریکیوں نے تیار کیا تھا، لیکن اصل پیش قدمی جنوبی ویت نامی فوجیوں نے، امریکی ہوائی جہازوں کی حفاظت میں، کی تھی۔ کرسٹوفر روبنز کے مطابق اس حملے کا منصوبہ پینٹاگون میں تیار کیا گیا تھا اور منصوبہ سازوں نے ایک ایسا نقشہ استعمال کیا تھا جس پر زمین کے جغرافیائی خدوخال کی علامتیں موجود نہیں تھیں، جس کے باعث انھیں اس بات کا اندازہ نہ ہو سکا کہ جنوبی ویت نامی فوجیوں کو بلند پہاڑی ڈھلوانوں کو عبور کرنا پڑے گا جو شمالاً جنوباً واقع ہیں، جب کہ شمالی ویت نامی سپاہیوں کے لیے متعدد نیچی وادیوں کے راستے کمک پہنچانا

Scanned with CamScanner

آسان ہو گا۔ اصل حملے کے وقت ناسازگار موسم کے باعث ہوائی جہازوں کا حفاظتی غلاف مہیا نہ کیا جا سکا، اور حملہ بری طرح ناکام ہو گیا؛ سترہ ہزار جنوبی ویت نامی فوجیوں میں سے پانچ ہزار ہلاک یا زخمی ہوئے اور ۱۷۶ امریکی ہلاک ہوئے۔ اس لڑائی کی یادگار اب صرف ان دو جنوبی ویت نامی ٹینکوں کے ملبے کی صورت میں موجود ہے۔ ہمارے پیچھے پیچھے آنے والے متجسس بچے کلکاریاں مارتے ہوئے ان پر چڑھ گئے۔

اُس شام واپسی پر ہم دوبارہ زیہون میں رکے تاکہ لاہون کو خدا حافظ کہہ سکیں اور اپنے گھر میں ہماری میزبانی کرنے پر اس کا شکریہ ادا کر سکیں؛ اس نے اس میزبانی کا معاوضہ لینے سے انکار کر دیا تھا، اور ہمیں بتایا تھا کہ ضلعی اہلکار کی حیثیت سے اس نے محض اپنا فرض ادا کیا ہے۔ لاہون قریب قریب ہر وقت مسکراتا رہتا تھا، حتیٰ کہ اُس وقت بھی جب وہ جنگ کی ہولناکیوں کا تذکرہ کر رہا ہوتا تھا، مگر اس بار اس پر غیر معمولی سنجیدگی طاری تھی۔ لگتا تھا کہ اس نے تمام دن حساب کتاب کرنے اور حساب کا حاصل جمع ایک نوٹ بک میں درج کرنے میں صرف کیا ہے، اور وہ مجھے ممکن حد تک سرکاری انداز میں ان اعداد و شمار سے باخبر کرانا اور مجھے ان کی سنگینی سے متاثر کرنا چاہتا تھا۔ وہ میز کے سرے پر بیٹھ گیا، اشارے سے مجھے اور میرے ترجمان کو بیٹھنے کے لیے کہا اور بات شروع کرنے سے پہلے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ "ضلع زیہون سڑک نمبر ۹ کے ساتھ ۷۵ میل کی لمبائی میں واقع ہے اور ویت نامی سرحد تک چلا گیا ہے،" اس نے کہا۔ "ہم نے اس علاقے کو ۱۹۶۰ ہی میں آزاد کر لیا تھا؛ اور یہ بھی ایک وجہ تھی کہ یہ اُن علاقوں میں شامل ہے جن کو سب سے زیادہ شدید بمباری کا ہدف بنایا گیا۔ ہمارے ضلعے میں دو سو گاؤں ہیں۔ بمباری نے ۲,۵۵۷ مکان، یعنی ضلعے میں موجود تمام مکان، تباہ کر دیے۔ پانچ ہزار ایسی عمارتیں بھی تباہ ہو گئیں جن کو چاول ذخیرہ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ جنگ کے نو برسوں میں زیہون ضلعے کے پندرہ سو افراد مارے گئے، جب کہ اس کی کل آبادی پینتالیس ہزار تھی۔ تقریباً چھ ہزار گایوں اور بھینسوں میں سے ۱۸۰۰ ہلاک ہو گئیں۔ چار گاؤں ایسے ہیں جن کے باشندوں کی اکثریت ماری گئی۔ ۱۹۷۵ سے اب تک اس ضلعے میں ہر سال کم سے کم تین افراد بموں کی زد میں آ کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔"

لاؤس کے لوگ ایسے ایسے تضادات کے ساتھ رہنے کی اہلیت رکھتے ہیں جن کے ساتھ مغربی ملکوں کے باشندے نہیں رہ سکتے، "وینتیان میں رہنے والے ایک امریکی نے مجھے بتایا۔ اور واقعی لاؤس میں ہر جانب بے شمار تضادات اور پیراڈوکس دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں معمولی معمولی چیزوں میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک پُررونق کھلے بازار میں ایک لڑکا سلیٹی رنگ کی ٹی شرٹ پہنے گزر رہا تھا جس پر "یو ایس ایر فورس" کے الفاظ اسٹینسل کے ذریعے لکھے ہوئے تھے۔ وینتیان میں ہر روز صبح سویرے اور غروب آفتاب کے وقت لاؤڈ اسپیکر میں پیپل براڈکاسٹ کی تیز آواز سے گونج اٹھتے ہیں، لیکن اب ان میں لوگوں کو پیداوار بڑھانے کی ترغیب نہیں دی جاتی بلکہ اناؤنسر سوفٹ ڈرنکس، صابن، کپڑوں اور بیئر کے اشتہار پڑھ کر سناتے ہیں۔ لاؤ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر ڈپٹی ڈائرکٹر نے ـــ جو ایک ایسے سخت فرانسیسی پسند خاندان سے تعلق رکھتا تھا کہ اس کے لاؤ اور فرانسیسی زبان میں دو الگ الگ نام تھے اور اس نے لاؤ زبان میں لکھنا پڑھنا ایک بھکشو سے اس وقت سیکھا تھا جب وہ پیرس کی سوربون یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا ـــ مجھے عمارت کی سیر کرائی جس کے دوران وہ برطانوی لب و لہجے میں انگریزی بولتا رہا۔ جب ہم انگریزی نشریات کے اسٹوڈیو میں داخل ہوئے تو وہاں باریک آواز والی ایک اناؤنسر "امریکی استعمار کے ایجنٹوں" کی مذمت کرنے میں مصروف تھی۔

لیکن لاؤس بھر میں سب سے زیادہ چونکا دینے والا تضاد وینتیان کی امارت کی فضا میں دکھائی دیتا ہے؛ پہلے ویت نام کی جنگ اور پھر پاتھٹ لاؤ کی نافذ کردہ اسٹالنسٹ معاشی پابندیوں کا شکار رہنے والی یہ قوم جس انتہائی درجے کی غربت کی لپیٹ میں ہے، اس کے پس منظر میں یہ شہر کوئی تخیلاتی مقام معلوم ہوتا ہے۔ کسی بھی معروضی معیار سے دیکھیں تو لاؤسی معیشت بمشکل زندہ کہی جا سکتی ہے۔ فی کس سالانہ آمدنی ۱۵۶ ڈالر ہے۔ برآمدات اس قدر قلیل ہیں کہ کمرشل ایرلائنوں کو نیچے جانے والے ملک کی فضا میں پرواز کرنے کے حقوق کا معاوضہ ملک میں زرمبادلہ کی آمد کی چند بڑی مدوں میں سے ایک ہے۔ لاؤس کی سالانہ مجموعی قومی پیداوار سے بڑی رقم آٹھ سو سے زائد امریکی کمپنیوں میں سے ہر ایک سال بھر کی فروخت پر کما لیتی ہے؛ ۱۹۸۸ میں یہ رقم محض ۵۳۶ ملین ڈالر تھی۔ تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق ملک بھر میں کل ۶۳۵۱ ٹیلی فون ہیں،

جن میں بہت سے خراب پڑے ہیں! جب میں نے بینکاک سے ایک اونچے لاؤسی اہلکار کو فون کرنے کی کوشش کی تو مجھے پہلے وینتیان میں مقیم ایک تھائی تاجر کو فون کرنا پڑا جس نے اس پر رضامندی ظاہر کی کہ وہ اس سرکاری اہلکار کو بلا بھیجے گا تاکہ میں آدھ گھنٹے بعد دوبارہ فون کرکے اس سے بات کرسکوں۔ ۱۹۹۰ تک تھائی لینڈ اور سوویت یونین کو چھوڑ کر باقی پوری دنیا سے لاؤس کا رابطہ محض ایک ٹیلی فون لائن پر منحصر تھا: کسی ایک وقت پر صرف ایک بین الاقوامی کال یا تو باہر سے آسکتی تھی یا لاؤس سے کی جاسکتی تھی۔ (اب، ایک آسٹریلوی امدادی پروجیکٹ کی بدولت، بین الاقوامی کالیں ایک آسٹریلوی مصنوعی سیارے کے ذریعے سے پہنچنے لگی ہیں۔) زندہ پیدا ہونے والے ایک ہزار بچوں میں سے ۱۰۹ نوزائیدہ بچے مر جاتے ہیں — یہ تناسب تھائی لینڈ کے مقابلے میں تین گنا اور ریاستہائے متحدہ امریکا کے مقابلے میں دس گنا ہے۔ ناخواندگی کا یہ عالم ہے کہ ایک ٹیچرز ٹریننگ اسکول میں امیدوار پہلی سے پانچویں جماعت تک پڑھتے ہیں تاکہ پہلی سے تیسری جماعت تک کے بچوں کو تعلیم دے سکیں۔ اس ملک میں، جو رقبے میں امریکی ریاست اوریگون کے برابر ہے اور جس کی آبادی صرف چار ملین (چالیس لاکھ) ہے، تین چوتھائی سے زیادہ لوگ دیہی علاقوں میں رہتے ہیں اور ان کی گزربسر صرف اپنے اگائے ہوئے اناج اور جنگل سے خود شکار کیے ہوئے گوشت پر ہوتی ہے۔ ایک امریکی امدادی کارکن نے لاؤس کا بیشتر حصہ گھوم پھر کر دیکھا ہے، اور اس نے ایک نیوز لیٹر میں ایک عام لاؤسی گاؤں کی زندگی کا نقشہ یوں کھینچا:

> یہاں کی خوراک مستقل طور پر چاول، بیج اور بودستی ہوئی مچھلی پر مشتمل ہے۔ اسکول بانسوں کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں قائم ہے جس میں پہلی سے تیسری جماعت تک پڑھائی ہوتی ہے؛ اس سے اوپر کا اسکول اتنی دور ہے کہ پیدل وہاں پہنچنے میں پورا ایک دن لگتا ہے۔ گاؤں کا معالج بیماریوں کا علاج جڑی بوٹیوں کے ذریعے کرتا ہے۔ قریب ترین شفاخانہ بیس میل کے فاصلے پر ہے، اور یاد رکھیے کہ یہ فاصلہ صرف پیدل طے کیا جا سکتا ہے۔ بیماری اور موت جوانوں اور بوڑھوں کے روز کے ساتھی ہیں۔ زندگی ایک متواتر کشمکش ہے جس میں آدمی کی بیشتر قوت معمول کے

کاسوں میں صرف ہو جاتی ہے؛ پانی لے کر آنا، چاول چھڑنا، اور زمین میں
نلائی کرنا۔

اس قسم کی ناداری بودھ مندروں اور پگوڈوں والے قدیم شہر لوئنگ پرابانگ میں بھی دیکھی جا سکتی ہے جو ایک شمالی وادی میں واقع ہے جسے دریائے میکانگ نے پہاڑوں کو کاٹ کر بنایا ہے، اور جس کے باقی ملک سے الگ تھلگ ہونے کے باعث یہاں معاشی تبدیلی بالکل نہیں آسکی ہے۔ اگرچہ لوانگ پرابانگ لاؤس کا مذہبی مرکز ہے اور قدیم شاہی محل بھی یہیں واقع ہے — جسے پاتھٹ لاؤ نے بادشاہت کے جانے کے بعد بھی سیاحوں کی دلچسپی کے لیے قائم رکھا — اس کے باوجود وینتیان سے یہاں تک پہنچنے والے دشوار گزار راستے کے علاوہ، جس پر ۲۳۰ میل کا سفر طے کرنے میں چار دن بھی لگ سکتے ہیں، آمدورفت کا صرف ایک ہی اور ذریعہ ہے۔ یہ ذریعہ دن میں ایک بار وینتیان سے آنے والی پرواز ہے جس میں سرکاری ایرلائن، لاؤ ایوی ایشن، کا ایک زنگ آلود انتونوف ۲۴ طیارہ استعمال کیا جاتا ہے۔ کسی لاؤسی باشندے کے لیے اس پرواز پر آنے جانے کا کرایہ سو ڈالر ہے، جو بیشتر برسرروزگار لوگوں کی مہینے بھر کی آمدنی کے برابر ہے۔ اگر بفرضِ محال کسی نے یہ خطیر رقم کہیں سے مہیا کر بھی لی تو اسے جہاز میں جگہ مشکل سے ملے گی کیوں کہ غیر ملکی باشندوں کو، جو ۶۵ ڈالر کرایہ ادا کرتے ہیں، ترجیح دی جاتی ہے۔ شمالی لاؤس ملک کا غریب ترین علاقہ ہے، اور لوانگ پرابانگ — جس کی آبادی ساٹھ ہزار ہے جس کے حساب سے وہ ملک کا تیسرا بڑا شہر ہے اور سوانا کھیت سے ذرا ہی پیچھے ہے — کئی دہائیوں سے تبدیلی سے نسبتاً ناآشنا رہا ہے۔ گلیوں میں بھینسیں سوتی رہتی ہیں؛ بودھ راہب کشکول ہاتھ میں لیے کھانے کی بھیک مانگتے پھرتے ہیں؛ ہمونگ عورتیں سیاہ زمین پر شوخ رنگوں کی کڑھائی والے کپڑے پہنے پہاڑی گاؤوں میں گھوم گھوم کر گھٹنے اور کڑھے ہوئے لباس بیچتی ہیں۔ سال کے خشک ترین حصے میں، جب کئی مہینوں کے لیے پانی کی سطح نیچی ہونے کے باعث تھوڑی بہت ہی بجلی بھی میسر نہیں ہوتی، شہر کے بیشتر علاقے محض لالٹینوں کی بدولت روشن رہتے ہیں۔ ایرپورٹ صرف ایک رن وے اور دو کمروں کی چھوٹی سی عمارت پر مشتمل ہے؛ روانہ ہونے والے مسافر اس وقت تک اپنے اپنے گھر پر انتظار کرتے ہیں جب تک انھیں وینتیان سے آنے والے جہاز کے اترنے کی آواز سنائی نہ دے جائے۔

اگر لاؤس مجموعی طور پر پس ماندگی اور ناداری کی زبان بولتا ہے تو وینتیان ایک بالکل ہی مختلف پیغام دیتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ شہر، جسے لاؤس کے باشندے اب بھی وینگ چان کہتے ہیں (وینتیان اس نام کا فرانسیسیوں کے ہاتھوں بزور نافذ کیا گیا روپ ہے)، ایک ایسا مقام محسوس ہوتا ہے جو طویل نیند سے بیدار ہونے پر اچانک پُرجوش انداز میں کام میں جُت گیا ہو۔ وینتیان کوئی خوش وضع دارالحکومت نہیں، کیوں کہ اس کی بیشتر عمارتیں بہت خستہ حال اور رنگ و روغن کی سخت محتاج ہیں۔ اس کی سب سے چوڑی سڑک، جسے لان زانگ ایونیو کہا جاتا ہے، پیرس کے انداز کی بولوار تعمیر کرنے کی کوشش کا ایک المناک نتیجہ ہے۔ (لان زانگ، جس کا لغوی مطلب لاکھوں ہاتھیوں کی سرزمین ہے، ایک قدیم لاؤ سلطنت کا نام تھا۔) یہ سڑک دریائے میکانگ کے کنارے واقع صدارتی محل سے شروع ہو کر ایک میل کے فاصلے پر ایک چوراہے پر بنائی گئی بڑی سی یادگار تک پہنچتی ہے جسے پیرس کی لیتوال سے مشابہت کے ارادے سے تعمیر کیا گیا تھا۔ یہ یادگار، جسے ۱۹۶۰ میں اس امریکی سیمنٹ سے تعمیر کرنا شروع کیا گیا جو ایرپورٹ پر ایک رن وے بنانے کی غرض سے بھیجا گیا تھا، قوسِ آزادی کی ایک اکڑوں بیٹھی ہوئی غیر متناسب نقل دکھائی دیتی ہے جس کے اوپر عروسی کیک سے مماثل ایک حیرت ناک ڈھانچہ رکھا ہو جو بزنطینی بُرج اور گوتھک گارگولوں (gargoyles) سے مزیّن کسی مشرقی محل سے مشابہت رکھتا ہے۔ اگر آپ اوپر چڑھ کر اس کی چھت تک پہنچیں تو آپ کو وینتیان کی عمارتیں، جو سب کی سب بہت پست قد اور غیر متاثر کن ہیں، ٹراپیکل سبزے میں چھپی ہوئی معلوم ہوں گی۔ لان زانگ ایونیو کے آس پاس گڑھوں میں ٹراتے ہوئے ویسپا تعداد میں راہ گیروں سے زیادہ ہیں اور ٹریفک کے چوراہے پر، جو سیکڑوں گاڑیوں کو سمو سکتا ہے، کاروں کی ایک چھوٹی سی قطار دکھائی دیتی ہے جو زیادہ تر روسی اور جاپانی ساخت کی ہیں۔ تاہم، کاروں کی یہ تعداد، اب سے چند برس پہلے کے حالات سے موازنہ کیا جائے تو، ایک تجارتی انقلاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ وینتیان کے بیشتر لوگوں کی آمدورفت کا ذریعہ بائیسکل ہے۔

وینتیان خواہ یورپی طرز کا دارالحکومت تعمیر کرنے کے فرانسیسی نوآبادکاروں کے خواب کو پورا نہ کر سکا ہو، پھر بھی اس میں کسی قدر کشش موجود ہے۔ شام کو دریائے میکانگ میں غروب ہوتا ہوا سورج گہرے سُرخ رنگ کی ایک بڑی سی گیند معلوم ہوتا ہے، اور دور تھائی لینڈ کی

روشنیاں شناسائی دکھائی دیتی ہیں۔ ہر صبح سڑک کے کنارے ٹھیلوں پر تازہ بیک کی ہوئی روٹیوں (baguettes) کی ٹوکریاں فروخت کی جاتی ہیں، جو فرانسیسی دور کی اکاد کا یادگاروں میں سے ایک ہے؛ لاؤسی باشندے ان روٹیوں پر مچھلی کی چٹنی لگا کر کھاتے ہیں۔ وینتیان کے محلّے کچے راستوں اور بانسوں پر اٹھے ہوئے روایتی طرز کے مکانوں والے خود کفیل گاؤں سے مشابہ ہیں۔ کوئی مغربی باشندہ اگر سرکاری اور تجارتی علاقے سے نکل کر ان محلّوں میں چہل قدمی کرے تو متجسس بچے اسے گھیر لیتے ہیں اور بڑے شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے سلام دعا کرنے لگتے ہیں۔ ۱۹۷۵ سے پہلے وینتیان آنے والے بیرونی مسافروں نے اسے ایک کھلے ہوئے شہر کے طور پر دیکھا تھا جہاں طوائفیں اور منشیات اسی آسانی سے فراہم تھیں جتنی آسانی سے پٹاکے ہیں، لیکن آج وینتیان سے ایک طہارت پسند معصومیت جھلکتی ہے جو لاؤسی کردار سے زیادہ قریب ہے۔ جب کوئی مغربی شخص گفتگو شروع کرنے کی غرض سے لاؤسی باشندوں کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو لاؤسی اس کا بہت خوش دلی سے خیر مقدم کرتے ہیں، لیکن ہوٹل کے باہر کوئی شخص آپ کو ٹیکسی، گائیڈ، سستی اشیا یا اشاروں سے ظاہر کی جانے والی لذتیں فراہم کرنے کی پیش کش کرتا نہیں ملے گا؛ یہ جارحانہ انداز، جو تیسری دنیا کے تقریباً تمام ملکوں میں دیکھنے کو ملتا ہے، لاؤسی مزاج کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ میں نے لاؤس بھر میں کوئی گداگر نہیں دیکھا، اور نہ کہیں کسی بچے نے مجھ سے کوئی ٹافی یا پیسوں کی فرمائش کی۔ "یہ انتہائی درجے کا تحمّل رکھنے والے لوگ ہیں ـــــ یہ کبھی آپے سے باہر نہیں ہوتے،" وینتیان میں مقیم عالمی بینک کے ایک اہلکار نے کہا۔ "اگر تم انھیں کوئی چیز دو تو یہ شکریہ ادا کریں گے، کچھ نہ دو تب بھی شکریہ ادا کریں گے۔"

وینتیان، جو پہلے ایک نیم خوابیدہ نوآبادیاتی دارالحکومت تھا، کمیونسٹ حکومت کی جانب سے، انفرادی ترقی کے جذبے کے ایک خطرناک سرگرمی قرار دیے جانے کے باعث مزید گہری نیند میں چلا گیا۔ وہاں کے رہنے والے کہتے ہیں کہ ابھی ۱۹۸۸ تک شہر کے مرکزی علاقے کی بیشتر دکانیں بند اور خالی تھیں۔ لیکن پھر اچانک وینتیان نیند سے جاگ اٹھا اور اب تقریباً تمام دکانیں کاروبار میں مصروف ہو چکی ہیں۔ سب سے بڑا بازار جو صدارتی محل سے کچھ فاصلے پر کئی ایکڑ رقبے پر پھیلا ہے، جاپانی ساخت کے جدید ترین الیکٹرونک سامان، اور تھائی کپڑوں اور کھانے پینے کی چیزوں سے بھرا ہوا ہے؛ اسے صبح کا بازار کہا جاتا ہے، مگر یہ نام اب اس پر صادق نہیں آتا

کیوں کہ وہاں اب دن بھر بھیڑ لگی رہتی ہے۔ چند برس پہلے تک وینتیان میں لاؤسی ریستوراں نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ اب لاؤسی کھانے درجنوں مقامات پر ملتے ہیں، اور ہر ہفتے ان میں کئی نئی دکانوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ غیر دلکش عمارتیں جن میں ہوٹل، ریستوراں اور دکانیں واقع ہیں، اب کرسمس ٹری کی سی جلتی بجھتی روشنیوں سے آراستہ ہیں، اور لان زانگ ہوٹل کی، جو شہر کا بہترین ہوٹل ہے، بیرونی دیوار پر درانتی اور ہتھوڑے کا چمکتا ہوا نیون سائن لگا ہوا ہے۔ اور ایک ایسے ملک میں جہاں کی روکھی اور سنجیدہ مزاج حکومت نے پندرہ سال قبل اقتدار سنبھالتے ہی شبینہ زندگی کی رمق تک باقی نہ رہنے دی تھی، اب کم سے کم ایک درجن ڈسکو تھیک نصف شب کے بعد تک اپنی بلند آواز موسیقی جاری رکھتے ہیں، کیوں کہ کاغذ پر کرفیو برقرار رہنے کے باوجود اسے مکمل طور پر نظرانداز کیا جانے لگا ہے۔

نئے ریستوراں، ڈسکو تھیک، بازار میں بکنے والے اسٹیریو، اور نئے سرے سے زندہ ہو جانے والے وینتیان شہر کے دوسرے مظاہر، دراصل کھلے پن کی ایک ایسی پالیسی کا نتیجہ ہیں جو کمیونسٹ بلاک کے لیے، دنیا میں آنے والی حالیہ تبدیلیوں کے پس منظر میں بھی، بہت غیر معمولی دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے کمیونسٹ ملکوں میں معاشی اصلاحات سے پہلے قیادت تبدیل ہوئی، اور نئی قیادت نے نئے خیالات پیش کیے۔ لیکن معاشی تعمیرِ نو کا لاؤسی روپ قیادت میں آنے والی کسی تبدیلی کا نتیجہ نہیں تھا: پاتھٹ لاؤ کے عمر رسیدہ اور سخت گیر رہنما، جو اب بھی لاؤس پر حکمرانی کرتے ہیں، دوسری جنگِ عظیم کے دنوں سے ایک ساتھ کام کر رہے ہیں، یعنی اس وقت سے جب وہ ہوچی منہ کی انڈوچائنیز کمیونسٹ پارٹی کی ایک شاخ کی رہنمائی پر فائز تھے۔ اور یہ اصلاحات سڑکوں پر ہونے والے مظاہروں کا بھی نتیجہ نہیں تھیں: وینتیان میں مقیم مغربی باشندوں کا کہنا ہے کہ انھوں نے کبھی کسی قسم کا احتجاج یا کسی جانب سے اختلاف کا کوئی مظاہرہ نہیں دیکھا۔ اس کے باوجود پاتھٹ لاؤ کی قیادت نے، اپنی مارکسی خطابت سے دست بردار ہوئے بغیر، اور ملک میں سیاسی اپوزیشن کی ذرا سی گنجائش پیدا کیے بغیر، اقتصادی ڈھانچے میں تبدیلی کا ایک ایسا عمل شروع کیا ہے جو اپنی وسعت میں مشرقی یوروپ میں آنے والے حالیہ سیاسی تغیر سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اگرچہ لاؤس بڑی شدت سے سوویت یونین، اور خصوصاً ویت نام، کے اثر میں تھا، یہ اصلاحات اس وقت شروع کی گئیں جب میخائل گورباچیف کے منظر پر نمودار ہونے میں ابھی کئی

برس باقی تھے ــــ ان کا آغاز ۱۹۷۹ میں اس وقت ہوا جب ریاست نے اپنی اجتماعی کاشتکاری کی پالیسی ترک کر دی ــــ اور یہ عمل ویت نامیوں کے اپنے ملک میں تبدیلی لانے کے متذبذب اقدامات سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے ہوا۔ اصلاحات کے اس عمل کو، جسے لاؤسی زبان میں "نئی فکر" کی مترادف اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے، "سیاسی تبدیلی کے بغیر معاشی اصلاحات" کے الفاظ میں بھی بیان کیا جا سکتا ہے، جو ٹھیک وہی فارمولا ہے جسے نافذ کرنے کی کوشش میں چین کے رہنماؤں کو بری طرح ناکامی ہوئی۔ بردباری سے کام کرنے والی پاتھٹ لاؤ نے اسٹالنسٹ طریقوں کو ترک کر کے ڈرامائی طور پر خود کو اپنے ماضی سے منقطع کر لیا ہے۔

لاؤس میں کی جانے والی اصلاحات سرمایہ دارانہ نظام کے کسی کٹر ترین حامی کو بھی متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ زراعت کے شعبے میں، کسان اب زمین کی ملکیت حاصل کر سکتے ہیں، اور اپنی آمدنی پر ٹیکس ادا کرنے کی واحد شرط کے ساتھ، وہ اپنی زمین کی پیداوار کو منڈی کے بھاؤ جس طرح چاہیں فروخت کر سکتے ہیں۔ اگر ریاست کا کوئی ادارہ چاول یا کوئی اور جنس خریدنا چاہے تو اسے کھلی منڈی میں آزاد تاجروں سے مسابقت کرنی پڑتی ہے۔ جہاں تک باقی ماندہ سرکاری زرعی کوآپریٹوز کا تعلق ہے، اگر وہ منافع نہ کما سکیں تو انہیں کاروبار بند کرنا پڑتا ہے۔ یہی معاملہ سرکاری ملکیت کے کارخانوں اور تجارتی اداروں کا بھی ہے، اور اب وہ پیداوار، سرمایہ کاری اور قیمتوں کے تعین کے سلسلے میں اپنے فیصلے خود کرتے ہیں۔ بینکاری کے شعبے میں بھی خاصی آزاد خیال تبدیلیاں کی گئی ہیں اور لاؤس کے پہلے کمرشل بینک نے، جس کی ۷۰ فیصد ملکیت تھائی سرمایہ کاروں کے پاس ہے، ۱۹۸۹ میں کام شروع کیا ہے۔ سرمایہ کاری کی نئی پالیسی کے تحت، جس کا نفاذ جولائی ۱۹۸۸ میں ہوا، مشترکہ منصوبوں اور مکمل طور پر بیرونی سرمایہ کاروں کی ملکیت کے منصوبوں کی اجازت دے دی گئی ہے۔ بیرونی سرمایہ کار اپنا منافع ملک سے باہر لے جا سکتے ہیں اور انہیں، اس نئے قانون کے تحت، نیشنلائزیشن سے تحفظ حاصل ہے۔ اس آزاد پالیسی نے ایک اہم، گو غیر متوقع، سرمایہ کار کو اپنی طرف راغب کیا؛ ہنٹ آئل کمپنی نے، جس کے ریاست ٹیکساس سے تعلق رکھنے والے مالک کا خاندان دوسری باتوں کے علاوہ اپنے شدید کمیونسٹ مخالف خیالات کے لیے بھی جانا جاتا ہے، جنوب مشرقی لاؤس میں تیل کی تلاش کے ایک معاہدے پر دستخط کیے۔ "پرائیویٹائزیشن" کا لفظ بار بار سنائی دیتا ہے؛ حکومت نے اپنا ایک سگریٹ بنانے کا

کارخانہ ایک تھائی سرمایہ کار کو اور شیٹ میٹل کا کارخانہ تھائی لاؤسی جوائنٹ وینچر کو پٹے پر دے دیا ہے۔ صنعت کے نائب وزیر کھامون پھونیکیو نے مجھ سے کہا کہ لاؤ ایوی ایشن کو بھی پرائیوٹائز کیا جاسکتا ہے۔ ابھی ہم غور کر رہے ہیں، اس نے کہا۔ "ہمیں معلوم نہیں کہ کون سی چیزیں اپنے پاس رکھنی چاہییں۔"

لیکن اصلاحات کی وسعت کا اندازہ کرنے کے لیے سرمایہ کاری کی پالیسی کا مطالعہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ وینتیان آنے والے کسی غیر ملکی کو نئی فکر کے نتائج کا اسی لمحے اندازہ ہو جاتا ہے جب وہ کرنسی تبدیل کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ کرنسی کا کالا بازار وجود نہیں رکھتا، کیوں کہ لاؤسی سکے کپ کو اب امریکی ڈالر اور تھائی بھات کے مقابلے میں اپنی قدر متعین کرنے کے لیے پوری طرح آزاد چھوڑ دیا گیا ہے، اور یہ تینوں کرنسیاں لاؤس میں یکساں طور پر قبول کر لی جاتی ہیں۔ (البتہ جو سیاح کپ میں خرید و فروخت کرتے ہیں انھیں ایک وقت ضرور شاقی پڑتی ہے: کپ کا سب سے بڑا نوٹ شمر امریکی سینٹ کے برابر ہے، اور کرنسی تبدیل کرنے والے اکثر تاجر اس سے بھی چھوٹے نوٹ تھمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لاؤس میں اپنے قیام کے پہلے دن میں نے سو ڈالر کا نوٹ تبدیل کرایا اور یہ نہ بتایا کہ مجھے کتنی مالیت کے نوٹ درکار ہیں، مجھے نوٹوں سے بھرا پانچ پونڈ وزنی پلاسٹک بیگ اٹھا کر چلنا پڑا۔) لاؤس میں زرمبادلہ کی شرح کا تعین ایک ایسا عمل ہے جسے دنیا بھر میں 'کھلی منڈی' کا سب سے زیادہ لغوی مفہوم قرار دیا جاسکتا ہے: ہر روز صبح سویرے لاؤس کے مرکزی بینک کا ایک اہلکار صبح کے بازار کا چکر لگا کر یہ معلوم کرتا ہے کہ وہاں دکان دار ایک ڈالر کے بدلے کتنے کپ دے رہے ہیں، اور اس شرح کو زرمبادلہ کی سرکاری شرح کے طور پر اختیار کر لیا جاتا ہے۔

ان معاشی اصلاحات کے نتائج پورے وینتیان میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ چند سال پہلے تک پٹرول خریدنے کے لیے سرکاری ملکیت کے اسٹیشن پر لمبی قطار میں انتظار کرنا اور پھر راشن کا کوپن دکھانا ضروری ہوتا تھا؛ لیکن اب کئی پرائیوٹ پٹرول پمپ ہیں، اور شیل کمپنی کا بڑا اسٹیشن، جو کسی بھی امریکی اسٹیشن سے مختلف نہیں، نصف شب تک کھلا رہتا ہے۔ پٹرول پمپوں کے کاروبار میں اضافہ ہو رہا ہے کیوں کہ، اگرچہ وینتیان نے ابھی تک اپنا پہلا ٹریفک جام نہیں دیکھا ہے، کاریں اور دوسری گاڑیاں پہلے سے زیادہ تعداد میں فروخت ہو رہی ہیں۔ مثال کے طو.

ون کے ایک کارخانے کے مالک نے، جو اپنی بیئر اور تمباکو ٹاؤن میں فروخت کرتا ہے، مجھے بتایا کہ اس نے اپنے کنبے کے لیے دو ٹویوٹا، ایک واکس ویگن اور دو موٹر سائیکلیں خریدی ہیں۔ وینتیان کی سڑکوں پر نیلی جینز اور لمبے بالوں والے نوجوان موٹر سائیکلوں پر انتہائی تیز رفتاری سے دندناتے پھرتے ہیں اور سراسیمگی پھیلا دیتے ہیں کیوں کہ وہاں کے ڈرائیور عموماً اس قدر محتاط ہیں کہ کسی انسانی غیر محتاط راہ گیر کے گزرنے کے لیے بھی گاڑی روک لیتے ہیں۔ صرف چند سال پہلے تک ان نوجوانوں کے لمبے بال ہی انہیں اصلاحی کیمپ کی ہوا کھلوا سکتے تھے۔

حکومت کی نئی پالیسی کے تحت ہر اس شخص کا خیر مقدم کیا جاتا ہے جو کسی بھی طور پر اس معاشی تعمیرِ نو میں حصہ لے سکے، یہاں تک کہ ایسے لاؤسی باشندوں کا بھی جنہیں ۱۹۷۵ میں اصلاحی کیمپوں میں قید کر لیا گیا تھا یا جو ملک سے فرار ہو گئے تھے۔ چند سال پہلے نائب وزیرِ خارجہ سُوبان سری تھیر تھ سے، جو ملک کے مغرب کے ساتھ تعلقات کے شعبے کا انچارج ہے، ریاست ہائے متحدہ کا دورہ کر کے لاؤسی نژاد امریکیوں کو یہی پیغام دیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر وہ لاؤس کی ترقی میں کوئی کردار ادا کرنا چاہتے ہیں تو انہیں واپس آ کر کوئی کاروبار شروع کرنا چاہیے،' اس نے مجھے بتایا۔ 'اگر وہ یہاں چھ ماہ ٹھہریں اور اپنی نئی شہریت سے دست بردار ہو جائیں تو ہم انہیں ان کی جائیداد بھی واپس لوٹانے کو تیار ہیں۔' وینتیان میں امریکی سفارت خانے کی رپورٹ ہے کہ سینکڑوں لاؤسی نژاد امریکیوں نے لاؤس کا دورہ کیا، جس میں ان کے ساتھ کوئی ناخوشگوار بات نہیں ہوئی، البتہ اب تک صرف ایک شخص کاروبار شروع کرنے کے ارادے سے واپس آیا ہے۔

ایک رات جب میں سوچان ریستوران نامی ایک جگہ کھانا کھا رہا تھا تو میری ملاقات فرانس سے لوٹنے والے ایک لاؤسی سے ہوئی۔ یہ ریستوران کا مالک دُوان سیہار تھ تھا جو مجھے مغرب سے آیا ہوا دیکھ کر میرے پاس بیٹھ گیا اور اپنی کہانی سنانے لگا۔ "میں سات برس پیرس میں رہا، اور اس سے پہلے امریکا اور آسٹریلیا میں، لیکن میں لاؤس کا رہنے والا ہوں اور مجھے اپنے ملک کی یاد ستایا کرتی تھی،' اس نے کہا۔ 'چنانچہ تین سال پہلے میں واپس آ گیا، اور اب میرے پاس یہ ریستوران ہے، درآمد برآمد کا کاروبار ہے اور ایک کمپیوٹر سنٹر ہے۔ میں نے Feeling Well کے نام سے ایک نائٹ کلب بھی شروع کیا ہے، اور حکومت سے اس نام کی منظوری لینے کے لیے مجھے تین مہینے تک کوشش کرنی پڑی۔ اس ریستوران کا نام میں نے اپنی بیوی کے نام پر رکھا ہے۔ اسے

شروع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب غیر ملکی یہاں آئیں گے تو لاؤسی کھانے تلاش کریں گے، اور اس شہر میں کوئی لاؤسی ریستوراں نہیں تھا۔ یہ ریستوراں میں نے غیر ملکیوں کے لیے شروع کیا ہے۔"

نو یافتہ خوشحالی کی کم ہی کہانیاں اس قدر ڈرامائی ہوں گی جتنی دوسون بلاوارن کی کہانی ہے۔ اس کا خاندان وینتیان کے ویتنگ والے ہوٹل کا مالک تھا اور وہ خود لاؤس کی شاہی فوج میں کرنل تھا۔ وہ ۱۹۶۰ میں امریکی فوج کے ہاتھوں تربیت حاصل کرنے کچھ عرصے کے لیے امریکا جا چکا تھا۔ جب پاتھٹ لاؤ نے اقتدار پر قبضہ کیا تو ہوٹل ضبط کر لیا گیا اور دوسون کو اصلاحی کیمپ میں بھیج دیا گیا جہاں اسے سڑکیں اور پل بنانے کی مزدوری پر لگا دیا گیا اور اس کا اپنے خاندان سے رابطہ بالکل کٹ گیا۔ ۱۹۸۸ میں اس کا کیمپ بند کر دیا گیا۔ حکومت نے دوسون کو اس کا ہوٹل لوٹا دیا، بلکہ سرکاری سیاحتی ادارے نے اس میں جزوی ملکیت کے بدلے کچھ سرمایہ کاری بھی کی۔ ایک تھائی ہوٹل والے کو ساتھ ملا کر دوسون کے پاس ہوٹل کی تزئین اور مرمت کے لیے کافی سرمایہ فراہم ہو گیا۔ جب میں نے اس سے بات چیت کی تو مزدوروں کی ٹولیاں شہر کے مرکزی کاروباری علاقے میں واقع ہوٹل کی اینٹوں والی عمارت کی مرمت کا کام شروع کر چکی تھیں۔ "ہم سے ایک فرسٹ کلاس ہوٹل بنائیں گے،" اس نے مجھے بتایا۔ "مجھے حکومت کے ساتھ کسی معاملے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ میں باہر سے جو بھی سامان منگوانا چاہوں، اس کی اجازت مل جاتی ہے۔ اب مجھے اپنا ہوٹل اور اپنا گھر واپس مل گیا ہے اور لاؤس میں میری زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔" بیگار کے مزدور سے یکایک سرمایہ دار بن جانے والے دوسون نے صرف ایک دشواری کا ذکر کیا: تعمیراتی کام کی کثرت کے باعث ہنرمند مزدوروں کی قلت ہو گئی ہے۔ "یہ واقعی بڑا مسئلہ ہے،" اس نے شکایت کی۔ "ایسے لوگ دستیاب نہیں ہوتے جنھیں تعمیراتی کام کا تجربہ ہو۔"

***

پاتھٹ لاؤ کے رہنما روایتی کمیونسٹ معیشت کو ترک کرنے پر کیوں کر آمادہ ہو گئے؟ اس کا کچھ سراغ لاؤس کی تاریخ سے مل سکتا ہے۔ یہ چھوٹا سا ملک جس کی کوئی سرحد سمندر سے نہیں ملتی،

صدیوں سے اپنے سے کہیں زیادہ طاقت ور ملکوں کے ہاتھوں میں مہرے کی طرح رہا ہے جو اس کے محلِ وقوع کی اہمیت کے باعث اس میں دل چسپی رکھتے تھے: اس کے شمال میں چین، مشرق میں ویت نام، مغرب میں تھائی لینڈ اور برما، اور جنوب میں کمبوڈیا واقع ہیں۔ نتیجہ یہ کہ لاؤس کو، جس نے کبھی کوئی جنگ نہیں چھیڑی، برسوں میں امن کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہوا۔ اگرچہ تاریخی طور پر یہ سیامی اور ویت نامی بادشاہتوں کی باہمی جنگوں کا میدان رہا ہے، لیکن اس پر ۱۸۸۰ میں فرانس کا اور دوسری جنگِ عظیم کے دوران جاپان کا تسلط ہو گیا، اور آخرکار اسے ایک جانب امریکا اور تھائی لینڈ اور دوسری طرف ویت نامیوں اور ان کے حلیف باغی پاتھٹ لاؤ سپاہیوں کے مابین ہونے والی خونخوار کشمکش جھیلنی پڑی۔ جدید لاؤس دراصل لاؤسیوں کی نہیں، فرانس کی تخلیق ہے: فرانسیسی نوآبادکاروں نے، جو انتظام چلانے کے لیے ویت نامیوں کو اپنے ساتھ لائے تھے، ہمسایہ طاقتوں سے مذاکرات کر کے لاؤس کی سرحدیں متعین کیں اور اس عمل میں لاؤسیوں کو بولنے کی بالکل اجازت نہ دی۔ نتیجہ یہ ہے کہ لاؤسی قوم ۶۸ نسلی گروہوں کا مجموعہ ہے، جن میں بیشتر دریاے میکانگ کے میدانی نشیبی علاقے کے باشندوں سے، جو ملک کی آبادی کے تقریباً نصف کے برابر ہیں، تاریخی طور پر برسرِپیکار رہے ہیں۔ ہمونگ نسل کے لوگ، جو بقیہ ۶۷ گروہوں میں سے ایک ہیں، امریکی سی آئی اے کی خفیہ فوج میں طور شامل ہو گئے؛ نوعمر لڑکوں کو، جنھوں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی کار یا بجلی کی روشنی نہیں دیکھی تھی، قدیم گاؤوں سے اٹھا کر جیٹ لڑاکا طیاروں اور ہیلی کاپٹر بردار جنگی جہازوں میں سوار کرا دیا گیا۔ جب پاتھٹ لاؤ نے اقتدار سنبھالا تو ہمونگ برادری کا رہنما وانگ پاؤ فرار ہو کر تھائی لینڈ چلا گیا — فریسنو سے نکلنے والے رسالے Bee کے جولائی ۱۹۸۹ کے شمارے میں شائع شدہ ایک تفصیلی مضمون کے مطابق، اس کی چھ بیویاں اور ۲۹ بچے بھی اس کے ساتھ تھے۔ بہت سے دوسرے ہمونگ باشندے بھی ملک چھوڑ گئے، اور اب ریاست ہاے متحدہ میں ان کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے جن میں سے بیشتر کیلی فورنیا کی مرکزی وادی میں فریسنو شہر کے قریب آباد ہیں۔

اگرچہ ۱۹۷۵ میں لاؤس ہندچینی کا فراموش کردہ ملک بن گیا، تاہم ۱۹۵۰ کی دہائی سے شروع ہونے والے عرصے میں، جب ویت نامی کمیونسٹوں — ویت منہ — اور ان کے لاؤسی حلیفوں — پاتھٹ لاؤ — کی جارحانہ سرگرمیوں میں اضافہ ہونا شروع ہوا، لاؤس نے اس خطے میں

مرکزی اہمیت کا کردار ادا کیا تھا۔ ۱۹۵۳ میں جب ویت منھ نے شمال مشرقی لاؤس میں اپنا ایک مورچہ قائم کیا تو فرانسیسیوں نے لوانگ پربانگ تک رسائی کے راستے کو محفوظ رکھنے کی غرض سے لاؤسی سرحد کے قریب واقع ویت نامی شہر دیئن بیئن پھو پر قبضہ کر لیا۔ اس اقدام کی قیمت فرانسیسیوں کو ہند چینی کی جنگ کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔ ۱۹۶۰ میں امریکی صدر ڈوائٹ آئزن ہاور نے لاؤس کو جنوب مشرقی ایشیا کی کنجی قرار دیا۔ کہا گیا کہ اس کا کردار جنوبی ویت نام سے بھی زیادہ اہم ہے، کیوں کہ اگر ویت منھ نے لاؤس پر قبضہ کر لیا تو وہ یہاں سے اپنے روایتی دشمن تھائی لینڈ پر حملہ کر سکتے ہیں۔ ویت منھ نے بھی پاتھٹ لاؤ سے اپنے تعلقات کے سلسلے میں کسی قسم کا خطرہ مول نہیں لیا، کیوں کہ لاؤسی، جو اپنی تاریخ کے ہر دور میں نہایت امن پسند رہے ہیں، اپنی اس صلاحیت کے لیے مشہور ہیں کہ جس وقت جنگ چھڑے وہ میدانِ جنگ سے دور کسی اور مقام پر ہوں۔ ویت نام کی جنگ کے دوران امریکی اخبار اکثر لاؤس کی شاہی فوج کی کارکردگی کا مضحکہ اڑایا کرتے تھے۔ ایک امریکی فوجی افسر نے کہا تھا، "بلاشبہ میں نے اس سے بدتر فوج دنیا میں کہیں نہیں دیکھی۔ اس کے مقابلے میں تو جنوبی ویت نام کی فوج ٹنک سورماؤں کا جتھا معلوم ہوتی ہے۔" لاؤسی ایئر فورس نے بھی امریکا کے بخشے ہوئے T-28 جہازوں کے استعمال کو محض بمباری تک محدود رکھنا مناسب نہ سمجھا؛ اس کے بجائے لاؤسی ان جہازوں کو کرائے پر مسافر لانے لے جانے اور افیم اسمگل کرنے کے مقصد سے استعمال کرتے تھے۔ روبنز نے اپنی کتاب The Ravens میں لکھا ہے کہ اگر لاؤسی ہوابازوں کو طیارہ شکن توپوں کے آس پاس ہونے کا شبہ بھی ہو جاتا تو وہ ہدف سے میلوں دور جا کر بمباری کرتے۔ اگر ان کے اندازے کے مطابق دن نحس ہوتا تو وہ اپنی شکل ہی نہ دکھاتے۔ اور روبنز کے مطابق، "لاؤسی سب سے مہنگا اسلحہ استعمال کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ جب کبھی ممکن ہوتا وہ CBU-25 بموں کی فرمائش کرتے... لاؤسی پائلٹ ان بموں کے خالی کنستر لو بیم بیچنے کی غرض سے گھر لے جاتے، جبکہ اس کے اندر کا تاروں کا گچھا وہ پہلے ہی نکال چکے ہوتے تھے۔"

پاتھٹ لاؤ البتہ اس سے مختلف تھے، کیوں کہ وہ ویت منھ کے ماتحت تھے۔ یونیورسٹی آف پٹس برگ کے سیاسیات کے پروفیسر جوزف جے زاسلوف نے، جو لاؤس پر مہارت رکھنے والے گنے چنے امریکیوں میں سے ایک ہے، مجھے بتایا کہ ویت نامی پاتھٹ لاؤ سے اتنے زیادہ متاثر

میں ہوتے تھے۔ پھر اس نے کہا، جب میں پاتھٹ لاؤ کے بارے میں اپنی کتاب لکھ رہا تھا، میں نے ان کے ایک ویت نامی مشیر کا انٹرویو کیا، اور اس کی باتیں سن کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی امریکی فوجی افسر جنوبی ویت نامی فوج کا ذکر کر رہا ہو۔ پاتھٹ لاؤ کے سلسلے میں ویت منہ کا کردار بنیادی تھا۔ وہی ان کے رہنماؤں کو بھرتی کرتے، وہی انہیں تربیت دیتے، وہی ان کی مشاورت کرتے اور ویت نام کی جنگ کے دوران ان کے فوجی لاؤس میں خود جا کر لڑے۔ تین اعلیٰ ترین پاتھٹ لاؤ رہنماؤں میں سے دو کی بیویاں ویت نامی تھیں۔ تیسرا، کیسون پھومووہانے، جو ۱۹۵۵ میں لاؤ کمیونسٹ پارٹی کے قیام سے لے کر مرتے دم تک پارٹی کا قائد رہا، خود نصف ویت نامی [illegible] وہ سوانا کھیت سے تعلق رکھنے والے ایک ویت نامی سرکاری افسر کا بیٹا تھا اور اس نے ہنوئی کے ایک اسکول اور لاء کالج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ۱۹۷۵ میں وہ نو قائم شدہ لاؤ پیپلز ڈیموکریٹک ریپبلک کا وزیر اعظم بن گیا۔ اس نے نومبر ۱۹۹۲ میں، ۷۲ برس کی عمر میں وفات پانے تک لاؤس پر حکمرانی کی۔ اس کے بعد اس کی جگہ ایک اور پرانے اور سخت گیر کمیونسٹ رہنما، ۷۸ سالہ نوہاک پھومساون، نے لی جو اس سے پہلے وزیر خزانہ کے عہدے پر فائز تھا۔

خلوت پسند کیسون، جو امریکی بمباری کے دوران ویت نامی سرحد کے نزدیک واقع سام نیو صوبے کے ایک غار میں مقیم رہا، مغربی دنیا کے لیے یکسر اجنبی ہستی ہے۔ ۱۹۶۰ کی دہائی میں امریکی اخبارات میں، جو ان دنوں لاؤس کا بے تحاشا تذکرہ کرتے تھے، کیسون کا شاذ و نادر ہی ذکر آتا۔ اس کے بجائے اخبارات دو سوتیلے بھائیوں کے درمیان ہونے والی رزمیہ کشمکش کی تفصیلات بیان کیا کرتے جن میں ایک جانب شہزادہ سوانا پھوما تھا — غیر جانبداری کا قائل، ہمیشہ مفاہمت پر آمادہ، کبھی امریکی حمایت کا ہدف اور کبھی سی آئی اے کی سازشوں کا نشانہ — اور دوسری جانب اس کا سیاسی مخالف شہزادہ سوپھانوونگ، جسے عرف عام میں سرخ شہزادہ سمجھا جاتا تھا۔ مگر یہ دونوں سیاسی مخالفت کے باوجود ذاتی طور پر ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔ لاؤس کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے والے ان دونوں افراد نے، جو فرانس میں تعلیم یافتہ، مہذب اور حکمرانہ مزاج کے حامل تھے، ۱۹۳۹ میں سیاسی طور پر الگ الگ راہیں اختیار کر لی تھیں جب سوپھانوونگ نے اپنی حمایت ویت منہ کو سونپ دی تھی۔ دریائی بندرگاہ لاؤس کی گودی میں

ایک سال کام کرنے کے دوران وہ فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کے اثر میں آ گیا تھا اور پھر ۱۹۴۵ میں، جب وہ ویت نام میں ۳۳ سالہ ہائی وے انجینئر کے طور پر کام کر رہا تھا، اس کی ہو چی منہ سے پہلی بار ملاقات ہوئی تھی۔ میرے والد کی گزر بسر کا واحد ذریعہ انجینئر کے طور پر ان کی تنخواہ تھی، شہزادہ سوپھانووونگ کے بیٹے کھماسائی سوپھانووونگ نے، جو ایک اعلیٰ لاؤسی اہلکار ہے، مجھے بتایا۔ ان کے پاس کوئی زمین تھی نہ مکان۔ کوئی یہ خیال نہیں کرتا تھا کہ کون شہزادہ ہے اور کون مزدور — وہ سب کمیونسٹ تھے۔ سوپھانووونگ کو ۱۹۵۰ میں مزاحمتی حکومت میں وزیرِ اعظم مقرر کیا گیا؛ پتھت لاؤ کے قبضہ سنبھالنے پر وہ لاؤس کا صدر بنا۔ ۱۹۸۷ میں فالج کا حملہ ہونے کے سبب اس نے اپنا عہدہ چھوڑ دیا۔

سوپھانووونگ نے اپنی نظریاتی پاکیزگی ہمیشہ برقرار رکھی، لیکن دوسری طرف سوواناپھوما نے ۱۹۵۱ سے ۱۹۷۵ تک بننے والی بھانت بھانت کی مخلوط حکومتوں میں وزیرِ اعظم کے فرائض انجام دیے؛ سازشوں، جوابی سازشوں اور بغاوتوں کے درمیان (جن میں سے بعض کو سی آئی اے کی پشت پناہی حاصل تھی) اس نے لاؤس کو ایک ایسے غیر جانب دار موقف پر رکھنے کی سر توڑ کوشش کی جو تمام فریقوں کو مطمئن کر سکے۔ روانی سے فرانسیسی بولنے والے، فرانسیسی وائن اور سگاروں کے شائق اور نفیس ذوق کے حامل اس شخص نے اپنے ملک کی حفاظت کرنے کے عمل کے دوران بہت سی ہزیمتیں اٹھائیں۔ لیونارڈ اُنگر نے، جو ۱۹۶۰ کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں لاؤس میں امریکی سفیر رہا تھا، حال ہی میں مجھے ایسے ہی ایک واقعے کے بارے میں بتایا۔ ۱۹۶۳ میں، جب اُنگر امریکی سیکرٹری خارجہ ڈین رسک سے ملاقات کے لیے سائیگان گیا ہوا تھا، اس کے نائب نے آدھی رات کو فون کر کے اسے اطلاع دی کہ سوواناپھوما کے خلاف فوجی بغاوت ہو رہی ہے جس کی قیادت دائیں بازو کا ایک جنرل کر رہا ہے۔ اُنگر فوراً وینتیان واپس پہنچا۔ "مجھے معلوم ہوا کہ سووانا گھر ہی پر ہے، لیکن درحقیقت وہ نظر بندی کی حالت میں تھا، کیوں کہ اس کے احاطے کو مخالف فوجیوں نے گھیر رکھا تھا،" اس نے بتایا۔ "مجھے اس کے پاس پہنچ کر اسے یہ بتانا تھا کہ سب کچھ ختم نہیں ہوا ہے اور یہ کہ امریکا اب بھی اس کے ساتھ ہے۔ چناں چہ میں اپنی گاڑی میں اس کے احاطے کے متوازی آگے تک گیا پھر پیدل چل کر اس کے جنگلے تک پہنچا اور اس پر سے جھک کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ اپنی بالکونی پر کھڑا تھا اور اگر میں زور سے چلاتا تو وہ

Scanned with CamScanner

میری آواز سن سکتا تھا۔ چاروں طرف اخباری رپورٹر کھڑے سن رہے تھے، میں چلّا کر اس سے بات کر رہا تھا اور وہ چلّا کر میری بات کا جواب دے رہا تھا۔ اس وقت فرانسیسی سفیر بھی وہاں موجود تھا اور اس نے فوری طور پر اس قصّے کو رومیو جولیٹ کی طرز کی سفارت کاری کا نام دے دیا۔ سوانا ایک حقیقی محبِ وطن تھا جس پر ایک طرف سے شدید کمیونسٹ مخالف امریکیوں اور لاؤسی فوج کے دائیں بازو کے گروہ کا اور دوسری طرف سے ویت منہ اور پاتھٹ لاؤ کا دباؤ پڑ رہا تھا۔ یہ دونوں فریق مناسبت پر راضی ہو کر سمجھوتے کر لیتے اور پھر لاؤس پر اپنی بالادستی قائم کرنے کی کوشش میں بڑی ڈھٹائی سے ان سمجھوتوں کو نظر انداز کر دیتے۔ "اس زمانے میں غیر جانب داری کچھ زیادہ فیشن ایبل تصور نہیں تھا۔" سوانا پھوما کے بیٹے شہزادہ پانیا سوانا پھوما نے بینکاک میں، جہاں وہ تجارتی کنسلٹنٹ کے طور پر کام کرتا ہے، مجھے ایک انٹرویو کے دوران بتایا۔ "مسئلہ یہ تھا کہ کسی کو لاؤس کی کوئی پروا نہ تھی۔ ہمارا ملک کئی سرحدوں کے درمیان واقع ہے، اور ہر فریق سمجھتا تھا کہ اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ امریکیوں کا طرزِ عمل کچھ ایسا تھا جیسے وہ بالکل اندھے ہوں۔ لاؤس کے مسائل اور امریکیوں کے ردِ عمل کے درمیان قطعی کوئی مطابقت نہ تھی۔"

جس وقت وینتیان میں سیاسی کشمکش جاری تھی اور دیہی علاقے پر امریکی بمباری ہو رہی تھی، پاتھٹ لاؤ کے رہنما سام نیوا صوبے کے غاروں میں بیٹھے صبر سے اس موقعے کے منتظر تھے جب وہ کوئی فیصلہ کن اقدام کر سکیں۔ ۱۹۷۵ کے موسمِ گرما میں، یہ بھانپ کر کہ پاتھٹ لاؤ جلد ہی پورے لاؤس پر کنٹرول حاصل کر لیں گے، برطانوی سفیر ایلن ڈیوڈسن نے ہوائی جہاز میں سام نیوا جا کر ایک پوری متبادل حکومت کو غاروں کے ایک سلسلے میں کام کرتے پایا۔ "میں وہاں جانے والا پہلا غیر کمیونسٹ مہمان تھا،" اس نے مجھے ایک ٹیلی فون انٹرویو میں لندن سے بتایا۔ "مجھے کیسون اور دوسرے نمایاں لیڈروں سے ملنے کی بہت امید تھی جن سے میری ملاقات پہلے نہیں ہوئی تھی، مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہاں ایک طرح کا ہوٹل غار تھا جہاں سے نکل کر ہم ایک اسپتال غار میں گئے اور وہاں سے ایک تھیٹر غار میں جہاں مجھے ایک پاتھٹ لاؤ رقاصہ کے ساتھ ناچنا بھی پڑا۔ سوپھانوونگ کا غار بڑی نفاست سے آراستہ تھا اور وہاں قالین، بک کیس اور ایسے صوفے اور کرسیاں تھیں جنھیں اس خطے میں عمدہ خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن ہوٹل غار میں محض ضرورت کی

چیزیں تھیں، بغیر شیڈ کا ایک بلب اور باہر لگا ہوا ٹھنڈے پانی کا نلکا۔ رات دس بجے سے کرفیو لگ جاتا تھا اور نو بج کر پچپن منٹ پر پاتھٹ لاؤ کے وزیرِ خارجہ نے ہمیں اطلاع دی کہ وقت صرف کرنے کے لیے ہمارے پاس صرف چار منٹ ہیں کیوں کہ ٹھیک دس بجے بتیاں بجھا دی جائیں گی۔ یہ کچھ کچھ پاگل پن کا اور غیر حقیقی سا ماحول تھا۔"

۱۹۷۵ کے آتے آتے لاؤس ایک تباہ شدہ ملک بن چکا تھا۔ تعلیم، صحت، سڑکیں اور مواصلات ایسے شعبے تھے جن پر برسوں سے کوئی توجہ نہیں دی گئی تھی اور وینتیان جنگ کے زمانے کی گرم بازاری کی بدولت گزر بسر کر رہا تھا اور یہ گرم بازاری ویت نام کے تنازعے کے خاتمے کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔ امریکی بمباری کا نشانہ بننے والے پورے صوبے ملبے کا ڈھیر بنے پڑے تھے۔ برسوں کی زر پرستی، بدعنوانی اور بیرونی طاقتوں کی شہ پر ہونے والی گروہ بندی کے بعد مختلف سیاسی خیالات کے حامل لوگوں نے پاتھٹ لاؤ کے اقتدار سنبھالنے کا خیر مقدم کیا۔ خون ریزی کے بغیر آنے والے اس انقلاب سے پہلی بار یہ ظاہر ہوا کہ پاتھٹ لاؤ، ویت نام کے ساتھ اپنے قریبی تعلقات کے باوجود، خالص لاؤسی حل نافذ کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں — اور اس موقعے پر یہ حل ایک ایسی حکومت کے قیام کی صورت میں سامنے آیا جو اپنے اندر تحمل اور غیر جارحانہ انداز کی وہی خصوصیت رکھتی تھی جن کی بدولت لاؤس اپنے ہمسایہ ملکوں میں ممتاز ہے۔ جو کچھ پیش آیا وہ نہایت غیر معمولی تھا: سوانا پھوما کی حکومت کو معزول کرنے اور شاہی خاندان کو کالعدم قرار دینے کے بعد پاتھٹ لاؤ نے شہزادے اور اس کے ساتھیوں کو نہ تو قتل کیا اور نہ جلاوطن، یہاں تک کہ انھیں جیل میں بھی نہیں ڈالا۔ بجائے اس کے انھوں نے شہزادہ سوانا پھوما اور بادشاہ ساوانگ وتھانا کو مشیروں کے طور پر اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ اور ریاست ہائے متحدہ امریکا کو، جس نے کمیونسٹوں کے زیرِ قبضہ علاقوں پر نو برس تک شدید بمباری کی تھی، دعوت دی گئی کہ وہ وینتیان میں اپنے سفارت خانے کی عمارت کو سنبھال لے۔ پاتھٹ لاؤ کے رویے کی یہی لچک ایک بار پھر اس وقت ظاہر ہوئی جب ملکی معیشت کا رخ تبدیل کرنے کا وقت آیا۔

اکثر بیانات کی رو سے سوانا کا عہدہ محض برائے نام نہیں تھا۔ ۱۹۷۷ میں نیویارک ٹائمز نے رپورٹ دی کہ ۷۶ سالہ سابق وزیرِ اعظم اب بھی اپنی پرانی قیام گاہ میں سکون سے رہ رہا ہے اور کبھی کبھی سفارت کاروں کی دعوتوں میں بھی شریک ہوتا ہے، اور مزید یہ کہ "اپنے

Scanned with CamScanner

خاندان کی جانب سے پڑنے والے دباؤ کے باوجود، کہ وہ ان کے پاس پیرس چلا آئے، اس نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ حکومت نے، جو اس کے ساتھ احترام سے پیش آتی ہے، اسے خصوصی مشیر کا عہدہ دے رکھا ہے اور وہ کابینہ کے ماہانہ اجلاسوں اور دوسری سرکاری تقریبوں میں شرکت کرتا ہے۔ جب ۱۹۸۳ میں اس کا انتقال ہوا تو اس کی مکمل سرکاری طور پر تدفین ہوئی اور جنازے میں خود کیسون نے بھی شرکت کی جو ویسے کبھی کبھار ہی منظر عام پر آتا تھا۔ بادشاہ البتہ اتنا خوش قسمت نہ تھا۔ ۱۹۷۷ میں حکومت نے اس خوف سے کہ تھائی بارڈر کی طرف سے آنے والے باغی کہیں اسے اپنی بغاوت کا مرکز نہ بنا لیں، کیونکہ بیشتر لاؤسی عوام اس کا احترام کرتے تھے، شاہی خاندان کو اندرون ملک جلاوطن کر کے سام نیوا صوبے میں بھیج دیا۔ شمال مشرقی علاقے کے پہاڑی جنگلوں کے دشوار ماحول میں بادشاہ اور ملکہ چل بسے۔ ان کی موت کی تفصیل سے کوئی واقف نہیں، اور اس موت کی تصدیق بھی حکومت کی جانب سے ۱۹۹۰ میں کی گئی۔ جب میں نے لوانگ پرابانگ میں واقع شاہی محل کا دورہ کیا تو ایک گائیڈ، جو مجھے بادشاہ کی زندگی کے قصے بہت خوش ہو ہو کر سنا رہا تھا، جب میں نے اس سے بادشاہ کی موت کے بارے میں سوال کیا تو گھبرا کر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ اسی طرح آج تک یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ ولی عہد شہزادہ وونگ ساوانگ کا کیا انجام ہوا۔

دو اور معاملے بھی ایسے تھے جو ویسی حل تلاش کرنے پر پاتھٹ لاؤ کی آمادگی کے دائرے سے باہر رہے: اول، سابق حکومت کے فوجی افسروں اور دفتری اہلکاروں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے، اور، دوم، اس معیشت کو کیوں کر سنبھالا جائے جو جنگ کے باعث تباہ ہو چکی ہے۔ ان دونوں معاملات میں پاتھٹ لاؤ نے وہی طرز عمل اختیار کیا جس کی نظیر اس سے پہلے آزادی کی کمیونسٹ تحریکوں نے قائم کی تھی۔ اس کے نتیجے میں ملک کو شدید نقصان پہنچا اور متعدد ایسے مسائل پیدا ہوئے جن سے نجات کے لیے لاؤس اب تک جدوجہد کر رہا ہے۔

نیا صدر سوپھانوونگ، اپنی فرانسیسی تعلیم اور اپنے بین الاقوامیت پسند طرز فکر کی بدولت لاؤس کو نسبتاً معتدل سیاسی راستے پر رکھ سکتا تھا، جس کے نتیجے میں ملک کو مغربی امداد کی فراہمی ممکن ہو سکتی تھی۔ لیکن ابتدا ہی سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اصل طاقت نئے وزیر اعظم کیسون کے پاس ہے — وہ ۵ دسمبر ۱۹۷۵ کو ایک استقبالیہ میں ظاہر ہوا اور ۱۹۵۸ کے بعد سے یہ پہلا

موقع تھا کہ لوگوں نے اسے دیکھا — اور یہ کہ سوپانوونگ کا عہدہ تقریباً رسمی نوعیت کا ہے۔ سابق برطانوی سفیر ڈیوڈسن کے نزدیک سوپانوونگ کو سونپا جانے والا کردار منطقی طور پر درست تھا کیوں کہ یہ باذوق اور مغرب سے متاثر شخص ویت منہ اور پاتھٹ لاؤ کے دوسرے رہنماؤں سے بے حد مختلف تھا جن کے نقطۂ نظر کی تشکیل پہاڑوں اور جنگلوں میں برسوں تک صعوبتیں اٹھانے سے ہوئی تھی۔ کوئی ایسا کمیونسٹ ملک کیسے ہو سکتا ہے جس پر شہزادوں اور پیرس کے پڑھے ہوئے حکمران طبقے کا تسلط ہو، ڈیوڈسن نے کہا۔

کیسون اور دوسرے پاتھٹ لاؤ رہنماؤں نے فوری طور پر دو سنگین غلطیاں کیں۔ پہلی یہ کہ انھوں نے تیس سے چالیس ہزار افراد کو گرفتار کر کے اصلاحی کیمپوں میں بھیج دیا جن میں بہت سے سرکاری اہلکار اور لاؤس کی شاہی فوج کے افسر شامل تھے۔ اس اقدام اور لاؤس کے اعلیٰ طبقے کے افراد کی بڑی تعداد کے دریائے میکانگ کے راستے تھائی لینڈ فرار ہو جانے کے باعث ملک ایسے لوگوں سے محروم ہو کر رہ گیا جو معیشت کو سنبھالنے اور سرکاری اداروں کا انتظام چلانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ امریکا میں میری ایک ایسے شخص سے بات ہوئی جسے اسی قسم کے ایک کیمپ میں بھیجا گیا تھا۔ (وہ شخص سیاسی پناہ حاصل کرنے کی درخواست دے رہا ہے اس لیے نہیں چاہتا کہ اس کا نام ظاہر کیا جائے۔) یہ شخص، جو روانی سے فرانسیسی بولتا ہے، ۱۹۶۰ سے ۱۹۷۵ تک لاؤس کی شاہی فوج میں کرنل رہا تھا۔ پاتھٹ لاؤ نے سو اعلیٰ ترین فوجی افسروں کو اپنے مقاصد کے بارے میں ایک فلم دکھانے اور ان سے بات چیت کرنے کے لیے اپنے علاقائی ہیڈکوارٹر میں بلایا تھا، اس کا کہنا ہے۔ انھوں نے باقاعدہ سرکاری دعوت نامے بھیجے تھے۔ لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو پاتھٹ لاؤ سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہمیں ملک کے شمالی حصے میں لے جایا جا رہا ہے تاکہ ملک کو درپیش صورتِ حال پر بات چیت کی جا سکے، اور یہ کہ وہاں لوگ بڑی تعداد میں ہمارے خیر مقدم کے لیے پھول لیے کھڑے ہوں گے۔ ہمیں طیارے میں سوار کرا کے سام نیوا صوبے میں پہنچایا گیا جہاں ویت نامی سرحد کے قریب ایک کیمپ واقع تھا۔ اس کے ارد گرد جنگلا تو نہیں تھا، لیکن وہ ایک پہاڑی علاقہ تھا جس کے ایک طرف دریا تھا اور باہر نکلنے کے واحد راستے پر پہرے دار متعین تھے۔ انھوں نے ہم سے فوجی یونیفارم لے کر ہمیں شہری لباس دے دیا، اور پھر ہمیں ہر سال کپڑوں کا ایک جوڑا ملنے لگا۔ ہمیں اپنے سائبان بنانے کے لیے

Scanned with CamScanner

شاخیں کاٹتی پڑتیں اور سونے کے لیے ہم نے کیلے کے پتوں سے بستر بنائے۔ دوائیں نہیں تھیں؛ بہت سے لوگ ملیریا سے مر گئے۔ ہر صبح پانچ بجے گھنٹیاں بجتیں اور ہر ایک کو اس کا اس دن کا کام سونپ دیا جاتا — چاول پکانا، لکڑی کاٹنا، کھیتوں میں کام کرنا۔ غروب آفتاب کے وقت ہم کھانا کھاتے اور پھر دائروں کی شکل میں بیٹھ کر سابق حکومت کی خامیوں پر بات چیت کرتے اور خود اپنا تنقیدی جائزہ لیتے۔ جسمانی تشدد نہیں کیا جاتا تھا، لیکن نفسیاتی طریقے بہت سے تھے، بے سروپا قواعد وضوابط جن کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ہمیں کنٹرول کیا جائے۔ وہ ہمیں گھر والوں کے نام خط لکھنے دیتے، مگر پھر انہیں خود پڑھتے تاکہ جان سکیں کہ ہم کیا سوچ رہے ہیں، اور یہ خط کبھی آگے نہ بھیجتے۔ میں نے ۱۹۸۷ تک بارہ سال کیمپ میں گزارے۔ اس عرصے میں مجھ سے نہر کھودنے اور اسکول کی عمارت بنانے کا کام لیا گیا اور بھینس کی طرح ہل میں بھی جوتا گیا۔"

اصلاحی کیمپ میں بھیجے جانے کے خیال سے گھبرا کر لاکھوں لاؤسی باشندے ملک سے فرار ہو گئے۔ ۱۹۷۵ کے بعد سے تین لاکھ تینتالیس ہزار لاؤسی — یعنی ملک کی کل آبادی کا تقریباً دس فیصد — تھائی لینڈ میں خود کو پناہ گزیں کی حیثیت سے رجسٹر کرا چکے ہیں۔ نئی حکومت کو چلانے والے کوئی اعلیٰ مہارت رکھنے والے لوگ نہیں بلکہ اُن علاقوں سے آنے والے ہزاروں کارکن تھے جن پر پاتھٹ لاؤ کا کنٹرول رہا تھا۔ "غاروں سے باہر آنے پر پاتھٹ لاؤ اس بات سے تو پوری طرح واقف تھے کہ گوریلا جنگ کس طرح لڑی جاتی ہے، لیکن اس بات کا انہیں ذرہ برابر اندازہ نہ تھا کہ ملک کیوں کر چلایا جاتا ہے،" وینتیان میں مقیم ایک مغربی امدادی ادارے کے اہلکار نے مجھے بتایا۔ جس طرح فرانسیسی نوآبادیاتی زمانے میں ہوا تھا، لاؤسی حکومت کا انتظام چلانے کے لیے عملہ ویت نام سے لایا گیا — فرق صرف یہ تھا کہ اس بار لائے جانے والے ویت نامی نظریاتی طور پر بالکل مختلف گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں، چالیس ہزار سے زیادہ ویت نامی فوجیوں کو لاؤس میں تعینات کر دیا گیا۔ پاتھٹ لاؤ نے ایک ایسے ملک کا اقتدار سنبھالا تھا جو دولت اور وسائل سے مکمل طور پر محروم تھا۔ سابق حکومت اپنے ۸۰ فیصد بجٹ کے لیے بیرونی امداد پر انحصار کرتی تھی، جو بیشتر امریکا سے آتی تھی؛ اب یہ امداد بند ہو چکی تھی اور ملک سے فرار ہونے والے ہر ایسی چیز اپنے ساتھ لیے جا رہے تھے جسے کسی بھی طرح نقد رقم میں تبدیل کیا جا سکتا ہو۔ فی کس سالانہ آمدنی کے نوے ڈالر سے بھی کم اوسط والے اس ملک میں شدید قلتوں اور سخت افراطِ زر کا مقابلہ

کرنے کے لیے پاتھٹ لاؤ حکومت اسٹالنسٹ نظام قائم کرنے میں جٹ گئی: زراعت میں اجتماعی طریقہ اختیار کیا گیا، ملک میں جو ذرا سی صنعت تھی اسے نیشنلائز کر لیا گیا اور قیمتوں اور معیشت کے دوسرے پہلوؤں پر مرکزی کنٹرول عائد کر دیا گیا۔ حکومت نے واضح کر دیا کہ وہ زندگی کے ہر شعبے کو ضوابط کے تحت لانا چاہتی ہے۔ لمبے بالوں والے نوجوانوں کو حجامت کرانے کی ہدایت کی جاتی؛ عورتوں سے کہا گیا کہ وہ دیسی وضع کا روایتی لمبا اسکرٹ پہنیں؛ ہر شخص کے لیے ضروری تھا کہ اپنا کام ختم کر کے شام کو اور چھٹی کے دن چاول اور سبزیوں کی اجتماعی کاشت میں حصہ لے اور بچوں کو فرانسیسی کے بجائے لاؤسی زبان کی تعلیم دی جانے لگی۔ 'اب قوانین کو نافذ کیا جانے لگا ہے' ۱۹۷۶ میں 'نیویارک ٹائمز' نے اطلاع دی۔ 'اب کوئی شخص اپنی کار کے دروازے کو مقفل نہیں کرتا۔ ٹریفک تک کے اصول بنا دیے گئے ہیں، اور لوگ ان کی پابندی کرنے لگے ہیں۔ اگر کوئی ان کی خلاف ورزی کرتا ہوا پکڑا جائے تو اس کی کار بھی ضبط کر لی جاتی ہے۔'

پھر وینتیان شہر، اسی پاتھٹ لاؤ قیادت کے تحت، بے مہار آزاد تجارت، دندناتی ہوئی موٹر سائیکلوں اور پرہجوم ڈسکوتھیک والے موجودہ شہر میں کیوں کر منقلب ہو گیا؟ لاؤس کے بارے میں سوال اٹھانے والے کسی بھی شخص کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ حکومت سے کسی بات کا سیدھا جواب حاصل کرنا آسان کام نہیں۔ کسی سرکاری اہلکار سے ملاقات کرنا تک سخت دشوار ہے، کیوں کہ لاؤس میں کسی اور شے کی قلت ہو تو ہو، دم گھونٹ دینے والے دفتری طور طریقے بے حد وافر مقدار میں ہیں۔ ہر سرکاری عمل سخت جامد ضابطوں کے تحت انجام دیا جاتا ہے؛ مثال کے طور پر اپنے جوہی جنوب ٹرپل کے سفر کے دوران مجھے نہ صرف ایک سرکاری ترجمان اور ڈرائیور کی، بلکہ سواناکھیت صوبے کے انتظامی اور اطلاعاتی شعبوں کے ایک ایک اہلکار کی بھی ہمراہی برداشت کرنی پڑی، اور ایک محافظ ان سب کے علاوہ تھا۔ (لاؤسی طریقے کے عین مطابق، یہ محافظ کیمرے کے سوا کسی چیز سے مسلح نہ تھا۔ وینتیان شہر تک میں پولیس یا فوج کی موجودگی کا کوئی سراغ پانا دشوار ہے۔) کسی سرکاری اہلکار سے میرا پہلا انٹرویو درخواستیں دینے اور سوالات جمع کرانے کے مہینہ بھر طویل عرصے کے بعد ممکن ہوا؛ میرے سوالات متعلقہ وزارتوں کو بھیجے جاتے جہاں انھیں غالباً اس امید میں نظر انداز کر دیا جاتا کہ مسئلے پر توجہ نہ دی جائے تو وہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ میرا ترجمان، جو میری طرف سے یہ مذاکرات کر رہا تھا، ہر صبح مایوسی سے اپنا سر ہلاتی

میں جلتا اور مذکورہ وزیر کے بارے میں کہتا، "وہ بہت مصروف آدمی ہیں۔" ایک موقعے پر اس نے ملاقاتوں کا ایک بہت متاثر کن چارٹ تیار کیا جس میں ہر اہلکار سے میری ملاقات کا وقت درج تھا۔ تاہم، اب تک کسی بھی وزیر نے ملاقات کی درخواست کا جواب نہیں دیا تھا! یہ چارٹ مکمل طور پر ترجمان کے تخیل کی نمائندگی کرتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ سرکاری اہلکاروں سے ملاقات کے سلسلے میں صرف صحافیوں ہی کو دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ وینتیان کے ایک سوویت سفارت کار نے مجھے بتایا، "سوویت سفیر کو، کیسون سے نہیں بلکہ صرف ایک اول نائب وزیر سے ملنے کے سلسلے میں کئی کئی دن بلکہ ایک ایک ہفتہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ سب لوگ بہت مصروف ہیں۔ کس کام میں مصروف ہیں یہ کوئی نہیں جانتا، مگر ہیں بہت مصروف۔ کوئی شخص ذمے داری اپنے سر نہیں لینا چاہتا۔ ہاں ... سوچیں گے ... دیکھتے ہیں ... بس یہی ہوتا رہتا ہے۔"

کسی سرکاری افسر کی ماہانہ تنخواہ بس اتنی ہے کہ کار کی ٹنکی میں دو ایک بار پٹرول بھروایا جا سکے۔ میرا ترجمان، جو لاؤسی حکومت کی طرف سے نیویارک، ہندوستان اور آسٹریلیا میں خدمات انجام دے چکا تھا اور اچھا خاصا مقام رکھتا تھا، بیس ڈالر ماہانہ کی تنخواہ میں اپنا، اپنی بیوی اور دو بچوں کا پیٹ پال رہا تھا۔ اول نائب وزیر مہینے میں چالیس ڈالر سے زیادہ نہیں پاتا، یعنی تقریباً اتنی رقم جو کسی نجی پرائیویٹ ہوٹل کا کلرک بھی کما لیتا ہے، لیکن اسے سرکاری مکان اور گاڑی ملتی ہے۔ کھاسائی سوپھانووانگ نے، جو اقتصادیات، منصوبہ بندی اور خزانے کی وزارت میں دوسرے درجے کا افسر ہے، مجھے بتایا، "کارخانے کے مزدور اب مجھ سے زیادہ تنخواہ پاتے ہیں، جبکہ میں پورے ملک کے اقتصادی معاملات کی نگرانی کرتا ہوں۔ میں بازار سے چیزیں خرید کر خود کھانا پکاتا ہوں، اور ریستوراں میں صرف اُس وقت جاتا ہوں جب مجھے کوئی سرکاری فرض انجام دینا ہوتا ہے۔ لیکن جنگ کے دنوں میں، جب ہم جنگل میں تھے، کسی کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ کئی سال تو ایسے تھے کہ ہمیں نمک تک نہیں ملتا تھا۔ ہمیں اپنے ملک کے لیے قربانیاں دینی پڑی ہیں۔" بعض سرکاری افسر دوسری ملازمت کر کے اپنا خرچ پورا کرتے ہیں — اور یہ دوسری ملازمت عموماً سرکاری وقت میں کی جاتی ہے — یا پھر اپنے مکانوں کے احاطوں میں سبزیاں اگاتے ہیں اور مرغیاں اور سوّر پالتے ہیں۔ ایک مغربی سفارت کار نے مجھے بتایا کہ اس نے ایک بار ایک سرکاری افسر کو دفتر جانے سے پہلے بازار میں شہر کے انڈے بیچتے دیکھا تھا۔ جن لوگوں کا

Scanned with CamScanner

طریقی موش شمنٹ پرے لاے ان کے لیے نئی نئی آزاد ہونے والی معیشت میں بدعنوانیوں کے بہت سے مواقع ہیں۔ بینکاک میں میری ملاقات ایک تھائی تاجر سے ہوئی جس کی کمپنی اپنی مصنوعات ویت نام اور کمبوڈیا میں فروخت کرتی ہے، لیکن لاؤس سے تجارت کرنے پر راضی نہیں۔ میں نے ایک لاؤی افسر کو دس ہزار تھائی بھات (یعنی چار سو ڈالر) رشوت دی۔ اس نے پیسے تو لے لیے اور میرا کام بھی نہیں کیا، اس نے شکایت کی۔ ویت نام اور کمبوڈیا میں بھی ہمیں سرکاری افسروں کو رشوت دینی پڑتی ہے لیکن وہ کم از کم ہمارا کام تو کر دیتے ہیں۔

قلیل تنخواہوں کے علاوہ کام کے حالات بھی نہایت مایوس کن ہیں۔ سرکاری عمارتیں بہت بوسیدہ اور غلیظ ہیں، کیوں کہ صفائی اور مرمت کا عملہ سرے سے مفقود ہے؛ ملازمین سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہر سنیچر کی صبح اپنے دفتر خود صاف کریں گے۔ ممتاز عہدوں پر فائز اکا دکا افراد کے پاس استقبالیہ کلرک یا سیکرٹری ہیں، اور وزارت خارجہ سے تعلق رکھنے والے میرے ترجمان تک کو ان لوگوں کے دفاتر تلاش کرنے میں دشواری ہوتی تھی جن سے میں ملنا چاہتا تھا۔ اگر ہم کسی مطلوبہ اہلکار تک پہنچ بھی جاتے تو انٹرویو ایک لیکچر کی صورت اختیار کر لیتا جس میں مداخلت کرنے کی مجھے اجازت نہ تھی۔ زراعت اور جنگلات کے نائب وزیر کھام ہوآن بوپھا نے میرے پہلے سوال کا جواب دینے میں پینتالیس منٹ لگائے۔ وہ دھات کے تار کے فریم والا چشمہ پہنے ایک سخت گیر آدمی دکھائی دیتا تھا؛ اس نے میرے ترجمان کو نظر انداز کر کے اپنے ترجمان کی خدمات حاصل کی تھیں اور ترجمانی کے دوران مستقل مجھ پر نظر جمائے رکھتا تھا۔ اگر میں ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نگاہ ہٹاتا تو وہ مجھے میری نوٹ بک کی طرف متوجہ کر کے انگوٹھے اور انگلی کے اشارے سے لکھنے کی ہدایت کرتا۔ میرے سوالات عموماً نئی آزاد ہونے والی معیشت کے بارے میں ہوتے تھے، اس لیے اس قسم کی بات چیت میں اعداد و شمار کا ہونا ناگزیر تھا، اور انھیں سن کر مجھے مغربی سفارت کاروں کا انتباہ یاد آ جاتا کہ لاؤس میں سرکاری اعداد و شمار نہایت ناقابلِ اعتبار ہیں۔ ایک اعلیٰ سرکاری اہلکار نے مجھے بتایا کہ لاؤس میں بیرونی سرمایہ کاری کی مالیت اب تک سو ملین ڈالر ہو چکی ہے؛ اس کے محکمے کے دوسرے افسر نے یہ مالیت ستر ملین ڈالر بتائی؛ اور ایک مغربی سفارت خانے نے لاؤس کی معیشت کے بارے میں اپنی ایک تازہ تحقیق کے مطابق بتایا کہ اصل مالیت پانچ ملین ڈالر کے لگ بھگ ہے۔ سوانا کھیت میں، جو میلوں پر پھیلا ہوا گنجان آباد شہر ہے، ایک

مقامی افسر کا اصرار تھا کہ یہاں کی آبادی صرف بیس ہزار ہے؛ وینتیان میں مقیم غیر ملکیوں کے اندازے کے مطابق اس شہر کی آبادی ستر ہزار سے کم نہیں ہے۔

تاہم، ان انٹرویوز سے کچھ نہ کچھ سراغ ضرور ملا کہ معاشی تبدیلی کا یہ لاؤسی روپ کس طرح وجود میں آیا۔ کئی سرکاری اہلکاروں کی وضاحت میں کسی نہ کسی طرح ایک بات ضرور کہی جاتی تھی: صدیوں کے عمل میں، جب لاؤسیوں کو کسی نہ کسی بیرونی طاقت کا محکوم بن کر رہنا پڑا، انھوں نے اپنا بچاؤ ہنی فکر کا رخ اندر کی طرف موڑ کر کیا ـــــ یعنی انھوں نے اپنے قومی شناخت کے شدید احساس کو قدیم بودھ عقیدے سے آمیخت کر لیا۔ اس طرح ہر کام کو انجام دینے کا مخصوص لاؤسی طریقہ وضع ہوا۔ پاتھٹ لاؤ کے دو اقدامات ایسے تھے جنھیں جوں کا توں ویت نامی کمیونسٹوں سے مستعار لے لیا گیا تھا ـــــ اسٹالنسٹ معاشی پالیسی اور اصلاحی کیمپوں کا قیام ـــــ اور یہ دونوں اقدامات آخر میں ناقابلِ عمل ثابت ہوئے۔ چناں چہ پاتھٹ لاؤ رہنماؤں کو، ہنی جادہ، آمرانہ شہرت کے باوجود، بڑی لچک کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ جو کچھ پیش آیا اس کی بہترین وضاحت ایک کلیدی معاشی منصوبہ ساز اور لاؤسی رہنماؤں میں سے غیر معمولی طور پر عمدہ گفتگو کرنے والے سومسپاوان انتھووونگ نے کی۔ 'اپنا وجود قائم رکھنے کے لیے ہمیں ایک نہایت ایشیائی قسم کے فلسفے کی ضرورت ہوتی ہے،' اس نے کہا۔ 'ہمیں ان پیڑوں جیسا ہونا پڑتا ہے جو منہ زور ہواؤں کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ جب تاریخ کی قوتوں نے ہمیں اس حد تک جھکا دیا کہ ہمیں ٹوٹنے کا خطرہ دکھائی دینے لگا، تب ہم نے خود میں تبدیلی پیدا کی۔ نئی حکومت کے پہلے دس برسوں میں ہم نے بہت سی غلطیاں کی ہیں، کیوں کہ ہمارا اپنا تجربہ صفر تھا اور ہم بڑے ملکوں کی نقالی کر رہے تھے۔ لیکن جب کبھی ہم اپنے انداز میں کام کرتے ہیں تو نتائج بہتر ہوتے ہیں۔ کسی اور ملک کی نقالی کرنے کا مطلب اس حقیقت سے انکار کرنا ہے کہ ہم ترقی کے ایک مختلف مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے ملک کا رقبہ مغربی جرمنی کے برابر ہے جب کہ آبادی اس کے صرف سات فیصد جتنی ہے۔ ہم ممکنہ طور پر چالیس لاکھ ہیکٹیئر زمین پر کاشت کر سکتے ہیں، لیکن اس وقت صرف چار لاکھ ہیکٹیئر رقبہ زیرِ کاشت ہے۔ پچھلے سال ہماری چاول کی پیداوار ہماری ضرورت کے بالکل مساوی تھی، لیکن ہم اسے آبادی میں یکساں طور پر تقسیم نہ کر سکے۔ اس کے لیے سڑکیں کہاں ہیں؟ جنوبی لاؤس سے چاول کو شمالی حصے تک پہنچانا اس سے کہیں زیادہ مہنگا ہے کہ تھائی لینڈ سے

Scanned with CamScanner

چاول درآمد کر لیا جائے۔ لہذا ہماری معیشت میں آنے والی تبدیلی کا بڑا سبب ہماری داخلی ضروریات ہیں۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ داخلی اسباب کے علاوہ لاؤس کو بیرونی دنیا کی اقتصادی اور سیاسی صورتِ حال کے اثرات بھی پڑے ہیں۔ لاؤس میں آپ ہر روز تھائی ٹی وی اور سی این این کی رنگین نشریات دیکھ سکتے ہیں۔" حکومت کے رویئے کی موجودہ لچک کو واضح کرنے کے لیے سومپاوان نے کہا، "ابھی آپ سے پہلے جو شخص مجھ سے ملنے آیا تھا وہ پرانی حکومت میں نائب وزیر اعظم رہا تھا اور انتہائی دائیں بازو سے تعلق رکھتا ہے۔ تمام ملکوں کو اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنی پڑتی ہے۔ بس ہمارا کام کرنے کا طریقہ، لاؤسی طریقہ، دوسروں سے مختلف ہے۔

جیسا کہ لاؤس میں ہونے والے ہر بڑے فیصلے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے، معاشی اصلاحات کے فیصلے میں بھی مرکزی کردار کیسون نے ادا کیا۔ "وہ واقعی بہت مصروف ہے، کیوں کہ وہی تمام اہم معاملات میں فیصلے کرتا ہے،" سوویت سفارت کار نے مجھے بتایا۔ (وینتیان میں مقیم بیشتر سفارت کار انٹرویو دینے پر رضامند ہو گئے، لیکن سب نے شرط لگا دی کہ ان کے نام ظاہر نہ کیے جائیں۔) "یہ بات کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے، اور اسی باعث لاؤس بہت سے میدانوں میں پیچھے رہ گیا ہے۔ کیسون لوگوں سے کام نہیں لے پاتا۔ یہ یہاں کا ایک بڑا مسئلہ ہے: اقتدار اب بھی پرانی نسل کے افراد کے پاس ہے۔" گول بھرے بھرے چہرے اور کنپٹیوں پر سے غائب ہوتے کھچڑی بالوں والے کیسون نے، جو اپنے انداز کے باعث ممتاز دکھائی دیتا تھا، اُسی خفیہ اندازِ کار کو قائم رکھا جسے اس نے سام نیوا کے غاروں میں وضع کیا تھا۔ ۱۹۸۹ میں جاپان اور فرانس کا دورہ کرنے سے پہلے تک اس نے سوویت بلاک اور تھائی لینڈ کے علاوہ کہیں بیرونِ ملک قدم نہیں رکھا تھا۔ وہ شاذونادر ہی انٹرویو دیتا تھا، اور اس سے انٹرویو کرنے کے سلسلے میں میری بار بار کی درخواست ہر بار ایک ہی عذر کے ساتھ مسترد کی جاتی رہی: "وہ بہت مصروف آدمی ہیں۔" اگرچہ کیسون کبھی امریکا نہیں گیا، اس کا مکان بالکل امریکی طرز کا نمونہ تھا۔ پاتھٹ لاؤ کے کئی دوسرے اعلیٰ رہنماؤں کی طرح وہ بھی وینتیان کے نواح میں کلومیٹر ۶ نامی امریکی طرز کی بستی میں رہتا تھا جس میں رینچ کی قسم کے مکانات ہیں جو امریکیوں نے ویت نام کی جنگ کے دوران تعمیر کیے تھے۔ (کلومیٹروں کی گنتی دریائے میکانگ کے کنارے واقع صدارتی محل سے شروع ہوتی ہے۔) اس محلے تک بڑی ہائی وے سے نکلنے والی آدھ میل لمبی سڑک کے ذریعے پہنچ

Scanned with CamScanner

جاتا ہے۔ جب مجھے اس موڑ پر پہرے دار دکھائی نہ دیے تو میں نے اپنے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا کہ مجھے کنارے پر اتار دے اور میں جہاں تک ہو سکا پیدل جا کر دیکھوں گا۔ اگرچہ پچھلے موقعوں پر اس نے ویئنتیان کے مختلف علاقوں میں لے جانے میں خاصی دلیری دکھائی تھی، اس بار میری بات سن کر اس نے رفتار دھیمی کرنے تک سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اگر ہم نے ایسا کیا تو اسے گرفتار کر لیا جائے گا۔

کئی لوگوں کے بیانات سے معلوم ہوا کہ کیسون خاصا بیدار مغز شخص ہے۔ "میں اس سے بہت دفعہ مل چکا ہوں،" سوویت سفارت کار نے کہا۔ "وہ بہت ہوشیار آدمی ہے۔ اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ ہر کسی سے سیکھنے کو تیار رہتا ہے۔ اسے اپنی غلطیوں کا اعتراف ہے، اور وہ جانتا ہے کہ اس ملک کی تعمیر کے لیے کیا کیا جانا چاہیے۔" معلوم ہوتا تھا کہ کیسون کو ہر قسم کے موضوعات پر عبور حاصل ہے۔ ۱۹۹۰ میں جب اس نے لاؤسی صحافیوں کی ایک کانفرنس سے خطاب کیا تو اس کی تقریر پورے دن جاری رہی، صرف کھانے کے لیے اس میں وقفہ کیا گیا۔ اس نے ملک کی معاشی پس ماندگی کو تفصیل سے بیان کیا اور اس بات کو نوٹ کیا کہ جہاں کہیں سرمایہ موجود بھی ہے، وہاں وہ یا تو ضائع کر دیا جاتا ہے یا فوری ضروریات پر خرچ ہو جاتا ہے، اور طویل میعادی منصوبوں میں نہیں لگایا جاتا۔ "چاول، دوسری خوراک، کھاد، زرعی آلات اور دیگر عام ضرورت کی چیزوں کی سخت قلت ہے،" اس نے صحافیوں کو بتایا۔ "جب کہ بیرونِ ملک سے درآمد کی گئی وسکی، بیئر، سگریٹ اور دوسری مہنگی اشیا بازار میں بھری پڑی ہیں۔"

معاشی اصلاحات کے بارے میں برسرِعام اپنے خیالات ظاہر کرنے کے قریب قریب وہ ۱۹۸۹ میں پہنچا جب اس نے ایک آسٹریلوی ماہرِ عمرانیات گرانٹ ایوز کو انٹرویو دیا۔ ایوز نے اس سے پوچھا، "آپ کی پرانی پالیسی کا کیا جواز تھا؟"

"بات یہ ہے کہ دوسرے سوشلسٹ ملکوں میں یہی کچھ کیا جا رہا تھا، اور میں سمجھتا تھا کہ میں اس طریقِ کار سے اچھی طرح واقف ہوں،" کیسون نے جواب دیا۔ "چناں چہ ہم نے یہاں بھی وہی طریقہ آزمایا۔ یہ بعض حالات میں درست ثابت ہوتا ہے اور بعض میں ناکام ہو جاتا ہے۔ پھر [۱۹۷۹ میں] ہمیں اپنی رفتار کم کرنی پڑی اور بعد میں رخ بدلنا پڑا۔" اس نے زور دیا کہ "اصل تبدیلی ۱۹۸۵ میں شروع ہوئی تھی،" اور کہا، "اسی موقعے پر ہم نے قیمت، قدر، اور زر کے

معاملات پر توجہ دینی شروع کی۔ ہم نے قیمتوں کے بارے میں زیادہ لچک دار روّیہ اختیار کر کے تجربات کیے۔۔۔ اگر ہم اشیا اور زر کے درمیان بڑے معاشی میدان میں رشتہ قائم نہ رکھ سکے تو ہمیں چین جیسے مسائل کا سامنا کرنا ہوگا۔'

باہر سے آنے والے کسی شخص کو یہ معاشی اصلاحات بے لگام سرمایہ داری معلوم ہوں گی۔ لیکن لاؤسی اہلکاروں نے ـــــ جن میں سے ایک لاؤس کے دیواری نقشے کے سامنے میں بیٹھا تھا جس پر حقابوں کی تصویر چپکائی گئی تھی ـــــ بڑے تحمل سے بتایا کہ دراصل ان اصلاحات کی تہہ میں پختہ سوشلسٹ اصول کارفرما ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ لینن کی تعلیمات کی رو سے، سوشلزم تک پہنچنے کے راستے میں آزاد تجارت کا کردار بہت اہم ہے ـــــ حقیقی سوشلزم تک پہنچنے کے لیے سرمایہ داری کے مرحلے سے گزرنا ضروری ہے، اور لاؤس اس مرحلے سے نہیں گزرا تھا۔

"کیا لاؤس کا ہدف ایک سوشلسٹ ریاست بننا ہے؟" میں نے بون اوم سوتھیچک سے دریافت کیا جو بیرونی سرمایہ کاری کی نگرانی کرنے والے افسروں میں سے ایک ہے۔

'یقیناً! لیکن اس کے لیے ہمیں وقت درکار ہے،' اس نے جواب دیا۔ "ہمیں قدم بہ قدم چلنا ہوگا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ سوشلزم کتنی دور ہے؛ اس کا انحصار بہت سے عوامل پر ہے۔

اپنے نظریاتی سازوسامان سے دست بردار نہ ہونے کی سرکاری پالیسی کا شاخسانہ دورنگی کے وہ مناظر ہیں جو آج کل ویئنتیان میں دیکھے جاتے ہیں۔ شہر کی سب سے بڑی کتابوں کی دکان میں صرف کمیونسٹ ملکوں کی مطبوعات فروخت ہوتی ہیں، جب کہ اس سے چند بلاک آگے کی دکان پر ٹیلی وژن دستیاب ہے جسے خرید کر آپ تھائی لینڈ کے چار چینل دیکھ سکتے ہیں۔ (تھائی اور لاؤسی زبانیں اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ ایک زبان بولنے والا دوسری زبان آسانی سے سمجھ لیتا ہے۔) اگرچہ لاؤس کا ٹیلی وژن اسٹیشن اب تک حکومتی پروپیگنڈا کے ترجمان کے سوا کچھ نہیں ہے، پھر بھی اس کے سیلزمین بازاروں میں تاجروں کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ وہ اشتہارات کے لیے اس ٹیلی وژن پر وقت خریدیں۔ یونیورسٹی کے طلبا کو اب بھی ڈگری حاصل کرنے کے لیے مارکسزم کا امتحان لازماً پاس کرنا ہوتا ہے، اور ایک طالب علم نے مجھے بتایا کہ ایسے زمانے میں جب حکومت اپنی ملکیت کے کارخانے پٹے پر سرمایہ داروں کے حوالے کر رہی ہے، اس کا مارکسزم کا استاد یہ تعلیم دے رہا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں کارخانے کس طرح اپنے مزدوروں

Scanned with CamScanner

کا استعمال کرتے ہیں۔

میں نے اس طالب علم سے پوچھا کہ کیا اس نے اس تضاد کی نشان دہی کی تھی۔
سوال نہیں کیا جا سکتا، اس نے جواب دیا۔ "استاد جو کچھ کہے بس اسے ذہن نشین کرنا ہوتا ہے۔"

یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ کسی افلاس زدہ ملک کے اقتصادی نظام میں اس طرح کی تبدیلی کرنے سے جس کے نتیجے میں چند لوگوں کو مالدار بننے کا موقع ملے اور آبادی کی بڑی اکثریت انتہائی غربت میں رہنے پر مجبور ہو، کچھ نہ کچھ شکایات پیدا ہوں گی، خصوصاً ایسی صورت میں جب معاشی اصلاحات کسی بنیادی نوعیت کی سیاسی اصلاحات کے بغیر کی جا رہی ہوں۔ چناں چہ میرا اندازہ تھا کہ ایسے لاؤسی باشندوں سے میری ملاقات آسانی سے ہو جائے گی جو، کم سے کم نجی گفتگو میں، اپنی حکومت پر تنقید کریں۔ لیکن مجھے ایسا کوئی بھی لاؤسی نہیں ملا۔ ایک مغربی سفارت کار نے کہا کہ اس نے کبھی حکومت کا کوئی سیاسی مخالف نہیں دیکھا، اور اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا، 'نوجوان لاؤسی کہتے ہیں: ہمیں سفر کرنے کی اجازت حاصل ہے، ہمارے پاس ڈسکو ہیں، ہمارے پاس معاشی اصلاحات ہیں۔ مجھے سیاسی تبدیلی کے لیے کوئی عوامی دباؤ دکھائی نہیں دیتا اور میرے لیے یہ تصور تک کرنا مشکل ہے کہ ایسا دباؤ کس جانب سے آ سکتا ہے۔'
ایک اور سفارت کار کا کہنا تھا، 'وائس آف امریکا رات کو ایک گھنٹے کا پروگرام نشر کرتا ہے، جسے بہت سے لوگ سنتے ہیں۔ پھر انہیں تھائی ٹی وی اور ریڈیو بھی میسر ہیں۔ چناں چہ بیج تو بویا جا چکا ہے۔ لیکن ایسی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی کہ کہیں کوئی انکھوا پھوٹ رہا ہو۔'

'لاؤس ایک مختلف ملک ہے، اس کی فکر مشرقی ہے،' ایک روسی سفارت کار نے کہا۔
"یہاں کے لوگ سیاسی طور پر نہایت صابر ہیں۔ ان کے سوچنے کا انداز یہ ہے کہ اگر ان کے پاس چاول موجود ہے تو بڑی اچھی بات ہے۔ لیکن وہ مزید چاول حاصل کرنے کے کچھ خاص خواہش مند نہیں۔ سیاسی اختلافِ رائے آخرکار ضرور سر اٹھائے گا، لیکن ابھی اگلے کئی برسوں تک اس کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔"

میں نے چند لاؤسی صحافیوں سے بات چیت کی اور مجھ پر انکشاف ہوا کہ وہ بھی سرکاری لائن

پر سختی سے کاربند ہیں۔ حکومت کی خامیوں کو سامنے لانے کے لیے پریس کی ضرورت نہیں ہے، وینتیان کے ایک اخبار نویس نے مجھ سے کہا۔ "حکومت کے اجلاس روز ہوتے ہیں اور ان میں ان تمام مسائل کے بارے میں بات کی جاتی ہے۔" وہ بولا۔ "لاؤس میں مشرقی یوروپ جیسے حالات پیدا نہیں ہوں گے، کیوں کہ یہاں کے لوگ بودھ مت کے پیرو ہیں، جو امن اور سکون سے رہنے کی تلقین کرتا ہے۔"

آخر میں نے سڑک پر چلتے ایسے لوگوں کو روک روک کر ان سے بات کی جو شکل سے کالج کے طالب علم لگتے تھے، اور انھیں انگریزی بول چال کی مشق کرانے کی پیش کش کی۔ اس پیش کش کا جواب ہمیشہ اثبات میں ملتا ہے، کیوں کہ لاؤس کے نوجوان باشندوں کے لیے انگریزی نے دوسری زبان کے طور پر فرانسیسی کی جگہ لے لی ہے۔ ایک روز خوش قسمتی سے میری ملاقات کوئی بیس طالب علموں کے ایک گروپ سے ہو گئی جو بات کرنے کے لیے بے تاب تھے۔ مگر جوں ہی میں نے اپنی گفتگو کا رخ سیاست کی طرف موڑا، ان میں سے صرف ایک طالب علم مجھ سے بات کرنے کے لیے باقی رہ گیا۔ اس نوجوان کو تخیل کے زور پر بھی اختلافِ رائے رکھنے والا شخص نہیں کہا جا سکتا تھا، لیکن کم سے کم وہ میرے سوالوں کا جواب صاف گوئی سے دینے پر آمادہ تھا۔ "سب طالب علم جانتے ہیں کہ مشرقی یوروپ میں کیا واقعات پیش آئے ہیں،" اس نے کہا۔ "ہم نے یہ سب کچھ تھائی ٹی وی پر سی این این کے پروگراموں میں دیکھا ہے۔ ہمیں چین میں ہونے والے واقعات کا بھی علم ہے، لیکن ہم کیا کر سکتے ہیں؟ یہاں لوگوں کو پیسے کمانے ہی سے فرصت نہیں ملتی۔ یہ مشرقی یوروپ جیسی جگہ نہیں ہے جہاں اتنے سارے لوگ مظاہرے کرنے کے لیے نکل آئے تھے۔ لاؤس میں اگر کوئی مظاہرہ کیا جائے تو پولیس والوں کی تعداد مظاہرین سے زیادہ ہو گی۔"

لیکن سیاسی اختلافِ رائے کے مفقود ہونے کی وضاحت محض ہر محلّے میں پہرے داروں کی موجودگی سے نہیں کی جا سکتی جو ہر آنے جانے والے پر نگاہ رکھتے ہیں، کیوں کہ گزشتہ کچھ برسوں میں پولیس اسٹیٹ کی علامت خاصی کم ہو گئی ہیں۔ چند سال پہلے وینتیان میں رہنے والا کوئی غیر ملکی کسی لاؤسی باشندے کو اپنے گھر اُس وقت تک نہیں بلا سکتا تھا جب تک اپنے تحریری دعوت نامے کی باقاعدہ تصدیق وزارتِ خارجہ سے نہ کرا لیتا۔ آج یہ طریقِ کار خاصا نرم کر دیا گیا

Scanned with CamScanner

سے، اور غیر ملکی اور لاؤسی باشندے ڈسکو تھیک میں ساتھ ساتھ ناچتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ (ڈسکو کے اولین دنوں میں حکومت نے ہدایات جاری کی تھیں کہ ناچنے والے ایک دوسرے سے کم از کم دو فٹ کے فاصلے پر رہیں، مگر اب اس پر زور نہیں دیا جاتا۔) ہر شخص، خواہ وہ اصلاحی کیمپ میں قید ہی کیوں نہ رہ چکا ہو، اب پاسپورٹ حاصل کر سکتا ہے؛ بلکہ ایک دن کے لیے تھائی لینڈ جانے کے لیے تو پاسپورٹ کی بھی ضرورت نہیں۔ پاسپورٹ حاصل کرنے پر پچپن سینٹ کے قریب خرچ آتا ہے اور چند ماہ انتظار کرنا پڑتا ہے، لیکن مزید رقم ادا کرنے پر اس عمل کو تیز بھی کیا جا سکتا ہے۔ تمام سابق لاؤسی شہری اب یہاں کا سفر کر سکتے ہیں، خواہ وہ کچھ بھی سیاسی خیالات رکھتے ہوں۔ مثلاً ۱۹۷۵ میں شہزادہ پانیا سواناپھو، کو پتا چلا کہ اسے اصلاحی کیمپ میں ڈالا جانے والا ہے، غالباً اس لیے کہ وہ وزارتِ خزانہ میں کام کرتا تھا۔ اسوانا پھوما کے تین دوسرے بچوں کو، جو سرکاری اہلکار نہیں تھے، ایسا کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا) پانیا دریائے میکانگ پار کر کے تھائی لینڈ چلا گیا، اور ۱۹۹۰ میں پہلی بار واپس آیا۔ "میرا بڑا اچھا خیر مقدم ہوا،" اس نے مجھے بتایا۔ لاؤس بھر میں میری ملاقات ایسے لوگوں سے ہوتی رہی جو ۱۹۷۵ میں ملک سے فرار ہو گئے تھے اور اب حالات کا جائزہ لینے آئے تھے۔ بیشتر تخمینوں کے مطابق ملک واپس آنے والے سابق لاؤسی تعداد میں ان لاؤسی باشندوں سے زیادہ ہیں جو دریائے میکانگ پار کر کے ملک سے فرار ہو رہے ہیں۔

لاؤسی حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس نے تمام اصلاحی کیمپ ختم کر دیے ہیں۔ اس دعوے کی سچائی کا پتا چلانا ناممکن ہے، لیکن یہ بات عام طور پر جانی جاتی ہے کہ سیاسی قیدیوں کی تعداد ۱۹۷۵ کے مقابلے میں اب بہت کم رہ گئی ہے۔ ۱۹۷۵ میں دس ہزار لوگ سیاسی قیدی تھے۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ نے اپنی ۱۹۸۹ کی انسانی حقوق کی رپورٹ میں کہا ہے کہ اسے یقینی طور پر صرف ۳۳ ایسے افراد کا علم ہے جو ۱۹۷۵ سے مسلسل قید میں ہیں، اور ملک بھر میں سیاسی قیدیوں کی کل تعداد اس عدد اور ایک ہزار سے زائد کے درمیان ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے، "بظاہر بعض لوگ جو پہلے کیمپوں میں قید تھے، اب روزگار حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں چند حکومتِ لاؤس کے ساتھ یا وینتیان میں موجود بین الاقوامی اداروں کے ساتھ ذمے دار پیشہ ورانہ عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔"

گو کہ سیاسی مخالفوں کے ساتھ بہتر سلوک کا نتیجہ کسی قسم کی اپوزیشن پارٹی کا وجود برداشت

کرنے کی صورت میں نہیں نکلا ہے، تاہم پابندیاں کسی قدر نرم ضرور ہوئی ہیں۔ چار سال پہلے تک حکومت کے تمام عہدوں پر تعیناتی کا کام لاؤسی کمیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں تھا مثلاً وزیر صحت کو اس فیصلے میں کوئی دخل ۔ تھا کہ اس کا نائب کون ہوگا ۔ لیکن اب اس سلسلے میں زیادہ سختی نہیں برتی جاتی۔ مزید برآں، ۱۹۸۹ کے پارلیمانی انتخابات میں ــــ جو پاتھٹ لاؤ کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ہونے والے پہلے انتخابات تھے ــــ ۷۹ نشستوں پر انتخاب میں حصہ لینے کے لیے ۱۲۱ امیدواروں کو اجازت دی گئی، اور کامیاب ہونے والے ۱۴ امیدوار پارٹی کے رکن نہیں تھے۔ پارلیمنٹ کو، جسے سپریم پیپلز اسمبلی کا نام دیا جاتا ہے، پہلی بار کچھ حقیقی اختیارات دیے جا رہے ہیں، اور وہ اب حکومت کے پہلے آئین کا مسودہ تیار کر رہی ہے۔ (۱۹۷۵ کے بعد سے لاؤس کسی آئین اور شہری قوانین کے کوڈ کے بغیر کام کر رہا ہے، اور یہ بات بھی بیرونی سرمایہ کاری کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ سی ہوئی ہے۔) وینتیان میں مقیم مغربی سفارت کار اب تک ان پارلیمانی انتخابات کو بڑی سیاسی تبدیلیوں کا پیش خیمہ قرار نہیں دیتے۔ "انتخابات ایک طرح کا ناٹک ہی تھے، کیوں کہ تمام امیدواروں کے ناموں کی ریاست سے پہلے ہی منظوری لی گئی تھی،" ایک سفیر نے کہا۔ "سیاسی نظام میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے؛ لاؤس ایک سخت گیر حکومت والی یک جماعتی سوشلسٹ ریاست ہے، اور غالباً ایسی ہی رہے گا۔" سرکاری اہلکار ایسی تمام قیاس آرائیوں کی فوراً تردید کرتے ہیں کہ کوئی سیاسی تبدیلی ہونے والی ہے۔ نائب وزیر خارجہ سوبان نے مجھے بتایا، "یہاں مشرقی یورپ والے حالات نہیں ہیں، کیوں کہ ہماری اقتصادی پالیسیاں منصفانہ ہیں اور ہم نے اپنی فکر میں آزادی پیدا کی ہے۔ ہماری معاشی پالیسی کے درست ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں مخالفانہ مظاہرے نہیں ہوتے۔ مستقبل میں بھی ایسے مظاہروں کا کوئی امکان نہیں... پارلیمنٹ کے جن ارکان کا پارٹی سے تعلق نہیں ہے، وہ بھی پارٹی کی پالیسیوں میں شریک ہیں۔ لاؤس کے تمام لوگ حکومت سے متفق ہیں۔"

بلاشبہ بہت سے لاؤسی تو سچ مچ نئی حکومت کے دلدادہ ہیں۔ مکمل محرومی کے طویل برسوں کے بعد معاشی میدان میں ملنے والی آزادی نے کسی حد تک مسرت کی فضا پیدا کر دی ہے۔ وینتیان میں ہر شخص ان مادی اشیا کی کثرت پر نازاں ہے جو اب دستیاب ہیں، خواہ شہر کے بیشتر باشندے محض ان پر نگاہ ڈالنے سے زیادہ کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ لیکن اختلاف رائے

Scanned with CamScanner

کے عدم وجود کی ایک اور، اور زیادہ اہم، توضیح بھی ہے، اور وہ ہے سیمیٹی والو کے طور پر دریاے میکانگ کی دستیابی۔ سیاسی اختلاف رائے رکھنے والے محض دریا پار کر کے تھائی لینڈ پہنچ سکتے ہیں۔ لاؤس چھوڑ کر جانے والوں کو روکنے کے لیے نگرانی کرنے والی کشتیاں، اس پار یا اُس پار، کہیں نہیں ہیں، اور وہاں پہنچنے والے لاؤسی باشندے کسی دقت کے بغیر شمال مشرقی تھائی لینڈ کی آبادی میں گم ہو سکتے ہیں، جہاں کی تھائی آبادی کا قدیم نسلی وطن میدانی لاؤس ہے۔ بہت سے لاؤسی باشندے اپنے دوستوں یا رشتہ داروں کے پاس جا سکتے ہیں؛ مثال کے طور پر میرے ترجمان نے بتایا کہ اس کے تین بھائی ہیں اور تینوں تھائی لینڈ میں رہتے ہیں۔ یہ وہ نازک فرق ہے جس کے باعث لاؤس میں ہونے والی معاشی تبدیلیاں سیاسی تبدیلیوں کے بغیر کامیاب رہی ہیں، جبکہ ایسی ہی کوشش چین میں ڈرامائی طور پر ناکام ہو چکی ہے۔ بیجنگ میں مشکل ہی سے کوئی شخص فرار ہو کر مغربی دنیا میں پہنچنے کا تصور تک کر سکتا ہے، لیکن وینتیان میں یہ عمل اتنا ہی آسان ہے جتنا کشتی لے کر دریا پار کر جانا۔ جو لاؤسی اب بھی یہاں مقیم ہیں انھوں نے، کسی نہ کسی وجہ سے، یہاں رہنے کا خود انتخاب کیا ہے۔

گزشتہ کچھ عرصے سے دریاے میکانگ پر ٹریفک دونوں سمتوں سے چلنے لگی ہے، کیوں کہ فرار ہونے والے کچھ افراد لاؤسی حکومت کے خلاف کام کرنے کے لیے، اسلحے سے لیس ہو کر، واپس آنے لگے ہیں۔ بغاوت پر آمادہ یہ لوگ ہمونگ نسل کے اور میدانی لاؤس کے وہ باشندے ہیں جو تھائی لینڈ کے پناہ گزین کیمپوں میں رہ رہے تھے؛ ان کے علاوہ عام جرائم پیشہ اور افیم کے اسمگلر بھی ان آنے والوں میں شامل ہیں۔ ہر سال جاڑوں میں جب موسم خشک ہوتا ہے، یہ لوگ سرحد پار کر کے لاؤسی گاؤوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور خصوصاً سڑک نمبر ۱۳ سے گزرنے والے ٹرکوں پر حملہ کر کے مسافروں کو نشانہ بناتے ہیں جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں۔ ۱۹۸۹ میں یہ حملے خاص طور پر وحشیانہ تھے؛ اس سال دسمبر میں حملہ آوروں نے تعاون نہ کرنے کی پاداش میں ایک پورے ہمونگ گاؤں کو جلا دیا اور سڑک نمبر ۱۳ سے گزرتے ہوئے چھ ٹرکوں کے ایک قافلے پر حملہ کر کے ۲۸ شہریوں کو مار ڈالا۔ اس بات کا امکان ہے کہ حملہ آوروں میں سے چند ضرور ایسے لاؤسی باشندے رہے ہوں گے جنھوں نے امریکی شہریت اختیار کر لی؛ ہمونگ رہنما وانگ پاؤ کو، جو اب امریکی شہری ہے، عام طور پر ایسے حملوں میں ملوث خیال کیا جاتا ہے۔ یہ

Scanned with CamScanner

جہاں کہ امریکی شہری ایک بار پھر لاؤس میں کسی جنگی کارروائی میں حصہ لے رہے ہوں، امریکی حکومت کے لیے کچھ زیادہ خوش کن نہیں ہے جو ان حملہ آوروں کو منشیات کے اسمگلر ہی سمجھتی ہے۔ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کا کہنا ہے کہ امریکا ان لوگوں کی براہ راست یا بالواسطہ مدد نہیں کر رہا ہے۔

جو لوگ ان حملہ آوروں کے بارے میں معلومات رکھتے ہیں ان میں بھی باغیوں کی تعداد کے بارے میں مختلف تخمینے پائے جاتے ہیں، جو دو سو سے لے کر تیرہ ہزار تک ہیں۔ اگرچہ یہ باغیانہ سرگرمیاں لاؤ کی حکومت کے استحکام کے لیے کسی طرح کا خطرہ نہیں ہیں، مگر پاتھٹ لاؤ کو اس امر پر تشویش ہے کہ یہ حملے دیہی علاقوں میں بیرونی امداد سے چلنے والے انتہائی ضروری منصوبوں کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔ ۱۹۸۱ کے موسم گرما میں ایسی ہی بات پیش آئی تھی جب سڑک تعمیر کرنے کے ایک ملکی منصوبے کا چارج لینے والا عالمی بینک کا ایک کنسلٹنٹ سواناکھیت کے شمال میں بظاہر کیے جانے والے ایک حملے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ حملہ کرنے والے کبھی پکڑے نہ جا سکے، لیکن عالمی بینک نے سڑکوں کی تعمیر کے تمام منصوبوں کو فوراً اگلے پانچ سال کے لیے ملتوی کر دیا۔ سڑک نمبر ۱۳ پر ہونے والے حملے غالباً اس بات کا ایک سبب تھے کہ ۱۹۸۹ کے موسم گرما میں، لاؤس میں داخلے کے دروازے کئی ماہ تک کھلے رکھنے کے بعد، حکومت نے انفرادی طور پر آنے والے سیاحوں کو ویزے جاری کرنے کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ معلوم ہوا تھا کہ کچھ کم حیثیت سیاح جہاز میں لوانگ پرابانگ جانے کے بجائے سڑک نمبر ۱۳ پر گزرنے والی گاڑیوں میں لفٹ لے کر خود کو خطرے میں ڈالنے لگے ہیں۔

جنوری ۱۹۹۰ میں حکومت نے شاید باغیوں کی سرگرمی کے خلاف باقاعدہ کارروائی کی۔ بینکاک کے اخبار "پوسٹ" میں شائع ہونے والے ایک مضمون کے مطابق، باغی لیڈروں نے حکومت پر الزام لگایا کہ اس نے ایسے دس گاؤں پر بمباری کی ہے جہاں انھوں نے اپنے قدم جما لیے تھے، اور اس کے نتیجے میں ۱۸۳ افراد ہلاک اور پانچ ہزار بے گھر ہو گئے ہیں۔ مضمون میں کہا گیا تھا، تھائی لینڈ اور لاؤس کی سرحد پر انٹیلیجنس کے ذرائع کا کہنا ہے کہ یہ الزامات درست ہو سکتے ہیں۔ مضمون نگار نے سوال اٹھایا تھا کہ کیا لاؤ حکومت ایک گوریلا تحریک کے خلاف وہی حکمت عملی اختیار کر رہی ہے جو ویت نام کی جنگ کے دوران امریکیوں نے اختیار کی تھی — یعنی

Scanned with CamScanner

دیہات کو بھاگنے کی غرض سے انھیں تباہ کر ڈالنے کی حکمتِ عملی۔ وینتیان میں کسی غیر ملکی سفارت خانے کے پاس دیہات پر بمباری کی کوئی شہادت نہیں ہے، لیکن سفارت کاروں کو یقین ہے کہ کسی نہ کسی طرح کی بمباری ضرور کی گئی تھی خواہ وہ باغیوں کے کیمپوں پر کی گئی ہو۔ جب میں نے یہ سوال سوبن کے سامنے رکھا تو اس نے اسے ہاتھ کے ایک اشارے سے مسترد کر دیا۔ "ہماری سلامتی کو ان سے کوئی خطرہ نہیں،" اس نے کہا۔ "کیا آپ کے خیال میں پہاڑوں پر موجود پانچ یا چھ افراد سے نمٹنے کے لیے ہمیں مگ ۲۱ طیاروں کی ضرورت ہو گی؟"

باغیوں نے، جو خود کو یونائیٹڈ لاؤشین نیشنل لبریشن فرنٹ کہتے ہیں، ۱۹۸۹ کے وسط میں اعلان کیا کہ انھوں نے ایک عارضی انقلابی حکومت قائم کی ہے جس نے لاؤسی سرزمین پر کام شروع کر دیا ہے۔ اس تمام سرگرمی کی ایک ممکنہ توضیح یہ ہے کہ باغیوں کو خدشہ ہے کہ وہ تھائی لینڈ میں اپنی روایتی پناہ گاہ سے محروم ہونے والے ہیں کیوں کہ تھائی حکومت کو لاؤس کی نو آزاد کردہ معیشت میں حصہ لینے کا کام کمیونسٹ مخالف باغیانہ تحریک کی درپردہ حمایت سے زیادہ منافع بخش معلوم ہونے لگا ہے۔ دونوں تاریخی دشمن ملکوں کے درمیان (تھائی رضاکاروں نے سی آئی اے کی خفیہ فوج میں شامل ہو کر جنگ کی تھی، اور لاؤس پر بمباری کے لیے امریکی جہاز تھائی علاقے سے پرواز کرتے تھے) تعلقات ڈرامائی طور پر بہتر ہوئے ہیں۔ دسمبر ۱۹۸۷ سے فروری ۱۹۸۸ تک تھائی لینڈ اور لاؤس ایک متنازعہ علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے خوں ریز جنگ میں مصروف رہے، جس میں سو لاؤسی اور پانچ سو تھائی باشندوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ اس تنازعے کے ختم ہونے کے سال بھر بعد، فروری ۱۹۸۹ میں، کیسون تھائی لینڈ میں اپنے میزبانوں کے سامنے کھڑا اعلان کر رہا تھا کہ "پہاڑ گر جائیں اور دریا خشک ہو جائیں، مگر تھائی لاؤ دوستی ہمیشہ قائم رہے۔" یہ نیا قائم کیا جانے والا رشتہ بڑی حد تک معقولیت پر مبنی ہے، کیوں کہ دونوں ملک ایک دوسرے سے اس قدر مماثلت رکھتے ہیں، اور کیوں کہ، لاؤسی نقطۂ نگاہ سے، تھائی لینڈ کی حیثیت ایک بے حد دولت مند سپر پاور کی سی ہے اور وہ مستقبل میں کی جانے والی بھاری اہم سرمایہ کاری کا ایک بڑا ممکنہ ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ "اگر رکاوٹیں ہٹ جائیں تو تھائی اور لاؤسی ایک دوسرے کے فطری دوست ہیں،" یونیورسٹی آف پٹس برگ کے جوزف زاسلوف نے کہا۔ "اور تھائی لینڈ میں بھی موڈ بدل رہا ہے، جس کا اندازہ وہاں کے وزیرِ اعظم کے اس نعرے سے ہوتا ہے کہ میدانِ

جنگ کو بازار میں بدل ڈالو۔"

بلاشبہ تھائی سرمایہ کار ــــ اور ان کے علاوہ تھائی حکومت کے اہلکار اور اعلیٰ فوجی افسر جو عادتاً اپنے سرکاری فرائض کو منافع کمانے کے کسی موقعے کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیتے ــــ لاؤس پر خاص توجہ دے رہے ہیں اور تھائی کمپنیوں نے نئی سرمایہ کاری کا ایک بڑا حصہ فراہم کیا ہے۔ وینتیان کے بازاروں کی مال سے بھری دکانیں، جو شہر کی خوش حالی کا تاثر دے رہی ہیں، زیادہ تر تھائی ساخت کی مصنوعات فروخت کرتی ہیں جن میں کھانے پینے کی اشیا سے لے کر ٹی وی سیٹ تک شامل ہیں۔ "لاؤسی معیشت تھائی لینڈ پر انحصار کرنے لگی ہے،" ایک مغربی سفیر نے مجھے بتایا۔ "میرا خیال ہے حکومت کو ویت نام سے قریبی طور پر وابستہ رہنے کے مقابلے میں معاشی طور پر تھائی لینڈ کا ایک صوبہ بن جانا زیادہ پسند ہے۔ لاؤس اور ویت نام کے لوگوں میں، سیاسی نظریے کو چھوڑ کر، کچھ بھی مشترک نہیں۔" اب آسٹریلیا دریائے میکانگ پر ایک پل تعمیر کرنے پر رضامند ہو گیا ہے جو ۱۹۹۳ میں مکمل ہو جائے گا۔ تب تھائی سرمایہ کاروں کے لیے لاؤس کو ریپ کرنا اور لوٹنا زیادہ آسان ہو جائے گا۔" لاؤس اور تھائی لینڈ کے تعلقات کے بارے میں یہ سنگین الفاظ استعمال کرنے والا یہ سفارت کار اکیلا نہیں ہے؛ خود لاؤسی باشندے بھی کبھی کبھی ان تعلقات کے بارے میں سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ ۳ جولائی ۱۹۸۹ کو ریاستی ملکیت کے ریڈیو وینتیان نے ایک تقریر نشر کی جس میں تھائی لینڈ پر الزام لگایا کہ وہ اپنی مسلح افواج کے ناکام رہنے کے بعد لاؤس پر بالادستی قائم کرنے کے لیے اقتصادی طاقت استعمال کر رہا ہے۔ "فوجی قوت سے ہمارے ملک کو مٹانے میں ناکام ہو کر دشمن نے اب ایک نئی حکمت عملی اختیار کی ہے اور ہندچینی کے میدانِ جنگ کو بازار میں تبدیل کرنے کی نام نہاد کوشش کے ذریعے ہم پر حملہ کر دیا ہے،" مقرر نے کہا۔ اس پر اٹھنے والے شوروغوغا کو خاموش کرنے کے لیے لاؤسی حکومت نے عجلت میں یہ عذرِ لنگ پیش کیا کہ یہ تقریر ــــ لاؤس جیسے ملک میں جہاں تمام ذرائع ابلاغ پر حکومت کا سخت کنٹرول ہے ــــ سرکاری موقف کی نمائندگی نہیں کرتی۔

تجارتی مسائل تعمیراتی لکڑی کے شعبے میں خاص طور پر سنگین ہیں۔ ۱۹۸۹ کے اوائل میں تھائی لینڈ نے اپنے چند ایک بچے کھچے جنگلوں میں درخت کاٹنے کی ممانعت کر دی، اور اس کے بعد سے وہ مسلسل اپنے ہمسایہ ملکوں کے جنگلوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس باعث

Scanned with CamScanner

اس کی پالیسی لاؤسی حکومت کی پالیسی سے براہ راست متصادم ہے جس نے ماحولیات سے متعلق مسائل پر ایسی حساسیت کا مظاہرہ کیا ہے جو تیسری دنیا میں نایاب ہے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ پہاڑی علاقوں میں رہنے والی بعض نسلی اقلیتوں کو، جو روایتی طور پر جنگل جلا کر اگائی جانے والی فصلوں پر گزر بسر کرتے ہیں، میدانی لاؤس میں منتقل ہونے پر آمادہ کرنے کے لیے حکومت نے مادی مراعات کی پیش کش کی ہے۔ بیشتر ملکوں میں ماحول کے بچاؤ کا عمل نچلی سطحوں سے شروع ہوتا ہے، "لاؤس میں کام کرنے والے جنگلات کے ایک کینیڈین کنسلٹنٹ نے ماحولیاتی شعور کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ "لوگوں کو ماحول کے بارے میں تشویش ہوتی ہے اور وہ سیاست دانوں پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ عمل اعلیٰ ترین سطح پر شروع ہوا۔ تھائی لینڈ میں درخت کاٹنے پر جوں ہی پابندی لگی، اس کے اگلے روز تھائی تاجر لاؤس پہنچ گئے۔ انھوں نے منہ مانگا معاوضہ دینے کی پیش کش کی، لیکن انکار کر دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت طویل میعادی ماحولیاتی مقاصد کے پیش نظر قلیل میعادی معاشی فوائد کو ٹھکرانے پر آمادہ ہے۔ یہ نہایت غیر معمولی بات ہے۔

اگرچہ لاؤس نے خام تعمیراتی لکڑی کی برآمد پر ۱۹۸۹ کے شروع میں پابندی لگا دی تھی، لیکن کاغذ پر پابندی کے ضوابط تحریر کرنا آسان ہے مگر درخت کاٹنے کی تھائی اشتہا سے محفوظ رہنا اتنا آسان نہیں۔ اس انتہائی غریب ملک میں لاؤسی فوج کے لیے، بدعنوان صوبائی افسروں کے لیے اور بہت سے کاشتکاروں کے لیے تعمیراتی لکڑی نقد رقم کی حیثیت رکھتی ہے۔ بعض مبصروں کا خیال ہے کہ درخت کاٹنے کا عمل پہلے ہی کی طرح جاری ہے، بس فرق یہ ہے کہ اب غیر قانونی طریقے سے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مرکزی حکومت اپنے محصولات سے محروم ہو گئی ہے۔ بہچی منہ ٹریل کی طرف سفر کے دوران، اور ایک بار وینتیان سے شمال کی سمت دن بھر کے سفر میں، میں نے سڑک کے دونوں طرف درختوں کے کٹے ہوئے تنے دیکھے۔ جو لوگ لاؤس سے بہتر طور پر واقف ہیں ان کا کہنا ہے کہ یہ مسئلہ زاگنابولی صوبے میں سب سے زیادہ سنگین ہے — یہ لاؤس کا واحد صوبہ ہے جو دریائے میکانگ کے مغربی کنارے پر واقع ہے، چناں چہ اس کی تھائی لینڈ کے ساتھ کوئی آبی سرحد نہیں ہے۔ زاگنابولی پر بیشتر لاؤسی فوج کا کنٹرول ہے، اور بعض اطلاعات کے مطابق وہاں پورے پورے جنگل صاف کیے جا رہے ہیں اور لاؤسی اور تھائی فوج کے افسر اس سے حاصل ہونے والی رقم سے اپنی جیبیں بھر رہے ہیں۔ میں نے بااثر معاشی منصوبہ ساز سوسپاداوان

Scanned with CamScanner

استھاوونگ سے اس بارے میں دریافت کیا اور اس نے دوسرے سرکاری اہلکاروں کے مقابلے میں، جو محض مسئلے کے وجود سے انکار کر دیتے ہیں، زیادہ صاف گوئی سے کام لیا۔ "مقامی باشندے اچھے بھی ہیں اور برے بھی،" وہ بولا۔ "محض ایک حکم جاری کر کے بُرے مقامیوں کو ملک سے نکالا نہیں جا سکتا۔ جنگل میں پہرے دار مقرر کرنے سے بھی کچھ فائدہ نہیں، اس لیے ہمیں گاؤں والوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ہم گاؤں کے لوگوں کو ان کے آس پاس جنگلوں کی ملکیت دے رہے ہیں، اور انھیں جنگل کی لکڑی کو اپنے استعمال میں لانے کی اجازت ہو گی۔ اس طرح وہ جنگلوں کی حفاظت کریں گے۔"

تھائی لینڈ کے لاؤس کے ساتھ اپنے تعلقات کو بہتر بنانے کے ساتھ ہی ساتھ یہ ہوا ہے کہ ویت نام نے، جو پاتھٹ لاؤ حکومت پر بہت زیادہ اثرانداز تھا، اب اپنی پوزیشن سے رضاکارانہ پسپائی اختیار کر لی ہے۔ کئی برسوں تک ویت نامیوں نے اپنے چالیس سے پچاس ہزار تک فوجی لاؤس میں تعینات رکھے۔ سوویت اور امریکی سفارت کاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ فوجی اب جا چکے ہیں، اور ان میں سے بیشتر ۱۹۸۷ اور ۱۹۸۸ کے دوران واپس گئے ہیں۔ ممکن ہے چند ایک فوجی مشیر اب تک ملک میں موجود ہوں، لیکن، سفارت کاروں کا خیال ہے کہ اگر ایسا ہے بھی تو وہ لاؤسی فوج کو ہدایات دینے کے بجائے کسی تعمیراتی منصوبے پر کام کر رہے ہوں گے۔ یہ تبدیلی کیوں کر آئی؟ اس کا ایک ممکنہ سبب تو جنوب مشرقی ایشیا میں کشیدگی میں آنے والی کمی ہے، جس میں ویت نام اور اس کے دو روایتی دشمن ملکوں، چین اور تھائی لینڈ، کے مابین تعلقات کی بہتری بھی شامل ہے۔ ان دونوں ملکوں کی جانب سے خطرہ کم ہونے کی وجہ سے ویت نام کے لیے لاؤس کی جغرافیائی اہمیت کم ہو گئی ہے۔ دوسری توضیح ویت نام کے اپنے اقتصادی مسائل سے کی جاتی ہے جن کے باعث اب اس کے لیے لاؤس میں اپنی ہزاروں کی نفری کو تعینات رکھنے کا خرچ اٹھانا دشوار ہو گیا ہے۔ "وہ عمدہ جنگ باز ہیں اور انھوں نے برسوں تک جنگ کی ہے،" ایک سوویت سفارت کار نے وضاحت کی، "لیکن اب وہ تھک چکے ہیں۔ انھیں بہت سی چیزیں درکار ہیں، ان کے بہت سے مسائل ہیں۔"

تھائی لینڈ واحد ملک نہیں جس نے لاؤس کی طرف رغبت کا اظہار کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۸۹ کے اواخر میں کیسون کے دورۂ بیجنگ کے بعد چین سے تعلقات میں بھی بہتری آئی

ہے۔ لاؤسی اہلکاروں کو یقین ہے کہ مستقبل میں بیرونی امداد میں اضافہ ہوگا، اور مشرقی یورپ سے آنے والی امداد کے بند ہونے کی تلافی مغربی ملکوں سے آنے والی امداد سے ہو جائے گی۔ یہ ایک کلیدی سوال ہے، کیوں کہ غیر یقینی اعداد و شمار کے اس ملک میں ہر کسی کے حساب سے بیرونی امداد ہی وہ واحد وسیلہ ہے جس کے بدولت لاؤس معاشی طور پر زندہ ہے۔ کھامسائی سوپھانووَنگ کا کہنا ہے کہ ۱۹۸۹ میں لاؤس کو بیرونی ملکوں اور بین الاقوامی اداروں کی جانب سے کل ۲۰۰ ملین ڈالر کے مساوی رقم امداد اور قرضوں کی شکل میں ملی، اور اس رقم کا تین چوتھائی حصہ کمیونسٹ بلاک کے ملکوں سے آیا۔ اس نے تخمینہ لگایا کہ ۱۹۸۹ میں حکومت کے اخراجات ۳۰۰ ملین ڈالر ہوں گے۔

معاشی اصلاحات اور ہمسایہ ملکوں سے تعلقات کی بہتری سے پیدا ہونے والی چمک دمک ان گمبھیر مسائل پر پردہ ڈالنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی جن کا لاؤس کو اب بھی سامنا ہے۔ وینتیان کے بازاروں میں دستیاب وی سی آر اور مسافروں کو لینے کے لیے ہوا ماکھیت کے ایرپورٹ پر آنے والی پرائیویٹ مرسڈیز کاریں اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ لاؤس میں ایک تاجر طبقہ پروان چڑھ رہا ہے، لیکن یہ اس بات کی علامت ہرگز نہیں ہے کہ خوش حالی نے گہری جڑیں پکڑی ہیں۔ دیہی علاقوں میں اب بھی شدید غربت کا راج ہے، اور اکثر گاؤں اسکول یا علاج کی سہولتوں سے محروم ہیں اور وہاں کے لوگ اپنی غذا خود اگا کر گزر بسر کرتے ہیں کیوں کہ فصل کو فروخت کے لیے لے جانے کے ذرائع مفقود ہیں۔ علاج اور تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے، اور ملک کے تباہ شدہ انفراسٹرکچر کی مرمت کرنے کے لیے حکومت کے وسائل نہایت قلیل ہیں۔ وینتیان کا مہوسوت اسپتال، جو لاؤس بھر میں سب سے بڑا ہے، اس امر کی ایک ڈرامائی مثال ہے۔ ۱۹۷۳ میں امریکیوں کا بنایا ہوا یہ اسپتال، جو کسی یونیورسٹی کیمپس کی سی فضا میں واقع ہے، پاتھٹ لاؤ کے قبضہ میں آنے کے بعد سے مرمت اور دیکھ بھال سے محروم ہو چکا ہے۔ وہاں ایک بھی ٹوائلٹ ایسا نہیں جس کا فلش کام کر رہا ہو، گرم پانی کا بندوبست نہیں، نکاس کی کوئی نالی درست حالت میں نہیں،" اقوام متحدہ کے ایک اہلکار نے مجھے بتایا۔ "آپریشن کرنے کے کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں، اور اس کا ایرکنڈیشنر دس سال سے خراب پڑا ہے۔ ۱۹۹۰ میں ہم نے دو لاکھ ڈالر سے کچھ کم رقم خرچ کی اور اس سے تمام چیزوں کو ڈِس انفکٹ کیا گیا، دیواروں پر روغن ہوا، ٹوائلٹ

Scanned with CamScanner

درست کرائے گئے، نالیاں کھدوائی گئیں اور دوسرے مسائل حل کیے گئے۔ لیکن جب نالیوں کی مرمت ہو چکی تو ہم پر انکشاف ہوا کہ یہ نالیاں کہیں بھی نہیں جاتیں؛ باہر نکلنے والا تمام گندا پانی عمارت کے نیچے چلا جاتا تھا۔ پھر طبی کوڑے کرکٹ کو ضائع کرنے کا کوئی طریقہ نہیں؛ اسے بھی باقی کوڑے کے ساتھ باہر اچھال دیا جاتا ہے۔ پھر حکومت کے پاس صفائی اور مرمت کے عملے کو ادا کرنے کے لیے رقم نہیں ہے؛ خراب ہونے والے بلب تبدیل کرنے تک کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ لہذا ہر چیز پھر ویسی ہی ہو جائے گی جیسی ہماری مداخلت سے پہلے تھی۔ لیکن ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔"

ماہوسوت اسپتال میں زیادہ تر مریض ملیریا کے علاج کے لیے داخل ہیں۔ میں نے لاؤس میں ملیریا کا مطالعہ کرنے والے ایک فرانسیسی ڈاکٹر سے بات کی، اور اس نے مجھے بتایا کہ یہ مرض نوزائیدہ اور کم عمر بچوں میں موت کا سب سے بڑا سبب ہے اور یہ کہ ہر چار میں سے ایک لاؤسی باشندہ اس کا مریض ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ اگر لاؤس میں ملیریا کو کنٹرول کرنے کا کوئی باقاعدہ پروگرام شروع کیا جائے ــــ جس میں علاقوں پر کیا جانے والا اسپرے، کیڑے مار ادویات میں بسی ہوئی مچھردانیوں کی تقسیم، اور مرض کا علاج شامل ہو ــــ تو اس میں سالانہ آٹھ لاکھ ڈالر خرچ آئے گا۔ "لیکن اس رواں خرچ کو ادا کرنے کے لیے رقم نہیں ہے،" اس نے کہا۔ "بالکل نہیں ہے۔ آلات خریدنے، عملے کو ادا کرنے، گاڑیوں کے لیے پٹرول خریدنے تک کے لیے پیسے نہیں ہیں۔"

صحت کے نائب وزیر ڈاکٹر وانارتھ راجچمو نے مجھے بتایا کہ ایک ڈاکٹر مہینے بھر میں تیس ڈالر سے زیادہ نہیں کماتا، اور بعض کو، خصوصاً افلاس زدہ صوبوں میں، چھ چھ مہینوں تک تنخواہ نہیں ملتی۔ "ہم لاؤس میں صحت کی سہولتیں فراہم کرنے پر تقریباً ایک ڈالر فی کس سالانہ خرچ کر رہے ہیں،" اس نے کہا۔

لاؤس میں ہنرمند منتظموں کی اس قدر کمی ہے کہ صحت کے شعبے میں جتنی کچھ بیرونی امداد اسے ملتی ہے اسے موثر طور پر استعمال ہی نہیں کیا جا سکتا۔ "آج بہت سے گاؤوں میں کلینک قائم کر دیے گئے ہیں، لیکن سوال یہ ہے: کیا وہ کام بھی کر رہے ہیں؟" ایک مغربی امدادی کارکن نے پوچھا۔ "یونیسیف والے دوائیں بھیجتے ہیں جو الماریوں میں بند پڑی رہتی ہیں اور پڑے پڑے

Scanned with CamScanner

ن کی میعاد گزر جاتی ہے، کیوں کہ کسی کو پتہ نہیں کہ ان کا کیا استعمال کیا جائے۔ روسی دوائیں بھی کسی کام نہیں آتیں، کیوں کہ ان کے ناموں کے لیبل ہی کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ کئی وزارتوں میں دفتروں کے کمرے دن دن بھر خالی پڑے رہتے ہیں، کیوں کہ ان میں بیٹھنے والے بیشتر لوگ کہیں اور کام کر رہے ہوتے ہیں۔ سوسپاوان انتھاوونگ نے مجھے بتایا کہ حال ہی میں سوویت یونین کی طرف سے ایک سیمنٹ پلانٹ کی پیش کش کی گئی تھی۔ مگر اس کے لیے ہمیں نئی سڑکیں بنانی پڑتیں، اور اس کی دیکھ بھال کا خرچ اٹھانا پڑتا، اس لیے ہم نے یہ پیش کش قبول نہیں کی، اس نے کہا۔ اس کے لیے تکنیکی کار کن کہاں سے آتے؟ پیٹ چھوٹا ہو تو آپ زیادہ مقدار میں کھانا نہیں کھا سکتے۔ جتنی بیرونی امداد ہمیں ملتی ہے، ہم اس میں سے صرف ساٹھ فیصد موثر طور پر استعمال کر پاتے ہیں۔ امداد کو جذب کرنے کی صلاحیت کلیدی چیز ہے۔"

معاشی اصلاحات سے پیدا ہونے والی خوش حالی کے ملمعے کے پیچھے لاؤسی معیشت کے چند بنیادی مسائل چھپے ہوئے ہیں۔ زراعت اب بھی معیشت کا غالب حصہ ہے، اور کھیتوں کی ۹۵ فیصد پیداوار محض چاول پر مشتمل ہے۔ چناں چہ کم بارش والے دو ایک سال، مثلاً ۱۹۸۷ اور ۱۹۸۸، تمام دوسری ترقی پر پانی پھیر سکتے ہیں۔ صنعتی شعبہ نہایت چھوٹا ہے، یعنی مجموعی قومی پیداوار کے صرف چار فیصد کے برابر، جو گنتی کی تیار کردہ شیا لاؤس سے برآمد کی جاتی ہیں ان میں دانت صاف کرنے کے خلال بھی شامل ہیں۔ سرکاری بجٹ کا خسارہ اخراجات کے ۶۰ فیصد کے برابر ہے، اور یہ خسارہ بیرونی امداد سے پورا کرنا پڑتا ہے۔ ہنرمند منتظموں کی عدم موجودگی کا نتیجہ یہ ہے کہ بیرونی ملکوں کے ساتھ شروع کیے جانے والے مشترکہ منصوبے محض شوقیہ سطح پر کیے جانے والے کاروبار سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ۱۹۸۸ کے آخر میں دھات کے کباڑ کی تجارت کرنے والی ایک تھائی کمپنی نے لاؤ پیمنگ کے نام سے ایک مشترکہ ایرلائن قائم کی۔ اس کے معاہدے میں تھائی لینڈ سے سرمایہ اور لاؤس سے فنی مہارت فراہم کرنے کا اصول طے کیا گیا۔ یہ "فنی مہارت" وینتیان کی قومی لائبریری کی کتاب دار خاتون کی صورت میں سامنے آئی جس نے اپنی ملازمت چھوڑ دی تاکہ اس کاروبار میں شرکت کر سکے۔ یہ ایرلائن اب بند ہو چکی ہے۔

وینتیان میں رہنے والے جو مغربی باشندے لاؤس سے اچھی طرح واقف ہیں ان میں خاصی قنوطیت پائی جاتی ہے۔ اس ملک کی ایک بہت بڑی مشکل، وہ کہتے ہیں، یہ ہے کہ اس کے مستقل

Scanned with CamScanner

میں زیادہ دور تک کچھ دیکھا نہیں جا سکتا۔ جب روسی اور مشرقی یوروپ کے لوگ رخصت ہو جائیں گے، کیونکہ ان کے ملک اپنے مسائل سے دوچار ہیں، تب لاؤس کیا کریں گے؟ ایک مغربی سفارت کار کا سوال ہے۔ ان کا رقص کا کارڈ کون پُر کیا کرے گا؟ اور کمبوڈیا میں امن قائم ہونے کے بعد کیا ہو گا؟ سب لوگ کمبوڈیا کے بارے میں احساسِ جرم میں مبتلا ہو جائیں گے اور لاؤس کو فراموش کر دیا جائے گا۔ یہ چالیس لاکھ لوگوں کا ملک ہے جو تھائی لینڈ اور ویت نام کے درمیان پھنسا ہے، جن میں سے ہر ایک کی آبادی ساڑھے پانچ کروڑ سے زیادہ ہے۔ لاؤس اپنے بل پر ان دونوں سے کیونکر مسابقت کرے گا؟"

عجیب بات یہ ہے کہ لاؤس کے بارے میں رجائی خیالات رکھنے والا ایک شخص وہ ہے جو ملک چھوڑ کر چلا گیا تھا — یعنی سابق وزیراعظم کا بیٹا پانیا سوونا پھوما جو اب بینکاک میں رہتا ہے۔ ہارورڈ بزنس اسکول کا تعلیم یافتہ اور لاؤ، تھائی، فرانسیسی اور انگریزی زبانوں میں مہارت رکھنے والا پانیا اپنے لاؤس کے دورے سے بے حد متاثر ہو کر لوٹا، اور اس کے خیال میں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ آیا لاؤس کے مقابلے میں تھائی لینڈ کی نسبتاً خوش حالی زیادہ قابلِ رشک ہے۔ 'لاؤس میں امن ہے۔ اس سے بینکاک محروم ہے۔ دیہات میں جائیے، لوگوں کو دیکھیے۔ سڑکیں بن رہی ہیں، لوگوں کی بہبودی کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ لوگ ہوٹلوں میں خدمت کریں؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ اپنے جنگل کاٹ ڈالیں؟ کیا یہ معاشی ترقی ہوئی کہ تھائی لینڈ کے پہاڑی قبائلی بینکاک میں آ کر گداگر بن گئے؟ پندرہ سال تاریخ میں ایک لمحے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، انہیں اور وقت دیجیے۔ جب اس ملک کی کوئی سرحد سمندر سے نہ ملتی ہو اور ہر ملک اسے وسیع رقبے اور کم آبادی کے باعث للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہو تو لاؤس کا ایک ملک کے طور پر قائم رہنا ہی ایک حیرانی کی بات ہے۔ میں تو کہتا ہوں: اپنی سرحدوں کو بند رکھو، اور آہستہ آہستہ اپنے مسائل حل کرو۔ لاؤ قوم کو احتیاط سے کام لینا چاہیے اور اپنے جو کچھ ان کے پاس ہے اسے کسی کو چھونے بھی نہیں دینا چاہیے۔

امریکی سفارت خانہ وینتیان شہر کے مرکز میں، صبح کے بازار، دریائے میکانگ اور مرکزی تجارتی علاقے سے دور، ایک سفید نیچی عمارتوں کے ایک وسیع سلسلے میں قائم ہے۔ انہیں

عمارتوں سے امریکیوں نے کبھی ایک خفیہ جنگ کی ہدایت کاری کی تھی اور اس کے علاوہ یک تابع فرمان لاؤسی حکومت کے سمت سے اقدامات کی بھی۔ آج اس عمارت میں صرف آٹھ امریکی موجود ہیں ـــــ تین سفارتی عہدے دار اور پانچ افراد پر مشتمل ماتحت عملہ۔ یہ سب نسبتاً جوان ہیں اور لاؤس کے بارے میں خاصی معلومات رکھتے ہیں ـــــ دوسرے اور تیسرے عہدے پر فائز سفارت کار روانی سے لاؤی زبان بولتے ہیں ـــــ اور اس معاندت کے اثر سے آزاد ہیں جو ویت نام کی جنگ کے نتیجے میں پیدا ہوئی تھی اور جو اب تک ویت نام اور کمبوڈیا سے ساتھ امریکی تعلقات کو آلودہ کیے ہوئے ہے۔ وہ ملک کے مختلف علاقوں میں آتے جاتے ہیں اور بعض اوقات ایسا کرتے ہوئے کئی کئی دن نہایت پسماندہ مقامات پر لاؤ ایوی ایشن کے روسی ساختہ ہیلی کاپٹروں کے انتظار میں رکے رہنے کا خطرہ مول لیتے ہیں۔ پچھلے کوئی درجن بھر برسوں سے امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ اور حکومت لاؤس ایک انتہائی نازک سفارتی رقص میں مشغول ہیں ـــــ چند ایک قدم کسی امدادی منصوبے پر ساتھ کام کرتے ہوئے اور چند ایک دوسرے سے دوری اختیار کرتے ہوئے ـــــ لیکن آج کل دونوں میں جیسی قربت ہے ویسی پہلے کبھی نہیں رہی۔ پاتھٹ لاؤ کی بابت امریکی کراہت، جس کا اظہار کبھی بموں کے حملوں سے ہوتا تھا، اب محض ناپسندیدگی کے علامتی سفارتی رویے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی مثال وینتیان کے امریکی سفارتی مشن کے سربراہ کے عہدے سے دی جا سکتی ہے جو بجائے خود اس رویے کا عکاس رہا ہے؛ ۱۹۹۲ تک وہ سفیر نہیں بلکہ محض ناظم الامور ہوتا تھا۔ لاؤس کے علاوہ صرف دو اور ملک اس رویے کا ہدف تھے: ایتھیوپیا اور گریناڈا۔

آج وینتیان میں امریکا کے سفارت خانے کا وجود ہے تو اس کی وجہ صرف پاتھٹ لاؤ کے اقتدار سنبھالنے کا پُرامن عمل تھا۔ جنوبی ویت نام اور کمبوڈیا میں کمیونسٹوں کی پُرتشدد فتح نے امریکیوں کو فرار پر مجبور کر دیا تھا، لیکن پاتھٹ لاؤ نے ابتدا ہی میں واضح کر دیا کہ امریکیوں کی موجودگی قابلِ قبول ہو گی۔ کمبوڈیا کی طرح لاؤس کی حکومت کے بھی ابتدائی عرصے میں اس پر ویت نام کا غلبہ تھا اور اسے دسیوں ہزار ویت نامی فوجیوں کی امداد حاصل تھی، لیکن لاؤس کے معاملے میں ۱۹۷۵ کے پُرامن تغیر نے کسی نہ کسی طرح کا تسلسل ضرور فراہم کر دیا تھا، اور آج امریکا لاؤسی حکومت سے کم و بیش نارمل سطح کے تعلقات قائم رکھے ہوئے ہے جب کہ کمبوڈیا کی حکومت کو تسلیم کرنے سے اس کے ویت نام سے تعلق کے باعث انکاری ہے۔ واشنگٹن کی امریکی انتظامیہ

Scanned with CamScanner

کو لاؤس سے شکایت کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے کیوں کہ س سے لاؤس نے دو ہی بڑے مطالبات کیے ہیں — ایک، افیون کی تجارت کی حوصلہ شکنی کے عمل میں تعاون، اور دوسرے، ہوائی حملوں کے دوران گمشدہ ہو جانے والے امریکی ہوا بازوں کی جسمانی باقیات کی تلاش کی اجازت — اور لاؤسی حکومت نے دونوں مطالبات ماننے کے سلسلے میں خاصی پیش رفت کی ہے۔

لاؤس دنیا بھر میں افیون پیدا کرنے والے ملکوں میں تیسرے نمبر پر ہے، اگرچہ مقدار کے اعتبار سے اس میں اور پہلے دو نمبروں پر آنے والے ملکوں — برما اور افغانستان — میں کافی فرق ہے۔ جیسا کہ تیسری دنیا کے منشیات پیدا کرنے والے دوسرے ملکوں کا معاملہ ہے، یہاں بھی مسئلے کو بیان کرنا آسان ہے لیکن اس سے نمٹنا مشکل۔ شمالی لاؤس میں آباد نسلی اقلیتوں میں — جن کے تعلقات مرکزمیں قائم حکومت سے عموماً کشیدہ ہیں — افیون کی کاشت ڈیڑھ سو برس پرانی روایت رہی ہے۔ حکومت پہلے ان نسلی اقلیتوں سے کوئی تعلق رکھنے کو تیار نہ تھی، لیکن پچھلے دنوں اس نے س فصل کا متبادل مہیا کرنے کے ایک پروگرام کی منظوری دی ہے۔ ۱۹۸۹ میں کیے گئے ایک معاہدے کی رُو سے ریاست ہائے متحدہ نے اس پروگرام کے لیے، جسے ملک کے دور دراز شمال مشرقی علاقے میں، پاتھٹ لاؤ کے سابق مسکن سام نیوا کے غاروں سے صرف ستر میل دور آزمایا جا رہا ہے، چھ سال کے عرصے میں ۸۰ء۷ ملین ڈالر فراہم کرنے کا وعدہ کیا۔ (یہ ابھی کہنا دشوار ہے کہ آیا اس پوری رقم کو خرد برد کر لیا جائے گا۔) زراعت اور جنگلات کے محکمے کے ایک افسر کھام اُو آنے کے مطابق سویابین اور کئی دوسری فصلیں اور مویشی بانی درحقیقت افیون کی کاشت سے زیادہ منفعت بخش ثابت ہو سکتے ہیں، بشرطے کہ ان مال واجناس کے شہروں تک پہنچنے کے لیے سڑکیں تعمیر کر دی جائیں۔ امریکا ان سڑکوں کی تعمیر کے لیے امداد فراہم کر رہا ہے۔ اس کے بدلے میں لاؤس نے افیون کی تجارت کو روکنے کی 'زیادہ سے زیادہ کوشش' کرنے کا وعدہ کیا ہے، اگرچہ یہ غیر یقینی ہے کہ اتنے کم وسائل رکھنے والا ملک کس طرح منشیات کے بہاؤ کو روک سکے گا۔ ۱۹۹۰ میں لاؤس کا نام 'ڈی سر ٹیفکیشن لسٹ' یعنی ان ملکوں کی فہرست سے نکال دیا گیا جن کے لیے منشیات کی تجارت میں ملوث ہونے کے باعث امریکی امداد ممنوع ہے۔ اس فہرست میں شامل اکثر ملک وہ ہیں جنھیں امریکی امدادیوں بھی نہیں، یا بہت کم ملتی تھی، تاہم اس فہرست میں لاؤس کے نام کی موجودگی امریکی لاؤسی تعلقات کا ایک بڑا اختلافی نکتہ تھی — خاص طور پر اس

لیے کہ امریکا کی جانب سے لاؤس کے سول اور فوجی افسروں پر منشیات کی تجارت میں ملوث ہونے کا الزام لگایا جاتا تھا۔ کانگریس کے سامنے لاؤس کا نام امداد کے مستحق ملکوں کی فہرست میں شامل کرنے کے سلسلے میں گواہی دیتے ہوئے اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ کے ایک اہلکار نے کہا، "لاؤس کے اعلیٰ فوجی اور شہری اہلکاروں کے ملوث ہونے کے باعث۔ امریکا سے اس ملک کے تعمیری تعاون کا سلسلہ اب بھی متاثر ہو رہا ہے۔ یہ بہت دشوار عمل ہے کہ ایک جانب بدعنوانی اور منشیات کی اسمگلنگ بھی جاری رہے اور دوسری طرف امریکا سے تعاون بھی چلتا رہے۔"

میں نے وینتیان میں مقیم ایک معروف مغربی سفارت کار سے اس بیان کا ذکر کیا۔

"مجھے یقین نہیں کہ منشیات کی اسمگلنگ کا انتظام قومی سطح پر حکومت کے ہاتھوں کیا جاتا ہے،" اس نے کہا۔ "اگر ایسا ہوتا تو غالباً یہ اس ملک کی واحد شے ہوتی جس کا انتظام درست ہوتا۔ لیکن افراد، خصوصاً فوجی اہلکاروں، کی ایک خاصی تعداد کے اس کاروبار میں ملوث ہونے پر یقیناً کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔"

ان امریکی ہوابازوں کا مسئلہ بھی خاصا نازک رہا ہے جو لاؤس پر امریکی حملوں کے دوران گم شدہ ہوگئے تھے — ان کی تعداد اب ۵۳۳ ہے۔ اگرچہ اس کی کوئی امید نہیں کہ ان میں سے کوئی امریکی اب بھی زندہ تلاش کیا جاسکے گا، لیکن امریکا کو ان کی باقیات تلاش کرنے کے سلسلے میں کھدائیاں کرنے پر اصرار ہے تاکہ ان کی ہڈیوں کو ریاست ہائے متحدہ لے جا کر مناسب طور سے دفن کیا جاسکے۔ لاؤس میں امریکی ہڈیوں کی تفصیلی تلاش کا مسئلہ لاؤس کی حکومت کے لیے ایک ناگوار تصور رہا ہے، کیوں کہ ہزاروں لاؤسی باشندے ان بمباریوں میں ہلاک ہوئے تھے اور اب بھی ہر سال بہت سے بموں کے باعث مارے جاتے ہیں، اور ان کے سلسلے میں کسی قسم کے معاوضے کی امریکا کی جانب سے کوئی پیش کش نہیں کی گئی۔ لیکن لاؤسی حکومت کو یہ احساس ہوگیا کہ کھدائی کے عمل کی اجازت واشنگٹن کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنے کی پیشگی شرط ہے، چناں چہ دونوں ملکوں نے ۱۹۸۵ میں ان پر کام شروع کیا۔ کھدائی اور تلاش کے سارے عمل کے اخراجات امریکا ادا کرتا ہے اور امریکی اور لاؤسی باشندوں پر مشتمل ٹیمیں اس عمل کو سرانجام دیتی ہیں۔ اب تک گیارہ مقامات پر کھدائی کی جاچکی ہے اور اس کے نتیجے میں بتیس امریکیوں کی ہڈیاں برآمد کی جاسکی ہیں۔ (ایک بات ناقابل فہم ہے کہ لاؤسی حکومت نے ان کھدائیوں پر

Scanned with CamScanner

رضامند ہو جانے کے باوجود باقی ماندہ بموں کو تلاش اور ضائع کرنے کے سلسلے میں میٹل ڈیٹیکٹر ور دوسرے آلات استعمال کرنے کی امریکی پیش کش کو رد کر دیا۔ شاید لاؤسی سمجھتے ہیں کہ اس قسم کی امداد قبول کرنا اہانت آمیز ہوگا، لیکن حکومت نے یہ بات کہی نہیں ہے۔) نائب وزیر خارجہ سوبان کا کہنا ہے، کھدائی کی ٹیموں میں شامل لاؤسیوں اور امریکیوں کے درمیان تعاون کا جذبہ بہت عمدہ رہا ہے اور اسے بہت سراہا بھی گیا ہے۔ ہم اعتماد اور تفہیم کا ماحول پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ دونوں ملکوں کے عوام جنگ کے دنوں کو بھلا دیں۔ ہمیں امید ہے کہ ماضی سے نجات حاصل کرنے کے بعد امریکی حکومت اپنے اندازِ فکر میں تبدیلی لا سکے گی۔

منشیات اور امریکی فوجیوں کے باقیات کی تلاش کے سلسلے میں لاؤسی رعایتوں کا ایک بڑا مقصد امریکی امداد کی حوصلہ افزائی کرنا ہے — امداد جو امریکی بمباریوں سے ہونے والے نقصان کی تلافی کرنے کے لیے درکار ہے۔ لیکن اب تک امداد کی یہ رقم — جسے وینتیان کا امریکی سفارت خانہ آخری ڈالر تک احتیاط سے درج کر کے رکھتا ہے تاکہ بہتر تعلقات کے ثبوت کے طور پر دکھا سکے — اس قدر قلیل ہے کہ اس مجموعی رقم سے ریاست ہائے متحدہ میں تین میل سے زیادہ لمبی ہائی وے تعمیر نہیں کی جا سکتی۔ پانچ جدا جدا برسوں میں امریکا کی جانب سے ہنگامی بنیاد پر آنے والے چاول کی کل مالیت محض ایک کروڑ پانچ لاکھ نوے ہزار ڈالر بنتی ہے۔ چار سال میں اس نے ایک لاکھ پینتیس ہزار ڈالر کی طبی اشیا بھیجی ہیں، جن کی تازہ ترین، ۱۹۸۷ کی، قسط کی رقم چار ہزار ڈالر تھی۔ افیون کی کاشت کا متبادل فراہم کرنے کے پروگرام کے لیے اب تک سات لاکھ ڈالر وصول ہوئے ہیں۔ یہ تمام رقمیں ملا کر پندرہ سال کے عرصے میں ایک کروڑ چودہ لاکھ پچیس ہزار تک پہنچتی ہیں — یعنی جنگ کے دنوں میں کی جانے والی بمباری کے پانچ دنوں کے اوسط خرچ کے تقریباً برابر۔

کیا ریاست ہائے متحدہ کو بمباریوں سے ہونے والے نقصان کی تلافی کے لیے کسی قسم کے معاوضے کی پیش کش کرنے کے سلسلے میں ذمے داری محسوس کرنی چاہیے؟ اس خیال ہی کو مسترد کر دینے والے امریکی سرکاری اہلکاروں کی دلیل یہ ہے کہ بمباری شمالی ویت نامیوں کے سپلائی کے راستوں پر کی گئی تھی نہ کہ لاؤسیوں پر، اور اس بمباری سے ہونے والا فالتو نقصان غیر ارادی اور ناگزیر تھا۔ لیکن پلین آف جارز کو نگاہ میں لائیں تو ان کی دلیل اپنی قوت کھو بیٹھتی ہے۔ وینتیان

سے ایک سو دس میل شمال میں پہاڑوں سے گھری یہ سطح مرتفع لاکھوں ٹن بموں کا ہدف رہ چکی ہے۔ یہ علاقہ شمالی ویت نامیوں کے سپلائی کے راستوں کے آس پاس ہی کہیں واقع نہیں تھا، لیکن یہاں وہ سرزمین تھی جہاں سے وینتیان اور لونگ پرابانگ کی طرف مارچ کرنے کے لیے ویت نامی اور پاتھیت لاؤ فوجیوں کو لازماً گزرنا پڑتا۔ علاوہ ازیں یہ بھی اطلاعات ہیں کہ جن امریکی طیاروں کو خراب موسم کے باعث شمالی ویت نام میں بمباری کیے بغیر لوٹنا پڑتا وہ اپنے بموں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس جگہ کو استعمال کیا کرتے تھے۔ پلین آف جارز لغوی معنوں میں بم گرنے کے گڑھوں سے پٹا پڑا ہے۔ ایک مغربی سفارت کار، جو کئی بار وہاں جا چکا ہے، کہتا ہے۔ 'یہ تصور کرنا بھی مشکل ہے کہ وہاں بمباری کے اتنے بے تحاشا ہدف رہے ہوں گے۔' یہ جار یا قدیم سنگی پیالے ہی — جن کی تعداد سو سے زیادہ اور تاریخی دور نامعلوم ہے — بمباری میں بیشتر محفوظ رہے، صرف ان میں سے بعض بم پھٹنے کے دھماکوں سے ریزہ ریزہ ہوئے۔ لیکن وہاں رہنے والے انسانوں کی قسمت اتنی اچھی ثابت نہ ہوئی، اور ۱۹۶۹ تک ژینگ کھوآنگ صوبے کے ایک لاکھ تیس ہزار باشندوں میں سے زیادہ تر فرار ہو چکے تھے۔ لاؤسیوں کا کہنا ہے کہ بمباری سے اس صوبے کے آٹھ ہزار اٹھائیس افراد ہلاک، ۱۱،۳۳۵ بچے یتیم اور تین سو تریپن گاؤں جل کر راکھ ہوئے۔

مغرب سے تعلق رکھنے والے بہت سے سفارت کار اور امدادی کارکن، جو وینتیان میں مقیم ہیں، محسوس کرتے ہیں کہ امریکا کے ذمے ایک قرض واجب الادا ہے۔ ایک بین الاقوامی ادارے کا ایک اہلکار، جو لاؤس آتا جاتا رہتا ہے، اس بات کو یوں بیان کرتا ہے: "ہوچی منہ ٹریل کے دونوں جانب امریکی اس وقت تک بمباری کرتے رہے جب تک کہ سب کچھ تباہ نہ ہو گیا۔ امریکی عوام کو سمجھنا چاہیے کہ ان پر لاؤسیوں کی جانب سے ایک ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ علاج کی سہولتوں کے اعتبار سے لاؤس کا موازنہ ساحل (Sahel) کے بدترین ملکوں سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ غلط ہے! یہ ایشیا کا حصہ ہی نہیں لگتا۔ اگر آپ مونگ کھائی دریا پار کرکے دوسری طرف تھائی لینڈ میں جا نکلیں تو اوسط طبعی عمر میں پندرہ سال کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ میں جرمن ہوں، اور ہم نے پولینڈ اور اسرائیل کو جنگ کا تاوان ادا کیا ہے۔ امریکا پر بھی اتنی ہی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔"

اگر ریاست ہائے متحدہ کبھی اس قسم کی ذمہ داری کا احساس کر سکے تو اسے اس کو پورا

کرنے کے لیے ایک نظیر بھی فراہم ہو جائے گی — ایک ایسی نظیر جو اس بات کو بھی ثابت کرتی ہے کہ دنیا کا امیر ترین ملک دنیا کے ایک غریب ترین ملک کے ساتھ مل کر کام کر سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی نظیر ہے جو ضیاع، بدعنوانی اور دفتری ناکارکردگی کو، جن کا حوالہ بیرونی امداد کے سلسلے میں اتنی تواتر سے دیا جاتا ہے، یکسر غائب کر دیتی ہے اور ان کی جگہ جوش و جذبے اور مروت کے احساس کو دے دیتی ہے۔ یہ لاؤس میں امریکی فوجیوں کی باقیات کی تلاش میں کیا جانے والا کھدائی کا عمل ہے، جسے لاؤسی باشندوں کی شرکت سے ایک امریکی فوجی گروپ کی نگرانی میں — جسے جوائنٹ کیژولٹی ریزولیوشن سنٹر کہا جاتا ہے — اور ہوائی میں قائم امریکی فوج کی سنٹرل آئیڈنٹیفیکیشن لیبوریٹری کے تعاون سے سرانجام دیا جاتا ہے۔ یقیناً یہ عمل بیرونی امداد کے طور پر نہیں کیا جاتا، اور اس سے لاؤسیوں کو پہنچنے والا فائدہ بھی ضمنی ہے۔ اس کے باوجود اس کوشش سے یہ بات مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اگر تعمیرِ نو کے منصوبے اس نمونے پر ڈھلے جائیں تو امریکی امداد لاؤس میں کیا کچھ کر سکتی ہے۔

مجھے وینتیان کے امریکی سفارت خانے سے معلوم ہوا تھا کہ زیپون کے نزدیک، جہاں میں جانے والا تھا، ایسی ہی ایک کھدائی اس وقت ہو رہی ہے۔ سفارت خانے کے ملازم مجھے اس کا ٹھیک محلِ وقوع تو نہ بتا سکے، لیکن انھوں نے ٹیم کو ریڈیو پر میرے پہنچنے کی اطلاع دینے کا ضرور وعدہ کیا۔ اور ہوا یہ کہ جب میں اور میرے لاؤسی ساتھی زیپون کے علاقے میں پہنچے تو ہمیں کسی سے اس مقام کا پتا دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ سڑک نمبر ۹ سے، جس پر سے ہم آئے تھے، ہوچی منہ ٹریل پر صرف چند میل آگے ہمیں ایک لاؤسی فوجی ہیلی کاپٹر کے گھومتے ہوئے پر دکھائی دیے۔ اس کی جانب رخ موڑ کر ہم تھوڑا سا آگے چلے تو ایک نیم حقیقی منظر ہمارے سامنے تھا: ایک امریکی ملٹری کیمپ، سبز فوجی خیموں اور تین سیاہ جیپوں سمیت۔ آس پاس امریکی فوجی نہیں تھے بلکہ درجنوں لاؤسی دیہاتی جو میلوں پیدل چل کر وہ تماشا دیکھنے آئے تھے جو یقیناً اپنی مثال آپ تھا۔ ایک نوعمر لاؤسی لڑکے نے ہمیں جنگل میں سے ہو کر پہلو کی جانب سے پہاڑ پر اس مقام پر لے جانے کی پیش کش کی جہاں امریکی کام میں مصروف تھے۔ گھنٹے بھر میں طے ہونے والے اس راستے کا ایک حصہ بمباری سے پڑنے والے گہرے گڑھوں کے کنارے کنارے گزرتا تھا اور ایک جگہ ہم ایک بم کے زنگ لگے خول کے پاس سے گزرے جس کے پہلو پر اسٹینسل سے

Scanned with CamScanner

صفائی کے ساتھ رنگے ہوئے لفظوں میں تحریر تھا: DISPENSER AND BOMB - 122 LBS۔ مجھے ایک ایسے دیہاتی کے پیچھے پیچھے چلنے پر اطمینان محسوس ہوا جو اس جنگل سے واقف تھا، صرف بمباری کے گڑھوں اور ممکنہ بموں کے باعث نہیں بلکہ اس لیے بھی کہ امریکیوں نے مجھے بتایا تھا کہ یہ جنگل، اپنے ہمسایہ ویت نام کے جنگلوں کی طرح، ایک مخصوص سانپ کا مسکن ہے جسے مقامی زبان میں "ایک قدم والا سانپ" کہا جاتا ہے، کیوں کہ اس کے کاٹنے کے بعد ایک قدم سے زیادہ چلنے سے پہلے پہلے متاثرہ عضو کو کاٹ پھینکنا پڑتا ہے ورنہ آدمی مر جاتا ہے۔ (میں نے امریکا لوٹ کر اس سانپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی جس کا نام میں نے پہلی بار ویت نام کی جنگ کے دوران سنا تھا۔ برونکس کے چڑیاگھر کے Herpetology کے شعبے کے سربراہ جان بہلر نے بتایا کہ یہ بات محض یوں ہی مشہور ہو گئی ہے ورنہ لاؤس اور ویت نام میں پائے جانے والے سانپوں کی قسموں میں سے کوئی ایسی نہیں جس کے کاٹنے سے آدمی پندرہ منٹ سے پہلے مر جائے۔)

چلتے چلتے ہم آخر جنگل کے ایک صاف کیے ہوئے قطعے میں پہنچے جہاں ایک امریکی سارجنٹ ایک لکڑی کی میز کے پاس بیٹھا سنتری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ اس نے یک لخت میں تر امریکی اور پانچ لاؤسیوں کو جنگل سے برآمد ہوتے دیکھ کر تعجب سے پلک تک نہ جھپکائی۔ اس نے سر اٹھا کر محض اتنا پوچھا، "میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟" اس کے لہجے سے پوری طرح واضح ہو گیا کہ ہم جو کوئی بھی ہیں اور جہاں سے بھی آئے ہیں، اگر ہمارے پاس سرکاری اجازت نامہ نہیں ہے تو ہمیں فوراً واپس جانا ہو گا۔ خوش قسمتی سے یہاں موجود امریکیوں کو سفارت خانے کا ریڈیو پر بھیجا ہوا پیغام مل چکا تھا، چناں چہ ٹیم کا سربراہ میجر جیمز کلیپ مجھے اپنا کام دکھانے لے گیا۔ ہم کھدائی کے ایک ایسے گڑھے کے گرد سے ہو کر گزرے جو بعد میں دیکھنے پر آثارِ قدیمہ کی پیشہ ورانہ کھدائی کا سا مقام ثابت ہوا۔ وہاں ہوائی کے سنٹر سے آیا ہوا ایک بشریات داں بھی موجود تھا۔ زمین کے اتنے رقبے کو جہاں جہازوں سے کھینچے ہوئے فوٹوؤں اور آس پاس کے باشندوں سے بات چیت کے نتیجے میں اندازہ ہوا تھا کہ کوئی طیارہ گرا تھا، رسیاں تان کر مختلف حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا اور مزدور ان حصوں میں مٹی کھود کھود کر بالٹیوں میں ڈال رہے تھے اور پھر اس مٹی کو چھلنیوں میں چھان چھان کر ہڈیوں کے ٹکڑے تلاش کیے جا رہے تھے۔ "ہم جو کچھ کر رہے ہیں وہ

Scanned with CamScanner

ہم پر ہمارے برادر فوجیوں کا قرض ہے،" میجر کلپ نے مجھے بتایا۔ "انھیں واپس اپنے خاندانوں کے پاس جانے کا حق پہنچتا ہے۔ لاؤسیوں کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے مگر ہمارے لیے ان کی باقیات کو تلاش کرنا بہت اہم ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے کھلی چھٹی ہے کہ اس کام پر جتنا چاہوں خرچ کروں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ میرے کسی مطالبے کو آج تک ٹھکرایا نہیں گیا۔ میرے پاس آرمی، میرینز، نیوی ڈاکٹر، ایرفورس کا ایک ٹیکنیشین، سب موجود ہیں ـــــ فوج کے سب شعبے پوری طرح اس کام میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ تمام بحرالکاہل سے طیارے مہیا کیے جاتے ہیں۔ حکومت اس بارے میں بالکل پُرعزم ہے۔ کبھی یہ نہیں سننا پڑتا کہ ہم یہ نہیں کر سکتے؛ ہمیشہ یہی جواب ملتا ہے کہ ہمیں بتاؤ کہ اس مقصد کے لیے ہمیں کیا کرنا ہوگا۔"

اس مقام پر جو بات خاص طور پر نمایاں تھی وہ امریکیوں اور لاؤسیوں کے درمیان، جو سب کے سب ٹی شرٹس میں ملبوس تھے، آپس میں پایا جانے والا مکمل تعاون تھا۔ پھاوڑے سے زمین کھودنے والے ہر امریکی کے ساتھ ساتھ ایک لاؤسی تھا، جسے اسی کام کے لیے قریبی گاؤں سے حاصل کیا گیا تھا۔ جس وقت مٹی کو چھلنی میں چھانا جا رہا ہوتا تھا، تب چھلنی کو ایک طرف سے ایک امریکی اور دوسری طرف سے ایک لاؤسی تھامے ہوتا۔ خود میجر کلپ کا ہم رُتبہ ایک لاؤسی فوجی وہاں موجود تھا۔ ہر امریکی کو اپنے سینے پر لگانے کے لیے ایک بلا دیا گیا تھا جس پر اس کے نام کا پہلا جز لاؤسی حروفِ تہجی میں تحریر تھا، اور اسی طرح ہر لاؤسی کا نام اس کے سینے پر انگریزی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ لاؤسی اور انگریزی دونوں سے واقف ایک امریکی اور ایک لاؤسی ترجمانی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ اگرچہ امریکی اور لاؤسی باشندوں کو ساتھ کام کرتے کرتے صرف چھ دن ہوئے تھے، ان کے مابین ایک دوسرے کے لیے سچی رفاقت اور ہمکاری کا جذبہ محسوس کیا جا سکتا تھا جس کا اظہار ان کے باہمی ہنسی مذاق سے متواتر ہو رہا تھا۔ "گاؤں والوں کو ہمیں دیکھ کر ویت نام کی جنگ کا خیال نہیں آتا،" میجر کلپ نے کہا۔ "لاؤسی ہم سے اس سے بہتر سلوک کر ہی نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ مددگار بھی ہیں۔ جب لاؤسی ہمارے ساتھ کام کرتے ہیں تو وہ مرد، عورت، کالے، سفید، ہر طرح کے امریکیوں کو دیکھتے ہیں ـــــ امریکی کس قدر متنوع قوم ہے۔"

میجر کلپ نے مجھے کیمپ میں جا کر نیوی ڈاکٹر، جینیفر رووہ، سے بات چیت کرنے کا مشورہ دیا۔ کھدائی کی اجازت کے سلسلے میں ہونے والے معاہدے کے تحت امریکی حکومت نے اس جگہ

Scanned with CamScanner

حکومت امریکی ڈاکٹر کو اجازت دے رکھی ہے کہ وہ چاہے تو آس پاس کے گاؤں والوں کا معائنہ کر کے انھیں اپنے پاس موجود دوائیں دے سکتی ہے۔ یہ خبر ہر جانب پھیل گئی، اور اس علاقے میں جہاں علاج معالجے کی کوئی سہولت موجود نہیں ہے، ڈاکٹر روہ نے خود کو مریضوں کے ایک سیلاب میں غرق ہوتے محسوس کیا۔ "میں چند دنوں میں سات سو اسی مریضوں کا معائنہ کر چکی ہوں،" اس نے بتایا۔ "یہاں لوگ چھ سات مختلف گاؤں سے آتے ہیں۔ اس علاقے کے رہنے والوں میں سانس کی نالی اور جلد کے امراض عام ہیں، اور پیٹ کے کیڑوں کے بھی بہت مریض ہیں۔ ہمارا دواؤں وغیرہ کا ذخیرہ اس تیزی سے ختم ہوا کہ کل مجھے ہیلی کاپٹر میں سونا کھیت جا کر اس کے مزید دوائیں لانی پڑیں۔ یہ لوگ کسی ڈاکٹر کو پا کر بے اندازہ خوش ہیں۔ یہ لوگوں کے لیے یہاں کا سب سے دلکش نظارہ ہے۔ کبھی کبھی تو پچاسوں لوگ دن بھر کھڑے تکا کرتے ہیں۔" دوپہر کو، جس وقت میں ڈاکٹر روہ کے خیمے سے باہر نکل رہا تھا، لوگ ایک لمبی قطار میں کھڑے صبر سے اس کے عارضی کلینک کے کھلنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کلینک دوبارہ کھلنے کا وقت دو بجے تھا۔ ان لوگوں میں سے بعض کے ہاتھوں میں زندہ مرغیاں تھیں جو وہ ڈاکٹرنی کو اپنے شکر کے اظہار کے طور پر دینے کے لیے ساتھ لائے تھے۔ لیکن آسمان سے اتری ہوئی یہ علاج کی سہولت بہت دنوں تک قائم رہنے والی نہ تھی۔ میرے دورے کے دو دن بعد کھدائی کا کام پورا ہو گیا۔ یہ کھدائی ناکام ثابت ہوئی، کیوں کہ وہاں سے امریکی فوجیوں کی باقیات نہ مل سکیں۔ کیمپ اکھڑ کر روانہ ہو گیا اور سونگ مینہ ٹریل پر زندگی اپنے معمول پر لوٹ گئی۔

**

آج

کراچی کی کہانی (۱)

مادن مل سوت چند　　جال برنش　　کیول رام رتن مل ملکانی　　پیر علی محمد راشدی

گوبند رنا تھ گپتا　　لوک رام ڈوڈیجا　　سہراب کٹرک　　ظہور احمد

گوپال داس کھوسلہ　　موہن کلپنا　　شیخ ایاز　　سوبھو گیانچندانی　　کیول موٹوانی

حاتم علوی　　حسن حبیب　　اے کے بروہی　　انوار شیخ

میر امداد علی　　حمید الحمید شیخ　　حسن منظر　　اسد محمد خاں

بیگوڈ کابلہ　　انیتا غلام علی　　عارف حسن

۳۰۵ صفحات، کراچی کے مختلف ادوار کے ۲ نقشے

مجلد، قیمت: ۱۵۰ روپے

کراچی کی کہانی (۲)

فہمیدہ ریاض　　اختر حمید خاں　　آصف فرخی

محمد حنیف　　زینت حسام　　بگسن ستوئی　　شریف سدو

لیاقت منور　　جیکسٹر بھٹی　　نسرین اسٹیفن　　آصف شہزاد

محبوب جان　　تسنیم صدیقی　　کینتھ فرنانڈیز

پال فاؤنڈ لنڈن　　اکبر زیدی　　مارک ٹلی　　عارف حسن

۳۰۸ صفحات، کراچی کے بارے میں اہم اعداد و شمار، کتابیات

مجلد، قیمت: ۱۵۰ روپے

Scanned with CamScanner

تماس الوسئے مارتینیز (Tomas Eloy Martinez)

تماس الوسئے مارتینیز ہسپانوی زبان کے ادیب ہیں اور ۱۹۳۴ میں ارجنٹینا میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اخبار نویس اور ایڈیٹر کے طور پر اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا، لیکن ۱۹۷۵ میں ازابیل پیرون کی حکومت کے ہاتھوں مشکلات پیش آنے پر انھیں ملک چھوڑ کر آٹھ برس وینیزویلا میں مقیم رہنا پڑا۔ ۱۹۸۴ میں وہ ایک فیلوشپ پر امریکا آ گئے جہاں انھوں نے اپنی کتاب The Peron Novel لکھی۔ اس کے بعد سے وہ دنیا کی مختلف یونیورسٹیوں میں لاطینی امریکی ادب پڑھانے اور کتابیں لکھنے میں مصروف رہے ہیں۔ ان کی کتاب Santa Evita، جس کے نویں باب کے ایک جز کا ترجمہ یہاں ایک مختصر کہانی کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، ۱۹۹۶ میں انگریزی میں شائع ہوئی۔ اس ناول کا مرکزی کردار ارجنٹینا کے فوجی آمر جنرل پیرون کی بیوی ایویتا ہے جو اپنے شوہر کے ساتھ ملک کے اقتدار میں شریک تھی اور رفتہ رفتہ ایک لیجنڈ کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ اس کہانی میں تیسری دنیا کی عوامی یا عوام پسند سیاست کی ایسی جھلک دکھائی دیتی ہے جو ہمارے خطے میں بھی زیادہ غیرمانوس معلوم نہیں ہو گی۔

ہیوگو فان ہوفمنسٹال (Hugo von Hofmannsthal)

ہیوگو فان ہوفمنسٹال (۱۸۷۴ - ۱۹۲۹) ایک معروف جرمن ادیب اور شاعر ہیں۔ ان کی جس کہانی کا اردو ترجمہ "آگ کے رنگ" کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے وہ انگریزی میں An Episode in the Life of the Marshal de Bassompierre کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔ باسوم پیئر ایک حقیقی شخصیت تھا اور اپنی زندگی کا یہ قصہ اس نے ۱۶۶۵ میں اپنے الفاظ میں لکھا تھا جسے بعد میں ہوفمنسٹال نے دوبارہ تحریر کیا۔ یہ ترجمہ اردو کے ممتاز ادیب اور مترجم محمد سلیم الرحمٰن نے ۱۹۶۰ کے عشرے میں ہفتہ وار رسالے "لیل و نہار" کے لیے کیا تھا اور انھوں نے "آج" میں اشاعت کے لیے اس پر نظرثانی کی ہے۔

Scanned with CamScanner

تامس الوئے مارتینیز

انگریزی سے ترجمہ: افضال احمد سید

وعدہ

اُسے دن اور وقت بالکل ٹھیک طور پر یاد تھا۔ اتوار ۵ ستمبر ۱۹۴۸ کو بارہ بج کر دس منٹ پر ریالٹو کے مالک نے اسے شاہراہِ آسٹریا پر واقع صدارتی قیام گاہ پر جانے کا حکم دیا تھا جہاں جا کر اسے پروجیکٹر پر چند فلمیں چلانی تھیں۔ "وہاں ایک چھوٹا سا مووی تھیٹر ہے،" اس نے اسے بتایا تھا۔ "اس کی مشینیں بالکل نئی اور بہت قیمتی ہیں۔" فلمی صنعت کے کارکنوں کی ہڑتال تھی اور مووی تھیٹر تین دن کے لیے بند تھے، مگر ایلجینو ایستور کام کرنے سے انکار نہ کر سکا۔ ہفتے کے ساتوں دن اس کے مالک کا انگوٹھا اس کے سر پر ہوتا تھا۔ اسی کی بدولت وہ مووی تھیٹر کے عقب میں ان دو کمروں کا کرایہ ادا کرنے کے قابل تھا جن کے رنگ کی تہیں جھڑ رہی تھیں اور جہاں وہ اپنی بیوی لیدیا اور اپنی ڈیڑھ سالہ بچی کے ساتھ رہتا تھا۔

تین بجے ایک سرکاری گاڑی اُسے لینے کے لیے آئی۔ پندرہ منٹ کے بعد اسے شاہراہ آسٹریا پر واقع صدارتی محل پر اتارا گیا اور اسے تھیٹر کے تنگ بوتھ میں پہنچا دیا گیا جہاں فلم کی ریلیں دو اونچے ڈھیروں میں جمع تھیں۔ ہوا گھٹی ہوئی تھی اور سلولائیڈ کی بھینی خوشبو قالین پر کسی عمر رسیدہ خدمت گار کی طرح گھسٹ رہی تھی۔ آٹھ ریلیں ایک ہی فلم کی تھیں جس کے بارے میں ایستور کو کچھ علم نہیں تھا؛ تین ریلیں "ارجنٹینا کا تصویری خبرنامہ" کی مختلف قسطوں کی تھیں۔ فلم دکھانے کے سوراخ سے اسے ایک اسکریننگ روم دکھائی دیا جس میں بیس بچھے ہوئے

کرسیاں پڑی تھیں۔ ہوزے سیمپیو ریستورگا ایک منضبط شخص تھا جو غیر مبہم اشکال کی دانش پر اعتبار کرتا تھا۔

ایک بٹلر نے اسے روشنیاں مدھم کرنے اور کسی کا انتظار کیے بغیر فلم چلانے کو کہا۔ فلم کے ابتدائی ٹائٹل کے رک رک کر چلنے کے دوران اس نے ایک پرچھائیں کو داخل ہوتے اور کمرے کے آخری سرے پر، باہر نکلنے کے دروازے کے قریب، ایک کرسی پر بیٹھتے دیکھا۔ فلم کا نام The Prodigal Woman تھا اور اس کے ستارے خوان ہوزے میگوئز اور ایوا ڈوارٹ تھے۔

فلم کی ایوِتا اور اُس ایوِتا میں جسے ہر شخص جانتا تھا، زمین آسمان کا فرق تھا۔ فلم کی ایوِتا سیاہ بالوں اور نہایت سیاہ آنکھوں والی ایک مقدس خاتون تھی جو ہمیشہ سر پر چادر والا رومال باندھے اور ماتمی لباس پہنے رہتی۔ اُس علاقے کی حدود میں جسے خاتون نے "میری دیہی جاگیر" سمجھا، ایک بند تعمیر ہو رہا تھا۔ دیہاتیوں کی ختم نہ ہونے والی لہر، اُس کے وہاں سے گزرتے وقت اس کی انگوٹھی کو چومتے ہوئے اور اُسے "غریبوں کی چھوٹی سی ماں" پکارتے ہوئے، اس کے سامنے زمیں بوس ہوتی جا رہی تھی۔ عورت نے تکریم کے اس اعلیٰ جذبے کے صلے میں جواہر، کمبل، لٹکے، اور مویشیوں کے چھوٹے چھوٹے ریوڑ تحفوں کے طور پر بانٹے۔ فنی خطابت کے مظاہرے کے لیے اس نے پھٹی ہوئی آواز میں ناممکن فقرے ادا کیے، مثلاً "مجھے ایک تیر لا دو اور میں اسے کائنات کے سینے میں دفن کر دوں گی،" یا "اے خدائے برتر! استقفِ اعظم کو معاف فرما کیوں کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں انہیں اس کی آگہی نہیں ہے۔" یہ فلم اپنے موضوع اور اپنی زبان کی وجہ سے، فلموں کی ایجاد سے قبل کسی اور صدی میں بنائی گئی معلوم ہوتی تھی۔

فلم کے دکھائے جانے کے دوران پرچھائیں اپنی پشت دار کرسی سے نہیں ہلی۔ ریستورگا نے اسے موکھے میں سے دیکھا، مگر اسے اس کے خدوخال واضح طور پر نظر نہیں آئے۔ اس نے وقفے وقفے سے اسے کھنکارتے یا ہیروئن کے زوال کے ساتھ آہیں اور دردانگیز سسکیاں بھرتے ہوئے سنا۔ اسکرین پر خودکشی کرنے والی کی ایک غیر واضح شبیہ اُبھری: خاتون نے ایک خنجر یا زہر کی شیشی کے ذریعے دنیا کو الوداع کہہ دیا تھا۔ تب اسکریننگ روم کی پشت دار کرسی سے ایک شکستہ سی آواز آئی:

سنو، بتیاں مت جلاؤ۔ آگے چلو اور خبرنامہ دکھاؤ۔

Scanned with CamScanner

اس نے اس آواز کو پہچان لیا۔ اس نے اُسی درشت لہجے میں خطاب کیا تھا جو یوتا کی تقریروں میں ہوتا تھا، اور ویسے ہی الفاظ استعمال کیے جو عامیانہ انداز اور بدمذاقی کے درمیان ڈولتے رہتے تھے۔ ارجنٹینا کے تصویری خبرنامے کی بےرحم روشنی میں آخرکار اس نے اسے دیکھ لیا جیسی وہ اصل میں تھی اور جیسا کہ فلمیں اسے اپنی گرفت میں لانے سے قاصر رہتی تھیں: بکھرے ہوئے بال جنھیں ایک معمولی ہیئر بینڈ نے تھام رکھا تھا، اسکرٹ کے اوپر رکھے ہوئے کھردرے ہاتھ، بالائی جسم پر ایک گھریلو لبادہ اور ہونٹوں کے اُبھار کے اوپر لمبی ستواں ناک۔ یہ وہی تھی۔ وہی شبیہ جس کے سامنے اس کی بیوی ہر رات کو سونے سے پہلے دعائیں مانگا کرتی تھی۔ وہ یہاں، صرف چند قدم کے فاصلے پر موجود تھی۔

ایچینو کو 'ارجنٹینا کے تصویری خبرنامے' کی تمام ہفتہ وار اقساط زبانی یاد تھیں، مگر اس نے یہ قسط، جو وہ اس وقت چلا رہا تھا، پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس پر کوئی قسط نمبر یا اجرا کی تاریخ بھی نہیں تھی اور اس کے شاٹ طوالت میں غیر متناسب تھے؛ کبھی بہت طویل، جن میں پوری گفتگو کا احاطہ کیا گیا تھا، اور کبھی بہت مختصر، جن میں ہجوم، چہروں، لباسوں کی تفصیل وغیرہ کو نہایت سُرعت کے ساتھ پیش کیا گیا تھا۔ خبرنامے کے پہلے حصے میں ایویتا لکھنے کی میز پر تنہا بیٹھی کاغذات کو الٹ پلٹ کرتی رہی اور پھر اس نے انھیں دوبارہ ترتیب سے رکھا۔ بالوں کی ایک بڑی سی لٹ اس کی پیشانی پر گر رہی تھی "میری ہم وطن عورتو، کامریڈو اور دوستو!" اس نے کاغذ کو دیکھ کر پڑھا۔ اس کی آواز کرخت اور غصے دار تھی۔ 'میں آپ سے باتیں کرنے آئی ہوں عورتوں کے ووٹ دینے کے حق پر، ایک دیہاتی لڑکی کا دل لیے جو محنت مشقت کے سادہ اور طاقتور اصولوں پر پروان چڑھی ہے۔' اسکریننگ روم کی ایویتا اپنے ہونٹوں کو نیوزریل والی ایویتا کے الفاظ دُہراتے ہوئے بے آواز جنبش دینے لگی؛ اس کی انگلیاں اسکرپٹ سے مختلف کسی اور زاویاں میں آگے پیچھے حرکت کر رہی تھیں ـــــ اس خاموش سوانگ نے لفظوں کے معنی تبدیل کر دیے۔ اگر اسکرین کی ایویتا نے کہا، 'میں اپنی زندگی کی ساعتوں کو اس عظیم کام کے لیے جو جنرل پیرون نے انجام دیے ہیں، نثار کرتی ہوں،' تو اسکریننگ روم کی ایویتا نے اپنا سر جھکایا، اپنے ہاتھوں کو سینے تک بلند کیا یا انھیں نادیدہ حاضرین کی جانب اس برجستگی سے پھیلایا کہ لفظ پیرون درمیان ہی میں کہیں کھو گیا اور صرف ایویتا کے نام کی گونج سنائی دے سکی۔ ایسا معلوم

Scanned with CamScanner

ہوتا تھا جیسے ماضی کی تقریروں کو دوبارہ سنتے ہوئے وہ مستقبل کے لیے اسکرین کے حیرت انگیز آئینے کے سامنے ریہرسل کر رہی تھی جس پر جو کچھ منعکس ہو رہا تھا وہ وہ نہیں رہ گیا تھا جو وہ کر سکتی تھی بلکہ وہ سب کچھ تھا جو دوبارہ نہیں ہو سکے گا۔

شبیہیں ایک سرکاری تقریب سے دوسری سرکاری تقریب پر جھٹکوں کے ساتھ گزر رہی تھیں۔ کبھی کبھی حزبِ اختلاف کے مائندے تیزی سے گزرتے ہوئے مناظر میں مخالفانہ نعرے بازی کرتے دکھائی دیتے کہ "یہ عورت جسے کسی نے کسی منصب کے لیے منتخب نہیں کیا ہے، ہر چیز میں دخل دیتی ہے۔" اپنی نشست پر بیٹھی ایویتا نے اپنے ہاتھوں کے پُرغرور اشارے سے ان الفاظ کو اڑا دیا۔ آخر میں اسے ایک دھوپ بھرے دن میں پلازا دی مایو پر ایک ہجوم کی جانب ہاتھ لہراتے اور ایک مسودے پر مشکوک انداز میں غور کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا جس کی لفظی کسی شکم بند لباس کی طرح اُسے بے آرام کیے ہوئے تھی۔ "میری ہم وطن عورتو!" وہ کہہ رہی تھی، "میں نے اسی وقت قومی حکومت سے براہِ راست اطلاع وصول کی ہے کہ نئے قانون نے ارجنٹینا کی تمام عورتوں کے ووٹ دینے کے حق کی توثیق کر دی ہے۔" دوسری ایویتا، جو کہ اپنی ہتھےدار کرسی پر ہے، اسی فقرے کو دوسری اشارتی حرکات کے ساتھ دُہرائے جا رہی تھی جیسا کہ اسٹیج پر ریہرسلوں میں ہوتا ہے۔

یوروپ کے دورے کی تصویریں اس کے فوراً بعد ہی نمودار ہونے لگیں۔ ایویتا ایک لمبی، بے آستین قمیص، پلیٹ فارم جوتے اور جون کرافورڈ کی طرح کا بارنگین چشمہ پہنے راپالو کے ساحل پر چہل قدمی کر رہی تھی۔ وہ لیٹے، ایک بےجان آسمان کے نیچے چل رہی تھی جو سمندری بگلوں کے شور سے بھرا ہوا تھا۔ محافظوں کا ایک دستہ اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ کیمرہ جلد ہی یک لانگ شاٹ کے لیے دور ہٹ گیا اور ایک ہلکی سے، جو غالباً ہوٹل کا نام ("ایکسلسیئر") ظاہر کرنے والے ایک نیون سائن کی وجہ سے غیر نمایاں ہو گئی تھی، اس کی شبیہ دکھائی گئی۔ اس نے قمیص کو ریت پر چھوڑ کر سمندر میں چھلانگ لگائی۔ ٹل کھاتی ہوئی لہروں کے درمیان اس کی ٹانگیں بار بار نظر آتی تھیں اور غسل کی ایک سفید ٹوپی نے اس کے سر کو بدنما بنا رکھا تھا۔ ساحل پر کوئی اور ذی روح دکھائی نہیں دیتا تھا مگر شیشوں کے دوسری طرف افق ساحلی چھتریوں سے بھرا تھا۔

وہ کتنی تنہا نظر آ رہی ہے، ایچینو نے سوچا۔ یہ تمام چیزیں جو اس کے پاس تھیں، ان کا کیا

Scanned with CamScanner

حاصل ہے؟

اگلے خبرنامے میں ان عکسوں کو دہرایا گیا تھا جو اس کے سفرِ روم کے دوران تیز اور مسلسل رو پر محیط تھے: خاتونِ اوّل کی ویا دیلا کونچیلیازونے کی طرف سے چار سفید گھوڑوں والی بگھی میں شاہانہ آمد، اس کے وفد کے ارکان کا کلیسائے پطرس کے ستونوں اور وسٹی کن کے چوک میں کالیگیولا کی اوبیلسک کو ہکا بکا ہو کر کمال حیرت سے تکنا، سان داماسو کے احاطے میں پاپائی مصاحبوں کی جانب سے اس کا استقبال، چست صدریاں پہنے نیزہ برداروں کے جلو میں اس کا پیو کلیمنتینو کے عجائب خانے تک جانا جس کے دوران ایک قدیم پاپائی سورما، اپنی ایک آنکھ کے اوپر ایک غلاف لگائے اور سیاہ برجیس پہنے، اس کے ساتھ ساتھ رافیل کی کاڑھی ہوئی تصویروں، پانچوں کے تعویذِ قبر اور جانوروں کے مرمریں مجسموں کی طرف اشارہ کرتا چل رہا تھا اور ایک چوغے میں ملفوف ایوبتا کوئی لفظ سمجھے بغیر مسکرا رہی تھی۔ وفد کے ارکان ایک بلند منقش چوبی دروازے کے سامنے رک گئے۔ ممتاز شخصیات کے عقب میں فواروں والے باغات کی غیرواضح اقلیدسی شکلیں اپنی جھلک دکھلا رہی تھیں۔ دفعتاً سب لوگ خاموش ہو گئے۔ پوپ پائیس دوازدہم ایک نیم تاریک محراب کے نیچے نمودار ہوا اور ہاتھ بڑھا کر پنٹ تعارف کرایا۔ ایوبتا نے دوزانو ہو کر اس کی انگشتری کے پاپائی نگ کو بوسہ دیا جسے کیمرے نے بے باکی کے ساتھ کلوز اپ میں لینے کے لیے زوم کیا۔ خبرنامے کی تمام قسطیں عموماً اسی شاٹ پر ختم ہوتی تھیں۔

ارکینِ وفد اب پاپائی کتب خانے میں داخل ہوئے اور قبطی مخطوطات، ساعات کی کتابوں اور گٹن برگ کی انجیلوں کے پاس ٹھہرے۔ خاتونِ اوّل سر جھکا کر چل رہی تھی اور یوروپ کے دوسرے مقامات کے معمول کے برخلاف یہاں اس نے اپنا منھ نہیں کھولا تھا۔ لائبریری کے وسط میں سیدھی پشت والی دو کرسیوں کے ساتھ شطرنج کے سے سفید اور سیاہ خانوں والی ایک میز تھی۔ پونٹیف کی جانب سے ایک اشارہ ہونے پر وہ دونوں بیٹھ گئے۔ وہ ڈرتے ڈرتے بیٹھی تھی اور اس نے اپنی پشت کرسی سے نہیں لگائی تھی۔

'پارلا، فیلیامیا، تی اسکولتو،' پائیس دوازدہم نے کہا۔

ایوبتا نے، ریڈیو کے کسی سوپ اوپیرا کی طرح، یہ الفاظ ادا کیے:

ہولی فادر، میں سمندر پار سے اطاعت میں آئی ہوں۔ مجھے اجازت دیجیے کہ میں عیسائی

معاشرے کی ان بنیادوں کے بارے میں بتاؤں جو جنرل پیرون ارجنٹینا میں یسوع مسیح اور آقائے ربانی کے فیض سے تعمیر کر رہے ہیں۔"

"خدائے برتر اس عمل کو برکت دے گا،" پائیس دوازدہم نے ہسپانوی زبان میں جواب دیا۔ "میں ہر روز اپنے محبوب ارجنٹینا کے لیے دعا کرتا ہوں۔"

"میں بے حد متشکر ہوں،" ایویتا نے کہا۔ "مقدس باپ کی دعا آسمان تک زیادہ جلد پہنچتی ہے۔"

"نہیں، میری بچی،" پائیس دوازدہم نے چیشائر بلے کی سی مسکراہٹ کے ساتھ وضاحت کی۔ "خدا تمام انسانوں کی دعائیں یکساں توجہ کے ساتھ سنتا ہے۔"

لائبریری کے دروازے کے قریب کھڑے سوئٹزرلینڈی محافظ اپنے نیزے بالکل سیدھے تھامے ہوئے تھے۔ کھڑے سخت چنٹ دار کالر اور گھٹنوں تک برجیس پہنے اور پٹی قمیص کے کف تک پر تمغے لگائے پاپائی سورماؤں کے پیچھے کارڈینلوں کی کلف دار برادری، پاپائی محل کی راہبائیں اور قابل احترام خواتین تھیلوں کے ساتھ لگی انتظار کر رہی تھیں۔ ایک رازداری کے ساتھ، جسے کیمرے نے واضح طور پر محفوظ کر لیا، پونٹیف نے اپنی چھنگلی کو حرکت دی؛ اسپاٹ لائٹ کی بے رحم روشنی میں اس کی انگلی، افعی کی زباں کی طرح لمبی اور چھریری، اچانک سرعت سے نمودار ہوئی۔ یہ ضرور کوئی مخصوص اشارہ رہا ہوگا۔ لائبریری کے آخری سرے سے دو راہبائیں سونے کے پتر چڑھے ایک صندوق کو، جو تحائف سے لبریز تھا، اٹھائے ڈگمگاتی چلتی ہوئی آئیں۔ کارڈینلوں میں سے ایک نے بلند آواز میں اعلان کیا:

"اب ہز ہولی نیس ارجنٹینا کی خاتونِ اول کو یروشلم کی ایک تسبیح مقدس صلیبی جنگ کے تبرکات کے ساتھ پیش کر رہے ہیں..." پائیس دوازدہم نے حاضرین کے سامنے اس صندوق کی نمائش کی جس کے غلاف کو راہباؤں نے پہلے ہی اتار دیا تھا، جب کہ ایویتا نے اپنے ہاتھ پھیلائے اور ایک بھدی کورنش بجا لانے کی سعی کی۔ "ہز ہولی نیس سینیورا کو میڈالیا دورو دیل پونٹیفیکاتو سے بھی آراستہ کرنا چاہتے ہیں۔" ایویتا نے، شاید یہ باور کرتے ہوئے کہ پوپ اس کی گردن میں تمغے کا ربن ڈالنا چاہتا ہے، سر جھکا لیا، مگر موخرالذکر نے سفیروں اور کارڈینلوں کے دستے کو ایک سند دکھایا جس پر خود اس کی شبیہ تھی، اور اسے سرد مہری سے مہمان کے ہاتھ پر رکھ دیا، جس نے شہر شہر

Scanned with CamScanner

رکھا، "میں پوپ موم کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔" اس کے الفاظ ضائع ہو گئے، کیوں کہ اسی وقت ایک راہبہ نے صندوق کی تہہ سے روغنی رنگوں سے بنی ایک تصویر نکال کر پوسف کے حوالے کی جس نے چابک دستی سے اسے حاضرین کے ملاحظے کے لیے کھول دیا۔ "یہ

کارڈینل نے، جو میر تقریبات کی حیثیت سے بھی خدمت انجام دے رہا تھا، اپنا بیان جاری رکھا، "یہ یان فان آئیک کی بنائی ہوئی تصویر اِل ماترِمونیو دیلی آرنولفینی کی تقریباً بے نقص نقل ہے جسے ۱۴۳۴ میں لکڑی پر نقش کیا گیا تھا۔ یہ نقل ۱۵۴۸ میں پیسترو گوچی نے کینوس پر روغنی رنگوں سے بنائی تھی اور وہ شی کن کے ذخائر سے تعلق رکھتی ہے... بلکہ مجھے کہنا چاہیے کہ رکھتی تھی، کیوں کہ اسے ارجنٹینا کی حکومت کو تحفے کے طور پر پیش کیا جانے والا ہے۔" معزز خواتین نے تالیاں بجائیں اور اس طرح شاید آدابِ مجلس اور نظم و ضبط کے قواعد کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوئیں۔ ایویتا نے اپنی نظریں جھکائے رکھیں۔ "یہ تصویر جیووانی دی آریگو آرنولفینی اور اس کی بیوی جیووانا چینامی کی ہے جو لوکا کے ایک سوداگر کی بیٹی تھی۔ ان کے گرد عروسی کی علامت کے طور پر ایک شمع، چوبی تلووں والے جوتوں کی ایک جوڑی اور ایک کتا بنا ہوا ہے۔"

اپنی تختہ دار کرسی سے ہلے بغیر، اپنی ایک ٹانگ دوسری پر چڑھائے، ایویتا مسحور ہو کر اس منظر کو دیکھ رہی تھی۔ پائیس دوازدہم اٹھا اور فلم کی ایویتا کو کینوس پیش کرتے ہوئے بولا، "یہ تصویر، میری بیٹی، ازدواجی مسرت کی مکمل نمائندہ ہے۔ نوجوان آرنولفینی، کسی بھی اچھے شوہر کی طرح، طاقت اور تحفظ کی عکاسی کرتا ہے۔ اپنے تکمیل کے احساسات کے باوجود، جیووانا کچھ شکست خوردہ اور پریشان نظر آرہی ہے۔" اسکریننگ روم کی ایویتا نے اپنا ایک جوتا اتارا اور اپنے بیمر بینڈ کو ذرا ڈھیلا کیا۔ وہ بے چین اور سوچ میں گم نظر آرہی تھی جیسے اس نے اپنی زندگی کا ایک دن گنوا دیا ہو۔ اس وقت فلم کی ایویتا صاف لفظوں میں کہہ رہی تھی، "اسے پریشان ہونا ہی چاہیے، ہولی فادر، وہ حمل سے ہے۔ میرا خیال ہے اسے ساتواں مہینہ ہے۔" پائیس دوازدہم کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ ارجنٹینا کا سفیر اپنا ہاتھ اپنی گنجی ہوتی چندیا پر پھیرنے لگا۔ کئی کارڈینل بیک آہنگ کھانسنے لگے۔

"ابھی انھوں نے شب زفاف نہیں منائی ہے، میری بچی،" پوپ نے لطافت آمیز لہجے میں اس کی تصحیح کی۔ "جس وقت فان آئیک نے اس کی تصویر بنائی تھی، جیووانا غیر شادی شدہ تھی۔"

تمھیں جس چیز سے مغالطہ ہوا ہے وہ اس کا اونچا زیر جامہ ہے جس کی وجہ سے اس کا پیٹ پھولا ہوا نظر آ رہا ہے، مگر یہ اس عہد کی نوجوان خواتین کے فیشن کا تقاضا تھا۔ مگر خدا نے آرنولفینی کو بہت سی اولادوں سے نوازا۔ میری دلی خواہش ہے کہ وہ تمھیں بھی اولاد عطا کرے۔'

'ہمیں یہی امید رکھنی چاہیے، ہولی فادر،' ایوبتا نے جواب دیا۔

'تم ابھی جوان ہو، تمھارے جتنے چاہو بچے ہو سکتے ہیں۔'

'میں چند بچوں کی خواہش مند ہوں، مگر وہ ہوئے نہیں۔ میرے دوسرے ہزاروں بچے ہیں۔ وہ مجھے ماں کہتے ہیں اور میں انھیں اپنے ننھے منو شادی پکارتی ہوں۔'

'وہ سیاسی بچے ہیں،' پوپ نے کہا۔ 'میں ان بچوں کی بات کر رہا ہوں جو خدا عطا کرتا ہے۔ اگر تم ان کی خواہش رکھتی ہو تو تمھیں محبت اور دعاؤں کے ذریعے ان کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہو گی۔"

اسکریننگ روم کی تنہائی میں ایوبتا نے رونا شروع کر دیا۔ شاید یہ باقاعدہ رونا نہیں بلکہ صرف آنکھ میں اچانک آ جانے والا ایک آنسو تھا، مگر ایجینو نے، جو فلم ہیروں کی پشت اور گردن کی حرکت سے پیدا ہونے والے اشارات کے معنی دریافت کرنے میں غیر معمولی مہارت رکھتا تھا، ایوبتا کے کاندھوں اور انگلیوں کی ہلکی سی لرزش کی مدد سے، جو اس تک چوری چھپے پہنچ گئی تھیں، اس کی اداسی کو پڑھ لیا۔ اس عرصے میں کیمرہ رافیل کی خواب گاہوں اور بورجیا اپارٹمنٹوں میں حرکت کرنا شروع کر چکا تھا، مگر ایوبتا اس وقت تک جا چکی تھی؛ صرف اس کے باریک ریشمی لبادے میں ملبوس جسم کے بوجھل غموں کی نشانی باقی رہ گئی تھی۔ وہ نہ اسکرین پر تھی اور نہ اپنی نشست میں، بلکہ وہ اپنی ذات کے کسی پنہاں نظارے میں گم ہو چکی تھی۔

ایجینو نے اسے اسکریننگ روم کے ایک کونے تک جاتے دیکھا اور اس کے ٹیلی فون پر بات کرنے کی آواز سنی۔ اس کے احکامات خبر نامے کے صدا کار کی آواز کے ساتھ گڈمڈ ہو رہے تھے اور اسے بیچ بیچ میں سے چند الفاظ سنائی دیتے رہے:

'یہ خواب گاہیں ان عمارتوں کا حصہ ہیں جن میں جولیس دوم ۱۵۰۷ سے رہ رہا تھا۔' 'اگر تمھارے پاس گھنٹوں ہیں تو انھیں جلا دو۔' 'پیگرو' 'چھت پر بنی ہوئی تصویریں جو مقدس تثلیث کی عظمت کی نمائندہ ہیں، پیرو جینو کا عمل ہیں' 'حو حل جاتا ہے' 'ختم ہو جاتا ہے۔' 'پیگرو، جو لکھ پالیا'

نہیں گیا سلادیا جائے گا۔ کلیسا کی چھت نو دائروں میں منقسم ہے جنھیں، نیکل انجلو نے رفتہ رفتہ ستونوں، کنگروں اور محرابوں کی جدا جدا صورتیں دیں... میں ایک فریم بھی باقی نہیں رہنے دینا چاہتی، سن لیا تم نے؟ آٹھواں دائرہ سیلابِ نوح کو پیش کرتا ہے۔ نوح کی کشتی کو دھلے پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اپنی گردن آگے کو نہ نکالیں، ہر شے کا عکس آئینے میں پڑ رہا ہے تم فکر مت کرو، کوئی کچھ نہیں کہے گا، اگر کوئی بکواس کرتا ہے تو اسے مجھ سے نمٹنا ہو گا۔ نویں دائرے میں نوح کی سرشاری... انھیں جلا دو اور بس یہ معاملہ ختم...'

اسٹرجنگ روم کی بتیاں جل اٹھیں۔ اس سے پہلے کہ الیچینو اندازہ لگا سکتا کہ وہ کہاں ہے، اچانک وہ اسے پروجیکشن بوتھ کے دروازے کے پاس کھڑی ہوئی نظر آ گئی۔

"کیا تم پیرونسٹ ہو؟ مجھے تمہارے کالر پر پارٹی کا نشان دکھائی نہیں دے رہا۔" اس نے الیچینو سے کہا۔ 'شاید تم پیرونسٹ نہیں ہو!"

"میں اور کیا ہو سکتا ہوں، سنیورا!" الیچینو نے گھبرا کر جواب دیا۔ 'میں ہمیشہ نشان لگائے رکھتا ہوں... میں اسے ہمیشہ لگاتا ہوں...'

'تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے۔ ہم ان تمام لوگوں سے چھٹکارا حاصل کر لیں گے جو پیرونسٹ نہیں ہیں۔"

'میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا، سنیورا... میں قسم کھاتا ہوں... میں اسے گھر پر بھول آیا ہوں۔ میں ہمیشہ اسے اپنے کالر پر لگاتا ہوں، سنیورا! مجھ پر یقین کیجیے۔"

مجھے سنیورا مت پکارو! مجھے، ایویتا کہو۔ تم کہاں رہتے ہو؟"

'میں ریالٹو تھیٹر میں پروجیکشنسٹ ہوں، پالیرمو میں۔ میں اسی میں رہتا ہوں، اسٹیج کے پیچھے بنے ہوئے کمروں میں۔"

"میں اس بات کا خیال رکھوں گی کہ تمہیں اچھی رہائش مل جائے۔ دو ایک دن میں فاؤنڈیشن میں آنا۔"

میں آؤں گا، سنیورا، مگر شاید وہاں مجھے اندر نہ جانے دیا جائے۔"

کہنا کہ تمہیں ایویتا نے بلایا ہے۔ تم دیکھنا وہ تمہیں کتنی جلدی اندر جانے دیتے ہیں۔"

اس تصور میں کہ ایویتا کی دولت کی خواہش اور طاقت سے بنا ہوا مکان کیسا ہو گا، وہ اس رات

Scanned with CamScanner

پلک بھر بھی نہیں سو سکا۔ اس نے اپنی بیوی لیدیا سے مشورہ کیا کہ مکان کی ملکیت کے کاغذات وصول کرتے وقت انہیں کیا کہنا چاہیے، اور آخر کار وہ اس فیصلے پر پہنچے کہ سب سے زیادہ مناسب بات یہ ہوگی کہ ایک لفظ بھی نہ کہا جائے۔

دن کے تقریباً گیارہ بجے ہوں گے نیمیسیو ایستورگا نے فاؤنڈیشن کے دفتر میں جانے کی کوشش کی تاکہ ایوٹا سے وہ کچھ حاصل کرے جس کا اس نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ وہ دفتر کے آس پاس بھی نہیں پہنچ سکا۔ عمارت کے گرد ان لوگوں کی دوہری قطار لگی تھی جو مہربانیوں کے طلبگار تھے۔ ان کے انتظار کو قدرے مختصر بنانے کی غرض سے کچھ پیرونسٹ رضاکار لڑکیاں انہیں پروپیگنڈا پمفلٹ پڑھنے کو دے رہی تھیں اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد فولڈنگ کرسیاں ان ماؤں کو پیش کر رہی تھیں جو اپنے غیر معمولی طور پر بڑے پستانوں کو پوری شان سے کھول کر ان بچوں کو دودھ پلا رہی تھیں جو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل تھے۔ ایوٹا نہیں پہنچی ہے، ایوٹا نہیں پہنچی ہے۔۔ چست کلف دار وردیاں اور نرسوں کی سی ٹوپیاں پہنے رضاکار لڑکیاں بار بار یہ اعلان کر رہی تھیں۔

ان میں سے ایک کے پاس پہنچ کر نیمیسیو نے اسے بتایا کہ سنیورا نے بذات خود اسے آنے اور ان سے ملنے کو کہا ہے۔ مگر مجھے یہ نہیں معلوم کہ کس دن اور کس وقت، اس نے اس کے سوال کے بغیر ہی یہ وضاحت کی۔

تب تو تمہیں باقی سب لوگوں کی طرح قطار میں کھڑا ہونا پڑے گا، رضاکار نے کہا۔ یہاں لوگ رات ایک بجے سے کھڑے ہیں۔ اور پھر کوئی شخص کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ سنیورا آ بھی رہی ہیں یا نہیں۔"

ایستورگا اپنی بیوی لیدیا اور ننھی یولانڈا کو بانفیلڈ میں سسرال میں چھوڑ کر ٹھیک ایک بجے رات وہاں آ حاضر ہوا۔ "میں سہ پہر کو تقریباً تین بجے آؤں گا، اس نے ان سے کہا۔ تھیٹر میں میرا انتظار کرنا۔"

اس وقت تک تمہیں یقیناً خوش خبری مل چکی ہوگی، لیدیا نے قیاس دوڑایا۔

"امید ہے خبر اچھی ہی ہوگی،" اس نے کہا۔

فاؤنڈیشن کے بیرونی دروازے تک پہنچ کر اس نے دیکھا کہ بائیس افراد اس سے پہلے پہنچ

بچکے ہیں۔ ویران گلیوں میں دھندلکے کی بھیڑیں چل پھر رہی تھیں اور ان کے ممیانے کی آوازیں تمہاری ہڈیوں تک پہنچتی محسوس ہو رہی تھیں۔ لوگ کھانس رہے تھے اور جوڑوں کے درد کی شکایتیں کر رہے تھے۔ یہ بھی ایک ستم ظریفی تھی کہ شہر کے نام کا مطلب خوشگوار ہوا تھا۔

انجینو کو پتا چل گیا کہ ایویتا، اگر کسی دن آتی بھی ہے تو دس بجے سے پہلے نہیں آتی۔ وہ صدارتی قیام گاہ میں آٹھ اور نو بجے کے درمیان کافی اور ٹوسٹ کا ناشتہ کرتی تھی، فون پر وزرا اور گورنروں سے بات چیت کرتی تھی اور آخر میں فاؤنڈیشن آتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے گورنمنٹ ہاؤس میں جا کر اپنے شوہر سے پندرہ منٹ تک گپ شپ کرتی تھی۔ وہ دونوں دن بھر میں صرف اسی وقت ملتے تھے، کیوں کہ وہ اپنے کاموں سے فارغ ہو کر گیارہ بجے رات سے پہلے نہیں لوٹتی تھی اور اس وقت تک وہ سو چکا ہوتا تھا۔ فاؤنڈیشن میں ایویتا لوگوں کو طویل باریابی کا موقع دیتی تھی جس کے دوران وہ مہربانیوں کے طلبگار لوگوں سے ان کی زندگی اور ان کی پریشانیوں کی بابت سوالات کرتی، ان کے نقلی دانتوں کا معائنہ کرتی، اور ان کے بچوں کے فوٹوؤں پر تبصرے کر کے خود کو تفریح مہیا کرتی۔ ہر باریابی میں کم سے کم بیس منٹ لگتے تھے؛ اور اس رفتار سے، انجینو نے حساب لگایا، اس کی باری آتے آتے ساڑھے سات گھنٹے لگیں گے۔

صبح ہونے سے پہلے، بچوں کے رونے دھونے کی آوازیں برداشت سے باہر ہو گئیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مٹی کے تیل کے چولہے جلائے جا رہے تھے جن پر لوگ شیر خوار بچوں کے لیے دودھ اور ماتے بنانے کے لیے پانی گرم کر رہے تھے۔ انجینو نے اپنے پیچھے والے خاندان سے پوچھا کہ کیا انھوں نے کبھی پہلے بھی اس طرح گھنٹوں انتظار کیا ہے۔

'یہ تیسری دفعہ ہے کہ ہم یہاں آئے ہیں، اور ابھی تک ہم ایویتا سے نہیں مل سکے،' ایک نوجوان نے جس کی مونچھیں نیچے کو مڑی ہوئی تھیں، کہا۔ بولتے وقت وہ اپنی ڈھیلی نقلی بتیسی کو تالو سے ٹھیک کر رہا تھا۔ 'ہمیں ٹرین میں سان فرانسسکو سے یہاں پہنچنے میں دس گھنٹے لگے ہیں۔ ہم آدھی رات کو پہنچے تھے اور ہمیں بارہ نمبر دیا گیا تھا مگر دس نمبر تک پہنچتے پہنچتے جنرل نے سینیورا کو فوری طور پر طلب کر لیا اور ہمیں اگلے روز آنے کو کہا گیا۔ ہم سڑک پر سو گئے۔ صبح تقریباً چار بجے اٹھے۔ اس بار ہمیں ایک سو چار نمبر ملا۔ ایویتا کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ وہ خدا کی طرح ہے یا تو موجود ہوتی ہے یا غائب ہو جاتی ہے۔'

اس نے مجھے ایک مکان دینے کا وعدہ کیا ہے،" ایجینسو نے کہا۔ "تم لوگ یہاں کس لیے آئے ہو؟"

ایک بے حد دبلی پتلی لڑکی جس کی ٹانگیں چڑیوں کی سی تھیں، مونچھوں والے نوجوان کے پیچھے چھپ گئی اور اپنا منہ ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔ اس کا کوئی بھی دانت سلامت نہیں تھا۔

"ہمیں شادی کا جوڑا چاہیے،" اس آدمی نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ "ہم ایک بیڈروم کا مکان پہلے ہی خرید چکے ہیں اور میرے پاس وہ سوٹ ہے جس میں میرے پاپا کو دفن کیا جانا تھا۔ اگر اس کو شادی کا جوڑا نہ ملا تو پادری کسی بھی حال میں ہماری شادی نہیں کرائے گا۔"

ایجینسو ان دونوں کو تسلی دینے کی کوشش کرنا ضرور پسند کرتا، اگر اسے معلوم ہوتا کہ کس طرح۔

"آج قسمت ہمارا ساتھ دے گی،" آدمی نے کہا۔ "آج یہ ہمیں ضرور مل جائے گا۔"

"مجھے امید ہے خدا تمہاری سن لے گا،" لڑکی نے جواب دیا۔

اگرچہ قطار کونے تک پہنچ کر مڑ چکی تھی اور آخر میں کھڑے لوگوں کے سر تاریکی میں نظر نہیں آ رہے تھے، تاہم مجمع اپنی بدقسمتی کی ترتیب کا احترام کر رہا تھا۔ ایجینسو نے مصائب کی وہ ناقابلِ برداشت داستانیں سنیں کہ کوئی انسانی طاقت، یہاں تک کہ دیوتا کی طاقت بھی، ان خواہشات کی تکمیل کے لیے سلگتے ہوئے اشتیاق کو رفع نہیں کر سکتی تھی۔ وہاں ذکر تھا ان بچوں کا جو سوکھے کے مرض کا شکار ہو کر کوڑے کے ڈھیروں کے پاس گندے گڑھوں میں آہستہ آہستہ دم توڑ رہے تھے؛ ان ہاتھوں کا جنہیں چاقو کی طرح تیز ریل کی پٹریوں نے کاٹ دیا تھا؛ ان بے انتہا غل مچاتے ہوئے پاگلوں کا جو ٹین کی چھتوں والے غلیظ جھونپڑوں میں زنجیروں سے باندھ کر رکھے گئے تھے؛ ان گردوں کا جو کام کرنا چھوڑ چکے تھے، آنتوں کو چھیدتے ہوئے السروں کا اور ہرنیاؤں کا جو پھٹنے کے قریب تھے۔ اور اگر یہ تکالیف کبھی ختم نہ ہو سکیں؟ ایجینسو نے خود سے سوال کیا۔ اگر ان مصائب کا خاتمہ ہونے سے پہلے خود دیوتا کا خاتمہ ہو جائے؟ کیا ہو اگر یہ ثابت ہو جائے کہ دیوتا خدا نہیں ہے، جیسا کہ ہر شخص اسے سمجھتا ہے؟

صبح کی آمد نے اسے اچنبھے میں ڈال دیا کیوں کہ روشنی کی شعاعیں تاریکی کی شعاعوں سے مختلف نہیں تھیں: اُجالا بھی سیلن بھرا اور راکھ کے رنگ کا تھا۔ رضاکاروں نے کافی کے ساتھ رول

تقسیم کیے، مگر ایلیجنو نے کھانے سے انکار کر دیا۔ انسانی بد نصیبیوں کی فہرست نے اس کے حلق کو خشک کر دیا تھا ورنہ وہ کچھ بھی نگل نہیں سکتا تھا۔ اس نے اپنے خیالوں کو منتشر ہو جانے دیا اور بعد میں گزرنے والی ساعتوں میں حقیقت کا تمام تر ادراک کھو بیٹھا کیوں کہ اسے اس کا سامنا کرنے سے خوف آتا تھا۔

ایک وقت آیا جب قطار نے حرکت کرنی شروع کی۔ فاؤنڈیشن کے دروازے کھل گئے اور لوگ پالش کی ہوئی لکڑی کے زینوں پر آہستہ آہستہ چڑھنے لگے جن پر پیرونسٹ پارٹی کے نشان کی نمائش کرتے ہوئے بینر لگے تھے۔ اوپر کی منزل پر ریلنگ کو تھامتے ہوئے بریل کریم سے چمکائے ہوئے بالوں والے ملانویس اور کانوں میں پنسلیں اٹکائے رضاکار لڑکیاں آ جا رہی تھیں۔ قطار کمخواب کے پردوں کے درمیان چڑھتے ہوئے زینے تک گئی اور ایک بے حد فاخرانہ استقبالیہ کمرے تک پہنچی جو شیشے کے قطروں سے سجے فانوسوں سے روشن تھا۔ یہ منظر کسی گرجا گھر سے مشابہ تھا۔ کمرے کے وسط میں نشیب کی طرف ایک تنگ راستا تھا جس کے دونوں طرف لکڑی کی بنچیں لگی تھیں جن پر وہ خاندان بیٹھے انتظار کر رہے تھے جنہیں دوسروں کی طرح قطار میں کھڑا نہیں ہونا پڑا تھا۔ فضا سے نوزائیدہ بچوں کے بول و براز، گندے پوتڑوں اور بیمار لوگوں کی سڑنے کے بھبکے آ رہے تھے۔ یہ بدبو سیلن کی طرح سخت جان تھی اور اس کے رینے بعد میں کئی دن حافظے میں چبھتے رہتے۔

کمرے کی آخری حد پر، ایک لمبی میز کے کنارے ایویتا، بہ نفسِ نفیس، ایک کندن جوڑے کے ہاتھوں کو سہلا رہی تھی وہ بار بار اپنے کان ان کی تھر تھراتی آوازوں کے قریب لاتی اور پھر اپنا سر پشت کی طرف جھکاتی جیسے وہ ان ناقابلِ فراموش الفاظ کی تلاش میں ہو جو وہ مصیبت زدہ لوگ وہاں حاصل کرنے آئے تھے۔ اس کے بال پیچھے کی طرف ایک جُوڑے میں بندھے ہوئے تھے اور وہ چارخانے دار سلا ہوا سوٹ پہنے تھی جیسا کہ اس کی تصویروں میں نظر آتا تھا۔ ہر کچھ دیر بعد، جھنجلاہٹ میں، وہ اپنی کوئی انگوٹھی یا سونے کا وزنی بریسلٹ اتار کر اسے وہیں میز پر پڑا چھوڑ دیتی۔

وہاں یکے بعد دیگرے وہ واقعات بالکل فطری انداز میں پیش آئے جو کسی اور جگہ نا ممکن ہوتے۔ زردی مائل بالوں والے دو آدمی بنچوں کے اوپر کھڑے ایک ایسی زبان میں تقریر کر رہے

Scanned with CamScanner

تھے جس کا کوئی کچھ مطلب نہیں نکال سکتا تھا۔ پردوں کے عقب سے کچھ خانداں شہد کے چھتوں کے تختے لیے ہوئے نمودار ہوئے جن میں زندہ مکھیاں چھتے بنانے میں مصروف تھیں اور وہ چاہتے تھے کہ ایویتا ان مکھیوں کے اپنا کام مکمل کرنے سے پہلے ان کا تحفہ قبول کر لے۔ ملحقہ انتظار گاہ میں پولیو کی حالیہ وبا میں بچ جانے والے بچے، فاؤنڈیشن کی جانب سے دی گئی وہیل چیئرز میں، ایویتا کے سامنے سے گزارے جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ مصائب کی اس کبھی نہ ختم ہونے والی رو کے سامنے ایستورگا نے اپنی زندگی کی کم مائیگی پر خدا کا شکر ادا کیا جو کسی بڑے رنج و الم سے واقف نہیں تھی۔

صبح کے معمول میں ایک غیر متوقع واقعے کے سبب تعطل پیدا ہو گیا۔ چند کسان جوڑوں کے بعد ایویتا سرکس کے تین بازی گروں کی طرف متوجہ ہوئی جو اپنے ہی سرکس میں کرتب دکھانے والی نابالغ لڑکیوں سے شادی کرنے کے خواہش مند تھے اور جن کو قبل از بلوغ شادی کے خصوصی اجازت نامے کی ضرورت تھی۔ جیسے ہی اس نے انھیں فارغ کیا، بے قابو اور الجھے ہوئے بالوں والی ایک قدآور عورت نے اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر شکایت کی کہ فاؤنڈیشن کے ایک ملازم نے اس کا اپارٹمنٹ چھین لیا ہے۔

"کیا یہ سچ ہے؟" خاتونِ اول نے کہا۔

"میں اپنے مرحوم خاوند کی روح کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ سچ ہے،" عورت نے جواب دیا۔

"کون ہے وہ؟"

ایک نام رک رک کر ادا ہوا۔ سنیورا میز پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ کمرے بھر میں لوگوں نے اپنی سانسیں روک لیں۔

"چیپو کو انسلاوے کو حاضر کرو،" اس نے حکم دیا۔ "میں اسے اسی وقت یہاں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

سنیورا کے عقب کا دروازہ فوراً کھلا، جس میں سے پتیلوں، ریفریجریٹروں اور عروسی لباسوں سے بھرے ایک اسٹور روم کی جھلک دکھائی دی۔ صندوقوں کے درمیان سے بھدے پن کی حد تک لمبا ایک لاغر آدمی آگے کو آیا۔ اس کی پیشانی کی رگیں اس قدر پھولی ہوئی تھیں کہ دورانِ

حوں کے نظام کی وضاحت کرنے والے نقشے کی طرح نظر آرہی تھیں۔ اس کی ٹانگیں خم کھا کر ایک مکمل بیضوی شکل بنا رہی تھیں۔ اس کی رنگت یوں زرد تھی جیسے اسے پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔

"تم نے اس غریب عورت کا اپارٹمنٹ چھینا ہے،" ایویتا نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"نہیں سنیورا،" چیپو کونے کہا۔ "میں نے صرف انھیں ایک چھوٹے اپارٹمنٹ میں منتقل کر دیا ہے۔ یہ اکیلی ہی تین کمروں کے اپارٹمنٹ میں رہ رہی تھیں۔ میرے پانچ بچے ہیں جو بیٹھک میں اوپر تلے سوتے ہیں۔ میں نے ان کو سامان لے جانے کا کرایہ دیا۔ میں نے ان کا فرنیچر خود لے جا کر صحیح جگہ پر رکھا۔ بدقسمتی سے مجھ سے ان کی ایک بید کی کرسی ٹوٹ گئی تھی، مگر میں نے اسی دن دوسری خرید کر لا دی۔"

"تمھیں کوئی حق نہیں تھا،" ایویتا نے کہا۔ "تم نے کسی سے اجازت نہیں لی تھی۔"

"مجھے معاف کر دیں، سنیورا!"

"جس میں تم رہتے تھے وہ اپارٹمنٹ تمھیں کس نے دیا تھا؟"

"آپ نے دیا تھا، سنیورا۔"

"میں نے دیا تھا، اور اب میں تم سے واپس لے رہی ہوں۔ اس کامریڈ کا اپارٹمنٹ اسی وقت اس کے حوالے کرو اور تمام سامان لا کر وہیں رکھو جہاں وہ پہلے رکھا ہوا تھا۔"

"اور میں کہاں جاؤں، سنیورا؟" چیپو کو حمایت کی تلاش میں مجھے کی طرف مڑا۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکلا۔

"تم جہنم میں جاؤ اس جگہ جہاں سے تمھیں کبھی آنا ہی نہیں چاہیے تھا،" وہ بولی۔ "اگلا کون ہے؟"

قد آور عورت ایویتا کے ہاتھوں کو بوسہ دینے کے لیے جھکی لیکن اس نے بے صبری سے انھیں پیچھے ہٹا لیا۔ اسٹور روم کے دروازے سے لا کھڑا چیپو کو السلاسے وہاں سے جانے میں متذبذب تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی تتلیاں نمودار ہوئیں، مگر افسردگی اور تذبذب نے انھیں باہر نکلنے سے باز رکھا۔

"میرے ایک بچے کو برونکائٹس ہے،" اس نے التجا کی۔ "میں اسے بستر سے کس طرح

Scanned with CamScanner

باہر لے جاؤں گا؟"

"بس بہت ہو چکا!" یوریتا نے کہا۔ "تمہیں معلوم تھا کہ تم کیا کر رہے ہو۔ اور اب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کیا کرنا ہے۔"

اس غیظ و غضب کی شدت نے ایچیسو کو مضطرب کر دیا۔ لوگ خاتونِ ول کے مزاج کی برہمی کی باتیں کرتے تھے مگر خبر ناموں میں اس کی صرف رعایا پرور، ماورائی تصویر پیش کی جاتی تھی۔ اسے اب اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر خطرناک ہو سکتی ہے۔ اس کی ناک کے دونوں طرف دو گہری شکنیں ابھر آئی تھیں اور ایسے لمحات میں کوئی بھی اس کی نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔

اب اسے اپنے وہاں موجود ہونے پر پچھتاوا ہونے لگا۔ جیسے جیسے قطار آگے بڑھتی گئی، ایچیسو اپنی خواہش کا اظہار کرنے سے اتنا ہی زیادہ خوف محسوس کر رہا تھا۔ مصیبتوں کی پلٹتی لہروں کے درمیان، جنہیں لوگ اپنے پیچھے چھوڑتے جا رہے تھے، اسے اپنی ضرورت کا اظہار ایک طرح کی بے ادبی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اس سے کیا کہے گا؟ یہ کہ اس نے پچھلے اتوار کو صدارتی محل میں اس کے لیے کچھ فلمیں چلائی تھیں؟ یہ مضحکہ خیز بات ہوگی۔ کیوں نہ وہ سب کچھ بھول کر گھر لوٹ جائے؟ لیکن اسے زیادہ دیر سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ ایک رضاکار نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ یوریتا اسے دیکھ کر مسکرائی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"ایستورگا۔" اس نے کاغذ کے ایک پرزے پر نظر ڈالتے ہوئے غیر متوقع ملائمت سے کہا۔ "جوزے نیمیسیو ایستورگا۔ تمہیں کیا چاہیے؟"

"آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟" ایچیسو نے پوچھا۔

یوریتا کو اس کی بات کا جواب دینے کا وقت نہیں ملا۔ دو نرسیں دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں اور چیختے ہوئے بولیں:

"آئیے سنیورا! ہمارے ساتھ چلیے! ایک ہولناک حادثہ ہو گیا ہے!"

"حادثہ؟" یوریتا نے دہرایا۔

"کونستی تیوسیون میں داخل ہوتے ہوئے ایک ٹرین پٹری سے اتر گئی ہے۔ گاڑی کے ڈبے الٹ گئے ہیں، سنیورا! بری طرح الٹ گئے ہیں!" نرسیں رو رہی تھیں۔ "لاشیں بچھائی جا رہی ہیں۔ بہت المناک حادثہ ہے۔"

اچانک ایوتا کی ایستورگا سے تمام دل چسپی ختم ہو گئی۔ اس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پھر ہمیں چلنا چاہیے، فوراً" اس نے کہا۔ پھر وہ نرسوں کی طرف مڑی اور حکم دیا، "نوٹ کر لو کہ ان کا مریضوں کی ضرورتیں کیا کیا ہیں۔ کل ان کے دوبارہ آنے کا انتظام کرو۔ میں کل صبح سویرے ان سے ملوں گی۔ مجھے معلوم نہیں آج میں یہاں لوٹ سکوں گی یا نہیں۔ ایسا حادثہ ہو جائے تو میں کس طرح واپس آ سکتی ہوں؟"

لگتا تھا جیسے یہ سب کچھ خواب میں ہو رہا ہو۔ یہ جانے بغیر کہ کیوں، ایلچیسو کی توجہ باریک نیلی رگوں کے اس جال پر مرتکز تھی جو ایوتا کے حلق کے نیچے مرتعش تھا۔ کمرہ ایسی آوازوں سے بھر گیا تھا جو کسی غرق شدہ جہاز کے مال و اسباب کی طرح تیر رہی تھیں۔ شور و غل اور افراتفری کے درمیان گندے پوتڑوں کی بدبو زبردستی پنا راستا بناتی اور ناقابلِ تسخیر طور پر تہہ میں بیٹھتی گئی۔

ایوتا لفٹ میں غائب ہو گئی جبکہ ایستورگا اچانک شروع ہو جانے والی بھگدڑ میں پھنس کر سیڑھیوں تک گھسٹتا چلا گیا۔ ایک دروازے کے پاس بغیر دانتوں کی دلھن، اپنے دولہا کی کمر کو مضبوطی سے تھامے، کھڑی سسکیاں بھر رہی تھی۔ شام کا دھندلکا چھا رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی ترچھی دھوپ شہر کو داغدار کر رہی تھی۔ مگر لوگوں نے آسمان کی طرف دیکھ کر اپنے چھاتے کھول لیے جیسے وہ خود کو ان دوسرے سورجوں سے بچانا چاہتے ہوں جو لس گرنے ہی والے تھے۔

ایلچیسو نے لاکروز کی زیرِ زمین ٹرین پکڑی، سوسینیزری پارک پر اترا اور پالیرمو ننتیگو کی گلیوں میں پیدل ادھر ادھر بڑے درختوں کے گھنے اور بوجھل سائے میں چلنے لگا جو گلیوں کے سروں کی خستگی کے سامنے شائستگی سے سرنگوں تھے۔ اس نے وقت گزاری کی غرض سے کچھ دیر خستہ حال آبادیوں کی ناہموار گلیوں میں تاک جھانک کی اور پھر شاہراہ لوایہ کی طرف مڑ گیا جو سیدھی ریاشو کو جاتی تھی۔ اس کے باپ نے اسے بتایا تھا کہ مرنے سے پہلے آدمی کی زندگی بھر کی یادیں اور محسوسات انہیں روشنی کے ساتھ لوٹ آتے ہیں، مگر اب اس نے دریافت کیا کہ ایسا تجربہ ہونے کے لیے مرنا ضروری نہیں ہے۔ اس کا ماضی ایک طویل حال کی سی وضاحت کے ساتھ اس کے پاس لوٹ آیا۔ وہ جمنیمہ خانے میں عشائے ربانی، فلم کے فیتے سے کاٹے ہوئے سیلولائیڈ کے ٹکڑے جن سے وہ سوئی جینٹروں کے دروازوں کے پاس بیٹھا کھیلا کرتا تھا، وہ موقع جب اس نے لیڈیا کا

پہلی بار بوسہ لیا، روورے دال میں کشتی کی سیر میں، فرام دی سول والز جس کی دھن پر وہ اپنی شادی کی رات کو ناچا تھا، پہلی بار اپنی ماں کے پستانوں میں خود کو چھپاتا ہوا یولاندا کا ننھا سبزی مائل چہرہ۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی زندگی اس کی ملکیت نہیں ہے، اور اگر کبھی وہ اس کی ملکیت بن بھی جائے تو اس کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ وہ اس کا کیا کرے۔

کچھ فاصلے پر، ریالتو کے بند دروازے کے قریب، اسے ہمسایوں کا ایک ہجوم نظر آیا۔ ترویسا لیبر گیراج کے مستری، جو اپنی گرد کی دوزخ سے کسی وقت بھی باہر نہیں آتے تھے جب حادثے کا پرشور دھماکا ان کے کانوں تک پہنچا تھا، اب اپنی ڈنگریوں کے پائنچے چڑھائے ان معمر خواتین کے پاس آ جا رہے تھے جو گھر میں پہنی جانے والی چپلیں پیروں میں اور ہاتھ کی بنی شالیں کندھوں پر ڈالے نیچے اتر آئی تھیں۔ یہاں تک کہ مووی ٹویسٹر کا مالک بھی وہاں کھڑا پولیس کے ایک دستے سے مبالغہ آمیز انداز میں باتیں کر رہا تھا۔

ایستورگا کو اپنی بچی یولاندا کے رونے کی آواز سنائی دی، مگر اسے ایسا معلوم ہوا جیسے چیزیں حقیقت کے دوسرے کنارے پر واقع ہو رہی ہیں اور وہ ان پر بہت فاصلے سے بے تعلق نگاہ ڈال رہا ہے۔ چوں کہ اس کے ساتھ پہلے کبھی کچھ پیش نہیں آیا تھا، اسے لگتا تھا کہ اب بھی اس کے ساتھ کچھ پیش نہیں آئے گا۔

وہ دوڑتا ہوا مووی ٹویسٹر کی طرف گیا۔ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں تھا۔ اس دوپہر کی افراتفری میں وہ یولاندا کو اس کے پھٹے ہوئے لباس اور اس کے ننھے چہرے سے پہچان سکا جو حیرت کے ایک ناقابلِ فراموش تاثر میں منجمد ہو گیا تھا۔ پڑوس کی ایک عورت اسے اپنے بازوؤں میں لیے ہلکورے دے رہی تھی۔ بانفیلد سے ٹرین میں سفر کرتی ہوئی لیدیا اور ننھی بچی اور کوستی تیروسیون پر گاڑی کے لٹ جانے کا دہشت ناک تصور اچانک اس کے حواس میں داخل ہوا۔ اس نے فضا کو رنگ بدلتے اور بدشگونیوں کے بوجھ سے غش کھاتے دیکھا۔ ٹویسٹر کا مالک اس سے ملنے کے لیے آگے بڑھا۔

لیدیا کہاں ہے؟ ایستورگا نے پوچھا۔ کیا کوئی بات ہو گئی ہے؟

لیدیا آخری ڈبے میں تھی، مالک نے جواب دیا۔ اس کی گردن کھڑکی سے ٹکرا کر ٹوٹ گئی۔ مگر ننھی بچی کو کچھ نہیں ہوا۔ دیکھو، وہ بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے ڈاکٹر سے بات کی تھی۔

اس نے بتایا کہ تمھاری بیوی کو تکلیف نہیں ہوئی۔ سب کچھ بہت تیزی سے ہو گیا۔'

"اسے آر گیرچ لے گئے،" ہمسایہ عورت نے بتایا۔ "تمھارے سسرال والے وہاں پوسٹ مارٹم کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ لیدیا سے بانفیلد کی گاڑی تقریباً چھوٹ گئی تھی۔ اسے دوڑ کر چڑھنا پڑا۔ اگر گاڑی نکل جاتی تو کچھ بھی نہ ہوا ہوتا۔ مگر اس نے گاڑی پکڑلی تھی۔

اسے اسپتال کے بستر میں لیٹی لیدیا کو پہچاننے میں دقت ہوئی۔ اس کا سر پٹیوں میں ریشم کے کیڑے کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ چوٹ نے اس کے جسم کے اندرونی حصوں کو تباہ کر دیا تھا اور اس کا چہرہ ہمیشہ کی طرح تھا، لیکن اس کے زرد نقوش کسی پردے سے مماثل تھے؛ اس کے خدوخال بس چکے تھے۔ وہ وہی تھی اور اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ویسی ہونا ترک کر چکی تھی؛ اب وہ کہیں اور سے آئی ہوئی ایک اجنبی ہستی تھی جس کی محبت میں وہ کبھی گرفتار نہیں ہوا تھا۔

جس انداز میں نرسیں بھاگ دوڑ کر رہی تھیں اور جس طرح پولیس اضطرابی سرگرمی کا حد سے بڑھ کر اظہار کر رہی تھی، اسے دیکھ کر وہ سمجھ گیا کہ ایویتا زخمیوں کی عیادت کرنے اور مرنے والوں کے پسماندگان کو دلاسا دینے کے لیے ابھی تک اسپتال میں موجود ہے۔ جب وہ لیدیا کے کمرے میں آئی تو ایچینوسر ہاتھوں میں دبائے رو رہا تھا۔ اس نے ایویتا کو اس وقت دیکھا جب اس نے آ کر اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ان کی نگاہیں ملیں، اور ایک لمحے کو اسے گمان ہوا کہ ایویتا نے اسے پہچان لیا ہے۔ مگر ایویتا نے اسے مسکراتی ہمدردانہ تاثر کے ساتھ دیکھا جو دوپہر کے آغاز سے اس کے چہرے پر چسپاں تھا۔ ایک نرس نے اسے لیدیا کا شناختی کارڈ تھمایا۔ سنیورا نے اس پر نظر ڈالی اور کہا:

'ایستورگا... جوزے نیمیسیو ایستورگا میں دیکھ رہی ہوں کہ تم ایک پیرونسٹ ہو اور تم نے اپنے کالر پر پارٹی کا نشان لگایا ہوا ہے۔ یہی تو میں دیکھنا پسند کرتی ہوں، ایستورگا۔ تمھیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جنرل اور ایویتا تمھاری بچی کے اسکول کے اخراجات برداشت کریں گے۔ جنرل اور ایویتا تمھیں مکان دیں گے۔ جب تم اس دردناک صدمے سے بحال ہو جاؤ تو فاؤنڈیشن میں آنا۔ بتانا کہ تمھارے ساتھ کیا ہوا ہے اور کہنا کہ تمھیں ایویتا نے بلایا ہے۔

**

Scanned with CamScanner

ہیوگو فان ہوفمنسٹال

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

آگ کے رنگ

ایک زمانے میں، جب میں برسرروزگار تھا، مجھے ہر ہفتے خاص باقاعدگی سے کئی کئی بار، ٹھیک ایک ہی وقت پر چھوٹے پل سے گزرنا پڑتا (اس وقت تک پوں نیوف نامی پل نہیں بنا تھا) اور وہاں آتے جاتے رہنے کی وجہ سے بعض مزدور اور دوسرے عام لوگ مجھے پہچاننے اور سلام کرنے لگے۔ مگر ایک ست خوبرو ساحن، جس کی دکان پر دو فرشتوں کا نشان بنا ہوا تھا، سب سے زیادہ باقاعدگی اور اہتمام کے ساتھ سلام کرتی۔ ان پانچ چھ مہینوں کے دوران میں جب میں ادھر سے گزرتا وہ جھک کر آداب بجالاتی اور جب تک میں نظر سے اوجھل نہ ہو جاتا مجھے دیکھتی رہتی۔ اس طرزِ عمل سے میں اس کی طرف مائل ہو کر اس سے نظر ملانے اور تسلیمات کا جواب دینے کا خیال رکھنے لگا۔

ایک مرتبہ میں موسم سرما کے آخر میں گھوڑے پر سوار فونتین بلو سے پیرس آرہا تھا اور جب میں نے گھوڑا پل پر چڑھایا تو وہ اپنی دکان کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی اور میں پاس سے گزرا تو بولی، "آپ کی خادمہ، جناب عالی۔" میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور کئی بار مڑ کر دیکھنے سے مجھے پتا چلا کہ وہ دروازے سے مزید باہر کو جھکی ہوئی ہے تاکہ جب تک ممکن ہو مجھے دیکھتی ہی رہے۔ میرے پیچھے میرا نوکر اور گھڑسوار کوچوان تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ بعض خواتین کے نام خط دے کر کوچوان کو اسی شام واپس فونتین بلو بھیج دوں گا۔ میں نے حکم دیا تو نوکر گھوڑے سے اتر کر نوجوان عورت کے پاس گیا اور میری طرف سے اس سے کہا کہ میں ملاحظہ کر چکا ہوں کہ

Scanned with CamScanner

وہ مجھے دیکھنے اور سلام کرنے کا کتنا اشتیاق رکھتی ہے اور یہ کہ اگر وہ مجھ سے زیادہ قریبی تعلقات قائم کرنے کی آرزومند ہے تو کوئی جگہ تجویز کر دے اور میں وہاں حاضرِ خدمت ہو جاؤں گا۔

اس نے میرے نوکر کو جواب دیا، اس سے زیادہ خوشگوار پیام اور کیا ہو گا جو تم نے پہنچایا ہے۔ میں خود تمہارے صاحب کی چنی ہوئی کسی جگہ آنے کو تیار ہوں۔

جب ہم آگے بڑھ گئے تو میں نے نوکر سے پوچھا کہ اسے کسی ایسی جگہ کا پتا ہے جہاں میں اس عورت سے مل سکوں۔ اس نے جواب دیا کہ میں اسے فلانی کٹنی کے گھر لے جا سکتا ہوں۔ مگر میرا یہ نوکر، ولیم نامی، کورزائی کا رہنے والا بہت ہی محتاط اور بااصول شخص واقع ہوا تھا اور اس نے فوراً یہ بھی بتایا کہ شہر میں کہیں کہیں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی ہے اور مرنے والوں میں چوں کہ کم اصل اور غیظ زدہ عورتوں کے علاوہ ایک طبیب اور ایک بڑا پادری بھی شامل ہے اس لیے وہ یہ مشورہ دے گا کہ میں اپنی چادریں اور گدّے ساتھ لے جاؤں۔ میں نے اس کی تجویز مان لی اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ میرے لیے بستر اچھی طرح بچھا دے گا۔ گھوڑے سے اترنے سے پہلے میں نے مزید کہا کہ وہ اس جگہ ایک ٹھیک ٹھاک سلفچی، تیز خوشبو والے عطر کی چھوٹی شیشی، چند ایک کیک اور سیب بھی لے جائے اور کمرے کو خوب اچھی طرح گرم کر دینے کا خیال بھی رکھے کیوں کہ جاڑا اتنا پڑ رہا تھا کہ میرے پاؤں رکابوں ہی میں اکڑ کر رہ گئے تھے اور آسمان پر برفانی بادل چھائے ہوئے تھے۔

اس شام جب میں مقررہ مقام پر پہنچا تو میں نے ایک بہت حسین نوجوان عورت کو، جو کوئی بیس برس کی ہو گی، بستر پر بیٹھا پایا اور کٹنی اپنے سر اور کمر کو کالی شال میں لپیٹے بظاہر کسی بات پر اصرار کر رہی تھی۔ دروازہ نیم وا تھا اور آتش دان میں بڑے بڑے تازہ کٹے لٹھے دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ عورتوں نے میری آہٹ نہ سنی اور میں لمحہ بھر دروازے میں کھڑا رہا۔ نوجوان عورت کی چوڑی سی کھلی ہوئی آنکھیں آگ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے سر کی ایک ہی جنبش سے یوں لگا جیسے اس کے اور بڑھیا ڈھڈو کے درمیان کالے کوس حائل ہو گئے ہوں۔ اس جنبش سے شب خوابی کی چھوٹی سی ٹوپی سے گھنے کالے بالوں کی چوٹیاں باہر نکل آئیں اور قدرتی گھونگھروں میں بل کھاتی ہوئی شانے اور سینے کے درمیان کرتی پر بکھر گئیں۔ اس نے سرخ اونی کپڑے کا چھوٹا سا جیکٹی کوٹ اور پاؤں میں چپل بھی پہن رکھے تھے۔

Scanned with CamScanner

اس لیے ضرور، میں نے کسی آہٹ سے اپنی وہاں موجودگی ان پر ظاہر کر دی۔ اس نے سر کو یک لخت حرکت دے کر جو چہرہ میری طرف کیا اس پر انتظار کی وجہ سے ایسی وحشت چھائی ہوئی تھی کہ تند خوئی کا گمان ہو سکتا تھا۔ مگر پرستاری کی اس تجلی نے جو اس کی چوڑی کھلی آنکھوں سے پھوٹ اور سکوت زدہ لبوں سے کسی غیر مرئی شعلے کی طرح لپک رہی تھی، اس گمان کو دور کر دیا۔ وہ اتنی حسین تھی کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ بڑھیا کو فی الفور کمرے سے دفان کر دیا گیا اور میں اپنی معشوقہ کے ساتھ تنہا رہ گیا۔ جب میں نے، یہ غیر مترقبہ دولت ہاتھ آنے کی سرخوشی میں، چند ایک گستاخیاں کرنے کی جسارت کی تو وہ اپنے نشرے اور لطیف دھیمی آواز سے ناقابل بیان طور پر اضطراب آمیز التجا کرتی ہوئی جھجک کر مجھ سے دور ہٹ گئی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس کی باہیں پھر میرے گرد تھیں اور اس کی اوپر کو دیکھتی ہوئی استادہ آنکھوں نے، جو مجھ پر دیاؤ ڈال رہی تھیں، مجھے اس زور سے گرفت میں لے لیا کہ اس کے ہونٹ اور باہیں بھی اتنے زور سے نہ بھینچ سکتی تھیں۔ پھر ایسا لگا جیسے وہ دوبارہ کچھ کہنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہو، لیکن اس کے بوسوں سے تھرتھراتے ہونٹوں پر کوئی لفظ نہ آیا اور اس کے مرتعش گلے سے ٹوٹی پھوٹی سسکی سے زیادہ واضح کوئی صدا نہ نکلی۔

اب سنیے کہ میں نے دن کا بیشتر حصہ منجمد شاہراہوں پر سواری کرنے میں گزارا تھا۔ بعد ازاں میں نے شاہی محل کے پیش دالان میں ایک بہت ہی ناگوار اور پرُ تشدد منظر میں حصہ لیا تھا اور پھر بد مزگی دور کرنے کے لیے شراب پی تھی اور بڑے زور شور سے دوستی تیغ زنی کی مشق کی تھی۔ چناں چہ اس دلکش و پرُ اسرار جوکھم کے دوران، جب میں اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ ملائم باہیں میرے گلے میں حمائل تھیں اور معطر بال مجھ پر بکھرے ہوئے تھے، تقریباً بے ہوشی سے مشابہ تکان مجھ پر غالب آ گئی۔ تکان اتنی اچانک اور مکمل طور پر حاوی آ جانے والی تھی کہ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں اس کمرے تک پہنچا کیسے تھا، بلکہ ایک لمحے کے لیے تو میں اس عورت کو، جس کا دل میرے دل کے اتنے قریب دھڑک رہا تھا، یک بالکل ہی دوسری عورت سمجھ بیٹھا جس سے میں پہلے کبھی واقف تھا، اور آن کی آن میں گہری نیند سو گیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو رات کا اندھیرا بدستور طاری تھا لیکن میں نے فوراً محسوس کیا کہ میری معشوقہ پہلو میں نہ تھی۔ میں نے سر اٹھایا اور بجھتے ہوئے انگاروں کی مدھم روشنی میں اسے

کھڑکی کے قریب کھڑے دیکھا۔ اس نے ایک جھلملی کھول دی تھی اور اس میں سے باہر جھانک رہی تھی۔ پھر وہ مڑی، اس نے دیکھا کہ میں جاگ گیا ہوں، اور کہا، (میں آج بھی چشمِ تصور میں اسے گرے ہوئے بالوں کو ہٹانے کے لیے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی رخسار تک لاتے دیکھ سکتا ہوں) "ابھی سویرا نہیں ہوا، بہت دیر تک نہ ہوگا۔" صرف اس وقت مجھے واقعی پتا چلا کہ وہ کتنی بلند قامت اور خوب صورت ہے۔ میرے لیے یہ اعتبار بھی مشکل ہو گیا کہ وہ اپنے خوش نما، دہک سے لال پانوؤں سے ایک یا دو لمبے، ڈول قدم بھر کر میرے پہلو میں آ جائے۔ آتے آتے وہ آتش دان تک گئی، نیچے جھکی، سامنے پڑے ہوئے آخری بھاری لٹھے کو چمکیلی ننگی بانہوں میں اٹھایا اور انگاروں پر پھینک دیا۔ پھر وہ میری طرف مڑی۔ اس کا چہرہ شادمانی اور شعلوں سے جگمگا رہا تھا۔ گزرتے گزرتے اس نے میز پر سے ایک سیب اٹھایا اور پھر میری بانہوں میں آ گئی۔ اس کے اعضا میں ابھی آگ کی تازہ حرارت رچی ہوئی تھی اور اگلے لمحے وہ گویا ان کہیں زیادہ تند شعلوں میں پگھل گئے جو اس کے بدن میں رواں دواں تھے۔ دائیں ہاتھ سے مجھے تھام کر، اس نے بائیں ہاتھ میں پکڑے سیب میں دانت گڑو دیے۔ پھر اسے میرے منھ کی طرف یوں بڑھایا جیسے پھل پیش کر رہی ہو، اپنا پیکر پیش کر رہی ہو۔ آتش دان میں پڑے آخری لٹھے سے اتنے اونچے شعلے اٹھے کہ باقی لٹھے مات ہو گئے۔ چنگاریوں کی بوچھاڑ کے ساتھ لٹھے نے شعلوں کو اندر کھینچا اور پھر انھیں تند لپٹ کی شکل میں اگل دیا اور آتش دان کی روشنی ہم پر اس طرح پھسلی جیسے کوئی موج دیوار سے ٹکرا رہی ہو، اور ہماری ہم آغوشی کا سایہ دیوار پر جھونٹے کھانے لگا۔ بڑا لٹھ چٹخا، اس نے اپنے دل سے تازہ شعلوں کو ہوا میں چڑھایا، جو ناچتے ہوئے اوپر اٹھتے گئے اور دمکتی ہوئی لالی کے فواروں اور طوماروں سے ظلمت کو دور کر دیا۔ پھر یکایک آگ سرد پڑ گئی۔ ٹھنڈی ہوا کے سانس نے، کسی ہاتھ کی طرح، جھلملی کھول کر نیلوں سے داغ داغ صبح کے بھیانک بھورے پن کو آشکار کر دیا۔

یہ جان کر کہ دن آ پہنچا ہے ہم اٹھ بیٹھے۔ مگر باہر جو اجالا تھا وہ دن جیسا نہ تھا۔ یہ دنیا کی بیداری نہ تھی اور مکان سے باہر جو چیز تھی وہ سڑک جیسی نہ تھی۔ چیزوں کے بیرونی خطوط معدوم تھے۔ یہ ایسی کائنات تھی جس کی کوئی شکل نہ تھی، جو خالی تھی، جہاں صرف بے شکل اور لازماں چیزیں ہی چل پھر سکتی تھیں۔ کہیں دور سے، کسی یاد کی طرح، گرجا کے گھنٹے کی ٹن ٹن سنائی دی اور ایک سسکی سی ہو، جس کا دن میں کوئی ٹھکانا نہ رات میں، کمرے میں آنے لگی حتیٰ کہ ہم

دونوں کانپتے ہوئے ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ وہ پیچھے کو جھکی، اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جم گئیں۔ اس کا گلا تھر تھرایا، کوئی چیز اس کے اندر ابھری، ہونٹوں تک امنڈ آئی، مگر کوئی لفظ ادا نہ ہوا، کوئی آہ نہ نکلی، کوئی بوسہ نہ لیا گیا بلکہ وہ کوئی ایسی چیز تھی جو، نازائیدہ، ان تینوں سے مشابہ تھی۔ بڑھتی ہوئی روشنی میں اس کے چہرے پر دوڑنے والی بدلتی کیفیات پہلے سے بھی زیادہ کچھ کھنچی ہوئی معلوم ہونے لگیں۔ اچانک، باہر سڑک پر گھسٹتے قدموں کی چاپ اور بولنے چالنے کی آوازیں کھڑکی کے اتنے قریب آ گئیں کہ اس نے جھک کر اپنا منہ دیوار کی طرف موڑ لیا۔ دو آدمی گزرے۔ ان میں سے ایک نے جو چھوٹی سی لالٹین اٹھا رکھی تھی اس کی روشنی سے لمحے بھر کو کمرے میں اجالا ہو گیا۔ دوسرا آدمی ایک ٹھیلا دھکیل رہا تھا جس کے پہیے بوجھ کے مارے چوں چوں کر رہے تھے۔ جب آدمی گزر گئے تو میں نے اٹھ کر جھلملی بند کر دی اور موم بتی جلائی۔ آدھا کھایا سیب ابھی وہیں پڑا تھا۔ ہم دونوں نے مل کر اسے کھا لیا اور پھر میں نے پوچھا کہ کیا اس سے ایک بار اور ملنا ممکن ہے، کیوں کہ مجھے اتوار تک قیام کرنا تھا اور گزری رات جمعرات اور جمعہ کی درمیانی رات تھی۔

اس نے جواب دیا کہ وہ یقیناً دوبارہ ملنے کی مجھ سے بھی زیادہ گرم جوشی سے متمنی ہے لیکن اگر میں اتوار کے بعد تک نہ ٹھیر سکا تو وہ مجھ سے نہ مل سکے گی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ مجھ سے صرف اتوار اور پیر کی درمیانی رات کو مل سکتی تھی۔

معاً مجھے کئی رکاوٹوں کا خیال آیا اور میں نے کوئی عذر کیا جسے وہ بغیر کچھ کہے سنتی رہی، مگر اس کی آنکھوں میں انتہائی دردناک سوالی کیفیت تھی اور چہرے کی مغموم روشنی تقریباً بھیانک نظر آنے لگی تھی۔ اس کے بعد، ظاہر ہے، مجھے اتوار کے بعد تک ٹھیرنے کا وعدہ کرتے ہی بنی اور میں نے مزید کہا کہ اتوار کی شام کو اسی جگہ آ جاؤں گا۔ وہ مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی اور بالکل کرخت اور بھرّائی ہوئی آواز میں بولی، مجھے بخوبی علم ہے کہ میں نے تمہاری خاطر اس قحبہ خانے میں قدم رکھا ہے، مگر اس میں میری رضا شامل تھی کیوں کہ میں تمہارے پاس آنا چاہتی تھی، کیوں کہ میں تمہیں بھی چاہنے اور کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔ لیکن اب اگر میں نے خود کو دوبارہ یہاں آنے پر آمادہ کیا تو اپنے آپ کو شہر کی سب سے ادنیٰ اور ذلیل ترین عورت تصور کروں گی۔ میں یہاں، تمہاری خاطر آئی کہ میری نظر میں تم وہ سب کچھ ہو جو تم ہو، کہ تم بالعموم بسر ہو، کہ دنیا میں

تم ہی وہ واحد انسان ہو جس کی موجودگی اس گھر کو میری عزت آبرو کا گھر بنا سکتی تھی۔"

اس نے کہا۔ ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے وہ کوئی زیادہ پُرحقارت لفظ کہنے والی تھی۔ یہ کہتے ہوئے اس نے دیواروں پر، پلنگ پر، بستر پر، جو پھسل کر نیچے گر گیا تھا، ایسی نگاہ ڈالی کہ اس کی آنکھوں سے کوندنے والی روشنی کے انبار تھے، وہ تمام کم اصل اور بدصورت چیزیں یوں معلوم ہوئیں جیسے ہڑبڑا کر، دم دبا کے، اس سے دور بھاگ رہی ہوں، جیسے بدحال کمرہ ایک لمحے کے لیے سچ مچ برہم ہو گیا ہو۔

پھر اس نے ایسی آواز میں جس کی ملائمت اور وقار بیان نہیں ہو سکتا، کہا، "کاش کہ مجھے ذلت کی موت نصیب ہو اگر میں تمہارے یا اپنے شوہر کے سوا کسی مرد سے آشنا ہوئی ہوں یا میں نے اس دنیا میں کسی اور کی خواہش کی ہو۔" اور ذرا سا آگے جھک کر، واہونٹوں کے تنفس میں اپنی ساری جان سموئے، گویا کسی جواب کی، میری طرف سے وفا کیشی کی کسی یقین دہانی کی، منتظر دکھائی دی۔ لیکن چونکہ اسے میرے چہرے پر وہ جذبہ نظر نہ آیا جس کی اسے جستجو تھی، اس کی اشتیاق بھری، متلاشی صورت پر اداسی چھا گئی، اس کی پلکیں گریں اور اُٹھیں اور چشم زدن میں وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔ اس نے اپنا ماتھا پورے زور سے جھلملی پر ٹیک رکھا تھا، اس کا سارا بدن بے صدا لیکن ہولناک طور پر ہیجانی اشک باری سے اس طرح لرز رہا تھا کہ میری گویائی سلب ہو گئی اور میں اسے چھونے کی جرأت بھی نہ کر سکا۔ اس کے دونوں ہاتھ بے جان سے ہو کر ڈھیلے لٹک رہے تھے۔ آخر کار میں نے اس کا ایک ہاتھ تھام لیا اور انتہائی پیار اور لگاؤ ظاہر کرنے والے جو جو لفظ مجھے آتے تھے بول کر، طویل کوشش کے بعد، اسے تسلی دینے میں کامیاب ہو گیا، یہاں تک کہ اس نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا چہرہ پھر میری طرف کر دیا اور مسکراہٹ روشنی کی طرح اس کی آنکھوں سے اُمنڈتی اور ہونٹوں کے ارد گرد کھیلنے لگی جس سے اس کے آنسو فی الفور خشک ہو گئے اور سارا چہرہ جگمگا اٹھا۔

وہ کیا ہی مزے دار تماشا تھا جب اس نے ایک ہی موضوع کو ان گنت بار طرز بدل بدل کر بیان کرتے ہوئے، مجھ سے دوبارہ گفتگو شروع کی، "تم مجھ سے دوبارہ ملو گے۔ پھر میں تمہیں اپنی بچی کے گھر میں بلاؤں گی۔" اور اس نے پہلے جملے کو درجن بھر مختلف انداز سے ادا کیا، کبھی شیریں اصرار سے، کبھی جھوٹ موٹ طفلانہ بدگمانی دکھا کر، کبھی کان میں اس طرح سرگوشی کر کے جیسے وہ

Scanned with CamScanner

محض دنیا کا عظیم ترین راز ہو، کبھی گردن ذرا موڑ کے، کندھے جھٹک کے، اور ہونٹ لٹکا کر جیسے ملاقات کا یہ وعدہ انتہائی معمولی بات ہو، اور آخر میں مجھ سے چمٹ کر، منہ اٹھا کر، کھلکھلاتے ہوئے، چمکار بھرے لہجے میں۔ اس نے چچی کے مکان کی لمبی چوڑی تفصیل مجھے اس طرح بتائی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو، جسے پہلی مرتبہ نانبائی کی دکان تک اکیلے جانا پڑ رہا ہو، سڑک پار کرنے کا طریقہ سمجھا رہی ہو۔ پھر وہ تن کر کھڑی ہو گئی، سنجیدہ نظر آنے لگی، اور اپنی چمکیلی آنکھیں اس شدت سے مجھ پر جما دیں کہ ان کے دیکھنے سے مُردے بھی جی اٹھتے، اور کہنے لگی، میں دس بجے سے آدھی رات تک تمہارا انتظار کروں گی، بلکہ آدھی رات کے بعد تک بلکہ اور بھی بعد تک، اور زینے کی طرف کھلنے والا دروازہ کھلا رہے گا۔ پہلے ایک چھوٹی غلام گردش آئے گی۔ تم وہاں ہرگز نہ رکنا کیونکہ میری چچی کے کمرے کا دروازہ وہیں کھلتا ہے۔ پھر تمہیں کوٹھے کا زینہ ملے گا، اور میں وہیں موجود ہوں گی۔" اور پھر اس نے آنکھیں اس طرح موندیں جیسے وہ چندھیا گئی ہوں، سر جھٹک کر پیچھے کیا اور بانہیں پھیلا کر مجھے آغوش میں لے لیا اور لمحہ بھر بعد، پوری طرح ملبوس، عجیب اور سنجیدہ سی، میری آغوش سے، کمرے سے، نکل کر چلی گئی کہ دن چڑھ چلا تھا۔

میں نے روانگی کی تیاری کی چند نوکروں کو سامان دے کر آگے بھیج دیا۔ اگلے دن شام کو مجھے ایسی شدید بے چینی نے ستایا کہ شام کی نماز کی گھنٹیاں بجے دیر نہ ہوئی تھی کہ میں نے اپنے نوکر ولیم کے ہمراہ وہ چھوٹا پل پار کیا۔ ولیم کو میں نے لالٹین ساتھ رکھنے کی ممانعت کر دی تھی تاکہ میں اپنی محبوبہ سے اس کی دکان یا کسی قریبی مکان میں مل سکوں۔ اور کچھ نہیں تو اپنی موجودگی کا کوئی اتا پتا ہی دے سکوں، گو مجھے اس کے سوا کوئی امید نہ تھی کہ شاید اس سے ایک دو باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔

لوگوں کی توجہ سے بچنے کے لیے میں پل پر ٹھیر گیا اور موقعے کی دیکھ بھال کے لیے نوکر کو آگے چلتا کیا۔ وہ کچھ دیر غائب رہا، اور جب لوٹا تو چہرے سے وہی ملال اور مایوسی ظاہر تھی جس کے معنی ہمیشہ یہ ہوتے تھے کہ وہ میرا حکم بجا لانے سے قاصر رہا۔ اس نے کہا، "دکان تو بند ہے اور معلوم ہوتا ہے اندر کوئی ہے بھی نہیں۔ سچ پوچھیے تو سڑک سے ملے ہوئے کمروں میں کوئی آدمی نظر نہیں آتا، نہ کسی کی آواز سنائی دیتی ہے۔ صحن میں پہنچنے کے لیے ایک اونچی دیوار پر چڑھنا ہو گا اور اندر ایک بڑا سا کتا غرا رہا ہے۔ لیکن اگلے کمروں میں سے ایک میں روشنی جل رہی ہے اور

ایک رخنے سے دکان میں جھانکنا ممکن ہے، گو میں سمجھتا ہوں کہ وہ خالی پڑی ہے۔

یہ سن کر میرا ولولہ سرد ہو گیا اور میں نے فوراً گھر کی راہ لینے کا تہیہ کر لیا۔ اس کے باوجود میں بہت ہی آہستہ آہستہ چلتا ہوا مکان کے سامنے سے دوبارہ گزرا اور میرے نوکر نے، اشتیاق کے مارے، رخنے سے جھانکا جس سے روشنی کی باریک لکیر باہر آ رہی تھی اور زیرِ لب مجھے بتایا کہ عورت تو دکان میں نہیں مگر اس کا شوہر ہے۔ میں دکان دار کو دیکھنے کے لیے مضطرب تھا۔ مجھے یاد آ رہا تھا کہ اسے کبھی دکان پر دیکھا ہو اور کبھی کبھی سوچ کرتا تھا کہ وہ موٹا اور بے ہنگم ہو گا اور کبھی یہ خیال آتا تھا کہ سوکھا ساکھا اور بڈھا پھونس ہو گا۔ جب میں رخنے کے پاس گیا تو یہ دیکھ کر میرے تحیر کی انتہا نہ رہی کہ اس آراستہ پیراستہ اور چوبی حاشیوں والے کمرے میں ایک غیر معمولی طور پر قد آور اور اچھی کاٹھی کا مرد ٹہل رہا تھا جو بلاشبہ مجھ سے سر بھر اونچا تھا اور جب اس نے میری طرف منہ کیا تو مجھے ایک بہت سنجیدہ چہرہ نظر آیا۔ اس کی بھوری داڑھی میں کہیں کہیں سفید بال آ گئے تھے، پیشانی تقریباً نادر رفعت کی حامل تھی اور اتنی کشادہ کنپٹیاں پہلے میں نے کسی انسان کی نہ دیکھی تھیں۔ گرچہ وہ کمرے میں بالکل تنہا تھا، اس کی آنکھوں کو قرار نہ تھا، ہونٹ ہل رہے تھے، اور جب وہ ٹہلتے ٹہلتے وقتاً فوقتاً رک کر کھڑا ہو جاتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ کسی سے خیالی گفتگو میں مصروف ہے۔ ایک دفعہ اس نے ہاتھ ہلا کر اشارہ بھی کیا جیسے کسی اعتراض کو نیم شفقت آمیز تحکم کے ساتھ رد کر رہا ہو۔ اس کی حرکت سے سہل انگاری اور تقریباً تحقیر آمیز نخوت نمایاں تھی اور اسے کمرے میں اکیلے چہل قدمی کرتے دیکھ کر میں ایک بہت نامی گرامی قیدی کو واضح طور پر یاد کیے بغیر نہ رہ سکا جو بلارنے قلعے کے ایک مینار کے حجرے میں قید ہونے کے دوران میری ہی تحویل میں تھا۔ میں اس وقت شاہی ملازم تھا۔ یہ مشابہت اور بھی زیادہ جاذبِ توجہ ہو گئی جب اس مرد نے دایاں ہاتھ بلند کیا اور اوپر اٹھی ہوئی انگلیوں پر تیز بلکہ خشونت آمیز نظر ڈالی۔

یہ قریب قریب وہی حرکت تھی جو میں نے اکثر اپنے عالی منزلت قیدی کو کرتے دیکھا تھا۔ یعنی وہ ایک انگوٹھی کو دیکھنے کے لیے کرتا تھا جو اس نے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی میں پہن رکھی تھی اور جسے وہ کبھی اتارتا نہ تھا۔ پھر وہ مرد کمرے میں رکھی میز کے قریب آیا، پانی سے بھرے گول شیشے کو کھسکا کر موم بتی کے سامنے کر دیا اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر روشنی کے دائرے میں لایا۔ معلوم ہوتا تھا وہ اپنے ناخنوں کا معائنہ کر رہا ہے۔ پھر اس نے پھونک مار کر موم

سی بجھا دی اور مجھے آزردہ اور طیش آلود حسد کے شمس احساس میں مبتلا چھوڑ کر کمرے سے چلا گیا۔ آزردگی ور حسد کی وجہ یہ کہ اس کی بیوی کی طلب میرے اندر بتدریج سر اٹھا رہی تھی، کسی پھیلتی ہوئی آگ کی طرح راہ میں حائل چیزوں کی مدد سے زور پکڑ رہی تھی، اور حیران کن انداز میں، اس غیر متوقع نظارے سے اور برف کے ہر اس گالے سے جو سیلی ہوا سے اڑ کر میری بھوؤں اور رخساروں پر یکے بعد دیگرے ٹک اور پگھل رہے تھے، بھڑک اٹھی تھی۔

میں نے اگلا دن کابل میں گزارا۔ میں اس قابل نہ تھا کہ ذہن کو کسی چیز پر مرکوز کر سکوں۔ ایک گھوڑا خریدا جس کی مجھے کوئی خواہش نہ تھی۔ ڈنر کے بعد ڈیوک دے نیمور کو سلام کرنے گیا اور وہاں کچھ وقت تاش کھیلنے اور انتہائی احمقانہ اور ناخوشگوار گفتگو، جو تصور میں آ سکتی ہے، سننے میں برباد کیا۔ یہ گفتگو تمام تر طاعون کے متعلق تھی جو بڑی تیزی سے شہر میں پھیل رہا تھا، چنانچہ لاشوں کو جلد از جلد دفنانے اور اس کمرے میں جہاں کسی کی موت واقع ہوئی ہو، بھُس کی آگ جلا کر وبائی ابخروں کو دور کرنے کی ضرورت وغیرہ وغیرہ کے سوا ان بھلے آدمیوں نے کوئی بات کر کے نہ دی۔ لیکن میری رائے میں سب سے بدحواس ندو کا بڑا پادری لگ رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح فربہ اور خوش مزاج تو وہ تھا مگر یک آنکھ اپنے ناخنوں پر جمائے رہنے سے خود کو باز نہ رکھ سکا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ کہیں ان پر اس مشکوک نیلاہٹ کے آثار تو نظر نہیں آ رہے جو بالعموم طاعون کی پہلی علامت ہوتے تھے۔

ان تمام باتوں سے متنفر ہو کر میں جلد ہی گھر چلا گیا اور بستر پر جا لیٹا مگر نیند نہ آئی۔ بے صبری کے مارے، میں نے دوبارہ کپڑے پہن لیے اور تہیہ کیا کہ کچھ بھی ہو، جا کر اپنی محبوبہ سے ملتا ہوں، چاہے مجھے اور میرے آدمیوں کو زبردستی گھر میں داخل ہونا پڑے۔ میں نوکروں کو آواز دینے گھڑی کی سمت گیا۔ رات کی برفانی ہوا سے میرے ہوش ٹھکانے آ گئے اور مجھے احساس ہوا کہ میرے منصوبے کی بدولت یہ سارا قصہ یقیناً ہی ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح کپڑے پہنے پہنے میں نے خود کو پلنگ پر گرا دیا اور آخر سو گیا۔

میں نے اتوار کا دن بھی اسی طور سے گزارا حتیٰ کہ شام ہو گئی اور میں بتائی ہوئی سڑک پر مقررہ وقت سے کہیں پہلے پہنچ گیا لیکن دل پر جبر کر کے قریب کی ایک گلی میں دس بجے تک ٹہلتا رہا۔ پھر میں نے جلد ہی اس کے بتائے ہوئے مکان اور دروازے کو ڈھونڈ لیا۔ اس کے قول کے مطابق

Scanned with CamScanner

دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کے بعد غلام گردش ورنہ واقع تھا۔ لیکن زینے کے اوپر جو دوسرا دروازہ تھا وہ بند تھا۔ البتہ روشنی کی باریک لکیر باہر آرہی تھی۔ سو وہ اندر موجود اور منتظر تھی؛ شاید دروازے کے اُدھر اسی طرح کان لگائے ہوئے تھی جیسے میں دروازے کے اِدھر کان لگائے کھڑا تھا۔ میں نے ناخن سے کواڑ کو کھرچا۔ پھر میں نے اندر ایسی آہٹ سنی جو ننگے پاؤں گھسٹ گھسٹ کر لڑکھڑاتے ہوئے چلنے کی آواز سے مشابہ تھی۔ ذرا دیر تو میں دم سادھے کھڑا رہا۔ اس کے بعد دوبارہ کواڑ کو کھٹکھٹایا لیکن ایک مرد کی آواز نے جواب میں پوچھا کہ "دروازے پر کون ہے؟" میں کوئی آواز نکالے بغیر دروازے کے سائے میں پیچھے کو دبک گیا۔ دروازہ بدستور بند رہا اور میں دبے پاؤں، آہستہ آہستہ چلتا ہوا زینے سے اتر کر نیچے پہنچا اور پھر غلام گردش سے ہوتا ہوا گلی ہوا میں نکل گیا اور بے صبری کے عالم میں، کھویا کھویا، ایک یا دو سڑکوں تک ٹہلتا چلا گیا۔ میں نے دانت بھینچ رکھے تھے اور میری کنپٹیاں پھڑک رہی تھیں۔ آخر کار مجھ سے رہا نہ گیا اور میں مکان کی طرف لوٹا۔ میرا فوراً اندر جانے کا ارادہ نہ تھا۔ مجھے احساس ہو بلکہ یقین سا ہو چلا کہ وہ شوہر کو کہیں بھیج دے گی، وہ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائے گی، اسے ضرور کامیاب ہونا چاہیے، اور پھر میرے لیے فی الفور اس کے پاس پہنچ جانا ممکن ہو گا۔ سڑک تنگ تھی۔ اس کے ایک طرف مکانات نہیں تھے بلکہ ایک کانونٹ کے باغ کی دیوار تھی۔ میں اس دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا اور سڑک کی دوسری جانب سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرنے لگا کہ اس کے کمرے کی کھڑکی کون سی ہے۔ یکایک دوسری منزل پر ایک کھلی ہوئی کھڑکی میں روشنی سی بھڑکی اور بجھ گئی۔ وہ پھیلتا ہوا سارا منظر میری آنکھوں میں گھوم گیا۔ اس نے جیسے اُس رات کی طرح ایک بڑا شعلۂ آتش دان میں پھینکا ہو۔ اسی رات کی طرح وہ کمرے کے بیچ میں کھڑی ہو، سراپے پر آگ کی دمک چھائی ہوئی ہو، یا بستر پر بیٹھی، کان لگائے، منتظر ہو۔ میں اسے دروازے میں کھڑے ہو کر دیکھوں گا اور اس کی گردن اور کندھوں کا سایہ اس غیر مرئی موج میں دیوار پر چڑھ اتر رہا ہو گا۔ میں اتنے میں غلام گردش میں پہنچ بھی چکا تھا، سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ دروازہ کھل چکا تھا۔ اس کے ادھ کھلے کواڑوں سے جھلملاتی روشنی باہر آرہی تھی۔ میں نے دروازے کے قبضے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ ایسا لگا جیسے میں کئی آدمیوں کو اندر بولتے چالتے اور چلتے پھرتے سن سکتا ہوں۔ لیکن مجھے اپنے پر یقین نہ آیا اور میں نے سوچا کہ گردن اور کنپٹیوں میں خون کی تیز گردش اور اندر کمرے میں بھڑکتی آگ کی وجہ سے ایسا معلوم ہو رہا ہے۔

Scanned with CamScanner

اس رات بھی آگ بہت پرشور انداز میں جل رہی تھی۔ میرا ہاتھ ابھی دروازے کے قبضے پر تھا کہ مجھ پر واقعی یہ انکشاف ہوا کہ کمرے میں لوگ موجود ہیں کئی آدمی ہیں۔ لیکن اب مجھے کوئی پروا نہ تھی کیوں کہ میں محسوس کر رہا تھا، میرا دل جانتا تھا، کہ وہ بھی وہاں موجود ہے اور دروازہ کھولتے ہی اسے دیکھ لوں گا، اپنے سینے سے لگا لوں گا اور چاہے اسے دوسروں کے ہاتھوں سے چھیننا پڑے، میں یک بارگی اسے تھامے، چیختے چلاتے مردوں عورتوں کے حملہ آور ہجوم کو تلوار اور خنجر کے زور سے پیچھے دھکیلتا ہوا نکل جاؤں گا۔ جو چیز مجھے بالکل ناقابلِ برداشت معلوم ہو رہی تھی وہ مزید توقف تھا۔

میں نے دروازہ کھول دیا۔ مجھے یہ منظر دکھائی دیا:

خالی کمرے کے بیچ میں چند آدمی کھڑے بستروں کے نیچے بچھایا جانے والا بھُس جلا رہے تھے اور شعلوں کی روشنی میں، جو تمام کمرے میں پھیلی ہوئی تھی، میں نے پھولی پھولی دیواریں دیکھیں جن کا پلستر فرش پر بکھرا پڑا تھا، اور ایک دیوار سے ملی ہوئی میز رکھی تھی جس پر دو ننگی لاشیں پڑی تھیں، ایک بہت بڑی تھی، اس کا سر ڈھکا ہوا تھا۔ دوسری لاش نسبتاً چھوٹی تھی اور دیوار سے ملی ہوئی دراز تھی۔ اس کے بدن کا کالا سایہ ساتھ کی دیوار پر اوپر نیچے ہو رہا تھا۔

میں لڑکھڑاتا ہوا زینے سے اترا اور مکان کے سامنے میری دو گورکنوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان میں سے ایک نے اپنی چھوٹی سی لالٹین اوپر اٹھا کر میرے چہرے کے قریب کر دی اور پوچھنے لگا کہ تمھیں کیا لینا دینا ہے؟ دوسرے نے بوجھ سے چرچراتے اور چوں چوں کرتے ٹھیلے کو دھکیل کر دروازے سے لگا دیا۔ میں نے انھیں پرے رکھنے کے لیے خنجر تان لیا اور گھر لوٹ گیا۔ وہاں پہنچ کر میں نے فوراً تند و تیز شراب کے تین چار جام اوپر تلے پیے اور سو لینے کے بعد لورین کی طرف چل دیا۔

واپس آ کر میں نے اس عورت کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کرنے کی جتنی بھی کوششیں کیں سب ناکام رہیں۔ میں تو اس دکان پر بھی گیا جس پر دو فرشتوں کا نشان بنا ہوا تھا مگر جو لوگ اس کے مالک تھے انھیں پتا نہیں تھا کہ ان سے پہلے وہ کس کے پاس تھی۔

انتخاب

اتالو کلوینو

کا مکمل ناول

دولخت سورما

انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی

Scanned with CamScanner

اٹالو کلوینو (Italo Calvino)

اطالوی زبان کے منفرد ادیب اٹالو کلوینو ۱۹۲۳ میں کیوبا میں پیدا ہوئے، اور اٹلی کے شہر سان ریمو میں پرورش پائی۔ ایک بلند پایہ فکشن نگار ہونے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ادب سے متعلق موضوعات پر مضامین بھی لکھے اور تورینو کے ایک اشاعتی ادارے کے ادارتی عملے میں بھی شامل رہے۔ کلوینو نے اطالوی لوک کہانیوں کا ایک ضخیم مجموعہ بھی مرتب کیا۔ کلوینو کی وفات ۱۹۸۸ میں ہوئی۔

کلوینو کی تحریروں میں پڑھنے والے کی ملاقات ایک بے حد ذہین تخیل اور اسلوب اور بیان پر بے پناہ گرفت سے ہوتی ہے۔ اس کا ناول If on a Winter's Night a Traveller اپنی ساخت اور اسالیب کے تنوع کے اعتبار سے عالمی فکشن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ فکشن کے میدان میں ان کی دیگر کتابوں میں Invisible Cities، The Castle of Crossed Destinies، Cosmicomics، t zero، Marcovaldo، Difficult Loves اور Mr Palomar شامل ہیں۔ کلوینو کے مضامین اور خطبات The Uses of Literature اور Six Memos to the Next Millennium میں جمع کیے گئے ہیں۔ ان کی جو کہانیاں ان کی زندگی میں کسی مجموعے میں شامل نہیں ہو سکی تھیں، ان پر مشتمل کتاب Numbers in the Dark کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

کلوینو نے Our Ancestors کے نام سے تین ناولوں کا ایک سلسلہ لکھا جس میں سے ایک ناول The Cloven Viscount کا اردو ترجمہ آئندہ صفحات میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ترجمہ راشد مفتی نے خاص طور پر اس شمارے کے لیے کیا ہے۔ راشد مفتی اس سے قبل گابریئل گارسیا مارکیز، آئزک باشیوس سنگر، سال بیلو اور برنارڈ مالامڈ کے منتخب فکشن کو اردو میں منتقل کر چکے ہیں۔ آج کل وہ کلوینو کے اسی سلسلے کے دوسرے ناول Baron in the Trees کا ترجمہ کرنے میں مصروف ہیں جو مکمل ہونے پر کتب خانہ "پیپربیک سیریز" میں ایک کتاب کے طور پر شائع کیا جائے گا۔

کلوینو کی ایک کہانی کا ترجمہ "چاند کی دوری" کے عنوان سے "آج" کے شمارہ ۳ (بہار ۱۹۹۰) میں شائع ہوا تھا۔

Scanned with CamScanner

اِتالو کلوِینو

انگریزی سے ترجمہ: راشد مفتی

دو لخت سورما

۱

ترکوں کے خلاف جنگ ہو رہی تھی۔ میرے ماموں، جو وائکاؤنٹ میداردو آف ترالبا کہلاتے تھے، کرت نامی ایک ہم رکاب کی معیت میں گھوڑے پر سوار بوہیمیا کے میدان کے پار مسیحی لشکرگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ بگلوں کے سفید جھنڈ گاڑھی، ساکت ہوا میں نیچی پرواز کر رہے تھے۔

"اتنے سارے بگلے کیوں؟" میداردو نے کرت سے پوچھا۔ "یہ کہاں جا رہے ہیں؟"

میرے ماموں نووارد تھے۔ انھوں نے اس جنگ میں شریک نوابی ہمسایوں کو خوش کرنے کے لیے حال ہی میں اپنا نام درج کرایا تھا۔ آخری مسیحی قلعے سے اپنے لیے ایک گھوڑا اور ہم رکاب فراہم کرنے کے بعد وہ اب شاہی پڑاؤ میں حاضر ہونے جا رہے تھے۔

"یہ جنگ کے میدانوں کی طرف جا رہے ہیں،" ہم رکاب نے افسردگی سے کہا۔ "یہ سارا راستہ ہمارے ساتھ رہیں گے۔"

وائکاؤنٹ میداردو نے سن رکھا تھا کہ ان علاقوں میں بگلوں کی پرواز کو ایک اچھا شگون سمجھا جاتا ہے؛ سو اس نظارے پر وہ خوش نظر آنا چاہتے تھے۔ لیکن انھوں نے بے اختیار خود کو فکرمند

Scanned with CamScanner

محسوس کیا۔

"ایسے پرندوں کو میدانِ جنگ کی طرف کیا چیز کھینچ سکتی ہے، کرت؟" انھوں نے پوچھا۔

"چوں کہ کھیتوں کو قحط نے اور دریاؤں کو خشک سالی نے تہی کر دیا ہے،" ہم رکاب نے جواب دیا، "لہٰذا ان دنوں یہ بھی انسانی گوشت کھانے لگے ہیں۔ اب گدھوں اور کووں کی جگہ بگلوں، کونجوں اور سارسوں نے لے لی ہے۔"

اُن دنوں میرے ماموں اپنے شباب کے ولیں دور میں تھے؛ وہ عمر جب جذبات، جو تمام گذشتہ ہوتے ہیں اور جن کی ابھی چھان پھٹک نہیں ہوئی ہوتی، چشم زدن میں خیر اور شر میں ڈھل جاتے ہیں، وہ عمر جس میں ہر نیا تجربہ ـــــ بھیانک اور غیر انسانی بھی ـــــ زندگی کے پیار سے حرارت پا کر دھڑکتا ہے۔

"اور کوّے کہاں گئے؟ گدھ کیا ہوئے؟" انھوں نے پوچھا۔ "اور دوسرے شکاری پرندے؟ وہ کہاں ہیں؟" وہ زرد ہو رہے تھے لیکن ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

ہم رکاب، جو گہری رنگت اور گھنیری مونچھوں والا سپاہی تھا، کبھی نظریں نہیں اٹھاتا تھا۔ "یہاں طاعون سے مرنے والوں کی اتنی لاشیں ہیں کہ انھیں بھی طاعون نے آلیا۔" اس نے اپنے نیزے سے کچھ سیاہ جھاڑیوں کی طرف اشارہ کیا جنھیں بغور دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ شاخوں سے نہیں بلکہ پروں اور شکاری پرندوں کے خشک پنجوں سے بنی ہیں۔

"کوئی نہیں کہہ سکتا کہ پہلے کون مرا، پرندہ یا انسان، یا کس نے دوسرے کو چیر پھاڑ کے برابر کیا،" کرت نے جواب دیا۔

آبادی کا قلع قمع کرتے ہوئے طاعون سے بچنے کے لیے پورے کے پورے خاندان کھیتے علاقوں میں نکل آئے تھے جہاں موت نے انھیں آلیا۔ طاعون کی گٹھلیوں اور، پہلی نظر میں ناقابلِ توجیہ طور پر، پروں سے ڈھکی، مردوں اور عورتوں کی بے لباس لاشیں بنجر میدان میں بکھری ہوئی تھیں جیسے ان بھرج ٹانگوں اور پسلیوں میں بال و پر اُگ آئے ہوں۔ یہ گدھوں کے ڈھانچے تھے جو سانی باقیات میں گڈمڈ ہو گئے تھے۔

اب میدان میں گزشتہ جنگوں کی نشانیاں بکھری ہوئی تھیں۔ دونوں سواروں کی رفتار سست

Scanned with CamScanner

پڑ گئی تھی کیوں کہ ان کے گھوڑوں نے قدم قدم پر بھڑک کر الف ہونا شروع کر دیا تھا۔

"ہمارے گھوڑوں کو کیا ہو گیا ہے؟" سید اردو نے ہم رکاب سے پوچھا۔

"سینیور،" اس نے جواب دیا۔ "گھوڑے اپنی آنتوں کی سڑاند سے زیادہ کسی چیز سے نفرت نہیں کرتے۔"

میدان کا وہ ٹکڑا جسے وہ قطع کر رہے تھے، گھوڑوں کے ڈھانچوں سے بھرا ہوا تھا۔ کچھ پیٹھ کے بل سُموں کو آسمان کی جانب کیے پڑے تھے جب کہ دوسرے منہ کے بل تھوتھنیاں زمین میں گاڑے پڑے تھے۔

"اتنے سارے مُردہ گھوڑے یہاں کیوں، کرت؟" سید اردو نے پوچھا۔

"گھوڑا جب اپنے پیٹ کو چاک ہوتا محسوس کرتا ہے،" ہم رکاب نے وضاحت کی، "تو اپنی آنتیں اندر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ اپنا پیٹ زمین پر رکھ دیتے ہیں، دوسرے انھیں نکلنے سے بچانے کے لیے پیٹھ کے بل لیٹ جاتے ہیں۔ لیکن موت پھر بھی انھیں آ لیتی ہے۔"

"سو اس جنگ میں زیادہ تر گھوڑے مر رہے ہیں؟"

"ترکی شمشیریں پہلے ہی وار میں پیٹ چاک کرنے کے لیے بنی معلوم ہوتی ہیں۔ آگے ہم انسانوں کی لاشیں دیکھیں گے۔ پہلے گھوڑے مرتے ہیں، بعد میں سوار۔ لیکن، پڑاؤ آ گیا ہے۔"

افق کے کناروں پر اونچے شامیانوں کے کلس، شاہی فوج کے پرچم اور دھواں نظر آ رہا تھا۔

جوں جوں وہ آگے بڑھے انھوں نے دیکھا کہ گزشتہ جنگ میں کام آنے والے تقریباً سارے کے سارے اُٹھائے اور دفنائے جا چکے ہیں۔ اب صرف چند اعضا ٹھنٹھوں پر بکھرے ہوئے تھے، خاص طور پر انگلیاں۔

"میں بار بار اپنی طرف اشارہ کرتی انگلیاں دیکھ رہا ہوں،" میرے ماموں سید اردو نے کہا۔ "اس کا کیا مطلب ہے؟"

"خدا انھیں معاف کرے، لیکن مُردوں کی انگوٹھیاں اتارنے کے لیے زندہ لوگ ان کی انگلیاں تراش دیتے ہیں۔"

"کون ہے؟" سنتری پکارا جس کا چہرہ مٹی ور کائی سے اس طرح لتھڑا ہوا تھا جیسے شمالی ہوا کی زد میں آنے والے سب سے مدافعت درخت کی چھال۔

مقدس تاجِ شاہی کا بول بالا ہو!" کرت نے چلا کر کہا۔

"اور سلطان پر لعنت ہو!" سنتری نے جواب دیا۔ "تاہم جب آپ پڑاؤ میں پہنچیں تو براہِ مہربانی میری بدلی ضرور بھجوا دیں۔ یہاں کھڑے کھڑے میری جڑیں اگنے لگی ہیں!"

لشکرگاہ کے اطراف فضلے کے ڈھیروں پر بھنبھناتی مکھیوں کے بادلوں سے بچنے کے لیے گھوڑے اب پوری رفتار سے دوڑ رہے تھے۔

"کیا بہادر لوگ ہیں،" کرت نے تبصرہ کیا، "جن کا فضلہ ابھی زمین پر ہے اور خود آسمان میں پہنچ گئے ہیں۔" اس نے اپنے آپ پر صلیب کا نشان بنایا۔

لشکرگاہ میں داخل ہونے پر وہ سائبانوں کے ایک سلسلے سے گزرے جن کے نیچے بیٹھی بستہ و دُبلی عورتوں نے چیخوں اور کھردرے قہقہوں سے ان کا استقبال کیا۔ انھوں نے کمخواب کی قبائیں پہن رکھی تھیں اور ان کے پستان عریاں تھے۔

"شاہی داشتاؤں کے شامیانے،" کرت نے کہا۔ "کسی فوج کے پاس ایسی نفیس عورتیں نہیں ہیں۔"

میرے ماموں گھوڑے پر بیٹھے سر گھمائے انھیں دیکھتے جا رہے تھے۔

"سنیور، ذرا احتیاط سے!" بمبرکاب نے اپنی بات میں اضافہ کیا۔ "یہ اتنی غلیظ اور آتشک زدہ ہیں کہ ترک بھی انھیں مالِ غنیمت کے طور پر نہیں لیں گے۔ یہ صرف جوؤں، کھٹملوں اور پسّوؤں ہی سے بھری ہوئی نہیں بلکہ اب تو بچھو اور چھپکلیاں بھی ان کے جسموں پر ٹھکانے بنانے لگے ہیں۔"

وہ میدانی توپ خانے کے پاس سے گزرے۔ رات کے وقت توپچی دن بھر کی گولا باری سے دہکتی توپوں اور کھیری بندوقوں کے کانسی والے حصوں پر اپنا شلغم اور پانی کا راتب پکایا کرتے تھے۔

مٹی سے لدی گاڑیاں آ رہی تھیں جسے توپچی چھلنیوں سے چھان رہے تھے۔

"بارود اب کم یاب ہے،" کرت نے وضاحت کی۔ "لیکن جنگ کے میدانوں کی مٹی بارود سے اتنی سیر ہے کہ چند گولے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔"

آگے بیلوں کے اصطبل تھے جہاں بھنکتی مکھیوں کے درمیان بیٹھے جراح گھائلوں کو

ٹانکوں، پٹیوں اور اپنے ہوئے تار کول کے لیپ سے جوڑنے میں مصروف تھے جب کہ گھوڑے اور ڈاکٹر بھنبھناتے ہوئے پیر پٹخ رہے تھے۔

اس کے بعد پیادوں کے پڑاؤ کے لمبے لمبے ٹکڑے تھے۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ ہر خیمے کے آگے سپاہی گرم پانی کی ناندوں میں پیر ڈالے بیٹھے تھے۔ رات دن ناگہانی خطرات کا عادی ہونے کے باعث وہ پیروں کو غسل دیتے وقت بھی سر پر خود اور ہاتھ میں بھالا لیے رکھتے تھے۔ اونچے شامیانوں کے اندر، جو محلوں کی طرح آراستہ تھے، افسر بغلوں میں پوڈر لگاتے اور جھالر پنکھے ہلاتے نظر آرہے تھے۔

"اس کی وجہ نسوانیت نہیں،" کرت نے وضاحت کی، "بلکہ اس کے برعکس وہ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ فوجی زندگی کی سختیوں میں بھی کتنے آرام سے ہیں۔"

وائکاؤنٹ آف ترالبا کو فوراً شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ فرماں روا اپنے خیمے میں قالی بقتوں اور فتح کی نشانیوں کے درمیان مستقبل کے جنگی منصوبوں پر غور کر رہا تھا۔ میزیں کھلے ہوئے نقشوں سے بھری تھیں اور شہنشاہ ایک درباری امیر کی پیش کردہ چھوٹی سی گدی میں سے پنیں نکال نکال کر ان نقشوں میں لگانے میں مصروف تھا۔ اس وقت تک نقشے پنوں سے اس حد تک بھر چکے تھے کہ ان سے کچھ سمجھنا ناممکن تھا۔ انھیں پڑھنے کے لیے پنوں کو نکالنا اور پھر سے لگانا پڑتا تھا۔ پنیں نکالنے اور لگانے کے اس متواتر عمل میں اپنے ہاتھ خالی رکھنے کی غرض سے شہنشاہ اور اس کے درباری افسروں نے پنیں اپنے ہونٹوں میں دبا رکھی تھیں اور وہ صرف غراہٹ ہی کے ذریعے ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔

اپنے آگے جھکتے ہوئے نوجوان کو دیکھ کر شہنشاہ نے ایک سوالیہ غراہٹ نکالی۔ پھر اپنے منھ سے پنیں نکال لیں۔

"عالی جاہ، اٹلی سے ابھی آنے والے نائٹ،" اسے متعارف کرایا گیا۔ "وائکاؤنٹ آف ترالبا جن کا تعلق جمہوریہ گینوسی کے ایک عالی نسب خاندان سے ہے۔"

"انھیں فوری طور پر لیفٹیننٹ بنا دیا جائے۔"

میرے ماموں نے چوکس ہو کر مہمیزیں بجائیں جب کہ شہنشاہ نے خسروانہ انداز سے اپنا بازو لہرایا اور سارے کے سارے نقشے خود بخود تہ ہو کر نیچے جا گرے۔

تھکا ہوا ہونے کے باوجود میدار دو اس شب دیر سے سویا۔ وہ اپنے خیمے کے پاس ٹہلتا ہوا سنتریوں کی پکاریں، گھوڑوں کی ہنہناہٹیں اور نیند میں بولتے سپاہیوں کی بے ربط باتیں سنتا رہا۔ اس نے بوہیمیا کے ستاروں پر نظر کی اور اپنے نئے منصب، صبح کی ہونے والی جنگ، اپنے دور دراز گھر اور اس کی آبجوؤں میں سرسراتے نرسلوں کے بارے میں سوچا کیا۔ اسے کوئی ہڑک یا شک یا خدشہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بلاشبہ چیزیں ابھی تک اسی طرح ثابت و سالم تھیں جس طرح وہ خود۔ اگر وہ اس دہشت ناک انجام کی پیش بینی کر سکتا جو اس کا منتظر تھا تو اسے بھی اس کے تمام تردد کے ساتھ عین فطری سمجھتا۔ اس کی نظریں تاریک افق کے سروں سے الجھ رہی تھیں جہاں اسے معلوم تھا کہ دشمن کا پڑاؤ ہے۔ بعید اور متضاد حقائق اور ان کے درمیاں اپنی موجودگی کے تیقن کے ساتھ اس نے بند بازوؤں سے اپنے آپ کو لپٹا لیا۔ اس نے اس ہولناک جنگ کے دوران لاتعداد ریلوں کی صورت میں زمین پر انڈیلنے اور انجام کار اپنے آپ تک پہنچنے والی خوں ریزی کو محسوس کیا اور اپنے آپ پر کسی ظلم یا رحم کے بغیر چھا جانے دیا۔

۲

اگلی صبح ٹھیک دس بجے جنگ شروع ہو گئی۔ اپنی زین کی اونچائی سے لیفٹیننٹ میدار دو نے حملے کے لیے تیار مسیحیوں کی وسیع صف بندی پر نظر ڈالی۔ اس نے اپنا چہرہ بوہیمیا کی ہوا کے مقابل کیا جو بھوسی سے لدی اس طرح چکر رہی تھی گویا کسی گرد آلود اناج گھر میں ہو۔

"نہیں، گھومیے مت، سینیور!" کرت نے، جو ساتھ تھا اور اب ایک سارجنٹ بن چکا تھا، وضاحت کی۔ اور اس حتمی فقرے کا جواز پیش کرنے کے لیے اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا، "جنگ سے پہلے مڑ کر دیکھنا بدبختی لاتا ہے۔"

حقیقت یہ تھی کہ وہ وائکاؤنٹ کو بددل نہیں کرنا چاہتا تھا کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ تمام مسیحی لشکر تقریباً اتنی ہی نفری پر مشتمل ہے جو وہاں موجود ہے اور یہ کہ اس کی واحد کمک صرف چند کمزور اور غیر موثر پیادہ دستے ہیں۔

لیکن میرے ماموں کی نظریں دُور اُفق کی جانب سے لمحہ بہ لمحہ نزدیک آتے ہوئے ایک بادل پر تھیں، اور وہ سوچ رہے تھے: "وہاں، اس بادل کے پیچھے تُرک ہیں، سچ مچ کے تُرک، اور یہاں یہ تمباکو تھوکتے ہوئے لوگ مسیحی دنیا کے تجربہ کار جنگجو ہیں۔ اور یہ بگل جو اب بج رہا ہے حملے کا اعلان ہے، جو میری زندگی کا پہلا حملہ ہے۔ اور یہ گڑگڑاہٹ اور یہ تھرتھراہٹ، یہ زمین میں گرتا ہوا شہابِ ثاقب، جس پر جنگجو اور گھوڑے نڈھال سی جھنجھلاہٹ دکھا رہے ہیں، توپ کا گولا ہے، دشمن کی طرف سے توپ کا پہلا گولا جو میں نے اپنی زندگی میں دیکھا ہے۔ خدا کرے یہ وہ دن نہ ہو جب مجھے کہنا پڑے کہ یہ میرا آخری گولا تھا۔"

پھر ہاتھ میں ننگی تلوار لیے وہ پوری رفتار سے میدان میں گھوڑا دوڑانے لگے۔ ان کی نظریں دھویں میں ڈوبتے ابھرتے شاہی پرچم پر جمی تھیں۔ اس دوران دوستانہ گولے ان کے سر پر آسمان میں گردش کر رہے تھے اور دشمن کے گولے مسیحی صفوں اور زمین کی غیر متوقع پناہوں میں دراڑیں ڈال رہے تھے۔ "اب میں دیکھوں گا تُرکوں کو! اب میں دیکھوں گا تُرکوں کو!" وہ سوچ رہے تھے۔ دشمن رکھنے سے اور پھر یہ جاننے سے کہ آیا وہ ایسے ہی ہیں جیسا آپ نے سوچا تھا، بڑا لطف کوئی نہیں ہے۔

اب میرے ماموں نے انھیں دیکھا، تُرکوں کو! ان میں سے دو ان کے بالکل قریب آ گئے تھے۔ ان کے گھوڑوں پر جھول پڑے ہوئے تھے، ہاتھوں میں چمڑے کی چھوٹی چھوٹی گول ڈھالیں اور جسموں پر کیسری دھاریوں والی عبائیں تھیں۔ وہ پگڑیاں باندھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں کی رنگت خاکی مائل زرد اور مونچھیں، تراپا کے ایک ایسے شخص کی سی تھیں جسے سچ مچ تُرک کہا جاتا تھا۔ دونوں میں سے ایک مارا گیا اور دوسرے نے کسی اور کو مار دیا لیکن اب ان کے دل کے دل چلے آ رہے تھے اور لڑائی دست بدست جنگ میں تبدیل ہو گئی تھی۔ دو تُرکوں کو دیکھنے کا مطلب ان کی ساری فوج کو دیکھ لینا تھا۔ اپنی فوج کے سازوسامان سے مزین وہ بھی آخر سپاہی تھے۔ ان کے چہرے دہقانوں کی طرح کرخت اور دھوپ کھائے ہوئے تھے۔ میدارادو انھیں جس قدر دیکھنا چاہتا تھا دیکھ چکا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ بٹیروں کے موسم کے لیے وقت پر تراپا پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اس نے پوری جنگ کے لیے نام لکھوایا تھا سو شمشیروں کے واروں سے بچتا ہوا وہ آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ اس نے ایک پستہ قد پیدل تُرک کو دیکھا اور اسے قتل کر دیا۔ اب جبکہ اسے قتل کرنا آ

Scanned with CamScanner

گیا تھا، وہ کسی دراز قد سوار کو ڈھونڈنے لگا۔ یہ اس کی غلطی تھی کیوں کہ سب سے زیادہ خطرناک پستہ قد ہی تھے۔ وہ سیدھے اپنی شمشیروں کے ساتھ گھوڑوں کے نیچے گھس کے ان کی کونچیں کاٹ دیتے تھے۔

میدارڈو کا گھوڑا یکایک رک گیا اور اس نے اپنی ٹانگیں چوڑی کر لیں۔ "کیا ہوا؟" وائکاؤنٹ نے کہا۔ کرٹ قریب آیا اور اس نے نیچے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ دیکھیے۔" گھوڑے کی تمام آنتیں زمین پر لٹک رہی تھیں۔ بے چارے جانور نے سر اٹھا کر اپنے مالک کو دیکھا۔ پھر اس نے اپنا سر اس طرح جھکا لیا گویا اسے اپنی آنتوں کو چرنا ہو۔ لیکن یہ بہادری کا آخری مظاہرہ تھا۔ اس نے غش کھایا اور پھر مر گیا۔ میدارڈو آف ترالبا پیدل ہو گئے۔

"میرا گھوڑا لے لو، لیفٹننٹ،" کرٹ نے کہا، لیکن اپنے گھوڑے کو روکنے سے قاصر رہا۔ وہ ترکوں کے ایک تیر سے زخمی ہو کر گر پڑا اور گھوڑا بھاگ گیا۔

"کرٹ!" وائکاؤنٹ چیخ پڑا۔ وہ اپنے ہم رکاب کے پاس گیا جو زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔

"میری فکر نہ کیجیے جناب،" ہم رکاب نے کہا۔ "خدا کرے اسپتال میں کچھ شراب ہو۔ ہر زخمی ایک کپی کا حق دار ہے۔"

میرے ماموں میدارڈو نے اپنے آپ کو ہجوم میں دھکیل دیا۔ جنگ کا انجام غیر یقینی تھا۔ افراتفری میں ایسا لگتا تھا کہ مسیحی جیت رہے ہیں۔ بلاشبہ انھوں نے ترکوں کی صفیں توڑ دی تھیں اور ان کے کچھ مورچے الٹ دیے تھے۔ میرے ماموں چند اور بہادروں کے ساتھ دشمن کی توپوں کے نزدیک پہنچ گئے۔ مسیحیوں کو گولاباری کی زد میں رکھنے کے لیے ترک اپنی توپوں کا رخ تبدیل کر رہے تھے۔ دو ترک توپچی ایک توپ کو گھما رہے تھے۔ وہ اپنی سست حرکات، داڑھیوں اور لمبی عباؤں کے ساتھ دو نجومیوں جیسے لگ رہے تھے۔ میرے ماموں نے کہا، "میں انھیں دیکھ لوں گا!" اپنے جوش اور ناتجربہ کاری میں وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ توپوں کی طرف ہمیشہ پہلو سے یا دہانے کے عقب سے بڑھنا چاہیے۔ وہ یہ سوچتے ہوئے ننگی تلوار کے ساتھ دہانے کے سامنے کود پڑے کہ دونوں نجومیوں کو ڈرا دیں گے۔ لیکن بجائے ڈرنے کے انھوں نے گولا سیدھا ان کے سینے پر داغ دیا۔ میدارڈو آف ترالبا ہوا میں اچھل گئے۔

شام ڈھلے جب صلح ہوئی تو دو گاڑیاں میدانِ جنگ سے مسیحی لاشوں کو اٹھانے گئیں۔ ایک

زخمیوں کے لیے تھی اور دوسری مُردوں کے لیے۔ پہلا انتخاب تو موقعے ہی پر کیا گیا۔ میں اسے اٹھاتا ہوں، تم اُسے اٹھاؤ۔ جہاں یہ نظر آتا کہ کسی شخص کو بچایا جاسکتا ہے تو اسے زخمیوں کی گاڑی میں ڈال دیا جاتا۔ جہاں ٹکڑوں اور حصّوں کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا، انھیں مناسب تدفین کے لیے مُردوں کی گاڑی میں رکھا جاتا۔ اور وہ جن کا جسم ہی نہیں ہوتا تھا بگلوں کے لیے چھوڑ دیے جاتے تھے۔ گزشتہ چند دنوں سے، جبکہ نقصانات فزوں ہو رہے تھے، زخمیوں کے بارے میں رواداری برتنے کے احکام دیے گئے تھے۔ سو میدارڈو کی باقیات ایک زخمی کی باقیات سمجھی گئیں اور انھیں اسی گاڑی میں رکھا گیا۔

دوسرا انتخاب اسپتال میں کیا گیا۔ جنگوں کے بعد جنگی اسپتال خود جنگ سے زیادہ ہولناک منظر پیش کر رہا تھا۔ فرش پر اسٹریچروں کی لمبی قطاریں تھیں جن میں بے چارے سپاہی پڑے کراہ رہے تھے، اور ہر طرف چمٹیاں، سوئیاں، کٹے ہوئے جوڑ اور دھاگے کے گولے تھے ڈاکٹروں کا بھیڑ تھی۔ وہ ایک جسم سے دوسرے جسم کی طرف جاتے اور ہر ایک کو دوبارہ زندگی دینے کی بھرپور کوشش کرتے۔ یہاں ایک نشتر، وہاں ایک ٹانکا، درزوں کو بند کرنا، رگوں کو دستانوں کی طرح الٹ کر دوبارہ اس طرح رکھنا کہ ان میں خون سے زیادہ دھاگا ہوتا، تاہم جوڑ جاڑ کر بند کر دینا۔ جب کوئی مریض مرتا تو اس کے سالم حصے دوسروں کی جوڑ جاڑ میں کام آتے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن سب سے زیادہ پریشانی کا سبب آنتیں ہوتیں جو ایک دفعہ باہر نکل پڑتیں تو دوبارہ رکھی ہی نہیں جاسکتی تھیں۔

چادر ہٹائی گئی تو وائکاؤنٹ کا بری طرح کٹا پھٹا جسم سامنے تھا۔ نہ صرف یہ کہ ایک بازو اور ٹانگ غائب تھی بلکہ بازو اور ٹانگ کے درمیان تمام سینہ اور پیٹ راست ضرب کے نتیجے میں اُڑ گیا تھا۔ سر کا جو کچھ باقی رہ گیا تھا وہ ایک آنکھ، ایک کان، ایک رخسار، نصف ناک، نصف منہ، نصف ٹھوڑی اور نصف پیشانی پر مشتمل تھا۔ سر کا بقیہ نصف وہاں سرے سے تھا ہی نہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ اس کا ٹھیک نصف، جو دایاں حصہ تھا، مکمل محفوظ حالت میں بچ گیا تھا اور ایک ضخیم گھاؤ کے سوا جو اسے گولے سے ڈھ جانے والے بائیں حصے سے الگ کر رہی تھی، اس پر کوئی خراش تک نہیں تھی۔

ڈاکٹر کس قدر خوش تھے۔ "کیا عمدہ ہے!" اگر یہ اس اثنا میں مر نہ گیا تو اسے بچانے کی

Scanned with CamScanner

ایک کوشش تو کی جا سکتی ہے۔ وہ اس کے گرد جمع ہو گئے جبکہ بےچارے سپاہی جن کے فقط بازوؤں میں تیر پھنسے ہوئے تھے، خون کی زہرناکی سے مرتے رہے۔ وہ سیتے، گوندھتے، چپکاتے رہے: کون کہہ سکتا ہے ان کے جی میں کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگلے دن میرے ماموں نے اپنی واحد آنکھ اور نصف منہ کھولا، انھوں نے اپنا اکلوتا نتھنا پھلایا اور سانس لینے لگے۔ ترالبا کی مضبوط ساخت نے ان کا بیڑا پار کر دیا تھا۔ اب وہ زندہ تھے لیکن نصف جسم کے ساتھ!

۳

جب میرے ماموں ترالبا واپس آئے تو میری عمر سات یا آٹھ برس کی تھی۔ اکتوبر کا مہینا تھا، آسمان ابر آلود تھا اور شام ڈھلے دیر ہو چکی تھی۔ اس روز ہم انگوروں کی فصل پر کام کر رہے تھے کہ ہم نے بیلوں کی قطاروں کے اوپر سے خاکستری سمندر میں ایک جہاز کے بادبان ظاہر ہوتے دیکھے جس پر شاہی پرچم لہرا رہا تھا۔ ان دنوں ہم ہر جہاز کو دیکھ کر کہا کرتے تھے: "وہ آقا میداردو واپس آ رہے ہیں۔" اس لیے نہیں کہ ہم ان کی واپسی کے لیے بےچین تھے، بلکہ اس غرض سے کہ انتظار کے لیے کچھ تو ہو۔ اس بار ہمارا اندازہ درست تھا؛ اور اس شام جب فیور فیسرو نامی نوجوان نے، جو کٹھاؤ کی اونچائی پر انگور کچل رہا تھا، چلا کر کہا: "ارے، ذرا نیچے تو دیکھو!" تو ہمیں پورا یقین تھا کہ ہمارا اندازہ درست ہے۔ اندھیرا تقریباً چھا گیا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ نیچے وادی میں خچروں والے راستے پر مشعلیں روشن کی جا رہی ہیں۔ پھر جب جلوس پُل پر سے گزرا تو ہم نے ایک ڈولی دیکھی جسے لوگوں نے اٹھا رکھا تھا۔ اب کوئی شبہ نہیں تھا، یہ وائکاؤنٹ ہی تھا جو معرکہ آرائیوں سے واپس آ رہا تھا۔

ساری وادی میں خبر پھیل گئی۔ مصاحب، ملازم، شراب ساز، چرواہے، سپاہی، غرض یہ کہ سبھی لوگ قلعے کے صحن میں جمع ہو گئے۔ واحد غیر حاضر شخص میداردو کا باپ بوڑھا وائکاؤنٹ ایولفو، یعنی میرے نانا تھے جو مدتوں سے نیچے صحن میں نہیں آئے تھے۔ کاروبارِ دنیا سے تھک ہار کر وہ اپنے خاص حقوق سے اپنے بیٹے کے حق میں دست بردار ہو چکے تھے۔ پرندوں سے ان کا شوق شدید،

جنھیں وہ قلعے کے اندر ہی ایک بہت بڑے چڑیاخانے میں پالتے تھے، اب ہر شوقِ ماسوا کو بے دخل کرنے لگا تھا۔ حال ہی میں اس مردِ ضعیف نے اپنا بستر بھی چڑیاخانے میں لگوا لیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو چڑیاخانے میں بند کر لیا تھا اور دن ہو یا رات، وہ کبھی باہر نہیں نکلتا تھا۔ اس کا کھانا پرندوں کے دانے کے ساتھ پنجرے کی سلاخوں میں سے دے دیا جاتا تھا جسے وہ اُن میں بانٹ دیتا تھا۔ اپنے بیٹے کی واپسی کا انتظار کرتے ہوئے وہ اپنے شب و روز چکوروں اور قمریوں کو سہلانے میں گزارتا تھا۔

اپنے قلعے کے صحن میں اتنے سارے لوگ میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہمسایوں کے ساتھ جشن و جنگ کے دن، جو قصے کہانیاں ہی تھے، کبھی کے گزر چکے تھے۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ دیواریں اور بُرج کتنے شکستہ ہیں اور صحن، جہاں ہم بکریوں کو چارہ ڈالتے تھے اور خنزیروں کی ناندیں بھرتے تھے، کیچڑ سے کتنا بھرا ہوا ہے۔ دورانِ انتظار سب لوگ اس بات پر بحث کر رہے تھے کہ وائکاؤنٹ میدار دو کس حالت میں لوٹے گا۔ ترکوں کے لگائے ہوئے شدید زخموں کی افواہیں کچھ عرصہ پہلے ہم تک پہنچ چکی تھیں، لیکن ابھی تک کوئی ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کے ہاتھ پیر کٹ چکے ہیں، یا وہ بیمار ہے، یا صرف اس کے جسم پر زخموں کے نشان ہیں۔ ڈولی کو دیکھ کر ہم بد ترین خبر کے لیے تیار ہو گئے۔

اب ڈولی زمین پر رکھ دی گئی تھی اور اس کی تاریکی میں سے ایک پُتلی چمکتی نظر آ رہی تھی۔ بوڑھی آیا سباستیانا ڈولی کی طرف بڑھی لیکن اندھیرے میں سے ایک اٹھا ہوا ہاتھ انکار کا اشارہ کرتا ظاہر ہوا۔ پھر اس بدن میں جو ڈولی کے اندر تھا، ایک تیکھی اور ناہموار سی جنبش نظر آئی اور ہماری آنکھوں کے سامنے میدار دو آفت ترالبا ایک بیساکھی کا سہارا لیے زمین پر کود پڑا۔ ایک سیاہ چغے اور سرپوش نے اسے سر سے پاؤں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ پیچھے کی سمت جھکا ہوا داہنے ہاتھ والا حصّہ اس کے نصف چہرے اور بدن کو بیساکھی کے بالکل پاس دکھا رہا جبکہ بائیں طرف کا سب کچھ اس کشادہ کپڑے کے سروں اور تہوں میں مستور و ملفوف تھا۔

وہ اسی جگہ کھڑا ہمیں دیکھتا رہا۔ ہم اس کے اطراف حلقہ کیے ہوئے تھے اور ہم میں سے کسی نے ایک بھی لفظ ادا نہیں کیا تھا۔ لیکن شاید وہ اپنی غیر متغیر پذیر آنکھ سے ہمیں بالکل دیکھ ہی نہیں رہا تھا اور وہاں سے دیکھتے ہی چلا جانا چاہتا تھا۔ سمندر کی طرف سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور انجیر

کے درخت کی ایک ٹوٹی ہوئی شاخ گرا دی تھی۔ میرے ماموں کا چغہ لہرایا۔ ہوا نے اسے پھڑپھڑایا اور پھر تان کر بادبان کی طرح پھیلا دیا۔ ہوا اس بدن میں سے تقریباً گزرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی گویا کہ وہ بدن وہاں موجود ہی نہ ہو اور چغہ کسی صوت کے چغے کی طرح خالی ہو۔ پھر غور سے دیکھنے پر ہم نے جانا کہ چغہ بدن سے اس طرح چپٹا ہوا ہے جیسے جھنڈا بانس سے۔ اور یہ بانس، بیساکھی پر جھکا ہوا ایک کندھا، ایک بازو، ایک پہلو اور ایک ٹانگ تھی۔ باقی بدن سرے سے تھا ہی نہیں۔

بکریاں اپنی بے تاثر منجمد نظروں سے ٹکٹکی باندھے وائکاؤنٹ کو دیکھ رہی تھیں۔ ہر بکری کی سمت نظر مختلف تھی لیکن سب ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں اور ان کے پٹھے قائمہ زاویوں کے ایک عجیب نمونے میں مرتب تھے۔ خنزیر، کہ زیادہ حساس اور تیز فہم ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو پہلوؤں سے دھکیلتے ہوئے بھاگ نکلے تھے۔ ہم اپنی دہشت کو اب اور نہ چھپا سکتے تھے۔ "اوہ، میرے پیارے بچے!" بوڑھی سباستیانا اپنے بازو اٹھا کر چلائی۔ "میرے چھوٹے سے بچہ گڑ تڑے!"

. میرے ماموں نے، جو ایسا تاثر پیدا کرنے پر برہم تھے، اپنی بیساکھی کی نوک زمین پر بڑھائی اور ایک جست کے ساتھ اپنے آپ کو قلعے کے دروازے کی طرف دھکیلنے لگے۔ لیکن بڑے پھاٹک کی سیڑھیوں پر سونے کی بالیوں، پھندنوں اور منڈے ہوئے سروں پر بالوں کے گچھوں والے نیم عریاں لوگ، جو ڈولی بردار تھے اور آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے، اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک چوٹیوں والا شخص، جو ان کا سرخیل لگتا تھا، گویا ہوا: "ہم اپنی ادائیگی کے منتظر ہیں۔"

"کتنے پیسے ہوئے؟" میدار دو نے تقریباً ہنستے ہوئے پوچھا۔

چوٹیوں والے شخص نے کہا، "ایک آدمی کو ڈولی میں لانے کا نرخ آپ کو معلوم ہی ہے۔"

میرے ماموں نے اپنی پیٹی سے بٹوا نکالا اور ایک جھنکار کے ساتھ اس کے پیروں میں پھینک دیا۔ اس شخص نے جلدی سے بٹوا ایک ہاتھ میں تولا اور کہنے لگا، "لیکن یہ تو اس سے بہت کم ہے جس پر ہم متفق ہوئے تھے، حضور۔"

میدار دو، جس کے چغے کے کنارے ہوا نے بلند کر دیے تھے، بولا: "آدھا!"

وہ ڈولی بردار کے کندھے سے کندھا رگڑتا ہوا اپنے واحد پیر سے چھوٹی چھلانگیں لگاتا سیڑھیاں

چڑھ گیا اور اس بڑے پھاٹک سے جو قلعے کے اندرونی حصے میں کھلتا تھا، اندر چلا گیا۔ اس نے دونوں بھاری دروازوں کو اپنی بیساکھی سے دھکیلا جو ایک زوردار آواز کے ساتھ بند ہو گئے۔ پھر اس نے پھاٹک کا چھوٹا دروازہ، جو کھلا رہ گیا تھا، زور سے بند کر دیا اور یوں ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم دیر اور بیساکھی کی بھاری بھاری اندر سے آتی ہوئی آواز سنتے رہے جو راہداریوں میں گونجتی قلعے کے اس حصے کی طرف جا رہی تھی جہاں اس کی نجی اقامت گاہ تھی۔ دروازے بند کرنے اور چٹخنیاں چڑھانے کا شور یہاں بھی تھا۔

اس کا باپ، پنجرے کی سلاخوں کے پیچھے کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ میداردو اس کی بھی خیریت معلوم کرنے نہیں رکا۔ اس نے خود کو اپنی اقامت گاہ میں تنہا بند کر لیا اور سباستیانا سے بھی ملنے سے انکار کر دیا جو تادیر دستک دیتی اور اظہارِ ہمدردی کرتی رہی۔

بوڑھی سباستیانا سیاہ لباس اور نقابوں میں ملبوس ایک لحیم شحیم عورت تھی۔ اس کے سُرخ چہرے پر اس ایک جھرّی کے سوا جس نے ان کی آنکھوں تقریباً چھپا رکھا تھا، کوئی جھرّی نہیں تھی۔ اس نے ترالبا خاندان کی تمام نرینہ اولادوں کو دودھ پلایا تھا، تمام بالغ مردوں کے ساتھ سوئی تھی اور سبھی مرنے والوں کی آنکھیں بند کی تھیں۔ اب وہ ان دونوں خودساختہ قیدیوں کی سکونت گاہوں کے درمیان اِدھر سے اُدھر دوڑتی رہتی کہ نہیں جانتی تھی ان کی مدد کے لیے کیا کرے۔

چوں کہ میداردو نے زندگی کی کوئی اور علامت نہیں دکھائی، سو اگلے دن ہم واپس انگور چگنے چلے گئے۔ لیکن اب اس کام میں کوئی خوشی نہیں تھی۔ بیلوں کے درمیان ہم صرف اسی کی بدنصیبی کی باتیں کرتے رہے، اس لیے نہیں کہ ہم اس کے بہت مدّاح تھے بلکہ اس وجہ سے یہ موضوع ہی جاذبِ توجہ اور عجیب تھا۔ صرف بوڑھی سباستیانا قلعے میں مقیم رہی۔ وہ ہر آواز کو بغور سن رہی تھی۔

اِدھر بوڑھے ایولفو نے، گویا اسے اپنے بیٹے کے اس قدر افسردہ اور غضب ناک لوٹنے کا پہلے ہی سے اندازہ ہو، اپنے ایک سب سے پسندیدہ پرندے کو قلعے کے اس حصے تک جہاں میدارود کی سکونت تھی اور جو اُس وقت خالی تھا، پرواز کرنے اور چھوٹی سی کھڑکی سے اندر داخل ہونے کی تربیت دے رکھی تھی۔ اس صبح اس نے پرندے کے پنجرے کا دروازہ کھولا اور اسے اپنے بیٹے کی کھڑکی تک اڑتے دیکھتا رہا۔ پھر وہ پرندوں کے چہچہانے کی نقالی کرتا ہوا، انھیں دانہ ڈالنے لگا۔

Scanned with CamScanner

کچھ دیر بعد اس نے کھڑکی پر کسی چیز کے پھڑپھڑانے کی آواز سنی۔ وہ باہر کی طرف جھکا۔ پرندہ نیچے پر مرا پڑا تھا۔ بوڑھے نے اسے اپنی ہتھیلیوں پر رکھ کر اٹھایا۔ اس نے دیکھا کہ پرندے کا ایک بازو ٹوٹا ہوا ہے، جیسے کسی نے اسے الگ کرنے کی کوشش کی ہو، ایک پنجہ مڑا ہوا ہے، جیسے دو انگلیوں سے مروڑا گیا ہو، اور ایک آنکھ نکلی ہوئی ہے۔ بوڑھا پرندے کو اپنے سینے میں سے چمٹا کر سسکیاں لینے لگا۔

اسی دن اس نے بستر پکڑ لیا۔ اور پنجرے کے دوسری طرف ملازموں نے دیکھا کہ وہ بہت بیمار ہے۔ لیکن کوئی اندر جا کر اس کی خبر گیری نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ اس نے اندر سے تالا لگا کر چابیاں چھپا دی تھیں۔ پرندے اس کے بستر کے گرد پرواز کر رہے تھے۔ چوں کہ وہ بستر سے اٹھ نہیں سکتا تھا لہٰذا پرندے بھی بیٹھنے یا پَر پھڑپھڑانا بند کرنے سے انکاری تھے۔

اگلی صبح جب آیا نے پنجرے میں سر ڈالا تو اسے احساس ہوا کہ وائکاؤنٹ ایولفو چل بسا ہے۔ سارے پرندے اس کے بستر پر اتر آئے تھے گویا کہ وہ سمندر میں بہتا ہوا درخت کا تنا ہو۔

۴

اپنے باپ کی موت کے بعد میدار دو نے قلعے کے باہر آنا جانا شروع کیا۔ یہ بات سب سے پہلے، جب اس نے ایک صبح میدار دو کے دروازے چوپٹ کھلے دیکھے اور اس کی سکونت گاہ کو خالی پایا، سباستیانا نے محسوس کی۔ نوکروں کا ایک گروہ وائکاؤنٹ کے نشانات کا پیچھا کرنے دیہات کے علاقے میں بھیجا گیا۔ وہ تیز تیز چلتے ہوئے ناشپاتی کے ایک درخت کے نیچے سے گزرے جسے گزشتہ شام دریاؤ پھلوں سے، جو ابھی تک کچے تھے، بھر ادیکھ چکے تھے۔ "ذرا اوپر تو دیکھو،" ان میں سے ایک بولا۔ انھوں نے سفیدی مائل آسمان کے پس منظر میں لٹکتی ہوئی ناشپاتیوں پر نظر ڈالی۔ اس منظر نے انھیں وحشت زدہ کر دیا، کیوں کہ ناشپاتیاں سالم نہیں بلکہ آدھے حصوں میں تھیں۔ انھیں لمبائی میں اس طرح کاٹا گیا تھا کہ ہر ایک ابھی تک اپنے ڈنٹھل سے لٹک رہی تھی۔ ہر ناشپاتی کا جو کچھ رہ گیا تھا وہ داہنا حصہ تھا (یا دیکھنے والے کی سمت کے مطابق بایاں، لیکن سارے

Scanned with CamScanner

حصے ایک ہی سمت میں تھے۔) دوسرا نصف غائب سا؛ کاٹ دیا گیا تھا یا شاید کھا لیا گیا تھا۔

"وائکاؤنٹ یہاں سے گزرا ہے!" نوکروں نے کہا۔

ظاہر ہے اتنا عرصہ خوراک کے بغیر بند رہنے کے بعد اس رات سے بھوک لگی تھی اور جو بھی پھلدار درخت نظر آیا وہ اس پر ماشپاتیاں کھانے چڑھ گیا تھا۔

چلتے چلتے نوکروں کو ایک چٹان پر آدھا مینڈک ملا جو ابھی زندہ تھا اور مینڈکوں کی توانائی کے ساتھ چھلانگیں لگا رہا تھا۔ "ہم صحیح راستے پر ہیں!" اور وہ آگے بڑھتے گئے، لیکن جلد ہی بھٹک گئے کیوں کہ وہ اس آدھے خربوزے کو نہیں دیکھ سکے جو پتوں میں نہاں تھا۔ سو اسے ڈھونڈنے کے لیے انھیں واپس آنا پڑا۔

اس طرح وہ کھیتوں سے جنگل میں نکل آئے۔ انھوں نے ایک آدھی کٹی ہوئی کھمبی دیکھی جو خوردنی تھی، اس کے بعد ایک اور جو زہریلی اور سرخ رنگ کی سانپ چھتری تھی۔ جوں جوں وہ جنگل میں اندر تک گئے انھیں قدم قدم پر زمین سے پھوٹتی آدھے تنوں اور آدھی چھتریوں والی کھمبیاں ملتی گئیں جو ایک واضح کاٹ کے ذریعے منقسم نظر آتی تھیں لیکن ان کے دوسرے نصف کا ایک ٹکڑا تک نظر نہ آتا تھا۔ فطری نبات، کھمب، سانپ چھتری، غرض ان میں ہر قسم کی کھمبیاں تھیں اور ان میں زہریلی بھی اتنی ہی تھیں جتنی کہ خوردنی۔

نوکر اس منتشر سُراغ سے ٹوہ لیتے ہوئے، ایک کھلی جگہ میں آ پہنچے جسے راہباؤں کا میدان کہا جاتا تھا اور جہاں گھاس کے درمیان ایک تالاب تھا۔ پو پھٹنے کا وقت تھا۔ سیاہ چغے میں لپٹا ہوا میدار دو کا دُبلا وجود تالاب کے کنارے کھڑا پانی میں منعکس ہو رہا تھا، جس پر سفید، زرد اور بھورے رنگ کی کھمبیاں تیر رہی تھیں۔ یہ وہ نصف حصے تھے جو وہ اپنے ساتھ لے آیا تھا اور جو اب اس شفاف سطح پر بکھرے ہوئے تھے۔ پانی میں تیرتی ہوئی کھمبیاں سالم لگ رہی تھیں اور وائکاؤنٹ کی نظریں ان پر جمی ہوئی تھیں۔ نوکر تالاب کے دوسرے کنارے پر چھپ گئے۔ انھوں نے ایک بھی لفظ ادا کرنے کی جرأت نہیں کی، بس تیرتی ہوئی کھمبیوں کو ٹکر ٹکر دیکھتے رہے، یہاں تک کہ اچانک انھیں احساس ہوا کہ پانی میں پڑی کھمبیاں تو واقعی خوردنی ہیں۔ زہریلی کھمبیاں کہاں گئیں؟ اگر اس نے انھیں تالاب میں نہیں پھینکا تو پھر ان کے ساتھ کیا کیا ہوگا؟ نوکر دوڑتے ہوئے جنگل میں واپس گئے۔ انھیں زیادہ دور جانا نہیں پڑا کیوں کہ انھیں راستے میں ٹوکری لیے

ہوئے ایک پنجہ ملا۔ ٹوکری کے اندر ساری زہریلی نصف کھمبیاں تھیں۔

وہ پنجہ نہیں تھا۔ ایک رات میں راہبوں کے میدان کے ارد گرد اُگے درختوں کے پیچھے تنہا آنکھ مچولی کھیل رہا تھا کہ ماموں سے میرا سامنا ہوا۔ وہ چاند کی روشنی میں کندھے پر ٹوکری لٹکائے اپنی ایک ٹانگ پر میدان میں پھدکتے جا رہے تھے۔

"ماموں!" میں نے چلّا کر کہا۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ مجھے انھیں اس طرح مخاطب کرنے کا موقع ملا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر پریشان نظر آنے لگے۔ "میں کھمبیاں اکٹھی کر رہا ہوں،" انھوں نے کہا۔

"کچھ ملیں؟"

"دیکھو،" میرے ماموں نے کہا اور ہم تالاب کے کنارے بیٹھ گئے۔ کچھ کو پانی میں پھینکتے ہوئے اور کچھ کو ٹوکری میں ڈالتے ہوئے وہ کھمبیاں چھانٹنے لگے۔

"یہ لو!" انھوں نے کہا، اور اپنی چھانٹی ہوئی کھمبیوں کی ٹوکری مجھے تھما دی۔ "انھیں تل کے کھانا۔"

میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ ٹوکری میں صرف آدھی آدھی کھمبیاں ہی کیوں ہیں، لیکن مجھے احساس ہوا کہ یہ سوال بے ادبی کے زُمرے میں آئے گا۔ سو گرم جوشی سے شکریہ ادا کرتے ہوئے میں بھاگ نکلا۔ میں انھیں اپنے لیے تلنے ہی جا رہا تھا کہ نوکروں کے گروہ سے میرا سامنا ہوا اور میں نے ان سے جانا کہ میرے سارے آدھے حصے زہریلے ہیں۔

آیا سباستیانا کو جب میں نے یہ قصّہ سنایا تو اس نے کہا، "میدارڈو کا نصف بدن لوٹ آیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ آج کے مقدمے کا کیا بنے گا۔"

اُس دن رہزنوں کے ایک گروہ پر، جنھیں قلعے کی پولیس نے گزشتہ روز گرفتار کیا تھا، مقدمہ چلنے والا تھا۔ چوں کہ رہزنوں کا تعلق ہماری جاگیروں سے تھا، لہٰذا ان کا فیصلہ وائکاؤنٹ کو کرنا تھا۔ مقدمہ چلایا گیا، جس کے دوران میدارڈو اپنی کرسی پر ترچھا بیٹھا ناخن چبا رہا تھا۔ رہزن، جن کا سردار فیور فیسترو نامی وہی نوجوان تھا جس نے انگور چکھتے ہوئے وائکاؤنٹ کی ڈولی کو سب سے پہلے دیکھا تھا، پابہ زنجیر تھے۔ متاثرہ فریق کے لوگ بھی حاضر ہوئے۔ وہ ٹسکن تاشت تھے جو پرووانس جاتے ہوئے ہمارے جنگل سے گزر رہے تھے کہ فیور فیسترو اور اس کے گروہ نے حملہ کر کے انھیں

Scanned with CamScanner

لوٹ لیا۔ فیور فیسٹرو نے یہ کہتے ہوئے اپنا دفاع کیا کہ وہ چوری چھپے شکار کھیلنے ہماری زمین پر آئے تھے۔ چوں کہ پولیس نے اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا تھا لہذا اُس نے انھیں چور شکاریوں کی حیثیت سے روکا اور غیر مسلح کیا۔ یہ بتانا ضروری ہے کہ اس وقت رہزنوں کے حملے بہت عام تھے اور قوانین نرم۔ علاوہ ازیں ہمارا علاقہ، خاص کر شورش کے دنوں میں، بہت غیر مستحکم تھا اور لوگ رہزنوں کے گروہ میں شامل ہو جایا کرتے تھے۔ جہاں تک چوری چھپے شکار کا سوال ہے تو یہ بہت معمولی نوعیت کا جرم سمجھا جاتا تھا۔

لیکن سباستیانا کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ میداردو نے فیور فیسٹرو اور اس کے سارے گروہ کو لوٹ مار کا مجرم قرار دے کر پھانسی کی سزا سنا دی۔ لیکن چوں کہ لوٹے گئے نائٹ چوری چھپے شکار کرنے کے قصوروار تھے، لہذا اس نے انھیں بھی پھانسی کی سزا سنائی، اور سپاہیوں کے اس جرم پر کہ وہ جائے وقوعہ پر بہت دیر سے پہنچے تھے اور رہزنی اور چور شکاریوں کو غلط روی سے نہیں روکا تھا، اس نے انھیں بھی پھانسی چڑھنے کا حکم دیا۔ وہ سب ملا کر تقریباً بیس افراد تھے۔ اس ظالمانہ سزا نے ہم سب کو سراسیمہ کر دیا۔ اور اس کا تعلق نسکن شرفا سے، جنھیں اس سے پہلے کسی نے نہیں دیکھا تھا، اس قدر نہیں تھا جتنا کہ رہزنوں اور سپاہیوں سے، جو عموماً اچھی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ سُولی بنانے کا کام ماسٹر پیٹرو کیودو کو سونپا گیا جو لکڑ کاٹھی ساز اور بڑھئی تھا۔ وہ بہت فرض شناس کارکن تھا اور ہر اس کام میں جو وہ سرانجام دیتا تھا گہری دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے بہت افسوس کے ساتھ، کیوں کہ دو سزا یافتہ اس کے عزیز تھے، ایک سولی بنائی جو کسی درخت کی طرح شاخ در شاخ تھی اور جس کے پھندے ایک ہی چرخی سے یک ساتھ اوپر اٹھتے تھے۔ یہ ایسی بڑی اور اختراعی کل تھی کہ بیک وقت اس سے بھی زیادہ لوگوں کو پھانسی دے سکتی تھی جنھیں سزائے موت سنائی گئی تھی۔ وائکاؤنٹ نے اس امر کا فائدہ دس بلیوں کو پھانسی چڑھا کر اٹھایا، اس طرح کہ ہر دو سزا یافتگان کے بعد ایک بلی کی لاش لٹک رہی تھی۔ اکڑی ہوئی لاشیں اور بلیوں کے ڈھانچے دس دن تک اسی طرح لٹکتے رہے۔ پہلے پہل تو کسی کو ان پر نظر ڈالنے کی ہمت نہ ہوئی، لیکن جلد ہی لوگوں کو اس منظر کے متاثر کن ہونے کا احساس ہو گیا اور ہمارے اپنے فیصلوں اور آرا میں تبدیلی پیدا ہونے لگی، یہاں تک کہ جب لاشیں اتارنے اور سولی کو توڑنے کا فیصلہ کیا گیا تو ہمیں افسوس بھی ہوا۔

Scanned with CamScanner

۵

میرے لیے وہ بڑے پُرمسرت دن تھے کہ میں مستنیر آثار کی تلاش میں ڈاکٹر ٹریلانی کے ساتھ جنگل میں پھرا کرتا تھا۔ ڈاکٹر ٹریلانی انگریز تھا۔ وہ اپنے جہاز کی تباہی کے بعد ایک جہازی پیپے پر سوار ہمارے ساحلوں سے آلگا تھا۔ وہ ساری عمر جہازی ڈاکٹر رہا اور اس نے طویل اور پُرخطر سفر کر رکھے تھے جن میں مشہور کپتان کک کے ساتھ کیے ہوئے سفر بھی شامل تھے۔ لیکن اس نے دنیا میں کچھ نہیں دیکھا تھا، کہ اسے جہاز کے دروازوں کی اوٹ میں بیٹھ کر تاش کھیلنے ہی سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ جہاز کی تباہی کے بعد ہمارے درمیان آبسنے پر چیمبون نامی شراب، جو ہمارے علاقے کی سب سے تُند شراب سمجھی جاتی تھی، اسے ایسی بھائی کہ اب وہ اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ ہر وقت اپنے کندھے پر ایک پانی کی بوتل، جس میں یہ شراب بھری ہوتی، لٹکائے رہتا تھا۔ وہ ترالبا میں رہنے لگا تھا اور یوں ہمارا ڈاکٹر بن گیا تھا۔ لیکن مریضوں کی پروا اسے ذرا کم ہی تھی۔ اسے غرض تھی تو بس اپنی سائنسی تحقیقات سے، جو اسے (اور اس کے ساتھ مجھے) کھیتوں اور جنگلوں میں روز و شب رواں رکھتی تھیں۔ اس کی سب سے پہلی دلچسپی تو جھینگروں کی ایک بیماری تھی جو ہزار جھینگروں میں سے ایک کو ہوتی اور کوئی خاص نقصان بھی نہ کرتی۔ وہ اس بیماری کا علاج معلوم کرنے کے لیے تمام جھینگروں کا معائنہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اُس زمانے کی نشانیاں تھیں جب ہماری زمینوں کو سمندر نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ہم سنگ ریزوں اور چقماقوں کے بوجھ سے لدے جاتے جو ڈاکٹر کے مطابق اُس زمانے میں مچھلیاں رہی تھیں۔ آخر میں، اسے سب سے زیادہ رغبت چھلاووں سے تھی۔ وہ انھیں پکڑنے اور رکھنے کا کوئی طریقہ معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر ہم راتوں کو قبرستان میں بھٹکتے اور ان مدھم روشنیوں میں سے کسی ایک کے اوپر اٹھنے کا انتظار کرتے جو مٹی کے ٹیلوں اور گھاس کے درمیان جھلملاتیں۔ ہم اس روشنی کو اپنی طرف لانے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے پیچھے آنے پر مجبور کرتے اور اسے بجھنے کی مہلت دیے بغیر ان مختلف ظروف میں جن سے ہم تجربہ کرتے تھے، بند کر دیتے۔ اس مقصد کے لیے ہم تھیلے، بوتلیں، کنستر، اگالدان، چھلنیاں، غرضیکہ سبھی کچھ استعمال کرتے تھے۔ ڈاکٹر ٹریلانی قبرستان کے نزدیک ایک جھونپڑے میں رہنے لگا تھا جو شان و شوکت اور جنگ و وبا کے زمانوں

میں، جب قبرستان میں ایک ہمہ وقتی آدمی کی ضرورت ہوا کرتی تھی، گورکن کا ڈیرا ہوتا تھا۔ اسی جھونپڑے میں اس نے اپنی تجربہ گاہ بنا رکھی تھی جس میں چمگادڑوں کو پکڑنے اور بوتلوں میں بند کرنے کے لیے ہر شکل کی نلکیاں اور جال (جیسے کہ مچھلیاں پکڑنے میں استعمال ہوتے ہیں) موجود تھے۔ قرنبیقیں اور کٹھالیاں تھیں جن میں وہ قبرستان کی مٹی اور لاشوں سے اٹھنے والے ان چھوٹے چھوٹے زرد شعلوں کے "کیوں اور کیسے" کا معائنہ کرتا تھا۔ لیکن وہ مطالعے میں تادیر منہمک رہنے والا شخص نہیں تھا۔ وہ اپنا کام چھوڑ کر باہر آجاتا تو پھر ہم فطرت کے نئے مظاہر دریافت کرنے نکل کھڑے ہوتے۔

میں ہوا کی طرح آزاد تھا کیوں کہ میرے ماں باپ ہی نہیں تھے اور میں اس زمرے سے تعلق رکھتا تھا جس کا شمار نوکروں میں تھا نہ مالکوں میں۔ صرف ایک مبہم سی شناخت نے مجھے ترالبا خاندان کا حصہ بنا رکھا تھا۔ کسی نے مجھے خاندانی نام دیا تھا اور نہ تعلیم دلوانے کی پروا کی تھی۔ میری بدنصیب ماں واکاؤنٹ ایولفو کی بیٹی اور میدارودو کی بڑی بہن تھی۔ لیکن اس نے ایک چور شکاری کے ساتھ، جو میرا باپ تھا، فرار ہو کر خاندان کی عزت کو بٹا لگا دیا تھا۔ میں ایک اسمگلر کی جھونپڑی میں پیدا ہوا جو جنگل کے قریب جھاڑ جھنکاڑ والے علاقے میں واقع تھی۔ میری پیدائش کے تھوڑے ہی دن بعد میرا باپ کسی قضیے میں مارا گیا اور میری ماں بھی، جو اس منحوس جھونپڑی میں تن تنہا رہتی تھی، ایک جلدی بیماری کی نذر ہو گئی۔ پھر مجھے قلعے میں لایا گیا کیوں کہ میرے نانا ایولفو کو مجھ پر ترس آ گیا تھا، اور میری پرورش بڑی آیا سباستیانا کی زیر نگرانی ہوئی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میدارودو ابھی لڑکا ہی تھا اور میں ایک چھوٹا بچہ، تب وہ مجھے اپنے کھیلوں میں شریک ہونے دیتا تھا جیسے ہم دونوں یکساں مرتبے کا حامل ہوں۔ پھر ہم دونوں کے درمیان فاصلہ بڑھ گیا اور میں گر کر نوکر کی سطح پر آ گیا۔ اب ڈاکٹر ٹریلانی کے روپ میں مجھے ایک ایسا ساتھی مل گیا تھا جو پہلے کبھی میسر نہ آیا تھا۔

ڈاکٹر کی عمر ساٹھ سال تھی لیکن اس کا قد تقریباً اتنا ہی تھا جتنا کہ میرا۔ تکونے ہیٹ اور وِگ کے نیچے اس کا چہرہ کسی پرانے شاہ بلوط کی طرح لکیروں سے بھرا تھا۔ اس کی ٹانگیں، جن پر آدھی رانوں تک گیٹس چڑھے ہوتے، کسی جھینگر کی ٹانگوں کی طرح لمبی اور غیر متناسب نظر آتی تھیں۔ وہ فاختئی رنگ کا حبشی کوٹ، جس پر سرخ زرد کشی تہ تھی، پہنے رہتا اور اس پر چشموں کی بوتل

نکالا سے نہ روکتا۔

چھلاووں سے شدید دل چسپی کے باعث وہ راتوں کو پیدل قریبی دیہات کے قبرستانوں میں جایا کرتا تھا جہاں کبھی کبھار ہمارے متروک قبرستان کی نسبت رنگ و حجم میں نفیس تر شعلے دیکھے جاتے تھے۔ لیکن جب مقامی لوگوں کو ہماری چوری چھپے کی نقل و حرکت کا پتا چل جاتا تو ہمارے لیے مشکل ہو جاتی۔ ایک بار تو دوشاخوں اور برچھوں سے مسلح لوگوں کے گروہ نے لاشیں چرانے والے سمجھ کر میلوں ہمارا پیچھا کیا۔

یہ پانی کے ریلوں سے کٹا پھٹا ایک پہاڑی علاقہ تھا۔ میں اور ڈاکٹر ٹریلانی ایک چٹان سے دوسری پر چھلانگیں لگاتے ہوئے اپنے تعاقب میں مشتعل کسانوں کے نزدیک آنے کی آوازیں سن رہے تھے۔ ایک مقام پر، جسے کھلے سنڈ کی چھلانگ کہا جاتا تھا، درختوں کے تنوں سے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے پل نے ایک گہری کھائی کو ڈھانپ رکھا تھا۔ عین اس وقت جب کسان ہمارے سر پر پہنچ چکے تھے، ڈاکٹر اور میں اسے پار کرنے کے بجائے کھائی کے بالکل کنارے پر واقع ایک چٹان کی آڑ میں چھپ گئے۔ انھوں نے ہمیں نہیں دیکھا اور 'کہاں گئے سوَر؟' چلاتے ہوئے سیدھے پل پر نکل گئے۔ لکڑی چٹخنے کی آواز آئی اور وہ چیخیں مارتے ہوئے نیچے دھارے میں جا گرے۔ خطرے سے بچ نکلنے پر ٹریلانی کی اور میری دہشت طمینان میں بدل گئی تھی، لیکن اپنے تعاقب کنندگان کے ہولناک انجام پر یہ اطمینان پھر دہشت میں ڈھل گیا۔ ہم بہ مشکل ہمت کر کے جھکے اور اس تاریکی میں جہاں کسان غائب ہوئے تھے، جھانکا۔ پھر نظریں اٹھا کر ہم نے اس چھوٹے سے پل کی باقیات کو دیکھا۔ تنے اپنی جگہ اب بھی مضبوطی سے قائم تھے لیکن وہ آدھے کٹے ہوئے تھے گویا کہ بیچ میں سے چیر دیے گئے ہوں۔ اتنی موٹی لکڑی کے اس صفائی سے ٹوٹنے کی یہی ایک توجیہ ہو سکتی تھی۔

'اس میں اُسی کا ہاتھ ہے جسے تم جانتے ہو،' ڈاکٹر ٹریلانی نے کہا، اور میں سمجھ گیا۔ عین اسی وقت ہم نے سُموں کی تیز گونج سنی۔ کھائی کے کنارے پر ایک گھوڑا اور سوار، جو سیاہ چغے میں نصف مستور تھا، وارد ہوئے۔ یہ وائکاؤنٹ میدار دو تھا جو اپنے دام کی الم ناک کامیابی پر، جس کی توقع شاید اسے خود بھی نہ تھی، اپنی منجمد کھوئی مسکراہٹ کے ساتھ غور کر رہا تھا۔ وہ یقیناً ہم دونوں کو ہلاک کر دینا چاہتا ہو گا لیکن اس کے بجائے ہوا یہ کہ اسی کے باعث ہماری جان بچی۔ کانپتے جسموں

Scanned with CamScanner

سے کے ساتھ ہم نے اس ڈبیلے گھوڑے پر، جو چٹانوں کو پھلانگتے یوں دوڑ رہا تھا جیسے کسی بکری کا جنا ہو، میدارڈو کو سرپٹ جاتے دیکھا۔

اُس زمانے میں وائکاؤنٹ ہمیشہ گھوڑے پر آتا جاتا تھا۔ اس لیے ہمارے زین ساز پیترو کیودو سے ایک خصوصی زین بنوائی تھی جس کی ایک رکاب سے وہ خود کو لٹکا لیتا جبکہ دوسری رکاب میں ایک مساوی وزن لٹکا رہتا۔ زین سے ایک تلوار اور بیساکھی ٹنگی رہتی۔ اور یوں وائکاؤنٹ چوڑے گھیرے والا کلغی دار ہیٹ پہنے، جو اس کے سدا پھڑپھڑاتے ہوئے چغے سے نصف مستور رہتا تھا، گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے گھوما کرتا تھا۔ جہاں کہیں بھی اس کے گھوڑے کے سموں کی آواز سنی جاتی، ہر کوئی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوتا۔ لوگ گالاتیو کوڑھی کے گزرنے سے بھی اتنے خائف نہ تھے۔ وہ اپنے بچوں اور جانوروں کو راستے سے ہٹا لیتے اور پنے پودوں کی خیر مانگتے کہ وائکاؤنٹ کی بد طینتی سے، جو کسی بھی لمحے انتہائی غیر متوقع اور ناقابلِ فہم اقدام میں ڈھل سکتی تھی، کوئی محفوظ نہ تھا۔

وہ کبھی بیمار نہیں ہوا تھا، سو اسے ڈاکٹر ٹریلانی کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسی امکانی صورت سے ڈاکٹر کیسے نمٹتا۔ وہ تو میرے ماموں کا ذکر تک سننے سے گریزاں تھا۔ وہ جب کبھی لوگوں کو وائکاؤنٹ اور اس کے ظلم کی باتیں کرتے سنتا تو اپنا سر جھٹک کر ایک ہونٹ سکیڑ لیتا اور اس کے منہ سے 'اوہ اوہ، بچ بچ ...' کی بڑبڑاہٹ نکلنے لگتی۔ ایسا لگتا تھا کہ اسے طبی نقطۂ نظر سے بھی میرے ماموں میں کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن میں سوچنے لگا تھا کہ وہ صرف خاندانی دباؤ کے تحت یا پھر اپنی سہولت کے لیے ڈاکٹر بنا ہے اور اس پیشے کی علمیت سے رتی برابر لگاؤ نہیں رکھتا۔ ہو سکتا ہے جہازی ڈاکٹر کی حیثیت سے اس کا پیشہ صرف تاش کھیلنے کی صلاحیت کے باعث ہو جو مشہور ترین جہاز رانوں، خاص طور پر کیپٹن کک، کو اسے ساتھی کی حیثیت سے لینے کے لیے مقابلے پر اکساتی تھی۔

ایک رات جب ڈاکٹر ٹریلانی ہمارے قدیم قبرستان میں جال کے ذریعے چھلاووں کی روشنیاں پکڑ رہا تھا، اس کی نظر میدارڈو آف ٹرالبا پر پڑی جو قبروں کے درمیان اپنا گھوڑا چرا رہا تھا۔ ڈاکٹر بہت پریشان اور خوف زدہ ہوا، لیکن وائکاؤنٹ نے قریب آ کر اپنے ٹوٹے منہ کے باقص

تلفظ کے ساتھ اس سے پوچھا، کیا شبینہ تتلیاں ڈھونڈ رہے ہو ڈاکٹر؟

'اوہ حضورِ والا! ڈاکٹر نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا، نہیں، تتلیاں نہیں، حضورِ والا، چھلاوے، آپ جانتے ہیں، چھلاوے..."

آہ! چھلاوے؟ مجھے بھی ان کی اصل کے بارے میں اکثر حیرت رہی ہے۔

کچھ دنوں سے چھلاوے میرے چھوٹے موٹے مطالعے کا موضوع رہے ہیں، حضورِ والا،" ٹریلانی نے اس کے مہربان لہجے سے حوصلہ پا کر کہا۔

میدارڈو نے اپنے تیکھے نصف چہرے کو، جس کی جلد، تنی ہی کھنچی ہوئی تھی جتنی کہ اس کی کھوپڑی کی، مسکراہٹ میں بدل دیا۔

'تم اپنے مطالعے کے لیے ہر طرح کی مدد کے مستحق ہو،' وہ اس سے بولا۔ "افسوس کہ یہ قبرستان بالکل متروک ہے اور چھلاووں کے لحاظ سے بے کار۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھاری مدد کے لیے کل جو بھی کر سکا وہ کروں گا۔"

اگلا دن انصاف کرنے کے لیے مخصوص تھا۔ وائکاؤنٹ نے درجن بھر کسانوں کو سزائے موت سنائی کیوں کہ اس کے حساب کے مطابق انھوں نے قلعے کے لیے فصلوں کا پورا واجب حصہ نہیں دیا تھا۔ کسانوں کی لاشیں مشترکہ قبر کی مٹی میں دفنا دی گئیں اور قبرستان چھلاووں کی روشنی سے ہر رات کھیلنے لگا۔ ڈاکٹر ٹریلانی اس مدد سے، جو اس کے مطالعے کے لیے بہرحال سودمند تھی، دہشت زدہ ہو گیا۔

ان تمام المیہ واقعات کے ساتھ ساتھ ماسٹر پیترو کیودو بہت بہتر سُولیاں تیار کر رہا تھا۔ یہ سُولیاں، شکنجوں، چرخیوں اور تشدد کے ان دوسرے آلات کی طرح جن کے ذریعے وائکاؤنٹ میدارڈو ملزموں سے اعترافات اگلواتا تھا، نجاری اور میکانیات کا حقیقی شاہکار تھیں۔ میں اکثر پیترو کیودو کے کارخانے میں جایا کرتا تھا۔ اسے اتنی اہلیت اور جوش کے ساتھ کام کرتے دیکھنا ایک عمدہ نظارہ تھا۔ لیکن اس کے دل پر ہمیشہ ایک بوجھ رہتا تھا۔ جو پھانسی کے تختے وہ بنا رہا تھا بے گناہوں کے لیے تھے۔ 'میں اس جیسا نازک کام، جس کا مقصد مختلف ہو، کیسے حاصل کر سکتا ہوں؟ سولیاں بناتے رہنے سے میں کن نئے میکانیوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہوں؟' لیکن ان

Scanned with CamScanner

سوالات کا کوئی جواب نہ پا کر وہ انھیں اپنے ذہن سے پرے دھکیلنے کی کوشش کرتا اور اپنے آلات کو، جس قدر بھی ممکن ہوتا، نازک اور اختراعی بنانے بیٹھ جاتا۔

"جس مقصد کے لیے یہ استعمال ہوں گے اسے بالکل بھول جاؤ،" اس نے مجھ سے کہا "انھیں صرف میکانیوں کے نمونوں کے طور پر دیکھو۔ دیکھ رہے ہو کتنے نازک ہیں یہ؟"

میں نے شمشیروں، رسیوں کے آڑے ترچھے جالوں، چرخوں اور گھرنیوں کے رابطوں کی بناوٹ کو دیکھا اور ان پر تشدد یافتہ جسموں کو نہ دیکھنے کی کوشش کی، لیکن میں جتنی بھی کوشش کرتا خود کو اتنا ہی زیادہ ان کے بارے میں سوچتے ہوئے پاتا۔ میں نے ہیرو کیودو سے کہا، "میں کیسے بھول سکتا ہوں؟"

"بچ گئے ہو، میرے بچے!" اس نے جواب دیا۔ "پھر تمھارے خیال میں مَیں کیسے بھول سکتا ہوں؟"

لیکن اپنے تمام تر کرب اور دہشت کے ساتھ ان دنوں میں مسرت کے لمحے بھی تھے۔ سب سے خوب صورت لمحے وہ ہوتے جب سورج اونچا اور سمندر سنہرا ہوتا، اور انڈے دیتی سوئی مرغیاں کڑکڑاتیں، اور گلی سے کوڑھی کے بھونپو کی آواز آتی جو ہر صبح اپنی بد نصیبی کے ساتھیوں کے لیے خیرات اکٹھی کرنے گزرا کرتا تھا۔ وہ گالاتیو کہلاتا تھا۔ اس کی گردن میں ایک بھاری بھونپو لٹکا رہتا تھا جس کی آواز ہمیں دور ہی سے اس کی آمد سے خبردار کر دیتی تھی۔ عورتیں بھونپو کی آواز سن کر انڈے یا خربوزے یا ٹماٹر اور بعض وقات کوئی چھوٹا سا خرگوش دیوار کے کنارے پر رکھ دیتیں اور پھر اپنے بچوں کو لیے دوڑ کر چھپ جاتیں کہ جب کوئی کوڑھی گزرے تو کسی کو باہر گلی میں نہیں رہنا چاہیے؛ کوڑھ دور سے بھی لگ سکتا ہے اور کوڑھی کو دیکھنا بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ اپنے بھونپو کی آوازوں کے عقب میں گالاتیو آہستہ آہستہ چلتا ہوا ویران گلیوں میں آتا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لمبی لاٹھی ہوتی اور بدن پر زمین کو چھوتی ہوئی لمبی پھٹی پرانی عبا۔ اس کے لمبے الجھے ہوئے بال زرد اور گول چہرہ، جسے کوڑھ پہلے ہی کھا چکا تھا، سفید تھا۔ وہ تحفے اکٹھے کر کے جھولے میں ڈالتا اور چھپے ہوئے کسانوں کے گھروں کی طرف منھ کر کے شکر کے ایسے شہد آگیں کلمات ادا کرتا جن میں ہمیشہ خوش طبعی کے ذو معنی جملے شامل ہوتے۔

ان دنوں سمندر کے قریبی علاقوں میں کوڑھ کی بیماری بہت عام تھی۔ ہمارے نزدیک پراتوفنگو نامی ایک گاؤں تھا جہاں صرف کوڑھی آباد تھے۔ ہم ان کے لیے تحائف دینے کے پابند تھے جو گالاتیو اکٹھے کیا کرتا تھا۔ جب ساحلی یا اندرونی علاقے میں کسی کو کوڑھ لگ جاتا تو وہ عزیزوں اور دوستوں کو چھوڑ کر باقی زندگی گزارنے پراتوفنگو چلا جاتا اور بیماری کے ہاتھوں اپنے گلتے جانے کا انتظار کرتا۔ افواہ یہ تھی کہ وہاں مرنے آنے والے کا خیر مقدم ضیافتوں اور رنگ رلیوں سے کیا جاتا ہے۔ رات پڑے تک دور سے گیتوں اور سازوں کی آوازیں سنائی دیتیں جو کوڑھیوں کے گھروں سے آیا کرتی تھیں۔

پراتوفنگو کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں، اگرچہ کوئی صحت مند شخص کبھی وہاں نہیں گیا تھا، لیکن سبھی میں اس بات پر اتفاق تھا کہ وہاں زندگی ایک دائمی ضیافت ہے۔ کوڑھیوں کی آماجگاہ بننے سے پہلے یہ گاؤں طوائفوں کا زبردست گڑھ تھا جہاں ہر نسل و مذہب کے ملاح آیا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کی عورتوں میں آزادانہ جنسی اختلاط کی عادتیں ہنوز باقی ہیں۔ سرخ گھوڑوں کے سوا، جن کا رس انھیں پورے سال سنسناتی ہوئی مدہوشی کے عالم میں رکھتا تھا، کوڑھی کوئی فصل نہیں اگاتے تھے۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت عجیب و غریب ساز بجانے میں صرف کرتے جو ان کی اپنی ایجاد تھے — جیسے چھوٹی چھوٹی گھنٹیوں والے بربط — اور اونچی مصنوعی آواز میں گاتے ہوئے ہر رنگ کے چھینٹوں سے انڈوں کو یوں مزین کرتے رہتے گویا کسی دائمی ایسٹر کی تیاری میں ہوں۔ وہ اس طرح، مسخ شدہ چہروں پر چنبیلی کے ہار لٹکائے، شیریں موسیقی سے وقت گزاری کرتے ہوئے، وہ انسانی برادری کو بھول جاتے جس سے بیماری نے انھیں کاٹ کر الگ کر رکھا تھا۔

کسی سلامی ڈاکٹر نے ان کوڑھیوں کی نگہداشت کبھی نہیں کی تھی، مگر جب ڈاکٹر ٹریلانی ہمارے درمیان آ بسا تو کچھ لوگوں کو امید ہوئی کہ شاید وہ اپنا علم ہماری بستی کے اس بہتے ناسور کے لیے وقف کر دے گا۔ میں بھی اپنے بچگانہ انداز میں ان امیدوں میں شریک تھا۔ کچھ مدت سے میری خواہش تھی کہ پراتوفنگو میں داخل ہو کر ان ضیافتوں میں شریک ہوں۔ اگر ڈاکٹر نے ان بدنصیبوں پر بھی دواؤں کا کوئی تجربہ کیا ہوتا تو ممکن ہے وہ کبھی کبھار مجھے اپنے ساتھ گاؤں میں جانے کی اجازت دے دیتا۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ ڈاکٹر ٹریلانی جوں ہی گالاتیو کا بھونپو سنتا،

پوری رفتار سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ اس سے بڑھ کر چھوت سے خائف کوئی اور نظر نہ آتا تھا۔ بعض اوقات میں اس بیماری کی نوعیت کے بارے میں سوال کرنے کی کوشش کرتا لیکن وہ ٹال جاتا یا پھر خاموش رہتا، جیسے کوڑھی کا لفظ ہی اسے بھگا دیتا ہو۔ سچ پوچھیے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ہم اسے ڈاکٹر سمجھنے پر کیوں مُصر تھے۔ وہ جانوروں (خاص طور پر چھوٹے جانوروں) اور قدرتی مظاہر والے پتھروں پر بہت توجہ دیتا تھا، لیکن انسانوں اور ان کی بیماریوں سے سے ہول آتا تھا، کراہت ہوتی تھی۔ خون دیکھ کر اسے دہشت ہوتی تھی۔ مریضوں کو وہ صرف اپنی انگلیوں کی پوروں سے چھوتا تھا اور جب تشویش ناک مریضوں کا سامنا ہوتا تو اپنی ناک سرکے میں ڈوبے ہوئے بڑے سے ریشمی رومال میں چھپا لیتا تھا۔ وہ لڑکیوں کی طرح شرمیلا تھا اور عریاں بدن دیکھ کر جھینپ جاتا تھا۔ بدن اگر عورت کا ہوتا تو وہ ہکلانے لگتا اور اپنی نظریں زمین میں گاڑے رہتا۔ ایسا نہیں لگتا تھا کہ سمندروں میں اپنے تمام طول طویل سفروں میں وہ عورتوں سے آشنا رہا ہے۔ ہماری خوش قسمتی سے اس زمانے میں پیدائش ڈاکٹروں کا نہیں دائیوں کا مسئلہ تھی ورنہ خدا جانے وہ اس سے کس طرح نمٹتا۔

اب میرے ماموں پر آتش زنی کا خبط سوار ہوا۔ رات کو اچانک کسی بد نصیب کسان کا خشک گھاس کا ڈھیر جل جاتا، ایندھن کے لیے کاٹے ہوئے درخت میں آگ لگ جاتی یا سارا جنگل سلگ اٹھتا۔ پھر ہم آگ بجھانے کے لیے ساری ساری رات پانی کی بالٹیاں ایک ہاتھ سے دوسرے تک منتقل کرنے میں گزار دیتے۔ تختۂ مشق ہمیشہ وہ بد نصیب بنتے جن کا وائکاؤنٹ سے جھگڑا ہوا جس کی وجہ یا تو اس کا حد سے سخت اور نامنصفانہ کوئی حکم ہوتا یا وہ واجبات ہوتے جو اس نے دُگنے کر دیے تھے۔ دوسری چیزوں کو جلاتے جلاتے اس نے گھروں کو آگ لگانی شروع کر دی۔ خیال یہ کیا جاتا تھا کہ وہ رات کو قریب آ کر چھتوں پر جلتی ہوئی لکڑیاں پھینک دیتا ہے اور پھر گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگ جاتا ہے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے سے کوئی پکڑ نہیں سکا تھا۔ ایک بار دو بوڑھے مر گئے۔ ایک بار ایک لڑکے کا منہ جھلس گیا۔ کسان اس سے متنفر ہوتے گئے۔ اس کے سب سے منہ زور دشمن ہیوگنات قبیلے کے چند خاندان تھے جو کال گریدو پہاڑ پر جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ ان کے مرد آگ سے بچنے کے لیے رات بھر باری باری پہرہ دیتے تھے۔

ایک شب کسی معقول سبب کے بغیر وہ پر توفنگو کے مکانوں تک چلا گیا اور ان کی گھاس

Scanned with CamScanner

پھوس کی چھتوں پر جلتی ہوئی لکڑیاں پھینکنے لگا۔ کوڑھیوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ انھیں جلنے سے کوئی درد نہیں محسوس ہوتا۔ شعلے انھیں سوتے میں آ لیتے تو وہ جاگ ہی نہ پاتے۔ وائکاؤنٹ نے گھوڑے پر بھاگتے ہوئے اپنے پیچھے گاؤں سے آتی ہوئی آواز سنی۔ پراتوفنگو کے باشندے ابھی بیدار تھے اور اپنے شغل میں محو۔ وہ سب تھوڑا بہت جھلسے ضرور لیکن انھوں نے کوئی ناگوار اثر محسوس نہیں کیا بلکہ اپنے انداز میں لطف اندوز ہوئے۔ آگ جلد ہی بجھ دی گئی اور ان کے گھروں کو، غالباً اس لیے کہ پہلے ہی کوڑھ سے لبریز تھے، شعلوں سے معمولی نقصان ہوا۔

میداردو کی بداندیش فطرت نے اسے خود اپنی ذاتی جائیداد، یعنی قلعے کے بھی خلاف کر دیا۔ نوکروں کے حصے میں اچانک آگ لگ گئی اور وہاں مقید لوگوں کی اونچی اونچی چیخوں کے درمیان پھیلتی گئی جس کے دوران وائکاؤنٹ کو گھوڑے پر سوار دیہات کی طرف فرار ہوتے دیکھا گیا۔ یہ اس کی آیا اور رضاعی ماں سباستیانا کی جان لینے کی ایک کوشش تھی۔ اس بٹیلے حکم کے ساتھ جو عورتیں اپنی دانست میں ان فرد پر برقرار رکھتی ہیں جنھیں بچوں کی حیثیت سے دیکھ چکی ہوں، سباستیانا وائکاؤنٹ کو اس کی ہر خباثت پر مستقل لعن طعن کرتی رہتی تھی اگرچہ باقی سب لوگوں کو یقین تھا کہ اس کی فطرت ہی اسے فاتر العقل حرکتوں اور ناقابلِ تلافی غلطی پر مجبور کرتی ہے۔ سباستیانا کو بہت بری حالت میں جلتی ہوئی دیواروں سے نکالا گیا اور سوختگی کے ٹھیک ہونے تک بہت دن بستر ہی میں رہنا پڑا۔

یک شب اس کمرے کا جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی، دروازہ کھلا اور وائکاؤنٹ اس کے بستر کے پاس آ کر ٹھہر گیا۔

"آیا! تمھارے چہرے پر یہ نشان کیسے ہیں؟" میداردو نے اس کے داغوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمھارے گناہوں کے، بیٹا،" بوڑھی عورت نے سکون سے جواب دیا۔

"تمھاری ساری جلد پر دھبے اور خراشیں ہیں۔ تمھیں کیا تکلیف ہے آیا؟"

"بیٹا، میری تکلیف ان عذابوں کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو دوزخ میں تمھارے منتظر ہیں، تاوقتیکہ تم اپنے طور طریقے تبدیل نہ کرو۔"

"تمھیں جلدی اچھا ہونا ہوگا۔ میں اس بیماری کے ساتھ تمھیں گھومتا پھرتا دیکھنا پسند نہیں

کروں گا۔"

میں شوہر کی تلاش میں تو ہوں نہیں جو مجھے اپنی شکل صورت کی فکر ہو۔ میرے لیے تو صاف ضمیر ہی کافی ہے۔ مجھے حسرت ہے کہ تم بھی یہی کہہ سکو۔

اس کے باوجود بھی تمہارا دولہا تمہیں ساتھ لے جانے کا منتظر ہے، جانتی ہو!

بڑھاپے کی تضحیک نہ کرو بیٹا۔ تم نے اپنی جوانی تو تباہ کر لی۔

میں مذاق نہیں کر رہا۔ سنو، آیا، تمہارا دولہا تمہاری کھڑکی کے نیچے ساز بجا رہا ہے۔

سباستیانا نے کان لگائے تو کوڑھی کے بھونپو کی آواز سنی جو قلعے کے باہر سے آ رہی تھی۔

اگلے روز میدارود نے ڈاکٹر ٹریلانی کو بلوا بھیجا۔

ہماری بوڑھی نوکرانی کے چہرے پر مشتبہ سے نشان ابھر آئے ہیں، خدا جانے کیسے، اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ہم سب کو ڈر ہے، کہیں یہ کوڑھ نہ ہو۔ ڈاکٹر، ہم اسے آپ کو تمہارے علم کی روشنی کے حوالے کرتے ہیں۔"

ٹریلانی خم ہو کر ہکلانے لگا۔

"میرا فرض ہے، حضور والا۔ میں ہمیشہ کی طرح آپ کے حکم کا منتظر ہوں، حضور والا۔

وہ گھوما اور دبے پاؤں قلعے سے باہر نکل گیا۔ اس نے چیتھڑوں کا ایک چھوٹا سا چھپا لیا اور جنگل میں غائب ہو گیا۔ وہ ہفتہ بھر لوٹا نہیں۔ جب وہ لوٹا تو سباستیانا کوڑھیوں کے گاؤں بھیجی جا چکی تھی۔

ایک شام کے جھٹ پٹے میں وہ قلعے سے رخصت ہوئی۔ اس نے سیاہ لباس اور سیاہ نقاب پہن رکھا تھا اور اس کے بازو میں ایک گٹھڑی لٹک رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی تقدیر کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اسے پراتوفنگو کا راستا لینا ہی ہو گا۔ اس کمرے کے سوا جہاں اسے رکھا گیا تھا، ساری راہداریاں اور سیڑھیاں ویران تھیں۔ وہ نیچے گئی، صحن عبور کیا اور باہر دیہات میں نکل گئی۔ سب جگہیں سنسان تھیں۔ اسے گزرتے ہوئے دیکھ کر ہر کوئی چھپ گیا تھا۔ اس نے شکاری بھونپو کی مدھم آواز سنی جو صرف دو سُروں میں بجایا جا رہا تھا۔ اس کے آگے راستے پر بھونپو کا منہ والا حصہ آسمان کی طرف کیے، گالاتیو کھڑا تھا۔ آیا آہستہ قدموں کے ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ راستا ڈوبتے سورج کی طرف جا رہا تھا۔ گالاتیو قدم قدم پر رکتا ہو، گویا کہ پتوں میں چھپے بھنوروں کو دیکھ رہا ہو،

ں سے بہت آگے چل رہا تھا۔ وہ اپنا بھونپو بلند کرتا اور ایک اداس سُر نکالتا۔ آیا نے ان پھولوں اور ہنڈھوں پر جنھیں وہ چھوڑ رہی تھی، نظر ڈالی، باڑھوں کے پیچھے خود سے کتراتے ہوئے لوگوں کی موجودگی محسوس کی اور چلتی گئی۔ وہ تنہا، گالاتیو کے بہت بعد، پراتو فنٹو پہنچی ور جوں ہی س کے عقب میں گاؤں کے دروازے بند ہوئے، ربط اور سارنگیاں بجنے لگیں۔

ڈاکٹر ٹریلانی نے مجھے بے حد مایوس کیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ سباستیانا کے چہرے کے نشان کوڑھ کے داغ نہیں ہیں، اس کی بے دخلی کو روکنے کے لیے انگلی تک نہ ہلانا بزدلی کی علامت تھی۔ مجھے پہلی بار ڈاکٹر سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب وہ جنگل کو بھاگا تو اس نے مجھے ساتھ نہیں لیا تھا، حالاں کہ وہ جانتا تھا کہ گلہریوں کے شکاری اور رس بھریوں کے کھوجی کی حیثیت سے میں کتنا سودمند ثابت ہو سکتا تھا۔ اب مجھے اس کے ساتھ چہل قدمی کرنے میں پہلے کی طرح لطف نہیں آتا تھا، اور میں نئے ساتھیوں کی تلاش میں اکثر تنہا ہی گھومتا تھا۔

اب جن لوگوں میں مجھے سب سے زیادہ دل چسپی تھی وہ کال گریبدو پر آباد ہیوگناٹ تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو فرانس سے بھاگ کر آئے تھے جہاں بادشاہ اس مذہب پر چلنے والوں کو بھیانک طور سے قتل کروا دیتا تھا۔ پہاڑ عبور کرتے وقت انھوں نے اپنی کتابیں اور مقدس اشیا گنوا دی تھیں۔ اب ان کے پاس پڑھنے کے لیے پستکیں تھیں نہ چکھنے کے لیے عشائے ربانی، گانے کے لیے حمدیں تھیں نہ انشا کے لیے دعائیں۔ اُن سب لوگوں کی طرح جو ایذا رسانی سے گزرے ہوں اور اپنے سے مختلف عقیدے کے لوگوں میں رہتے ہوں، وہ اس حد تک شکی تھے کہ انھوں نے کوئی مذہبی کتاب لینے یا اپنی رسوم کی ادائیگی کے بارے میں مشورہ کرنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اگر کوئی ان کی تلاش میں آ نکلتا اور اپنے آپ کو ہیوگناٹ ظاہر کرتا تو وہ، سے پاپائی کارندہ سمجھ کر ڈر جاتے اور اپنے آپ کو خاموشی میں مقفل کر لیتے۔ انھوں نے کال گریبدو کی سخت زمینوں کی کاشت کرنے کا کام شروع کر دیا تھا اور ان کے سب مرد و زن خدائی لطف و کرم کی امید میں صبح سے شام ڈھلے تک مصروف رہتے تھے۔ گناہ کے تعین میں ناتجربہ کاری کے باعث انھوں نے اپنی مناجات کو، مبادا ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے، کم کر لیا تھا اور اگر کسی کا معمولی سا اشارہ بھی کسی قابلِ

اعتراض ارادے کا عماز ہوتا تو ایک دوسرے کو مستقل سخت گیر نظروں سے گھورنے لگتے تھے۔ دینیاتی مباحث کی گڈمڈ یادوں کے باعث وہ بے حرمتی کے خوف سے خدا کا نام لینے یا دوسرے مذہبی کلمات استعمال کرنے سے گریز کرتے تھے۔ لہٰذا وہ کسی رسم پر کاربند نہ تھے اور غالباً دینی معاملات پر اپنے خیالات کو منتقل کرنے کی جرأت ہی نہ کرتے تھے، گو اپنے اطراف ایک سنجیدہ انہماک کی فضا قائم رکھتے جیسے کہ یہ سب کچھ ان کے ذہنوں میں دائمی طور پر موجود ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کی زراعتی محنت کے اصولوں نے ___ ان کی مجبوراً اختیار کردہ کفایت شعاری اور گھر بار چلانے میں ان کی عورتوں کی اہلیت کی طرح ___ احکامِ عشرہ کے مساوی اہمیت حاصل کر لی تھی۔

ڈھیر سارے پوتے پوتیوں اور سسرالیوں کے ساتھ، جو سب کے سب لمبے اور بےڈھب تھے، وہ تمام ایک بڑے خاندان کے افراد تھے۔ زمین جوتتے وقت وہ ہمیشہ سیاہ بٹن دار رسمی لباس میں ملبوس ہوتے۔ مرد چوڑے گھیرے والے ہیٹ پہنتے اور عورتیں سر پر سفید رومال باندھتیں۔ مرد لمبی لمبی داڑھیاں رکھتے اور کندھے پر ہمیشہ بندوق لٹکائے رہتے لیکن شنید یہ تھی کہ ان میں سے کسی نے بھی چڑیوں کے سوا کسی پر گولی نہیں چلائی تھی، کہ خدائی فرامین میں اس کی ممانعت تھی۔

ڈھلان پر واقع کھریائی چبوتروں سے، جہاں چند ایک کم قامت انگور کی بیلیں اور اکھڑی بکھری فصلیں لگی تھیں، بوڑھے ایزیکل کی آواز ابھرتی جو اپنی کانپتی ہوئی سفید بکرا داڑھی اور نکی نما ہیٹ کے نیچے گھومتی آنکھوں کے ساتھ آسمان کی طرف مٹھیاں اٹھائے ہمیشہ چلاتا رہتا تھا۔ "قحط اور وبا!" وہ کام میں جتے ہوئے اپنے اہلِ خاندان پر چیختا۔ "کھرپا اچھی طرح چلاؤ، جوناہ! زرئی اکھیڑو، سوسنا! وہ کھاد پھیلاؤ، توبیاس!" اور اس شخص کے سے تلخ لہجے میں جو بےوقوف نکھٹوؤں کے ایک گروہ سے مخاطب ہو، ہزاروں ہدایتیں اور سرزنشیں جاری کرتا۔ ہر بار لاتعداد کام بتانے کے بعد، جو زمین کو تباہی سے بچانے کے لیے انھیں لازمی طور پر کرنا تھے، وہ دوسروں کو پیچھے دھکیل کر، اور ابھی تک "قحط اور وبا!" چلاتے ہوئے، وہی کام آپ کرنے لگتا۔

اس کے برعکس اس کی بیوی کبھی نہیں چلاتی تھی۔ اپنے ہی کسی خفیہ مذہب میں ملفوف، جس کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات بھی مقرر تھیں اور جس کے بارے میں کسی کو ایک لفظ بھی نہیں بتایا

Scanned with CamScanner

جاتا تھا، وہ دوسروں سے الگ نظر آتی تھی۔ اپنی ان آنکھوں سے جو تمام پتلیاں تھیں، وہ صرف ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتی اور بھینچے ہوئے ہونٹوں سے بس اتنا کہتی، 'تمہارے خیال میں کیا یہ بات ٹھیک ہے، راکیل بہن؟ تمہارے خیال میں کیا یہ بات ٹھیک ہے آرون بھائی؟' اور اس کے اہلِ خاندان کے ہونٹوں سے شاذ مسکراہٹیں غائب ہو جاتیں اور ان کی جگہ ان کے سنجیدہ اور مستقل تاثرات اُبھر آتے۔

ایک شام، جب کہ بیوگنات عبادت میں مصروف تھے، میں کال گریدہ جا پہنچا۔ یہ نہیں کہ وہ کوئی دعا ادا کر رہے تھے یا ہاتھ باندھے ہوئے تھے یا گھٹنوں کے بل جھکے ہوئے تھے۔ وہ انگور کے باغ میں قطار باندھے کھڑے تھے۔ مرد ایک جانب تھے اور عورتیں دوسری طرف، جب کہ قطار کے آخری سرے پر داڑھی سینے پر لٹکائے، بوڑھا ایزیکل تھا۔ لمبے، بےڈھب بازوؤں سے لٹکتے بھینچے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ وہ بالکل اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ حالاں کہ وہ محو نظر آ رہے تھے مگر اپنے گردوپیش سے بےخبر نہیں ہوئے تھے۔ توبیاس نے ہاتھ بڑھا کر بیل سے ایک سُنڈی کو نوچ لیا، راکیل نے پیچ دار جوتے سے ایک گھونگے کو کچل دیا اور ایزیکل اچانک اپنا ہیٹ اتار کر فصل پر بیٹھی چڑیوں کو اڑانے لگا۔

پھر وہ لحن سے ایک حمد پڑھنے لگا۔ نہیں، الفاظ نہیں صرف دُھن یاد تھی اور وہ بھی ٹھیک سے نہیں۔ اکثر کوئی نہ کوئی دھن سے ہٹ جاتا یا پھر یوں ہوتا کہ وہ سبھی تمام وقت دُھن سے ہٹے ہوئے تھے۔ لیکن وہ رکے نہیں۔ ایک حصہ ختم کرنے کے بعد وہ دوسرا شروع کر دیتے، لیکن ہمیشہ الفاظ ادا کیے بغیر۔

میں نے اپنے بازو پر ایک جھٹکا محسوس کیا۔ یہ ننھا عیسو تھا جو مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھ آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ عیسو میری ہی عمر کا تھا۔ وہ ایزیکل کا آخری بیٹا تھا۔ اس میں اپنے والدین کی کوئی شباہت تھی تو بس ان کے چہرے کی سخت اور کشیدہ ساخت۔ اس کی پُرفریب بدباطنی اس کی اپنی تھی۔ 'جانتے ہو، انھیں ابھی آدھا گھنٹا اور لگے گا۔ آؤ میرا غار دیکھو۔' اس نے کہا اور ہم چاروں ہاتھوں پیروں پر، انگوروں کے باغ میں ہوتے ہوئے چل پڑے۔

عیسو کا غار خفیہ تھا۔ وہ وہاں چھپ جایا کرتا تھا اور اس طرح گھر والے، جو اسے ڈھونڈنے میں ناکام رہتے، اسے بکریوں کی رکھوالی کرنے یا فصلوں سے گھونگھے ہٹانے کے لیے نہیں بھیج سکتے

Scanned with CamScanner

تھے۔ وہ غار میں سارا سارا دن بے کار بیٹھے گزر دیتا جب کہ اس کا باپ سارے دیہات میں اسے ڈھونڈھتا اور پکارتا پھرتا۔

میسو نے مجھے ایک پائپ دیا اور پینے کے لیے کہا۔ ایک پائپ اس نے خود جلایا اور ایسے جوش کے ساتھ لمبے لمبے کش پینے لگا جو میں نے کسی لڑکے میں نہیں دیکھا تھا۔ میں پہلی بار تمباکو پی رہا تھا۔ جلد ہی میرا جی متلانے لگا اور میں نے پائپ رکھ دیا۔ مجھے سنبھالا دینے کے لیے میسو نے گراپا کی بوتل نکالی۔ اس نے مجھے ایک گلاس دیا جس سے مجھے کھانسی آگئی اور میری آنکھیں ابل کھا گئیں۔ وہ اس طرح پی رہا تھا گویا کہ پانی پی رہا ہو۔

نشہ کرنے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہے، اس نے کہا۔

یہ سب چیزیں جو تمہارے غار میں ہیں، تم نے کہاں سے حاصل کیں؟ میں نے اس سے پوچھا۔

میسو نے ایسا اشارہ کیا گویا کہ مکھی کو پکڑ رہا ہو۔ چرائی ہیں!

اس نے اپنے آپ کو کیتھولک لڑکوں کے ایک گروہ کا سردار بنا لیا جو دیہات میں لوٹ مار کرتے پھرتے تھے۔ وہ نہ صرف درختوں کو پھلوں سے تہی کر دیتے بلکہ گھروں اور مرغیوں کے ڈربوں میں گھس جاتے تھے۔ وہ ماسٹر پیٹرو کیودو سے بھی گندی اور واہیات گالیاں بکا کرتے تھے۔ انہیں کیتھولک اور میسوکنات دونوں کی بدگمانی آتی تھی اور بے تکلفی سے ان گالیوں کا تبادلہ کیا کرتے تھے۔

میں اور بھی بہت سے گناہ کرتا ہوں، اس نے مجھ سے وضاحت کی۔ میں جھوٹی گواہی دیتا ہوں، مچھلیوں کو پانی دینا بھول جاتا ہوں، ماں باپ کی عزت نہیں کرتا، گھر دیر سے جاتا ہوں۔ اب میں ہر وہ گناہ کرنا چاہتا ہوں جس کا وجود ہے۔ حتیٰ کہ وہ بھی جن کے بارے میں لوگ کہتے ہیں، میں سمجھنے کے لیے ابھی چھوٹا ہوں۔"

ہر گناہ؟ میں نے اس سے پوچھا۔ قتل بھی؟'

اس نے اپنے کندھے اُچکائے۔ "قتل اب میرے دھندے میں نہیں ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

میرا ماموں قتل کرتا ہے، اور سنا ہے لوگوں کو محض تفریحاً قتل کرواتا ہے، میں نے میسو

سے کے ساتھ فقط توازن قائم رکھنے کے خیال سے کہا۔

عیسو نے تھوکا۔ "بے وقوفوں کا کھیل!" اس نے کہا۔

بادل گرجا اور غار کے باہر بارش ہونے لگی۔

"گھر میں تمھارا انتظار ہو رہا ہوگا،" میں نے عیسو سے کہا۔ میرا انتظار کبھی کسی نے نہیں کیا تھا، لیکن میں نے دوسرے لڑکوں کی تلاش میں ان کے ماں باپ کو دیکھا تھا، خاص طور پر خراب موسم میں، اور میں اسے اہم بات سمجھتا تھا۔

"ہمیں اس کے رکنے کا انتظار کرنا چاہیے،" عیسو بولا۔ "آؤ تب تک پانسے کی ایک بازی ہو جائے۔"

اس نے پانسا اور رقم کا ایک ڈھیر نکالا۔ میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ سو میں نے اپنی سیٹیاں، چاقو اور گوچیاں داؤ پر لگا دیں، لیکن سب کچھ ہار گیا۔

"اپنی ہار کو دل پر نہ لو،" انجام کار عیسو نے کہا۔ "جانتے ہو، میں بے ایمانی کرتا ہوں۔"

باہر گرج چمک اور موسلادھار بارش تھی۔ عیسو کا غار پانی سے بھر گیا تھا۔ اس نے اپنے پائپ اور دوسری چیزیں بچائیں اور کہنے لگا، "یہ تو رات بھر برسے گی۔ بہتر ہے کہ دوڑ کر گھر پہنچ جائیں۔"

جب ہم بوڑھے ایزیکل کی جھونپڑی میں پہنچے تو بارش سے تر اور کیچڑ میں لت پت تھے۔ ہیو گناٹ، ایک بھڑکتی ہوئی موم بتی کی روشنی میں میز کے گرد بیٹھے انجیل کی کہانیاں یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ اسے سنانے میں اس داستان کی طرح بڑی احتیاط سے کام لے رہے تھے جس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ انھوں نے پڑھ رکھی ہے اور جس کے معانی اور سچائی غیر یقینی ہیں۔

"قحط اور وبا!" ایزیکل چلایا اور میز پر اس زور سے گھونسا مارا کہ عین اس وقت جب اس کا بیٹا عیسو چوکھٹ پر میرے ساتھ نمودار ہوا، روشنی گل ہو گئی

میرے دانت بجنے لگے تھے۔ عیسو کنڈے چکا رہا تھا۔ باہر تمام گرج اور چمک کال گرید و پر ختم ہوتی نظر آتی تھی۔ ان کے دوبارہ موم بتی جلانے کے دوران وہ بوڑھا شخص مٹھیاں اوپر اٹھائے، اپنے بیٹے کے گناہ اس طرح شمار کر رہا تھا جیسے وہ کسی انسان سے سرزد ہونے والے بدترین

Scanned with CamScanner

گناہ ہوں، لیکن وہ صرف ان کے ایک چھوٹے سے حصے سے آگاہ تھا۔ ماں خاموشی سے اثبات میں سر ہلا رہی تھی اور تمام دوسرے بیٹے اور داماد اور بہوئیں اور پوتے پوتیاں ٹھوڑیاں سینے پر لٹکائے اور منہ ہاتھوں میں چھپائے سن رہے تھے۔ صرف اس طرح سب چپ رہا تھا جیسے یہ خطبہ اس سے تعلق نہ رکھتا ہو۔ بادلوں کی گرج اور ایزیکل کی آواز کے باعث تیس نرسل کی طرح کانپ رہا تھا۔

پہرے پر کھڑے آدمیوں کی واپسی نے، جو سروں پر بوریاں ڈالے پانی سے تربتر تھے، اس تلخ تنقید کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ وانکاؤنٹ کے دُزدیدہ حملوں سے بچاؤ کے لیے، جو اب ان کا کھلا دشمن تھا، ہیوگنات بندوقوں، درانتیوں اور دوشاخوں سے مسلح ہو کر ساری رات باری باری پہرہ دیتے تھے۔

فادر! ایزیکل!" آنے والے ہیوگنات بولے۔ "یہ رات تو بھیڑیوں کی رات ہے۔ لنگڑا یقیناً نہیں آئے گا۔ کیا ہم گھر لوٹ آئیں، فادر؟"

"کیا مفلوج کے کوئی آثار نہیں ہیں؟" ایزیکل نے پوچھا۔

"نہیں، فادر۔ صرف بجلی کی چھوڑی ہوئی جلنے کی بو ہے۔ یہ رات محروم کے لیے نہیں ہے۔"

"پھر ہمیں ٹھہرو اور اپنے کپڑے بدل لو، خدا کرے یہ طوفان بے پہلو کے اور ہمارے لیے سکون کا باعث بنے۔"

لنگڑا، مفلوج، محروم اور بے پہلو... یہ وہ چند القاب تھے جو انھوں نے میرے ماموں کو دے رکھے تھے۔ میں نے ایک بار بھی انھیں اُس کا اصل نام لیتے نہیں سنا۔ یہ جملے وانکاؤنٹ سے ایک طرح کی شناسائی ظاہر کرتے تھے گویا وہ اس کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہوں اور وہ تقریباً کوئی پرانا دشمن ہو۔ وہ آنکھ مارتے اور قہقہے لگاتے ہوئے مختصر فقروں کا تبادلہ کیا کرتے۔ "بابا! وہ مفلوج — یہ اسی کا کام ہے۔ بابا! وہ نیم بہرا —" گویا میرے ماموں کی ساری شر انگیز حماقتیں ان پر عیاں اور پیش دیدہ ہوں۔

وہ اسی طرح باتوں میں محو تھے کہ دروازے پر طوفان میں ایک دستک سنائی دی۔

"اس موسم میں کون دستک دے رہا ہے؟" ایزیکل نے کہا۔ "جلدی کرو۔ کھولو۔"

انھوں نے دروازہ کھولا۔ دہلیز پر اپنی ایک ٹانگ کے سہارے وانکاؤنٹ پانی ٹپکاتے چیخے

Scanned with CamScanner

میں لپٹا کھڑا تھا۔ اس کا کلغی دار ہیٹ بارش سے تر تھا۔

میں نے اپنا گھوڑا تمہارے تھان پر باندھ دیا ہے،" اس نے کہا۔ "براہِ مہربانی میری مہمان نوازی کرو۔ یہ رات مسافر کے لیے بہت خراب ہے۔"

سب ایزیکل کی طرف دیکھنے لگے۔ میں میز کے نیچے چھپ گیا تھا مبادا میرے ماموں کو اس دشمن گھر میں میرے آنے جانے کا پتا چل جائے۔

آگ کے پاس بیٹھ جاؤ،" ایزیکل نے کہا۔ "اس گھر میں مہمان کو ہمیشہ خوش آمدید کہا جاتا ہے۔"

دہلیز کے پاس چادروں کا ایک ڈھیر تھا جیسی کہ درختوں کے نیچے تان کر زیتون اکٹھے کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ میداردو وہاں لیٹ گیا اور اسے نیند نے آلیا۔

اندھیرے میں بیوگنات ایزیکل کے گرد جمع ہو گئے۔ 'فادر! اب لنگڑا ہمارے ہاتھ میں ہے!' وہ ایک دوسرے سے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ "کیا ضروری ہے کہ ہم اسے جانے دیں؟ کیا ضروری ہے کہ ہم اسے معصوم لوگوں کے خلاف اور جرم کرنے دیں؟ ایزیکل، کیا بے سرین کے لیے اپنے گناہوں کی قیمت چکانے کا وقت نہیں آ گیا؟'

بوڑھے نے اپنی مٹھیاں چھت کی طرف اٹھائیں۔ "قحط اور وبا!' وہ چلایا، اگر کسی کے بے مشکل آواز نکالنے کو ـــــ ہر چند کہ وہ اس میں اپنی پوری طاقت صرف کرتا ہو ـــــ چلانا کہا جا سکتا ہو۔ 'ہمارے گھر میں مہمان کے ساتھ کبھی برا سلوک نہیں ہوا۔ میں اس کی نیند کے تحفظ کے لیے خود پہرہ دوں گا۔

اور اپنی بھری ہوئی بندوق کے ساتھ اس نے خوابیدہ وائکاؤنٹ کے پاس جگہ سنبھال لی۔

میداردو کی آنکھ کھلی۔ 'تم یہاں کیا کر رہے ہو، ماسٹر ایزیکل؟'

میں تمہاری نیند کی حفاظت کر رہا ہوں، مہمان۔ بہت لوگ تم سے نفرت کرتے ہیں۔"

یہ میں جانتا ہوں،' وائکاؤنٹ نے کہا۔ "میں قلعے میں اس ڈر سے نہیں سوتا کہ نوکر مجھے نیند میں مار نہ ڈالیں۔'

میرے گھر میں بھی تمہیں کوئی پسند نہیں کرتا، ماسٹر میداردو۔ لیکن آج رات تمہارا احترام کیا جائے گا۔'

وانکاؤنٹ کچھ دیر چپ رہا۔ پھر بولا، ایزیکل، میں تمہارا مذہب اختیار کرنا چاہتا ہوں۔

بوڑھے نے کچھ نہیں کہا۔

میں ایسے لوگوں میں گھرا ہوا ہوں جن پر مجھے اعتبار نہیں ہے، میدارڈو نے بات جاری رکھی۔ "میں ان سب سے چھٹکارا حاصل کر کے تمہیں قلعے میں بلانا پسند کروں گا۔ تم، ماسٹر ایزیکل، میرے وزیر ہو گے۔ میں ترالبا کو ہیوگناتی علاقہ بنا دوں گا۔ ہم مسیحی شہزادوں کے خلاف جنگ چھیڑ دیں گے۔ تم اور تمہارا خاندان سر خیل ہوں گے۔ کیا تم آمادہ ہو، ایزیکل؟ میرا مذہب تبدیل کرا سکتے ہو؟"

بوڑھا کشیدہ و ساکت کھڑا رہا۔ بندوق کی نال اس کے داغ سینے کو قطع کر رہی تھی۔ "ہم اپنے مذہب کی اتنی باتیں بھول چکے ہیں،" وہ بولا، "کہ میں کسی کو اپنے مذہب میں لانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے علاقے میں اپنے ضمیر کے ساتھ رہوں گا، تم اپنے علاقے میں اپنے ضمیر کے ساتھ۔"

وائکاؤنٹ گھنی کے بل اٹھا۔ "جانتے ہو، ایزیکل، میں نے اپنی مملکت میں بے دینوں کی موجودگی سے دینی عدالت کو ابھی تک مطلع نہیں کیا۔ ورنہ کہ تمہارے جتھے کے لیے تمہارے سروں کا تحفہ مجھے فوراً عدالت پوپ کا مقرب بنا دے گا؟"

"جناب، ہمارے سر ابھی تک ہماری گردنوں پر ہیں،" بوڑھے نے کہا۔ "مگر کچھ اور بھی ہے جسے ہم سے الگ کرنا کہیں زیادہ مشکل ہے۔"

میدارڈو ایک جست کے ساتھ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

"دشمنوں کے گھر کی نسبت میں وہاں اس بلوط کے نیچے سونا پسند کروں گا!" اور وہ ایک پیر پر اُچھلتا ہوا بارش میں نکل گیا۔

بوڑھے نے دوسروں کو بلایا۔ "بیٹو! یہ مقدر تھا کہ لنگڑا ہمیں ملنے کے لیے آئے۔ اب وہ جا چکا ہے۔ ہمارے گھر کا راستہ صاف ہے۔ مایوس نہ ہو، بیٹو۔ شاید کسی روز کوئی بہتر مسافر گزرے۔"

سارے باریش مردوں اور ماتھے پر پڑے بالوں والی عورتوں نے سر خم کر دیے۔

"اور اگر کوئی نہ بھی آئے،" ایزیکل کی بیوی نے اضافہ کیا "تو ہم اپنے محاذوں پر ڈٹے

Scanned with CamScanner

رہیں گے۔"

اسی لمحے بجلی کی ایک لکیر نے آسمان کو منقسم کر دیا اور بادلوں کی گرج سے دیواروں کے شمائل اور پتھر لرزنے لگے۔ تو بیاس چلایا۔ "بلوط پر بجلی گری ہے! وہ جل رہا ہے!"

وہ اپنی لالٹینیں لیے باہر دوڑے تو دیکھا کہ نصف درخت پھننگ سے جڑوں تک جل کر کوئلہ ہو چکا ہے جبکہ اس کا دوسرا نصف صحیح سلامت ہے۔ انھوں نے کہیں دور سے بارش میں آتی ہوئی گھوڑے کی ٹاپیں سنیں اور بجلی کے ایک کوندے میں انھیں چغے میں لپٹے ہوئے دبلے پتلے سوار کی جھلک دکھائی دی۔

"فادر! تم نے ہمیں بچا لیا،" ہیوگنات بولے۔ "شکریہ، ایریکل!"

مشرق میں آسمان صاف ہوا اور صبح کا اولین اجالا پھیلنے لگا۔

ہیسو نے مجھے ایک طرف بلایا۔ "دیکھا، کتنے احمق ہیں!" اس نے سرگوشی کی۔ "دیکھو، میں نے اس دوران کیا کیا ہے۔" اس نے مجھے مٹھی بھر چمکتے بٹن دکھائے۔ "جب گھوڑا ہمارے تھان پر بندھا ہوا تھا، میں نے زین سے سونے کے سارے بٹن نکال لیے۔ دیکھا، احمق ہیں یہ کہ انھیں اس کا خیال ہی نہیں تھا۔"

مجھے ہیسو کے طور طریقے پسند نہیں تھے اور اس کے رشتے داروں کے اطوار مجھے جابرانہ لگتے تھے۔ لہٰذا میں تنہا رہنے اور ساحل پر جا کر لیٹ اور کیکڑے جمع کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ میں ایک چھوٹی سی چٹان پر بیٹھا ایک ننھے سے کیکڑے کو قابو میں کر رہا تھا کہ میں نے نیچے پُرسکون پانی میں اپنے سر کے اوپر ایک تلوار کے پھل کا عکس دیکھا۔ میں ڈر کے مارے سمندر میں جا گرا۔

"اسے پکڑ لو!" میرے ماموں نے کہا کہ میرے پیچھے آنے والے وہی تھے۔ انھوں نے مجھے پھل کی طرف سے اپنی تلوار پکڑانے کی کوشش کی۔

"نہیں، میں خود آ جاؤں گا،" میں نے ایک کھائی پر چڑھتے ہوئے جواب دیا جسے پانی کے ایک جھنے نے باقی چٹان سے الگ کر رکھا تھا۔

"کیا تم کیکڑے پکڑ رہے ہو؟" میدارودو نے پوچھا۔ "میں ہشت پاؤں کے بچے پکڑنے نکلا ہوں۔" اس نے مجھے اپنا شکار دکھایا جو بڑے بڑے سفید اور بھورے ہشت پا بچے تھے اور ہر چند کہ

Scanned with CamScanner

انھیں تلوار سے کاٹ کر دو ٹکڑے کر دیا گیا تھا، وہ ابھی تک اپنے منہ ہلا رہے تھے۔

"کاش میں ہر سالم شے کو اسی طرح آدھا کر سکتا!" میرے ماموں نے چٹان پر منہ کے بل لیٹ کر تڑپتے ہوئے ہشت پایوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "تاکہ ہر کوئی اپنی ٹھس اور جاہلانہ سالمیت سے بچ سکتا۔ میں سالم تھا اور میرے لیے ساری چیزیں فطری اور گڈمڈ تھیں۔ ہوا کی طرح احمقانہ۔ میں سمجھتا تھا کہ میں سب کچھ دیکھ رہا ہوں، لیکن وہ محض باہری خول تھا۔ اگر تم کبھی اپنے آپ کا نصف بن سکے ___ اور مجھے امید ہے کہ میرے بچے، تم اپنی خاطر ایسا ضرور کرو گے ___ تب تم چیزوں کو سالم دماغوں کی عام فہم سے بڑھ کر سمجھ سکو گے۔ تم اپنے آپ کا اور دنیا کا نصف گنوا چکے ہو گے، لیکن تمھارا باقی نصف ہزار گنا گہرا اور کہیں زیادہ قیمتی ہو گا۔ اور تم اپنے آپ کو یہ خواہش کرتا ہوا بھی پاؤ گے کہ ہر چیز تمھاری طرح نصف ہو جائے۔ حسن، علم اور انصاف صرف اسی چیز میں ہے جسے کاٹ کر ریشہ ریشہ کر دیا گیا ہو۔"

"ہوں، ہوں!" میں کہتا رہا۔ "یہاں کتنے کیکڑے ہیں!" اپنے ماموں کی تلوار سے جہاں تک ممکن فاصلہ برقرار رکھنے کے لیے میں نے صرف اپنے ہی شکار میں دلچسپی کا بہانہ کیا۔ میں اس وقت تک خشکی پر نہ آیا جب تک وہ اپنے ہشت پاؤں کے ساتھ چلے نہ گئے۔ لیکن ان کے الفاظ کی گونج مجھے پریشان کرتی رہی اور میں ان کے نصف کر دینے کے جنون سے فرار حاصل نہ کر سکا۔ ٹریلانی، پیترو کیودو، ہیوگنات، کوڑھی... میں جدھر بھی دیکھتا ہم سب کے سب اس نصف شدہ آدمی کے زیر اثر تھے۔ وہ آقا تھا جس کی ہم خدمت کرتے تھے اور جس سے اپنے آپ کو آزاد کرانے میں کامیاب نہ ہو سکتے تھے۔

۶

اپنے بلند جست گھوڑے کی زین سے میدار دو آف ترالبا صبح سویرے باہر آتا اور اونچے نیچے کناروں پر چڑھتا اترتا ہوا، چٹانوں کی بلندی سے جھانک کر نیچے پھیلی ہوئی وادی کو شکاری پرندے کی آنکھ سے دیکھتا۔ اسی طرح اس نے ایک میدان کے وسط میں پامیلا کو اپنی بکریوں

کے ساتھ دیکھا۔

وائکاؤنٹ اپنے آپ سے کہنے لگا، "میرے تمام شدید جذبات میں اس شے سے مطابقت رکھنے والا کوئی جذبہ نہیں جسے لوگ محبت کا نام دیتے ہیں۔ اب اگر ایسا احمقانہ جذبہ بھی ان کے لیے اتنی اہمیت رکھتا ہے تو اس کا جو بھی بدل مجھ میں ہے وہ یقیناً بہت عظیم و پُرشکوہ ہوگا۔" سو اس نے گدازبدن اور برہنہ پا پامیلا سے، جو سادہ گلابی لباس میں ملبوس، گھاس پر اوندھے منہ لیٹی، غنودگی میں بکریوں سے باتیں کرتے ہوئے پھول سونگھ رہی تھی، محبت کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

لیکن اس طرح سرد مہری سے وضع کیے ہوئے خیالات سے ہمیں دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ پامیلا کو دیکھ کر میداردو نے اپنے لہو میں ایک مبہم سی اُچھال محسوس کی تھی۔ یہ ایسی کیفیت تھی جو اس نے برسوں میں پہلی بار محسوس کی تھی اور اس طرح کا استدلال ایک طرح کی پریشان کن ہڑبڑاہٹ میں محض ایک پناہ تھی۔

دوپہر کو گھر لوٹتے ہوئے پامیلا نے دیکھا کہ میدانوں میں اُگے مروارید کے سارے پھولوں میں صرف آدھی پتیاں ہیں اور باقی آدھی نوچ لی گئی ہیں۔ "ارے توبہ!" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "وادی کی ساری لڑکیوں میں یہ میرے ہی ساتھ ہونا تھا!" اسے احساس ہو گیا تھا کہ وائکاؤنٹ کو اس سے محبت ہو گئی ہے۔ اس نے سارے نصف پھول چُن لیے اور گھر لے جا کر اپنی دعاؤں کی کتاب میں رکھ دیے۔

اس سہ پہر وہ اپنی بطخوں کو چرانے اور تالاب میں تیرانے نسوں کے میدان میں گئی۔ میدان گاجر کے سفید پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا لیکن ان کا انجام بھی مروارید کے پھولوں جیسا ہی ہوا تھا جیسے ہر پھول کا ایک حصہ قینچی سے اڑا دیا گیا ہو۔ "توبہ، ارے توبہ!" وہ اپنے آپ سے بولی۔ "سو یہ میں ہوں جسے وہ چاہتا ہے!" اس نے گاجر کے نصف شدہ پھول اپنے صندوق پر لگے آئینے کے چوکھٹے میں ڈالنے کے لیے ایک گلدستے کی شکل میں اکٹھے کر لیے۔

پھر یہ بات ذہن سے نکال کر اس نے اپنی چوٹیاں سر کے گرد باندھیں اور کپڑے اتار کر اپنی بطخوں کے ساتھ تالاب میں نہانے لگی۔

اس شام جب وہ گھر واپس گئی تو میدان گلروندے کے پھولوں سے بھرے ہوئے تھے۔ پامیلا نے دیکھا کہ اُن کے ایک طرف کا رُواں غائب ہو چکا ہے جیسے کسی نے زمین پر لیٹ کر ایک

Scanned with CamScanner

ہی طرف پھونک ماری ہو یا صرف آدھا منہ استعمال کیا ہو۔ پامیلا نے ان نصف شدہ کولوں میں سے کچھ اکٹھے کیے۔ اس نے جوں ہی ان پر سانس لیا ان کا نرم رُواں ہوا میں تیر گیا۔ "توبہ، ارے میری توبہ!" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "وہ مجھے چاہتا ہے، واقعی چاہتا ہے۔ اس کا انجام کیا ہو گا؟"

پامیلا کا گھر اتنا چھوٹا تھا کہ پہلی منزل پر بکریوں اور زمینی منزل پر بطخوں کو بند کرنے کے بعد ذرا سی جگہ باقی نہ رہتی تھی۔ پھر وہ چاروں طرف سے شہد کی مکھیوں سے گھرا تھا جو انھوں نے پال رکھی تھیں۔ اور زمین کے نیچے کی مٹی چیونٹیوں سے اس قدر بھری ہوئی تھی کہ ہاتھ نیچے رکھا نہیں اور وہ امنڈتی ہوئی چیونٹیوں سے اٹا نہیں۔ اس وجہ سے پامیلا کی ماں خشک گھاس کے ڈھیر میں سوتی، اس کا باپ ایک خالی پیپے میں اور خود پامیلا ایک جھولنے میں جو ایک انجیر اور زیتون کے درخت کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔

دہلیز پر ایک مُردہ تتلی کو دیکھ کر پامیلا کے قدم رک گئے۔ اس کا ایک پَر اور آدھا بدن پتھر سے کچلا ہوا تھا۔ پامیلا کی چیخ نکل گئی۔ اس نے اپنے ماں باپ کو آواز دی۔

"یہاں کون آیا تھا؟" اس نے پوچھا۔

"تھوڑی دیر پہلے ہمارا وائکاؤنٹ اِدھر سے گزرا تھا،" اس کے ماں باپ نے بتایا۔ "اس نے کہا کہ وہ ایک تتلی کا تعاقب کر رہا ہے جس نے اسے ڈنک مارا ہے۔"

"تتلی نے بھی کبھی کسی کو ڈنک مارا ہے؟" پامیلا نے کہا۔

"ہمیں بھی یہی حیرت ہے۔"

"حقیقت یہ ہے،" پامیلا بولی، "کہ وائکاؤنٹ کو مجھ سے محبت ہو گئی ہے۔ ہمیں بد سے بدتر کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"اُف رے، اُف رے! اب اِتراؤ مت! مبالغہ مت کرو۔" بوڑھے جوڑے نے اسی طرح جواب دیا جس طرح عمر رسیدہ لوگ جواب دیا کرتے ہیں، جب نوجوان انھیں جواب نہیں دے پاتے۔

اگلی صبح پامیلا جب اس پتھر کے پاس پہنچی جہاں وہ عام طور پر بیٹھ کر اپنی بکریاں چرایا کرتی تھی، تو اس کی چیخ نکل گئی۔ سارے کا سارا پتھر ایک نصف چمگادڑ اور ایک نصف لمبی مچھلی کی

خوفناک باقیات سے لتھڑا ہوا تھا۔ ایک سے سیاہ خون رس رہا تھا اور دوسری سے چکیلا مادہ۔ ایک بازو پھیلا ہوا تھا اور دوسری کے نرم چیپ دار کنارے عیاں تھے۔ بکریوں والی کو احساس ہو گیا کہ یہ ایک پیغام ہے۔ اس کا مطلب تھا: "آج شب سمندر کے کنارے ملو۔" پامیلا نے اپنی ہمت کو دونوں ہاتھوں میں سنبھالا اور ساحل پر گئی۔

وہ سمندر کے پاس کنکریوں پر بیٹھ کر سفید دھبےدار موجوں کی سرسراہٹ سنتی رہی۔ پھر سنگ ریزوں پر ایک کھڑکھڑاہٹ سنائی دی اور میدار دو ساحل کے ساتھ ساتھ گھوڑا سرپٹ دوڑاتا آیا۔ اس نے گھوڑا روک کر اپنے آپ کو کھولا اور زین سے اتر آیا۔

"پامیلا، میں نے تم سے محبت کرنے کا فیصلہ کیا ہے،" میدار دو نے اس سے کہا

"کیا یہی وجہ ہے،" پامیلا نے بلند آواز میں کہا، "کہ تم اپنی بھر اس فطرت کی مخلوقات پر نکال رہے ہو؟"

"پامیلا!" وائکاؤنٹ نے آہ بھری۔ "ہمارے پاس اپنے اظہار کے لیے اس کے سوا کوئی زبان نہیں ہے۔ اس دنیا میں دو مخلوقات کے درمیان ہر ملاقات ایک باہمی ٹوٹ پھوٹ ہے۔ میرے ساتھ آؤ کہ میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔ تم کسی اور کی نسبت میرے ساتھ زیادہ محفوظ رہو گی۔ اگرچہ میں بھی دوسروں کی طرح نقصان پہنچاتا ہوں لیکن مجھ میں اور دوسروں میں فرق یہ ہے کہ میرا ہاتھ متوازن ہے۔"

"اور تم مجھے مروارید کے پھولوں اور لعابی مچھلی کی طرح دو حصوں میں چیر دو گے؟"

"میں نہیں جانتا کہ تمھارے ساتھ کیا کروں گا۔ یقیناً تمھیں حاصل کرنے سے وہ کچھ ممکن ہو سکے گا جو میں نے سوچا بھی نہیں ہے۔ میں تمھیں قلعے میں لے جا کر اس طرح رکھوں گا کہ تمھیں کوئی کبھی نہیں دیکھ سکے گا اور ہمارے پاس ایک ساتھ رہنے کے نئے طریقے ایجاد کرنے اور یہ محسوس کرنے کے لیے وقت ہو گا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔"

پامیلا ریت پر لیٹی تھی اور میدار دو اس کے پاس گھٹنوں کے بل جھکا ہوا تھا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے اس کے چاروں طرف اپنے ہاتھ کو حرکت دے رہا تھا لیکن اس نے اسے چھوا نہیں تھا۔

"لیکن پہلے مجھے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تم میرے ساتھ کیا کرو گے؟ تم ایک نمونہ مجھے ابھی دکھا سکتے ہو۔ پھر میں طے کروں گی کہ مجھے قلعے میں آنا ہے یا نہیں۔"

وائکاؤنٹ اپنا ڈبلا استخوانی ہاتھ پامیلا کے رخسار کے قریب لایا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور یہ واضح نہیں تھا کہ وہ تھپتھپانے کے لیے بڑھا ہے یا خراش ڈالنے کے لیے۔ لیکن ہاتھ نے ابھی رخسار کو چھوا نہیں تھا کہ اس نے اچانک اسے کھینچ لیا اور اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں تمھیں قلعے میں دیکھنا چاہتا ہوں،" اس نے اپنے آپ کو گھوڑے سے ٹانگتے ہوئے کہا۔ "میں تمھارے رہنے کے لیے بُرج بنانے جا رہا ہوں۔ میں تمھیں سوچنے کے لیے ایک دن اور دیتا ہوں۔ اس کے بعد تمھیں یقینی طور پر فیصلہ کرنا ہوگا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ساحل کے ساتھ ساتھ رخصت ہو گیا۔

اگلے روز معمول کے مطابق پامیلا شہتوت کے درخت پر پھل اکٹھے کرنے چڑھی تو اس نے شاخوں کے درمیان کراہنے اور پر پھڑپھڑانے کی آواز سنی۔ وہ خوف کے مارے گرتے گرتے بچی۔ شاخوں میں ایک مرغا پروں کے ذریعے بندھا تھا اور بالوں والی بڑی بڑی نیلی سُنڈیاں اسے کھا رہی تھیں۔ ان ضرر رساں کیڑوں کا جو صنوبر کے درختوں پر بیٹھتے ہیں، ایک پورا جھنڈ مرغے کے بالکل اوپر جمع ہو گیا تھا۔

بلاشبہ، وائکاؤنٹ کا یہ ایک اور خوفناک پیغام تھا۔ پامیلا کی توضیح تھی: "کل جنگل میں چوپٹ۔"

حسبِ معمول صنوبر کے مخروط جمع کرنے کے بہانے وہ جنگل میں گئی۔ ابھی بیساکھی پر جھکا ہوا میدار دو ایک درخت کے عقب سے نمودار ہوا۔

"اچھا،" اس نے پامیلا سے پوچھا، "کیا تم نے قلعے میں آنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

پامیلا صنوبر کی سوئیوں پر پھیلی ہوئی لیٹی تھی۔ "میں نے نہ جانے کا فیصلہ کیا ہے،" اس نے مشکل ہی سے مڑتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر تم مجھے حاصل کرنا چاہتے ہو تو یہاں جنگل میں آ کر مجھ سے ملو۔"

"تم قلعے میں آؤ گی۔ جس بُرج میں تمھیں رہنا ہے تیار ہو چکا ہے۔ تم اس کی واحد مالکہ ہو گی۔"

تم وہاں مجھے قیدی بنا کر رکھنا چاہتے ہو۔ اور پھر شاید آگ میں جلانا یا چوہوں کو کھلانا چاہتے ہو۔ نہیں، نہیں۔ میں نے تمھیں بتا دیا تھا کہ اگر تم چاہو تو میں تمھاری ہو سکتی ہوں، لیکن یہاں، ان

صنوبر کی سوئیوں پر۔"

وائکاؤنٹ اس کے سر کے قریب دوزانو بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں صنوبر کی ایک سوئی تھی۔ وہ اسے پامیلا کی گردن کے قریب لایا اور اس کے ارد گرد پھرانے لگا۔ پامیلا کو جھرجھری محسوس ہوئی لیکن وہ چپ چاپ لیٹی رہی۔ اس نے اپنے اوپر جھکا ہوا وائکاؤنٹ کا چہرہ دیکھا۔ اس نیم رُخ پر نظر کی جو سامنے سے دیکھنے پر بھی نیم رُخ ہی رہتا تھا اور دانتوں کے اس نصف جوڑے کو دیکھا جو قینچی جیسی مسکراہٹ میں عیاں تھے۔ میدارڈو نے صنوبر کی سوئی کو اپنی مٹھی میں جکڑا اور وہ ٹوٹ گئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں تمھیں قلعے میں بند دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہاں، قلعے میں بند!"

پامیلا نے محسوس کیا کہ وہ یہ خطرہ مول لے سکتی ہے۔ سو اس نے اپنے ننگے پاؤں ہوا میں لہراتے ہوئے کہا، "یہاں جنگل میں میں تمہیں نہیں کھوں گی۔ لیکن قلعے میں بند ہو کر، کبھی نہیں۔ چاہے میں مر ہی کیوں نہ جاؤں۔"

"میں تمھیں وہیں لے جاؤں گا،" میدارڈو نے اپنا ہاتھ گھوڑے کے شانے پر رکھتے ہوئے کہا جو اس طرح قریب آ گیا تھا جیسے وہاں سے اتفاقاً گزر رہا ہو۔ اس نے زین پر چھلانگ لگائی اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر جنگل کی ایک پگڈنڈی پر ڈال دیا۔

اس رات پامیلا زیتون اور انجیر کے درختوں میں پڑے اپنے جھولنے میں سوئی لیکن صبح ہوئی تو وہ دہشت زدہ ہو گئی۔ اس کی آغوش میں ایک چھوٹی سی لاش پڑی تھی جس سے خون بہہ رہا تھا۔ یہ ایک آدھی گلہری تھی جسے حسبِ معمول لمبائی میں قطع کیا گیا تھا، لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اس کی روئیں دار دُم صحیح سلامت تھی۔

"ہائے اللہ!" اس نے اپنے ماں باپ سے کہا۔ "یہ وائکاؤنٹ مجھے نہیں بخشے گا۔"

اس کے ماں باپ گلہری کی لاش ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل کرتے رہے۔

"لیکن،" اس کے باپ نے کہا، "اس نے دُم کو سالم چھوڑ دیا ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہو سکتی ہے۔"

"ہو سکتا ہے وہ اچھا بننے جا رہا ہو۔" اس کی ماں نے کہا۔

"وہ ہر چیز کو ہمیشہ دو حصوں میں کاٹتا ہے،" اس کا باپ بولا۔ "لیکن گلہری میں جو چیز سب سے خوبصورت ہوتی ہے اس کا وہ احترام کرتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے اس پیغام کا یہی مفہوم ہو،" اس کی ماں نے تبصرہ کیا، "کہ تم میں جو حسن و خوبی ہے وہ اس کا احترام کرے گا۔"

پامیلا نے اپنے ہاتھ بالوں میں رکھ لیے۔ "اپنے ماں باپ سے یہی باتیں سُننے کو رہ گئی تھی! اس کے پیچھے ضرور کوئی بھید ہے۔ وائکاؤنٹ نے تم لوگوں سے بات کی ہے"

"بات نہیں کی ہے،" اس کے باپ نے کہا، "لیکن اس نے ہمیں کہلوایا ہے کہ ہمارے ہاں آنا چاہتا ہے اور یہ کہ وہ ہماری خستہ حالی میں دلچسپی لے گا۔"

"ابا، اگر وہ تم سے بات کرنے آئے تو چھتے کھول کر اس پر بھڑیں چھوڑ دینا۔"

"بیٹی، ہو سکتا ہے آقا صیدار دوا چھا ن رہا ہو" بوڑھی عورت بولی۔

"اماں، اگر وہ تم سے بات کرنے آئے تو اسے چیونٹیوں کے ڈھیر سے باندھ کر وہیں چھوڑ دینا۔"

اس رات گھاس کے اس خشک ڈھیر میں جہاں پامیلا کی ماں سوتی تھی، آگ لگ گئی اور وہ چھپا جس میں اس کا باپ سوتا تھا ٹوٹ کر کھل گیا۔ صبح دونوں بوڑھے افراد جو کچھ بچ رہا تھا اسے دیکھ رہے تھے کہ وائکاؤنٹ نمودار ہوا۔

"کل رات تم لوگوں کو ڈرا دینے پر مجھے معافی مانگنی چاہیے،" وہ بولا، "لیکن مجھے معلوم ہی نہیں کہ اس موضوع پر کیسے بات کروں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہاری بیٹی پامیلا مجھے بھا گئی ہے۔ میں اسے قلعے میں لے جانا چاہتا ہوں۔ لہٰذا میری خواہش ہے کہ اسے اپنے حوالے کرنے کی تم لوگوں سے رسمی طور پر درخواست کروں۔ اس کی زندگی بدل جائے گی اور اسی طرح تمہاری بھی۔"

"آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں کتنی خوشی ہوگی، سنیور!" بوڑھے آدمی نے کہا۔ "لیکن کاش آپ جان سکتے کہ میری بیٹی کس فطرت کی مالک ہے! حد یہ ہے کہ اس نے ہمیں آپ پر بھڑیں چھوڑنے کے لیے کہا۔"

"ذرا سوچیے تو، سنیور،" پامیلا کی ماں بولی۔ "اس نے ہمیں آپ کو چیونٹیوں کے ڈھیر پر باندھنے کو کہا۔"

خوش قسمتی سے اس دن پامیلا جلدی گھر آ گئی۔ اس نے اپنے ماں باپ کو اس حال میں پایا کہ ان کے ہاتھ پاؤں بندھے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھسا ہوا تھا۔ باپ بھڑوں کے چھتے پر پڑا تھا اور

Scanned with CamScanner

ماں چیونٹیوں کے ڈھیر پر۔ وہ تو بھلا ہو کہ بہرین بوڑھے کو پہچانتی تھیں اور چیونٹیوں کے پاس بڑھیا کو کاٹنے سے زیادہ ضروری کام تھے۔ اس طرح پامیلا نے کسی نقصان کے بغیر دونوں کو بچا لیا۔

"دیکھا، کیسا نیک ہو گیا ہے وائکاؤنٹ، کیوں؟" پامیلا نے کہا۔

لیکن دونوں بوڑھے افراد ایک سازش تیار کر رہے تھے۔ اگلے انھوں نے پامیلا کو باندھ کر اسے جانوروں کے ساتھ بند کر دیا اور وائکاؤنٹ کو یہ بتانے قلعے کی طرف روانہ ہو گئے کہ اگر وہ ان کی بیٹی کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے منگوا سکتا ہے کیوں کہ وہ اپنی طرف سے اسے وائکاؤنٹ کے حوالے کرنے کو تیار ہیں۔

لیکن پامیلا اپنے جانوروں سے بات کر سکتی تھی۔ بطخوں نے ٹھونگیں مار مار کر اسے رسیوں سے آزاد کر دیا اور بکریوں نے ٹکریں مار مار کر دروازہ گرا دیا۔ پامیلا اپنی من چاہی بکری اور بطخ کو لے کر بھاگ نکلی۔ اس نے جنگل میں گھر بنا لیا اور ایک غار میں رہنے لگی جس کا علم صرف اسے اور ایک بچے کو تھا جو اس کے لیے کھانا اور خبریں لاتا تھا۔

وہ بچہ میں تھا۔ جنگل میں پامیلا کے ساتھ زندگی خوش گوار تھی۔ میں اس کے لیے پھل، پنیر اور تلی ہوئی مچھلی لایا کرتا تھا اور بدلے میں وہ مجھے پیالیاں بھر بھر کے بکری کا دودھ اور بطخ کے انڈے دیتی تھی۔ جب وہ تالابوں اور چشموں میں نہاتی تو میں پہرہ دیا کرتا، تاکہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔

بعض اوقات میرے ماموں جنگل سے گزرتے لیکن اپنی موجودگی اپنے عام ظالمانہ انداز میں ظاہر کرنے کے باوجود وہ ایک فاصلہ برقرار رکھتے۔ بعض اوقات پتھروں کی بوچھاڑ پامیلا اور اس کی بکری اور بطخ کو چھوتی ہوئی نکل جاتی، بعض اوقات کسی صنوبر کا تنا جس سے وہ ٹیک لگائے ہوتی نیچے آ رہتا کہ اسے کلہاڑی کی ضربوں سے اندر ہی اندر جڑوں پر سے کاٹ دیا گیا ہوتا۔ بعض اوقات ہلاک کیے ہوئے جانوروں کی باقیات سے کوئی چشمہ گندا ہو جاتا۔

اب وائکاؤنٹ ایک ٹیڑھی کمان سے، جسے وہ اپنے ایک بازو سے استعمال کرنا سیکھ گیا تھا، شکار کیا کرتا تھا۔ لیکن وہ اور زیادہ بے رحم اور دبلا ہو گیا تھا جیسے نئی اذیتیں اس کے بچے کھچے بدن کو چاٹ رہی ہوں۔

Scanned with CamScanner

ایک دن ڈاکٹر ٹریلانی میرے ساتھ میدانوں سے گزر رہا تھا کہ گھوڑے پر سوار وائکاؤنٹ ہماری طرف آیا اور ڈاکٹر کو تقریباً کچل دیا۔ گھوڑے کا تو اس کا سم انگریز کے سینے پر تھا۔ میرے ماموں نے کہا، "ڈاکٹر کیا تم وضاحت کر سکتے ہو؟ مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میری مفقود ٹانگ کسی طویل سفر سے تھک چکی ہو۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟"

ٹریلانی بڑبڑا کر معمول کے مطابق ہکلانے لگا اور وائکاؤنٹ گھوڑے کو ایڑ لگا کر یہ جا وہ جا۔ لیکن اس سوال نے ڈاکٹر کو متاثر ضرور کیا ہوگا، کیوں کہ سر باغوں میں تمام کروہ تادیر سوچتا رہا۔ انسانی بدنصیبی کے معاملے میں ایسی دلچسپی لیتے ہوئے میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

۷

پراتوفنگو کے نواح میں پودینے کی جھاڑیاں اور سفید نرگس کی باڑھیں اُگی ہوئی تھیں۔ لیکن یہ واضح نہیں تھا کہ وہ خودرو تھیں یا کسی نباتاتی باغ کی روشیں تھیں۔ میں ان جھاڑیوں اور باڑھوں میں خوشبو سے بوجھل ہوا میں سانس لیتا گھومتا پھرتا اور بوڑھی سباستیانا تک پہنچنے کا کوئی راستا نکالنے کی کوشش کرتا۔

جب سے سباستیانا کوڑھیوں کے گاؤں کو جانے والے راستے پر غائب ہوئی تھی، مجھے اکثر و بیشتر اپنے یتیم ہونے کا احساس ہونے لگا تھا اور میں اس کی خبر گیری کے بارے میں مایوس ہو گیا تھا۔ میں نے ایک درخت کی اونچائی سے، جہاں میں گالاتیو کے گزرنے وقت چڑھ گیا تھا، اس سے پوچھا، لیکن وہ بچوں سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتا تھا جو بعض اوقات درختوں سے اس پر زندہ چھپکلیاں پھونک دیا کرتے تھے۔ اس نے مجھے اپنی چیں چیں کرنے والی گاڑھے شربت جیسی آواز میں تمسخرانہ اور ناقابلِ فہم جواب ہی دیے۔ اب پراتوفنگو میں داخل ہونے خواہش میں بوڑھی آیا کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو بھی شامل ہو گئی تھی اور میں ان خوشبو پھیلاتی جھاڑیوں کے گرد ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا۔

ایک دفعہ جنگلی پودینے کے گچھوں سے ہلکے رنگ کی عبا اور تنکوں کی ٹوپی پہنے ایک شکل

اٹھی اور گاؤں کی طرف جانے لگی۔ وہ ایک بوڑھا کوڑھی تھا۔ آیا کے بارے میں اس سے پوچھنے کی خواہش کرتے ہوئے میں اس کے اتنا نزدیک ہو گیا کہ وہ میرے چلائے بغیر میری آواز سن لے۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ "ذرا سنیے، کوڑھی صاحب!"

لیکن اسی لمحے غالباً میرے الفاظ سے جاگ کر میرے بالکل سامنے ایک اور شکل ابھری جس نے بیٹھ کر پاؤں پھیلا دیے۔ اس کا چہرہ خشک چھال کی طرح تمام چھلکے دار تھا اور اس کی داڑھی چھدری اور ریشمی سفید تھی۔ اس نے اپنی جیب سے ایک سیٹی نکالی اور میری سمت منہ کر کے تمسخرانہ انداز میں زور سے بجائی۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ ڈھلوان سے پرے جھاڑیوں میں چھپ کر لیٹے ہوئے کوڑھیوں سے بھری ہے۔ ہلکے رنگ کی عباؤں میں انھوں نے بہت آہستہ آہستہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا شروع کیا اور سورج کے مخالف پراتوفنگو کی سمت چلنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں موسیقی کے آلات تھے یا باطبانی کے اوزار جن کے ذریعے وہ غل غپاڑا مچائے جا رہے تھے۔ میں داڑھی والے شخص سے پرے کھسک گیا تھا لیکن جھاڑیوں کے درمیان لنگڑاتے ہوئے ایک گنجے کوڑھی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

میں جھاڑیوں میں جس قدر بھی اچھل اچھل کر بھاگا، دوسرے کوڑھیوں سے ٹکراتا رہا اور مجھے احساس ہونے لگا کہ واحد سمت جدھر میں قدم بڑھا سکتا ہوں پراتوفنگو کی سمت ہے جس کی عنابوں کے پیڑوں سے بنی چھپر کی چھتیں نشیب کے سرے پر اب بالکل قریب تھیں۔

صرف کبھی کبھار سنکھوں کے شوروں یا منہ باجے کے سُروں سے کوڑھی میری طرف توجہ کر رہے تھے۔ لیکن مجھے احساس تھا کہ اس پیش قدمی کا حقیقی مرکز خود میں ہوں، اور یہ کہ وہ میرے ساتھ پراتوفنگو اس طرح جا رہے ہیں جیسے میں کوئی پکڑا ہوا جانور ہوں۔ گاؤں میں مکانوں کی دیواروں کا رنگ ارغوانی تھا اور ایک کھڑکی میں کھڑی عورت، جس نے ادھورا لباس پہن رکھا تھا اور جس کے چہرے اور چھاتیوں پر ارغوانی نشان تھے، بربط بجاتے ہوئے پکار رہی تھی: "باطبان لوٹ آئے ہیں!" اب کھڑکیوں اور چھجوں میں طنبور لہرا لہرا کے "باطبانو! واپسی مبارک!" گاتی ہوئی دوسری عورتیں بھی ظاہر ہو رہی تھیں۔

میں گلی کے درمیان میں رہنے اور کسی کو نہ چھونے کے بارے میں بہت احتیاط برت رہا تھا لیکن میں نے اپنے آپ کو ایک طرح کے چبوترے پر پایا جہاں میرے چاروں طرف کوڑھی تھے:

بالوں میں لالہ اور بنفشی کے پھول لگائے اور پراسرار چیتھڑوں میں سے رسولیاں اور اندرونی اعضا دکھاتے ہوئے مرد اور عورتیں۔ یہ سب اپنے مکانوں کی دہلیزوں پر بیٹھے تھے۔

کوڑھی ایک چھوٹا موٹا جشنِ موسیقی منا رہے تھے جو تمام آثار و شواہد کے مطابق میرے اعزاز میں تھا۔ کچھ گزوں کو تاروں پر زور زور سے رگڑتے ہوئے اپنی سارنگیاں میری جانب جھکا رہے تھے، کچھ جوں ہی میں انھیں دیکھتا منہ بنانے لگتے جبکہ کچھ تاروں پر اوپر نیچے حرکت کرتی ہوئی عجیب و غریب کٹھ پتلیاں لیے ہوئے تھے۔ جشن انھی متنوع اور بے تال اشاروں اور آوازوں پر مشتمل تھا لیکن وہ سب ایک طرح کے کشمیری گیت کو مسلسل دُہرائے جا رہے تھے: "بےداغ تھا کالے گوت کے پاس وہ جانے تک۔"

"میں ہی آیا، بوڑھی سباستیانا کو ڈھونڈ رہا ہوں،" میں نے چلا کر کہا۔ "کیا تم بتا سکتے ہو وہ کہاں ہے؟"

وہ ایک آشنا صداوتی انداز میں ہنس پڑے۔

"سباستیانا!" میں پکارا۔ "سباستیانا! تم کہاں ہو؟"

"بس، بچے،" ایک کوڑھی نے کہا۔ "اب چپ ہو جاؤ۔" اس نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

دروازہ کھلا اور ایک نیم عریاں زیتونی جلد والی عورت، جو غالباً بربر تھی اور جس کے بدن پر عقاب کے پر لگے ہوئے تھے، باہر آئی اور ایک جنسی رقص شروع کر دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا میں اسے ٹھیک سے سمجھا نہیں۔ مرد اور عورتیں اپنے آپ کو ایک دوسرے پر گراتے ہوئے اس عمل میں محو ہو گئے جس کے بارے میں مجھے بعدازاں احساس ہوا کہ جنسی اختلاط تھا۔

میں اپنے آپ کو جس حد تک ممکن تھا، سکیڑ رہا تھا کہ بوڑھی سباستیانا کگڑیوں میں سے اچانک ظاہر ہوئی۔

"غلیظ سورو!" وہ چلائی۔ "کم سے کم ایک معصوم بچے کا تو لحاظ کرو۔"

اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑا اور گھسیٹتی ہوئی دور لے گئی۔ کوڑھی اس اثنا میں گنگناتے رہے۔ "بےداغ تھا کالے گوت کے پاس وہ جانے تک۔!"

سباستیانا راہباؤں جیسی ہلکے رنگ کی ارغوانی عبا پہنے ہوئے تھی اور اس کے بے جھری

رخساروں پر پہلے ہی چند بدرنگ دھبے پڑ چکے تھے۔ میں آیا کو پا لینے پر خوش تھا لیکن ساتھ ہی مایوس بھی کہ اس نے مجھے ہاتھ سے پکڑا تھا اور اس طرح ضرور کوڑھ لگا دیا ہوگا۔ میں نے یہ بات اس سے کہہ دی۔

'فکر مت کرو،' سماستیانا نے جواب دیا۔ "میرا باپ بحری قزاق تھا اور دوا تارک الدنیا۔ اپنی اور بر بوں کی بیماریوں کے خلاف میں ہر بوٹی کی تاثیر جانتی ہوں۔ یہاں یہ لوگ اپنے آپ کو بازبو اور خطمی سے تقویت دیتے ہیں لیکن میں خاموشی سے گاؤزبان اور آبی سلاد سے اپنے جوشاندے بنا لیتی ہوں اور ان کی وجہ سے مجھے تاحیات کوڑھ کا خطرہ نہیں ہے۔"

'لیکن تمھارے چہرے پر یہ نشان کیسے ہیں، آیا؟" میں نے قدرے مطمئن ہو کر پوچھا، گو ابھی پوری طرح قائل نہیں تھا۔

'یونانی بروزہ، انھیں یقین دلانے کے لیے کہ مجھے بھی کوڑھ ہے۔ آؤ، اب میرے ساتھ چلو۔ میں تمھیں سنسناتا ہوا گرم جوشاندہ پلاؤں گی کیوں کہ ایسی جگہوں پر آدمی جتنی احتیاطی تدابیر کر سکے کم ہے۔"

وہ مجھے اپنے گھر لے گئی جو کچھ پرے ایک صاف ستھرے جھونپڑے میں تھا جہاں دُھلے ہوئے کپڑے سوکھنے کے لیے لٹکے ہوئے تھے، اور وہاں ہم باتیں کرتے رہے۔

'میداردو کیسا ہے؟ میداردو کیسا ہے؟' وہ مجھ سے پوچھتی رہی اور میں نے جتنی بار بھی زبان کھولی، وہ ان فقروں کے ساتھ مداخلت کرتی رہی۔ "آہ، وہ حرامی! آہ، وہ بدمعاش! اچھی محبت ہے! آہ وہ کھیا لڑکی! اور یہاں، تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ یہاں کیسے گزرتی ہے! یہ کیسا ضیاع کرتے ہیں! ذرا ان چیزوں کا سوچو جو ہم خود کو محروم کر کے گالاتیو کو دیتے ہیں، اور یہ ان کے ساتھ کیا کرتے ہیں! بہرحال یہ گالاتیو بالکل ناکارہ ہے۔ غلط آدمی ہے۔ اور یہ اکیلا ہی نہیں ہے! اور یہ رات میں کیا بن جاتے ہیں! اور دن میں بھی! اور عورتیں! ایسی بے حیا کٹنائیں میں نے زندگی میں نہیں دیکھیں! کاش وہ اپنے کپڑے ہی ٹھیک کر لیں! غلیظ اور دریدہ لباس! میں نے یہ بات ان کے منہ پر کہی ہے... اور تمھیں معلوم ہے انھوں نے کیا جواب دیا؟'

آیا کے ساتھ اس ملاقات سے شاداں، میں اگلے روز ہام مچھلیاں پکڑنے گیا۔ میں نے چشمے

Scanned with CamScanner

کے ایک تال میں ڈوی ڈالی اور انتظار کے دوران مجھے نیند آ گئی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ میں کتنی دیر سویا۔ ایک آواز نے مجھے جگا دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے سر پر ایک اٹھا ہوا ہاتھ دیکھا۔ اس ہاتھ میں بالوں والی ایک سرخ مکڑی تھی۔ میں گھوما تو میرے سامنے اپنے سیاہ چغے میں ملبوس میرے ماموں تھے۔

میں دھک سے رہ گیا۔ لیکن اسی لمحے مکڑی نے میرے ماموں کے ہاتھ پر کاٹا اور کھسک گئی۔ میرے ماموں نے ہاتھ منہ پر رکھ کر زخم کو تھوڑا سا چوسا اور مجھ سے بولے، "تم سو رہے تھے تو میں نے اس شاخ سے ایک زہریلی مکڑی کو تمہاری گردن پر اترتے دیکھا۔ میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تو اس نے مجھے ڈنک مار دیا۔"

مجھے ان کے ایک لفظ کا بھی یقین نہیں تھا کہ انھوں نے ایسے ہی طریقوں سے کم از کم تین بار میری جان لینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن مکڑی نے ان کے ہاتھ پر یقیناً کاٹ کھایا تھا اور ان کا ہاتھ سوج رہا تھا۔

"تم میرے بھانجے ہو،" انھوں نے کہا۔

"جی،" میں نے قدرے حیرت سے جواب دیا کہ یہ پہلا موقع تھا جب انھوں نے مجھے پہچاننے کی کوئی علامت دکھائی تھی۔

"میں تمہیں فوراً پہچان گیا تھا،" انھوں نے کہا۔ پھر اضافہ کیا، "آہ مکڑی! میرا صرف ایک ہی ہاتھ ہے اور تم اسے بھی زہر آلود کرنا چاہتی ہو۔ لیکن اس بچے کی گردن سے تو میرا ہی ہاتھ بہتر ہے۔"

میں نے اپنے ماموں کے منہ سے ایسی باتیں کبھی نہیں سنی تھیں۔ میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ سچ بول رہے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ اچانک اچھے بن گئے ہوں لیکن میں نے اس خیال کو فوراً جھٹک دیا کہ جھوٹ اور ساز باز ان کی عادت میں شامل تھے۔ وہ یقیناً بہت بدلے ہوئے نظر آ رہے تھے اور اب ان کا چہرہ ـــ شاید ڈنک کے خوف اور درد سے ـــ سخت گیر اور ظالمانہ نہیں، بلکہ نڈھال اور ستا ہوا لگ رہا تھا۔ لیکن ان کا لباس بھی، جو گرد آلود اور عجیب تراش کا تھا، مختلف تھا اور مذکورہ تاثر پیدا کرنے میں مدد کر رہا تھا۔ ان کا سیاہ چغہ قدرے پھٹا پرانا تھا اور اس کے کناروں پر خشک پتے اور خطوط کے چھلکے چپکے ہوئے تھے۔ ان کا سوٹ بھی عام سیاہ مخمل کا نہیں بلکہ

Scanned with CamScanner

کثرتِ استعمال سے گھسے ہوئے کھردرے کپڑے کا تھا، اور ان کی ٹانگ اب چمڑے کے اونچے بوٹ میں نہیں، نیلی اور سفید دھاریوں والے اونی موزے میں ملفوف تھی۔

یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ میں ان کے بارے میں متجسس نہیں ہوں، میں یہ دیکھنے لگا کہ کسی مچھلی نے چارا نگلا ہے یا نہیں۔ مچھلی تو کوئی نہیں تھی لیکن کانٹے میں ہیرے کی ایک سنہری انگوٹھی اٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اوپر کھینچا تو دیکھا کہ پتھر پر ترالبا کا نشان کندہ ہے۔

وائکاؤنٹ کی نظریں میرا تعاقب کر رہی تھیں۔ انھوں نے کہا، "حیران نہ ہو۔ جب میں گزر رہا تھا تو میں نے ایک مچھلی کو کانٹے میں پھنسا دیکھا۔ مجھے اس پر اتنا ترس آیا کہ میں نے اسے آزاد کر دیا۔ پھر اپنے عمل سے مچھیرے کو پہنچنے والے نقصان کا خیال کرتے ہوئے میں نے اسے اپنی انگوٹھی سے پورا کرنے کا فیصلہ کیا کہ میرے پاس آخری قیمتی چیز یہی تھی۔"

میرا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ کہتے رہے، "اس وقت میں نہیں جانتا تھا کہ وہ مچھیرے تم ہو۔ پھر میں نے تمھیں گھاس پر سوتے دیکھا۔ لیکن تمھیں دیکھنے کی خوشی تم پر آ گری ہوئی کرسی کو دیکھ کر فوراً تشویش میں بدل گئی۔ باقی تم جانتے ہی ہو۔" اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے اپنے سوجے ہوئے لوہے ہاتھ کو اداسی سے دیکھا۔

یہ سب کچھ ظالمانہ فریبوں کا محض ایک سلسلہ ہو سکتا تھا، لیکن میں نے سوچا کہ وائکاؤنٹ کے جذبات کا اچانک تغیر کس قدر دلکش ہو گا اور اس کے جلو میں سباستیانا اور پامیلا اور دوسرے تمام لوگوں کے لیے، جو میدارڈو کا ظلم سہہ رہے ہیں، کتنی مسرت ہو گی۔

"ماموں،" میں نے میدارڈو سے کہا۔ "آپ یہاں میرا انتظار کریں۔ میں آیا سباستیانا کے پاس جاتا ہوں۔ وہ بوٹیوں کے بارے میں سب کچھ جانتی ہے۔ میں اس سے مکڑیوں کے ڈنک کا علاج کرنے والی بوٹی لاتا ہوں۔"

"آیا سباستیانا..." وائکاؤنٹ نے، جو اپنے سینے پر ہاتھ دھرے چت لیٹے تھے، کہا۔ "وہ ان دنوں کیسی ہے؟"

مجھے ان پر اتنا اعتماد نہیں تھا کہ یہ بتاتا کہ سباستیانا کو کوڑھ نہیں لگا ہے، سو میں نے اتنا ہی کہا، "بس ٹھیک ہی ہے۔ میں اب چلا۔" اور دوڑ پڑا کہ اس وقت ان عجیب واقعات کے بارے میں سباستیانا سے بات کرنے سے زیادہ مجھے کسی چیز کی خواہش نہیں تھی۔

آیا ابھی تک اپنے جھونپڑے میں تھی۔ میں، کہ تیز رفتاری اور بے صبری سے ہانپ رہا تھا، سے صرف ایک گڈمڈ کہانی سنا سکا۔ لیکن اس بوڑھی عورت کو سید اردو کے نیک اعمال سے زیادہ اس کے زخم سے دلچسپی تھی۔ "کیا کہا تم نے، سرخ لکڑی؟ میں اس کی صحیح بوٹی جانتی ہوں۔ ایک بار ایک لکڑہارے کا سارا بازو سوج گیا تھا۔ کیا کہا تم نے، وہ اچھا بن گیا ہے؟ ہاں اگر کوئی سمجھ سکے تو ایک طرح سے وہ ہمیشہ ہی سے اچھا تھا۔۔ میں نے وہ بوٹی کہاں رکھ دی؟ بس اس سے ایک پلٹس بنا لینا۔ ہاں، سید اردو ہمیشہ سے منتشر دماغ رہا ہے، جب بچہ تھا تبھی سے۔۔۔ آہ، یہ رہی بوٹی، میں اسے ایک تھیلے میں سنبھال کر رکھ دوں گی۔ ہاں، وہ ہمیشہ سے ایسا تھا، اسے جب بھی چوٹ لگتی تھی تو اپنی آیا کے پاس آ کر سسکیاں لیتا تھا۔ کیا کاٹ گہری ہے؟"

"ان کا پورا بایاں ہاتھ سوجا ہوا ہے،" میں نے کہا۔

"اوہ، اوہ، احمق لڑکے۔" آیا ہنس پڑی۔ "بایاں ہاتھ! آقا سید اردو کا بایاں ہاتھ ہے کہاں؟ اسے تو وہ پیچھے بوہیمیا میں ترکوں کے پاس چھوڑ آیا ہے۔ خدا انہیں غارت کرے! اسے وہ اپنے تمام آدھے بدن کے ساتھ وہاں چھوڑ آیا ہے۔"

"ہاں، یقیناً،" میں نے کہا۔ "لیکن پھر بھی وہ وہاں تھے اور میں یہاں۔ ان کا ہاتھ اس طرح سوجا ہوا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اب تم واہمے اور باتوں میں بھی فرق نہیں کر سکتے؟" آیا نے کہا۔ "یہ باتیں تو جب تم پانچ سال کے تھے۔۔۔"

میری سمجھ میں خاک نہ آیا۔ سہاسنیا نا یقیناً ٹھیک کہہ رہی ہو گی مگر مجھے اس کا بالکل اُلٹ یاد تھا۔

"چلو، اب اچھے بچے کی طرح اسے یہ بوٹی لے جا کر دو،" آیا نے کہا اور میں دوڑ لیا۔

میں ہانپتا کانپتا چشمے تک پہنچا لیکن اب میرے ماموں وہاں نہیں تھے۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا مگر وہ اپنے سُوجے ہوئے زہر آلود ہاتھ کے ساتھ غائب ہو چکے تھے۔

اس شام میں زیتونوں تلے سیر گشت کر رہا تھا۔ اور وہاں وہ موجود تھے! اپنے سیاہ چغے میں لپٹے وہ ایک ٹھنڈ پر درخت کے سہارے جھکے کھڑے تھے۔ ان کی پشت میری طرف تھی اور وہ سمندر کے اوپر دیکھ رہے تھے۔ میں نے خود پر دوبارہ خوف کو غالب آتے محسوس کیا اور کانپ

Scanned with CamScanner

کوشش کے بعد مری ہوئی آواز میں بولنے کے قابل ہو سکا۔ "ماسوں، یہ رہی کاٹنے کے لیے بوٹی
وہ نصف چہرہ فوراً مڑا اور ایک سفاک زہر خند میں سکڑ گیا۔
"کیسی بوٹی؟ کیسا کاٹنا؟" انھوں نے چلّا کر کہا۔
"مکڑی کے کاٹنے کی" میں نے کہا۔ لیکن پہلے کا شیریں تاثر، جو صرف لمحاتی ہی رہا ہوگا، غائب ہو چکا تھا۔ غالباً اب وہ آہستہ آہستہ ایک کشیدہ مسکراہٹ میں لوٹ رہا تھا، مگر صاف طور پر اوڑھا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔
"ارے ہاں، بہت خوب... اسے اس تنے کے سوراخ میں رکھ دو... میں بعد میں لے لوں گا۔" انھوں نے کہا۔
میں نے تعمیل کی اور اپنا ہاتھ سوراخ میں ڈال دیا۔ وہاں بھڑوں کا چھتا تھا۔ وہ سب کی سب مجھ پر آ پڑیں۔ میں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ بھڑیں میرے پیچھے پیچھے تھیں۔ میں نے خود کو ایک چشمے میں پھینک دیا۔ پانی کے نیچے تیر کر ہی میں بھڑوں کو اپنے سر رخ سے دور رکھنے کے قابل ہو سکا۔ میں نے پانی سے سر نکالا تو دوری پر وائکاؤنٹ کی دہشت ناک ہنسی سنائی دی۔
وہ پھر ایک بار مجھے دھوکا دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ لیکن بہت باتیں ایسی تھیں جو میں سمجھ نہیں پایا تھا۔ سوان کے بارے میں گفتگو کرنے میں ڈاکٹر ٹریلانی کے ہاں گیا۔ اپنی گور کن کی جھونپڑی میں لالٹین کی روشنی کے سہارے ڈاکٹر ٹریلانی تشریح الاعضا کی کتاب پر جھکا ہوا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔
"ڈاکٹر،" میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا تم نے کبھی سنا ہے کہ آدمی کو سرخ مکڑی کاٹے اور اس پر کچھ اثر نہ ہو؟"
"سرخ مکڑی، یہی کہا نا تم نے؟" ڈاکٹر چونک گیا۔ "سرخ مکڑی نے اور کسے کاٹا ہے؟"
"میرے ماموں وائکاؤنٹ کو،" میں نے کہا۔ "میں ان کے لیے سبا ستیانا سے ایک بوٹی لایا تھا لیکن وہ بھلے سے ـــ جیسا کہ پہلے نظر آتا تھا ـــ دوبارہ بُرے بن گئے اور انھوں نے میری مدد قبول کرنے سے انکار کر دیا۔"
"میں نے ابھی ابھی وائکاؤنٹ کی خبر گیری کی ہے۔ اس کے ہاتھ پر سرخ مکڑی نے کاٹا تھا،" ٹریلانی نے کہا۔

"بتاؤ ڈاکٹر، تم نے انھیں بھلا پایا یا نہ؟"

تب ڈاکٹر نے جو کچھ پیش آیا تھا مجھ سے بیان کیا۔

جب میں نے وائکاؤنٹ کو سوجے ہوئے ہاتھ کے ساتھ گھاس پر دراز چھوڑا تو ڈاکٹر ٹریلانی اس رستے سے گزر رہا تھا۔ اس نے وائکاؤنٹ کو دیکھا اور ہمیشہ کی طرح خوف کی گرفت میں آ کر درختوں میں چھپنے کی کوشش کی۔ لیکن میداردو نے اس کے قدموں کی چاپ سن لی تھی۔ وہ متوجہ ہوا اور پکارا: "کون ہے؟"

انگریز نے سوچا، 'اگر اسے معلوم ہو گیا کہ میں اس سے چھپ رہا ہوں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا نہیں کرے گا!' سو پہچان لیے جانے کے ڈر سے وہ دوڑ لیا۔ لیکن اس نے ٹھوکر کھائی اور چشمے کے ایک تال میں جا گرا۔ گو اس نے اپنی زندگی جہازوں پر گزاری تھی مگر ڈاکٹر ٹریلانی تیرنا نہیں جانتا تھا۔ وہ مدد کے لیے چلاتے ہوئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ وائکاؤنٹ اسے استوار کرنے کے لیے کھسک کر کنارے پر گیا اور پانی میں اتر گیا۔ وہ اپنے درد کرتے ہوئے ہاتھ کو ایک درخت کی باہر جھکی ہوئی جڑ کے گرد حمائل کرتے ہوئے دراز ہو گیا یہاں تک کہ اس کا پاؤں ڈاکٹر کی پہنچ میں آ گیا۔ لمبا اور دبلا ہونے کے باعث اس نے ڈاکٹر کو ساحل پر پہنچانے کے لیے رسی کا کام کیا۔

وہ دونوں صحیح سلامت ہیں۔ ڈاکٹر ہکلا رہا ہے۔ 'اوہ... اوہ... حضور والا، شکریہ... حضور والا میں کس طرح...؟' اور سردی لگ جانے کے باعث وہ عین اس کے منہ پر چھینک دیتا ہے۔

'مبارک ہو!' میداردو کہتا ہے۔ 'لیکن براہ مہربانی اپنے آپ کو ڈھانپ لو۔' اور وہ اپنا چغہ ڈاکٹر کے کندھوں پر ڈال دیتا ہے۔

ڈاکٹر پہلے سے کہیں زیادہ پریشان ہو کر احتجاج کرتا ہے۔ وائکاؤنٹ کہتا ہے، "رکھ لو یہ تمہارا ہے۔"

پھر ٹریلانی کی نظر میدردو کے سوجے ہوئے ہاتھ پر پڑتی ہے۔

"آپ کو کس چیز نے کاٹا ہے؟"

"سرخ کرمچی نے۔"

مجھے اس کا علاج کرنے دیجیے، حضور والا۔

اور وہ اسے اپنی گورکی کی جھونپڑی میں لے جاتا ہے۔ جہاں وہ دواؤں اور پٹیوں سے اس

Scanned with CamScanner

کے ہاتھ کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ وریں اثنا وائکاؤنٹ، جو سراپا انسانیت اور شائستگی ہے، اس کے ساتھ گپ شپ کرتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے جلد ملنے اور اپنی دوستی کو مضبوط کرنے کے وعدے کے ساتھ جدا ہوتے ہیں۔

"ڈاکٹر!" میں نے اس کی کہانی سننے کے بعد کہا۔ "تم نے جس وائکاؤنٹ کی مرہم پٹی کی تھی وہ تھوڑی ہی دیر بعد اپنے ظالمانہ پاگل پن پر لوٹ گیا تھا اور اس نے بھیڑوں کے پورے بچے کو میرے پیچھے لگا دیا تھا۔"

"یہ وہ نہیں ہے جس کا علاج میں نے کیا ہے،" ڈاکٹر نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"تمھارا کیا مطلب ہے ڈاکٹر؟"

"یہ میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔ فی الحال اس کے بارے میں کسی کو ایک لفظ بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ اور مجھے مطالعہ کرنے دو کیوں کہ آنے والا وقت بہت کڑا ہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر ٹریلانی نے مجھ پر مزید توجہ نہیں کی اور انسانی تشریح الاعضا پر ایک مقالے کی غیر معمولی خواندگی میں پھر سے محو ہو گیا۔ اس کے ذہن میں ضرور کوئی نہ کوئی منصوبہ رہا ہو گا کہ آنے والے دنوں میں وہ بالکل خاموش اور منہمک رہا۔

اب میدارود کی دوہری فطرت کی خبریں مختلف ذرائع سے آنے لگیں۔ جنگل میں گم شدہ بچے بیساکھی لیے ہوئے نصف آدمی کو اپنے قریب آتے دیکھ کر دہشت زدہ ہو جاتے جو ہاتھ پکڑ کر انھیں گھر پہنچاتا اور انجیر، پھول اور مٹھائیاں دیتا تھا۔ وہ غریب بیواؤں کو چشمے پار کراتا، سانپوں کے ڈسے کتوں کا علاج کرتا، غریبوں کو بنی دہلیزوں اور کھڑکی کے چھجوں پر پُراسرار تحفے پڑے ملتے۔ ہوا کے اکھاڑے ہوئے پھل دار درخت، اس سے قبل کہ ان کے مالک دروازے سے باہر قدم رکھیں، سیدھے کر کے اپنے خانوں میں بٹھا دیے جاتے

اس کے ساتھ ہی سیاہ چغے میں نیم ملفوف وائکاؤنٹ کے ظواہر بھی جیسے ہولناک واقعات کا ایک اشارہ تھے۔ بچے اغوا کر لیے جاتے جو بعد ازاں پتھروں سے بند کیے ہوئے غاروں میں مقید ملتے۔ شاخیں ٹوٹ جاتیں اور چٹانیں بوڑھی عورتوں پر لڑھک پڑتیں۔ تازہ پکے ہوئے کدو بلامقصد عناد سے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جاتے۔

Scanned with CamScanner

کچھ عرصے سے میدار دو کی کمان صرف ابابیلوں کے خلاف استعمال ہو رہی تھی اور وہ بھی اس انداز میں کہ ابابیلوں کو ہلاک کرنے کے بجائے صرف زخمی اور بے ہوش کر دیا جاتا تھا۔ لیکن اب آسمان میں ایسی ابابیلیں نظر آتی تھیں جن کی ٹانگوں پر پٹیاں اور کھپچیاں بندھی ہوتیں یا جن کے پر جڑے ہوئے یا موم سے لتھڑے ہوتے۔ اس طرح علاج کی ہوئی ابابیلوں کا ایک پورا جھنڈ کسی پرندوں کے اسپتال سے فاقہ یابوں کی طرح ہوش مندی سے ایک ساتھ اڑ رہا تھا اور افواہ یہ تھی کہ ان کا معالج میدار دو ہے۔

ایک دفعہ پاسیلا اپنی بکری اور بطخ کے ساتھ ایک دور دراز ویران مقام پر طوفان میں گھر گئی۔ وہ ایک قریبی غار کو، جو بہت چھوٹا بلکہ چٹان میں ایک طرح کا سوراخ تھا، جانتی تھی۔ وہ اس کی طرف چل پڑی۔ اس نے غار سے جھانکتا ایک پھٹا پرانا اور جوڑ لگا ہوا جوتا دیکھا۔ اندر سیاہ چغے میں لپٹا نیم بدن ڈھیر تھا۔ پاسیلا بھاگنے ہی والی تھی کہ وانکاؤنٹ، جو اسے دیکھ چکا تھا، برستی بارش میں باہر نکل آیا اور اس سے بولا، "آؤ لڑکی، یہاں پناہ لے لو۔"

"نہیں، میں یہاں پناہ نہیں لوں گی،" پاسیلا نے کہا۔ "یہاں تو ایک کی بھی گنجائش مشکل ہی سے ہے اور تم اپنے ساتھ مجھے بھی ٹھونسنا چاہتے ہو۔"

"ڈرو نہیں،" وانکاؤنٹ بولا۔ "میں باہر ہی رہوں گا۔ تم سہولت سے اپنی بکری اور بطخ کے ساتھ اندر رہو۔"

"بکری اور بطخ بھیگ سکتی ہیں۔"

"تم دیکھو گی کہ وہ بھی پناہ لے لیں گی۔"

پاسیلا جو وانکاؤنٹ کی عجیب رنگوں کے ٹکڑے سی چتی تھی، اپنے آپ سے بولی۔ "اچھا، دیکھتے ہیں۔" وہ دوزانو ہو کر غار میں داخل ہوئی اور اپنی بکری اور بطخ کے ساتھ سکڑ کر بیٹھ گئی۔ وانکاؤنٹ نے سامنے کھڑے ہو کر اپنا چغہ خیمے کی طرح یوں تان دیا کہ نہ تو بکری ہی بھیگی اور نہ بطخ۔ پاسیلا نے چغہ سنبھالے ہوئے ہاتھ کو دیکھا، لمحہ بھر اپنی گہری سوچ میں رہی اور پھر خود اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ اس نے اپنے ہاتھوں کا ایک دوسرے سے موازنہ کیا اور پھر ٹھٹھا مار کر ہنس پڑی۔

"لڑکی، میں تمھیں اتنا زندہ دل دیکھ کر خوش ہوں۔ لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں تم کیوں ہنس رہی ہو؟"

"میں اس لیے ہنس رہی ہوں کہ جو بات سارے گاؤں والوں کو پاگل بنائے ہوئے ہے میں اسے سمجھ گئی ہوں۔"

"وہ کیا ہے؟"

"یہ کہ تم کچھ بھلے ہو اور کچھ بُرے۔ اب یہ سب واضح ہے۔"

"ایسا کیوں ہے؟"

"کیوں کہ میں نے محسوس کر لیا ہے کہ تم دوسرا نصف ہو۔ قلعے میں رہنے والا بدخُو وائکاؤنٹ پہلا نصف ہے۔ اور تم دوسرے ہو جس کے بارے میں خیال تھا کہ جنگ میں ضائع ہو چکا ہے۔ لیکن اب لوٹ آیا ہے اور یہ نیک نصف ہے۔"

"یہ تمھارا کرم ہے۔ شکریہ۔"

"اوہ، یہ واقعہ ہے، ستائش نہیں۔"

اب میدردو کی کہانی جو اس شام پامیلا نے سنی، یہ تھی: یہ بات درست نہیں تھی کہ توپ کے گولے نے اس کے جسم کا نصف حصہ ریزہ ریزہ کر کے اُڑا دیا تھا بلکہ اس نے میداردو کو دو ادھوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک فوجی اسٹریچر برداروں کو مل گیا تھا جب کہ دوسرا مسیحی اور ترکی لاشوں کے ہیرم تلے دفن رہا اور جسے کسی نے نہیں دیکھا۔ رات گئے میدانِ جنگ سے دو راہب گزرے۔ اب یہ بات یقینی نہیں ہے کہ وہ دینِ حق کے پیرو تھے یا مُردوں کے ذریعے مستقبل بینی کرنے والے۔ وہ، جیسا کہ جنگوں میں کچھ لوگوں کو پیش آتا ہے، جنگ کے دو میدانوں کے درمیان غیر جانبدار علاقے میں رہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہو سکتا ہے، جیسا کہ آج کل کچھ لوگ سمجھتے ہیں، وہ بیک وقت مسیحی تثلیث اور مسلمانوں کے اللہ کی عبادت کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ میداردو کا نصف شدہ جسم دیکھ کر وہ اسے اپنی مخصوص خدا ترسی میں اپنی کھوہ میں لے گئے اور وہاں اپنے بنائے ہوئے روغنوں اور مرہموں سے علاج کر کے اسے بچا لیا۔ جوں ہی اس کی طاقت بحال ہوئی، زخمی نے اپنے نجات دہندوں کو خداحافظ کہا اور قلعے میں واپس پہنچنے کی غرض سے مہینوں اور برسوں مسیحی دنیا کی تمام قوموں میں لوگوں کو اپنے نیک کاموں سے حیران کرتا ہوا اپنی بیساکھی کے سہارے متحرک رہا۔

پامیلا کو اپنی کہانی سنانے کے بعد وائکاؤنٹ کے نیک نصف نے اسے اپنی کہانی سنائے

Scanned with CamScanner

کو کہا۔ پامیلا نے بتایا کہ میداردو اسے کس طرح گھیر رہا ہے، وہ کس طرح گھر سے بھاگ نکلی ہے اور اب جنگل میں بھٹک رہی ہے۔ نیک میداردو پامیلا کی سرگزشت سے متاثر ہوا اور اس کا ترحم بکریوں والی لڑکی کی ایذا یافتہ نیکی، بد میداردو کی ناقابلِ علاج کس مپرسی اور پامیلا کے ماں باپ کی تنہائی میں بٹ گیا۔

"جہاں تک میرے ماں باپ کا تعلق ہے،" پامیلا بولی، "وہ دونوں مسخ بوڑھے پاکھنڈی ہیں۔ ان پر تمہارا ترس کھانا بے سود ہے۔"

"اوہ، لیکن ذرا ان کے بارے میں سوچو تو، پامیلا، وہ اس لمحے اپنے پرانے گھر میں کتنے اداس ہوں گے۔ کوئی ان کی خبر گیری کرنے والا ہے اور نہ کوئی کھیتوں میں کام کرنے والا اور نہ کوئی مویشی گھر صاف کرنے والا۔"

"مویشی گھر ان کے سروں پر گر جائے، میری بلا سے!" پامیلا نے کہا۔ "میں یہ محسوس کرنے لگی ہوں کہ تم کچھ زیادہ ہی رحم دل ہو اور اس کے نفرت انگیز کاموں کے لیے اپنے دوسرے نصف پر حملہ آور ہونے کے بجائے اس پر بھی ترس کھاتے معلوم ہوتے ہو۔"

"یقیناً، مجھے اس پر ترس آتا ہے! میں جانتا ہوں کہ نصف آدمی ہونا کیا ہوتا ہے۔ بلاشبہ مجھے اس پر رحم آتا ہے۔"

"مگر تم مختلف ہو۔ تھوڑے سے پاگل بھی، مگر اچھے ہو۔"

تب نیک میداردو نے کہا، "اوہ، پامیلا! نصف ہونے میں اچھی بات یہ ہے کہ آدمی دنیا کے ہر شخص اور شے کا دکھ خود اپنے نامکمل پن سے سمجھ لیتا ہے۔ میں مکمل تھا اور سمجھ نہیں پاتا تھا۔ میں چاروں طرف بکھرے دکھ درد کے درمیان ایسی جگہوں میں بہرا اور بے حس بنا پھرتا تھا جہاں مکمل آدمی کی حیثیت سے کسی کو بھی دکھ درد کا خیال نہیں آتا۔ پامیلا، یہ صرف میں ہی نہیں ہوں جس کا وجود دو نیم ہے بلکہ تم اور دوسرے بھی ایسے ہی ہیں۔ اب مجھے ایسی قربت حاصل ہے جیسے جب میں مکمل تھا، نہ سمجھتا تھا اور نہ جانتا تھا۔ یہ قربت دنیا کی تمام کٹی پھٹی اور نامکمل چیزوں کی قربت ہے۔ پامیلا، اگر تم میرے ساتھ رہو گی تو ہر ایک کی تکلیفیں سہنا سیکھ جاؤ گی اور ان کی خبر گیری سے خود اپنے دکھوں کا علاج کر سکو گی۔"

"یہ باتیں بہت اچھی ہیں،" پامیلا نے کہا، "لیکن تمہارے دوسرے حصے کی وجہ سے میں بڑی

مصیبت میں ہوں۔ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور میں نہیں جانتی کہ وہ میرا کیا حشر کرنے والا ہے۔"

میرے ماموں نے اپنا چند گرا دیا کیوں کہ طوفان ختم چکا تھا۔

"مجھے بھی تم سے محبت ہے، پامیلا۔"

پامیلا اُچھل کر غار سے باہر نکل آئی۔ "کیا تمسخر ہے! پہلے ہی کیا کم مصیبت تھی کہ اب ایک اور چاہنے والا پیدا ہو گیا! یہ سچ ہے نصف شدہ ہے، مگر دل کا اچھا ہے۔

وہ شاخوں سے، جو ابھی تک بارش سے ٹپک رہی تھیں، ایسے راستوں پر چل رہے تھے جو تمام کیچڑ بھرے تھے۔ وائکاؤنٹ کا آدھا منہ ایک دلکش ادھوری مسکراہٹ میں خم کھایا ہوا تھا۔

"اچھا، تو اب کیا کریں؟" پامیلا نے کہا۔

میں تو کہوں گا تمہیں اپنے دکھی ماں باپ کے پاس لوٹ جانا چاہیے اور ان کے کام میں مدد کرنی چاہیے۔"

"تمہیں مدد کرنے کا شوق ہے تو تم جاؤ،" پامیلا بولی۔

"میں واقعی ان کی مدد کرنا چاہتا ہوں، جانم،" وائکاؤنٹ نے کہا۔

"میں یہیں ٹھہروں گی،" پامیلا نے اپنی بکری اور بطخ کے ساتھ رکتے ہوئے کہا۔

اکٹھے بھلائی کرنا ہی محبت کرنے کا واحد طریقہ ہے۔"

"افسوس، میں سمجھتی تھی اس کے اور طریقے بھی ہیں۔"

خدا حافظ، جانم! میں تمہارے لیے کچھ شہد کے کیک لاؤں گا۔"

اور وہ اپنی چھڑی کے سہارے اُچھلتا ہوا راستے پر چل دیا۔

تم کیا کہتی ہو، بکریا؟ تم کیا کہتی ہو، پیاری بطخی؟" پامیلا نے، جب وہ اپنے چہیتوں کے ساتھ اکیلی رہ گئی، بلند آواز میں کہا۔ "یہ تمام عجیب باتیں میرے ہی ساتھ کیوں؟"

Scanned with CamScanner

٨

جوں ہی یہ خبر کہ وانکاونٹ کا دوسرا نصف پھر سے ظاہر ہو گیا ہے، ترالبا میں پھیلی تو حالات بہت مختلف ہو گئے۔

صبح جب ڈاکٹر بیماروں کو دیکھنے دورے پر نکلتا تو میں اس کے ساتھ ہوتا وہ رفتہ رفتہ اپنے پیشے کی طرف لوٹ رہا تھا اور اسے احساس ہو گیا تھا کہ ہمارے لوگ، جن کی ساخت عالیہ زمانوں کے طویل قحطوں سے کھوکھلی ہو چکی تھی، کتنی علالت کا شکار ہیں۔ یہ ایسی آفات تھیں جنھوں نے اس سے قبل زحمت نہیں کی تھی۔

ہم دیہات کی گلیوں میں جاتے تو ہمیں ہم سے قبل میرے ماموں کے گزرنے کے نشان ملتے — میرا مطلب ہے کہ میرے نیک ماموں کے نشان، جو ہر صبح نہ صرف بیماروں بلکہ غریبوں اور بوڑھوں اور جس کسی کو بھی مدد کی ضرورت ہوتی اسے دیکھنے جایا کرتے تھے۔

باسیپیا کے باغ میں ہر پکا انار ایک چیتھڑے میں بندھا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم سمجھ گئے کہ باسیپیا کے دانت میں درد ہے۔ چوں کہ اس کے مصائب اسے باہر آنے اور انار خود توڑنے سے روک رہے تھے، میرے ماموں نے انھیں لپیٹ دیا تھا مبادہ وہ گر کے پھوٹ جائیں۔ لیکن ڈاکٹر ٹریلانی کے لیے یہ یک اشارہ بھی تھا کہ وہ بیمار کو دیکھنے آئے اور اپنا زنبور بھی ساتھ لائے۔

خانقاہ کے نگراں سیسو کے چبوترے پر ایک سورج مکھی کا پودا تھا لیکن کھاد کی ماری مٹی میں اس پر کبھی پھول ہی نہ آتے تھے۔ اس صبح ہم نے وہاں جنگلے سے بندھے تین چوزے دیکھے جو سب کے سب جتنی تیزی سے دانہ چگ سکتے تھے چگتے ہوئے اپنی سفید بیٹ سورج مکھی کے گملے میں خارج کر رہے تھے۔ ہمیں احساس ہو گیا کہ نگراں کو یقیناً اسہال کی شکایت ہو گی۔ میرے ماموں نے سورج مکھی کو کھاد دینے کے لیے وہاں چوزے باندھے تھے اور ساتھ ہی ڈاکٹر ٹریلانی کو اس کے اہم مریض سے آگاہ کرنے کے لیے بھی۔

بوڑھی جیرومینا کی سیڑھیوں پر ہم نے اوپر دروازے کی سمت بڑھتی ہوئی گھونگھوں کی ایک قطار دیکھی۔ وہ اس طرح کے بڑے گھونگھے تھے جو پکا کر کھائے جاتے ہیں۔ یہ جیرومینا کے لیے جنگل سے لایا ہوا میرے ماموں کا ایک تحفہ تھا، لیکن ساتھ ہی اس امر کی علامت بھی کہ بوڑھی

Scanned with CamScanner

عورت کی بیماریِ دل ابتر ہو گئی ہے اور یہ کہ ڈاکٹر کو خاموشی سے داخل ہونا چاہیے مبادا وہ اسے خوف زدہ کر دے۔

نیک میداردو ابلاغ کے یہ سارے طریقے اس غرض سے استعمال کرتا تھا کہ ڈاکٹر کی مدد لینے کے لیے اس کی سپاٹ درخواست سے بیمار پریشان نہ ہو جائیں اور اس لیے بھی کہ داخل ہونے سے قبل ٹریلانی علاج کے ضرورت مند مریض کے بارے میں کچھ اندازہ کر لے اور یوں دوسروں کے گھر میں قدم رکھنے اور ان مریضوں تک جن کی تکالیف وہ نہیں جانتا، پہنچنے کی جھجک پر قابو پا لے۔

اچانک ساری وادی میں خطرے کی لہر دوڑ گئی۔ "بدخُو، بدخُو آ رہا ہے!"

یہ میرے ماموں کا بد نصف تھا جو قریبی آبادی میں گھوڑے پر سوار دیکھا گیا تھا۔ پھر ہر کوئی چُھپنے کو بھاگ کھڑا ہوا۔ اپنے عقب میں مجھے لیے سب سے پہلے بھاگنے والا ڈاکٹر ٹریلانی تھا۔

ہم جیرومینا کے گھر کے پاس سے گزرے۔ سیڑھیوں پر چیختے ہوئے گھونگوں کی لکیر تھی، جو گاد اور خول کے ٹکڑوں کے سوا کچھ نہ رہ گئے تھے۔

"وہ اس رستے سے گزرا ہے۔ تیز!"

خانقاہ کے نگران سیمو کے چبوترے پر چوزے اس برتن سے بندھے ہوئے تھے جہاں ٹماٹر سوکھنے کو رکھے تھے اور وہ انھیں برباد کر رہے تھے۔

"تیز!"

باسیمیا کے باغ میں سارے انار زمین پر گرا کے چھوڑ دیے گئے تھے اور شاخوں سے خالی چبوتروں کے کنارے لٹک رہے تھے۔

"تیز!"

سو ہم اپنی زندگیاں بھلائی کرنے اور ڈرتے رہنے کے درمیان گزارتے تھے۔ نیک خو (جیسا کہ بد خو کے مقابلے میں، جو اس کا دوسرا نصف تھا، میرے ماموں کا بایاں نصف کہلاتا تھا) اب ولی سمجھا جاتا تھا۔ پاہج، غریب، دغا خوردہ عورتیں، غرض جو بھی مشکلات سے دوچار ہوتا، اسی کے پاس جاتا تھا۔ وہ اس کا فائدہ اٹھا کر حود وانکاؤنٹ بن سکتا تھا، لیکن اس کے بجائے اپنے پھٹے پرانے چغے میں نیم ملفوف، بیساکھی پر جھکا ہوا، سوراخوں سے بھرا نیلا اور سفید موزہ پہنے، مانگنے اور اپنے در سے دھتکارنے والوں، دونوں کے ساتھ بھلائی کرتا ہوا وہ بے خانماں ہی رہا۔ گھاٹی میں گر

سے کے ٹانگ توڑنے والی بسیرا ہو یا سرائے میں چاقو نکال لینے والا قشی یا رات کو محبوب کے پاس جاتی ہوئی بد چلن بیوی، مدد اور مشورے کے لیے، تشدد اور گناہ کو روکنے کے لیے اسے یوں ظاہر ہوتا دیکھتے جیسے وہ سیاہ اور دبلا اور مسکراتا پیکر آسمان سے گرا ہو۔

پامیلا ہنوز جنگل میں تھی۔ اس نے صنوبر کے دو درختوں کے درمیان اپنے لیے جھولا ڈال لیا تھا۔ پھر ایک ذرا مضبوط سا بکری کے لیے اور ایک ذرا ہلکا سا بطخ کے لیے بھی بنا لیا۔ یوں وہ اپنے پالتوؤں کے ساتھ اپنے آپ کو جھلانے میں گھنٹوں گزار دیتی تھی۔ لیکن نیک خو کندھے پر گٹھری باندھے ہوئے مقررہ اوقات پر صنوبر کے درختوں میں سے اچھلتا ہوا آ جاتا۔ گٹھری میں دھلنے اور مرمت کرنے والے کپڑے ہوتے جو وہ اکیلے فقیروں، یتیموں اور بیماروں سے اکٹھے کرتا تھا۔ اس نے پامیلا کو یہ کپڑے دھونے پر راضی کر لیا تھا اور یوں اسے بھی نیکی کرنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ پامیلا جو ہمہ وقت جنگل میں رہنے کی وجہ سے اکتا چلی تھی، چشمے میں کپڑے دھوتی اور وہ اس کی مدد کرتا تھا۔ پھر انھیں سکھانے کے لیے وہ اپنے جھولے کی رسیوں پر لٹکا دیتی۔ اس دوران نیک خو ایک پتھر پر بیٹھا تاسو کی کتاب "یروشلم کی آزادی" پڑھا کرتا۔

پامیلا اس کے پڑھنے پر کوئی توجہ نہ کرتی اور ستانے کے انداز میں گھاس پر لیٹی جوئیں مارتی رہتی (کیوں کہ جنگل میں رہنے کے دوران اس کے سر میں جوئیں پڑ گئی تھیں۔) وہ اپنے آپ کو ایک پودے سے، جس کا لغوی نام چوتڑ کھجاؤ تھا، کھجاتی، جمائیاں لیتی، اپنے ننگے پنجوں سے پتھر لڑھکاتی اپنی ٹانگوں کو دیکھا کرتی جو ہمیشہ کی طرح گلابی اور گداز تھیں۔ اس دیہاتی کے طور طریقوں کو تہذیب کی حدوں میں رکھنے کے خیال سے نیک خو کتاب سے سر اٹھائے بغیر بندوں پر بند پڑھتا چلا جاتا۔

لیکن پامیلا جو یہ بات سمجھنے سے قاصر تھی اور اکتا چکی تھی، خاموشی سے بکری کو نیک خو کا نصف چہرہ چاٹنے اور بطخ کو کتاب پر بسیرا لینے کے لیے اکسا رہی تھی۔ نیک خو بدک کر پیچھے ہٹا اور اس نے کتاب اوپر اٹھائی جو بند ہو گئی۔ عین اسی لمحے درختوں کے درمیان سے گھوڑا دوڑاتا اور نیک خو پر برچھی سی درانتی لہراتا، بد خو ظاہر ہو۔ درانتی کا پھل کتاب پر گرا اور اسے صفائی کے ساتھ لمبائی میں آدھوں آدھ کر گیا۔ پچھلا حصہ نیک خو کے ہاتھ میں رہا جبکہ باقی ہزار نصف صفحوں میں بٹ کر ہوا میں منتشر ہو گیا۔ بد خو تیزی سے گھوڑا بھگاتا ہوا غائب ہو گیا۔ اس نے یقیناً درانتی سے

Scanned with CamScanner

نیک خو کا سر اڑانے کی کوشش کی تھی لیکن کمری اور بلغ میں وقت پر نمودار ہو گئیں۔ سفید حاشیوں اور دو قت شمار کے ساتھ تاسو کے صفحات ہوا میں اڑتے ہوئے صنوبر کی شاخیں گھاس ور چشمے کے پانی پر آ گرے۔ پامیلا نے ایک ٹیلے کی بلندی سے اس سفید پھڑپھڑاہٹ کو دیکھ اور پکار اٹھی۔ "کیا حسین نظارہ ہے!"

کچھ ورق ایک راستے پر، جہاں ڈاکٹر ٹریلانی اور میں گزر رہے تھے آ پہنچے۔ ڈاکٹر نے ایک ورق ہوا ہی میں پکڑ لیا اور اسے بار بار الٹتے پلٹتے ہوئے ان بے سروپا اشعار کا مطلب نکالنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اس نے اپنا سر ہلایا۔ "لیکن میں تو خاک بھی نہیں سمجھ پایا۔ پچ پچ۔"

نیک خو کی شہرت ہیوگنات لوگوں تک بھی پہنچ گئی تھی اور بوڑھا ازیکل اکثر زرو تاکستان کے سب سے اونچے چبوترے پر کھڑا وادی سے اوپر آنے والے پتھریلے خچر راستے پر نظریں جمائے نظر آتا تھا۔

"ابا،" اس کا ایک بیٹا اس سے بولا، "میں آپ کو نیچے وادی پر نظریں جمائے دیکھ رہا ہوں جیسے کسی کے آنے کا انتظار ہے۔"

"انتظار کرنا آدمی کا مقدر ہے،" ازیکل نے جواب دیا۔ "انصاف پسند آدمی یقین کے ساتھ انتظار کرتا ہے اور بے انصاف خوف کے ساتھ۔"

"آپ جس کا انتظار کر رہے ہیں، کیا وہ دوسرے پاؤں والا لنگڑا ہے؟"

"کیا تم نے اس کا ذکر سنا ہے؟"

"نیچے وادی میں آدھے آدمی کے سوا کسی اور شے کا ذکر ہی نہیں ہے۔ آپ کے خیال میں کیا وہ ہمارے پاس یہاں اوپر آئے گا؟"

"اگر ہماری زمین راستی پر رہنے والوں کی زمین ہے اور وہ راستی پر رہنے والوں میں سے ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ یہاں نہ آئے۔"

"بیساکھی پر چلنے والے کے لیے خچر راستا بہت ڈھلوان ہے۔"

"دوسرے ایک ٹانگ والے نے تو اوپر آنے کے لیے گھوڑا ڈھونڈ نکالا تھا۔"

ازیکل کو باتیں کرتے سن کر دوسرے ہیوگنات کی بیلوں سے نکل کر اس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ وہ وائکاؤنٹ کا حوالہ سن کر خاموشی سے کانپ رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

"فادر ایزیکل،" وہ بولے۔ "اس رات جب وہ لاشخص آیا تھا اور بجلی نے آدھا بلوط جلا ڈالا تھا، تم نے کہا تھا، ہو سکتا ہے کسی دن ہمارے ہاں کوئی بہتر مسافر آئے۔

ایزیکل نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنی داڑھی اپنے سینے پر جھکالی۔

"اناں اب جس کی باتیں ہو رہی ہیں وہ بھی اتنا ہی مفلوج ہے جتنا کہ وہ دوسرا، مگر جسم اور روح دونوں میں اس کا اُلٹ ہے۔ یہ رحم دل ہے جبکہ دوسرا ظالم تھا۔ کیا یہ آنے والا وہ ہو سکتا ہے جس کا اعلان تمہارے الفاظ کر رہے ہیں؟"

"وہ کسی بھی سڑک پر کوئی بھی مسافر ہو سکتا ہے،" ایزیکل نے کہا۔ "چھاں یہ بھی۔"

"تب تو ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ وہی ہے،" ہیوگنات بولے۔

ایزیکل کی بیوی، جس کی نظریں اس کے بالکل سامنے جمی ہوئی تھیں، انگور کی کونپلوں سے بھری ہاتھ گاڑی دھکیلتی ہوئی آگے آئی۔ "ہم ہمیشہ اچھی بات کی امید کرتے ہیں،" وہ بولی۔ "لیکن وہ جو ان پہاڑوں پر پیدل کتا پھرتا ہے اگر جنگ میں اپاہج ہونے والا کوئی دکھیا سپاہی یا مدروت بھی ہو تو بھی ہمیں روزانہ نیکیاں کرتے رہنا اور اپنی زمین کاشت کرتے رہنا ہے۔

"یہ واضح ہے،" ہیوگنات بولے۔ "کیا واقعی ہم نے کوئی ایسی بات کہی ہے جو اس کے برعکس ہو؟"

"پھر، اگر ہم سب متفق ہیں،" اس عورت نے کہا، "تو ہمیں اپنے کھرپے اور درانتے سنبھال لینے چاہییں۔"

"قحط اور وبا!" ایزیکل پھٹ پڑا۔ "مگر تم سے کام بند کرنے کو کس نے کہا تھا؟

جھریوں میں چھوڑے ہوئے اپنے اوزار اٹھانے کے لیے ہیوگنات بیلوں کی قطاروں کے درمیان منتشر ہو گئے لیکن اسی لمحے عیسو، جو اپنے باپ کی نظر بچا کر ابتدائی پھل کھانے کے لیے انجیر کے درخت پر چڑھ گیا تھا، پکار اٹھا۔ "وہ نیچے۔ اس خچر پر کون آ رہا ہے؟

حقیقت میں ایک خچر، جس کے پٹھے سے ایک نصف آدمی بندھا تھا، ڈھلان پر چڑھ رہا تھا۔ یہ نیک خو تھا جس نے ایک بوڑھی مادہ خچر عین اس وقت خرید لی تھی جب اسے بوچڑخانے کے بھی لائق نہ ہونے کے باعث ڈبویا جا رہا تھا۔

"بہرحال، میرا وزن صرف نصف آدمی کے برابر ہے،" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "ہو

سکتا ہے یہ بوڑھی خچر یا اب بھی میرا بوجھ اٹھا سکے۔ اپنی سواری پر تو میں آور آگے تک جا سکتا ہوں، زیادہ تیکیل کر سکتا ہوں۔" سو اس کا پہلا سفر اوپر ہیوگنات لوگوں کے ہاں آنے کے لیے تھا۔

ہیوگنات لوگوں نے، جو سب قطار میں بدن اکڑائے ساکت کھڑے تھے، ایک حمد پڑھتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ پھر بوڑھے شخص نے اس کے پاس جا کر بھائی کی طرح سے خوش آمدید کہا۔ نیک خو خچر سے اترا اور پر تکلف انداز میں ایزیکل کی بیوی کا، جو تیوری پر بل ڈالے سنجیدہ کھڑی تھی، ہاتھ چومتے ہوئے خیر مقدمی کلمات کا جواب دیا۔ اس نے ہر ایک کی صحت کے بارے میں دریافت کیا، عیسو کے گندے سر کو تھپتھپانے کے لیے ہاتھ بڑھایا جو فوراً ہی پیچھے ہٹ گیا، ہر ایک کی مشکلات میں دلچسپی ظاہر کی، ان کی داستانِ اذیت سنی اور اظہار ناپسندیدگی کرتے ہوئے متاثر نظر آیا۔ وہ مذہبی مناقشے پر توجہ مرکوز کیے بغیر باتیں کرتے رہے گویا کہ یہ قضیہ انسان کی عمومی بد طینتی سے منسوب بد بختیوں کا ایک سلسلہ ہو۔ میداردو اس حقیقت کو پی گیا کہ یہ اذیت رسانیاں اس کلیسا کے ہاتھوں تھیں جس سے خود اس کا تعلق تھا اور ہیوگنات لوگوں نے اپنی طرف سے عقیدے کا اظہار اس خوف سے نہیں کیا کہ ایسی باتیں نہ کہہ بیٹھیں جو دینیاتی طور پر غلط ہوں۔ سو نفوں نے ہر تشدد اور زیادتی پر ناپسندیدگی ظاہر کرتے ہوئے مبہم سی اخلاص مند نہ گفتار کے ساتھ بات ختم کی۔ گو سب متفق نے، گر عمومی طور پر ماحول میں قدرے رکھائی تھی۔

پھر نیک خو نے ان کے کھیت دیکھے۔ اس نے خراب فصلوں پر اظہار ہمدردی کیا اور یہ سن کر کہ اگر کچھ اور نہیں تو ان کی رائی کی فصل اچھی ہوئی ہے، خوشی ظاہر کی۔

"تم لوگ یہ کیا حساب بیچتے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"تین اسکدی فی پونڈ،" ایزیکل نے جواب دیا۔

"تین اسکدی فی پونڈ؟ لیکن ترالبا کے غریب بھوکے مر رہے ہیں، میرے دوستو۔ وہ مٹھی بھر رائی بھی نہیں خرید سکتے۔ شاید تم لوگوں کو معلوم نہیں کہ ژالہ باری سے ساری وادی میں رائی کی فصل تباہ کر دی ہے۔ اب صرف تمھیں لوگ موجودہ ہست سے خاندانوں کو قحط سے محفوظ رکھ سکتے ہو۔"

"ہم یقیناً یہ جانتے ہیں،" ایزیکل نے کہا، "اور یہی وجہ تو ہے کہ ہم اپنی رائی بہتر نرخ پر بیچ سکتے ہیں۔"

Scanned with CamScanner

"لیکن ذرا اس مدد کا تو سوچو جو تمھارے قیمت کم کرنے کی صورت میں ان غریبوں کو پہنچے گی۔ اس نیکی کا سوچو جو تم کر سکتے ہو..."

بوڑھا ایزیکل اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ نیک خو کے آگے رک گیا۔ سارے ہیوگنات اس کی نقل کر رہے تھے۔

"برادر، نیکی کرنے کا مطلب،" اس نے کہا، "اپنی قیمتیں کم کرنا نہیں ہے۔"

نیک خو نے کھیتوں پر نظر کی اور دھوپ میں گوڈی کرتے ہوئے ڈھانچوں جیسے بوڑھے ہیوگنات دیکھے۔

"تمھاری رنگت زرد ہو رہی ہے،" اس نے ایک بوڑھے سے کہا جس کی داڑھی اتنی لمبی تھی کہ کھرپا چلاتے وقت زمین کو چھو رہی تھی۔ "کیا طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

"اتنی ہی ٹھیک ہے جتنی کہ ستر سال کی عمر میں صرف بند شوربہ پی کر دس گھنٹے کھرپا چلانے والے کی ہو سکتی ہے۔"

"یہ میرا عم زاد آدم ہے،" ایزیکل بولا۔ "ایک غیر معمولی کارکن!"

"اس عمر میں تمھیں آرام اور غذا چاہیے،" نیک خو ابھی یہ کہنے ہی والا تھا کہ ایزیکل اسے الگ ہی سے کھینچ کر پرے لے گیا۔

"یہاں ہم سب محنت کی روٹی کھاتے ہیں، برادر،" اس نے ایسے لہجے میں کہا جس میں جواب کی گنجائش نہیں تھی۔

نیک خو جب خچر سے اترا تھا تو اس نے خچر کو خود باندھنے پر اصرار کیا تھا اور چڑھائی کے بعد اسے تازہ دم کرنے کے لیے چارے کا ایک تھیلا مانگا تھا۔ ایزیکل اور اس کی بیوی ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے تھے کیوں کہ ان کے خیال میں اس جیسے خچر کو صرف مٹھی بھر گھاس کی ضرورت تھی۔ لیکن یہ مکالمہ مہمان نوازی کے سب سے بڑے تپاک لہجے میں ہوا تھا اور انھوں نے چارا منگوا لیا تھا۔ اب گویا بات پر دوبارہ غور کرتے ہوئے بوڑھے ایزیکل نے محسوس کیا کہ وہ اس ازکار رفتہ خچر کو وہ ضرورت سے بہت زیادہ چارا جو ان کے پاس ہے کھانے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس لیے مہمان سے نظریں بچاتے ہوئے میسو کو بلا کر کہا، "فوراً خچر کے پاس جاؤ اور چارا ہٹا کر اسے کچھ اور دے دو۔"

Scanned with CamScanner

"ڈسے کے لیے جوشاندہ؟"

"مکئی کی بھوسی، مٹر کی پھلیاں، جو تم چاہو۔"

میسو لیکا اور خچر کے منہ سے توبڑا ہٹا دیا خچر نے اسے دولتی ماری جس کے نتیجے میں اسے کچھ دیر لنگڑا کے چلنا پڑا۔ میسو نے اس کا ازالہ کرنے کے لیے باقی ماندہ چارا اپنے حساب میں بیچ دیا اور ایزیکل کو یہ بتایا کہ خچر نے سب ہڑپ کر لیا ہے۔

جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ نیک خوجیوگات لوگوں کے ساتھ کھیتوں کے وسط میں تھا اور وہ نہیں جانتے تھے کہ ایک دوسرے سے کیا بات کریں۔

"مہمان، ابھی ہمارے پاس کم و بیش ایک گھنٹے کا کام باقی ہے،" ایزیکل کی بیوی نے کہا۔

"اچھا، تو پھر میں رخصت چاہوں گا۔"

"قسمت تمہارے ساتھ ہو، مہمان۔"

اور نیک خوصیدارو اپنے خچر پر واپس لوٹ گیا۔

"جنگوں میں اپاہج ہونے والی دکھی مخلوق،" جب وہ جا چکا تو عورت نے کہا۔ "ان کی کتنی بڑی تعداد یہاں گھوم رہی ہے! غریب بے چارے!"

"غریب بے چارے!" سارے خاندان نے اتفاق کیا۔

"قحط اور وبا!" کھیتوں میں جتا ہوا بوڑھا ایزیکل جس کی مٹھیاں پھوہڑپن سے کیے ہوئے کام اور قحط سالی سے ہونے والے نقصان پر اٹھی ہوئی تھیں، چلا رہا تھا۔ "قحط اور وبا!"

۹

میں اکثر صبحوں کو پیترو کیودو کے کارخانے جایا کرتا تھا کہ اس ہنرمند بڑھئی کی بنائی ہوئی چیزیں دیکھ سکوں۔ وہ بڑھتے ہوئے کرب اور پشیمانی میں جی رہا تھا کیوں کہ نیک خوجورات کو اس کے ہاں آیا کرتا تھا، اسے ان ایجادات کے الم ناک مقصد پر سرزنش کرتے ہوئے ایسے میکانیے

بنانے پر اکسا رہا تھا جو ایذادہی کی شیطانی خواہش سے نہیں بلکہ نیکی سے حرکت پذیر ہوں۔

"پھر میں کیسی کل بناؤں، آکا میداردو؟" پیسترو کیودو نے پوچھا۔

"میں بتاتا ہوں۔ مثال کے طور پر تم..." اور نیک خو نے ایک ایسی کل کی تفصیل بتانی شروع کر دی جسے وہ اگر وہ دوسرے نصف کی بجائے خود وائکاؤنٹ ہوتا تو آپ بنواتا۔ اپنی بات کی وضاحت میں اس نے کچھ پیچیدہ نمونے بھی کاغذ پر بنائے۔

پہلے پہل پیسترو کیودو نے سوچا کہ اس کل سے اس کی مراد چھوٹا کوئی باجا، بہت بڑا باجا ہوگا جس کے پردوں سے شیریں موسیقی پیدا ہوگی۔ وہ قرنوں کے لیے موزوں لکڑی ڈھونڈنے ہی والا تھا کہ نیک خو کی ایک اور گفتگو نے اس کے خیالات کو منتشر کر دیا کیوں کہ اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ میداردو قرنوں میں سے ہوا نہیں بلکہ گندم گزارنا چاہتا ہے! درحقیقت اس کل کو صرف باجا ہی نہیں، غریبوں کے غلہ پیسنے والی چکی بھی ہونا تھا اور ممکنہ طور پر روٹی پکانے کے لیے تنور بھی۔ نیک خو روزانہ، اپنے منصوبے کو بہتر کرتے ہوئے، نقشوں سے کاغذ بھر رہا تھا، لیکن پیسترو کیودو اس کے ساتھ چل نہیں سکا کہ اس باجانما چکی نما تنور کو گدھوں کا کام بچاتے ہوئے کنووں سے پانی بھی کھینچنا تھا! اور مختلف دیہات کے کام آنے کی خاطر پہیوں پر حرکت کرنا تھا جب کہ چھٹی کے دن اپنے چاروں طرف جالوں کے ساتھ تتلیاں پکڑنے کے لیے ہوا میں معلق رہنا تھا۔

بڑھئی کو شک سا ہو چلا تھا کہ نیک مقاصد کے لیے کلیں بنانا انسانی امکان سے باہر ہے کیوں کہ عملی اور صحیح طور پر کام کرنے والے میکانیے صرف سولیاں اور شکنجے ہی نظر آتے تھے۔ حقیقت میں جوں ہی بدخو کسی نئے میکانیے کا خیال پیسترو کیودو پر واضح کرتا تو بڑھئی کو یوں محسوس ہوتا جیسے اسے بنانے کا طریقہ فوراً ہی اس کے ذہن میں آ گیا ہے۔ وہ کام کرنے بیٹھ جاتا اور دیکھتا کہ ہر تفصیل مکمل اور ناقابلِ تبدیل طور پر خود بخود سامنے آتی چلی جا رہی ہے اور یہ کہ مکمل ہونے کے بعد آلہ ہنرمندی کا ایک شاہکار ہے۔

بڑھئی کے ذہن میں یہ اذیت ناک خیال آیا: "کیا یہ ممکن ہے کہ شیطان جو مجھ سے صرف میری ظالمانہ کلیں چلواتا ہے، میری اپنی روح میں ہو؟" لیکن وہ بڑے جذبے اور اہلیت کے ساتھ ایذادہی کے دیگر ذرائع ایجاد کرتا رہا۔

Scanned with CamScanner

ایک روز میں نے اسے بلاکت کے ایک عجیب آلے پر کام کرتے دیکھا جو سیاہ لکڑی کی دیوار میں جڑی ہوئی ایک سفید سُولی اور دیوار میں پھندے کے بالکل صحیح مقام پر بنے دو سوراخوں سے گزرتی ہوئی ایک سفید رسی پر مشتمل تھا۔

"یہ کیسی کل ہے، استاد؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ایک زرخ سے لٹانے کے لیے سولی۔"

"یہ تم نے کس کے لیے بنائی ہے؟"

"اس ایک شخص کے لیے جو سزا دیتا بھی ہے اور سزا یافتہ بھی ہے۔ وہ اپنے آدھے سر سے خود کو سزائے موت دیتا اور دوسرے آدھے سے پھندے میں داخل ہو کر جان دے دیتا ہے۔ میں اسے اس طرح ترتیب دینا چاہتا ہوں کہ کوئی یہ نہ بتا سکے کہ کون کون ہے۔"

مجھے احساس ہو گیا کہ بدخو نے اپنے نیک نصف کی بڑھتی ہوئی مقبولیت محسوس کر کے اس سے جلد از جلد چھٹکارا پانے کا بندوبست کر لیا ہے۔

حقیقت یہ تھی کہ اس نے سپاہیوں کو بلا کر کہا، "بہت دنوں سے ایک گھٹیا آوارہ گرد ہماری زمینوں کو آلودہ کرتے ہوئے نفاق کے بیج بو رہا ہے۔ کل تک یہ مجرم گرفتار ہو کر مرنے کے لیے یہاں آ جانا چاہیے۔"

"حضور والا، ایسا ہی ہو گا۔" سپاہیوں نے کہا اور اس کی تلاش میں چل دیے۔ یک چشم ہونے کے باعث بدخو نے دیکھا نہیں تھا کہ جواب دیتے وقت سپاہی ایک دوسرے کو آنکھ مار رہے تھے۔

یہاں یہ بتا دینا چاہیے کہ اُن دنوں ایک محلاتی سازش جاری تھی جس میں سپاہی بھی شریک تھے۔ مقصد یہ تھا کہ حکمران نصف واکاؤنٹ کو قید میں ڈال کر ختم کر دیا جائے اور قلعہ و خطاب دوسرے نصف کو دے دیا جائے۔ تاہم موخرالذکر اس بات سے بے خبر تھا۔ اس رات خشک گھاس کے ڈھیر میں، جہاں وہ رہتا تھا، اس کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو سپاہیوں سے گھرا ہوا پایا۔

"دوست،" سپاہیوں کے نگراں نے کہا۔ "ہمیں واکاؤنٹ نے تمھیں قتل کرنے کو بھیجا ہے لیکن ہم اس کے ظالمانہ استبداد سے تنگ آ چکے ہیں۔ سو ہم نے اسے قتل کرنے اور اس کی جگہ تمھیں بٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

Scanned with CamScanner

'میں کیا سن رہا ہوں؟ کیا یہ ہو چکا ہے؟ میں تم سے پوچھتا ہوں، کیا تم وانکاؤنٹ کو قتل نہیں کر چکے؟"

'نہیں۔ مگر صبح ہوتے ہوتے ہم یقیناً اسے قتل کر دیں گے۔'

خدا کا شکر ہے! نہیں، خود کو مزید خون سے داغ دار نہ کرو۔ پہلے ہی بہت خون بہایا جا چکا ہے۔ جرم سے جنم لینے والی حکمرانی کیا بھلائی لا سکتی ہے؟"

کوئی بات نہیں۔ ہم سے برج میں قید کر دیں گے اور اس سے کوئی غرض نہیں رکھیں گے۔'

اس کے یا کسی اور کے خلاف ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ میں تم سے التجا کرتا ہوں! اس کے غرور سے مجھے دکھ پہنچا ہے۔ اس کے باوجود خود کو رحم دل اور نیک دکھا کر اس کے سامنے اچھی مثال پیش کرنا ہی واحد علاج ہے۔"

'پھر تو ہمیں آپ کو قتل کرنا پڑے گا، سینیور۔

اوہ، نہیں! میں نے تم سے کسی کو بھی قتل نہ کرنے کو کہا ہے۔'

'پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟ اگر ہم وانکاؤنٹ کو ختم نہیں کرتے تو اس کا حکم ماننے پر مجبور ہیں۔"

'یہ شیشی لو۔ اس میں اُس روغن کے چند آخری قطرے ہیں جس سے بوہیمیا کے زاہدوں نے میرا علاج کیا تھا اور جو اب تک، جب موسم کی تبدیلی سے میرا پرانا زخم دکھتا ہے، میرے لیے سب سے زیادہ قیمتی رہا ہے۔ یہ وانکاؤنٹ کو دینا اور اس سے صرف اتنا کہنا: یہ اُس کی طرف سے ایک تحفہ ہے جو یہ جانتا ہے کہ رگوں کے سرے بند ہونا کیا معنی رکھتا ہے!'

سپاہی وانکاؤنٹ کے پاس شیشی لے گئے جس نے انھیں پھانسی کی سزا سنا دی۔ سپاہیوں کو بچانے کے لیے دوسرے سازشیوں نے شورش کا منصوبہ بنایا لیکن ان کے بھونڈے پن سے شورش کی خبر طشت از بام ہو گئی جسے کشت و خون سے کچل دیا گیا۔ نیک خو نے مرنے والوں کی قبروں پر پھول چڑھائے اور بیواؤں اور یتیموں کی مدد بھی کی۔

نیک خو کی نیکی سے بوڑھی سباستیانا کبھی متاثر نہیں ہوئی۔ اپنی پُرجوش مہموں کے دوران وہ بوڑھی آیا کی جھونپڑی پر اکثر رکتا اور انتہائی رحم دلی اور توجہ کے ساتھ اس سے ملتا۔ وہ ہر بار

اسے پندو نصیحت کرتی۔ شاید اپنی مادرانہ جبلت کے باعث، یا شاید بڑھاپے کے باتھوں حافظے کی خرابی کے باعث، وہ میدا اردو کے دو حصوں میں بٹ جانے پر کم ہی دھیان دیتی تھی۔ وہ ایک نصف کی غلط روی پر دوسرے نصف کی نکتہ چینی کرتی، ایک کو نصیحت کرتی جو دوسرے کے لیے ہوتی، وغیرہ وغیرہ۔

"یہ تم نے نانی بیبن کے چوزے کا سر کیوں کاٹا؟ بے چاری بڑھیا، اس کے سوا اس کے پاس اور تھا ہی کیا؟ تم اب بچے نہیں ہو کہ ایسی حرکتیں کرو..."

"تم یہ مجھ سے کیوں کہہ رہی ہو آیا؟ تم جانتی ہو چوزے کا سر کاٹنے والا میں نہیں تھا۔"

"اوہ! یہ بات ہے تو ذرا بتاؤ وہ کون تھا؟"

"تھا تو میں ہی، لیکن"

"دیکھا!"

"لیکن جو میں یہاں ہے، وہ نہیں۔"

"آہ! میں بوڑھی ہوں اس لیے تم سمجھتے ہو پاگل بھی ہوں۔ کیوں؟ جب میں کسی بدمعاشی کا ذکر سنتی ہوں تو فوراً سمجھ جاتی ہوں کہ اس کے پیچھے تم ہو یا نہیں۔ اور میں اپنے آپ سے کہتی ہوں: قسم کھاتی ہوں کہ اس میں میدا اردو کا ہاتھ ہے۔"

"لیکن تمہیں ہمیشہ مغالطہ ہوتا ہے..."

"مجھے مغالطہ ہوتا ہے، مجھے؟ تم نوجوان ہم بوڑھوں سے کہتے ہو کہ ہمیں مغالطہ ہوتا ہے! اور اپنے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟ تم نے اپنی بیساکھی بوڑھے ایسودورو کو دے ڈالی..."

"ہاں، وہ میں ہی تھا..."

"تم اس پر شیخی بگھار رہے ہو! ایسودورو نے اس سے اپنی بیوی کو پیٹا ہے، دکھیا عورت..."

"اس نے تو مجھ سے کہا تھا کہ وہ گٹھیا کی وجہ سے چل نہیں سکتا..."

"وہ بہانہ کر رہا تھا... اور تم نے فوراً جا کر اپنی بیساکھی دے دی... اب اس نے اسے اپنی بیوی کی کمر پر توڑ ڈالا ہے اور تم خمیدہ ڈال کے سہارے گھوم رہے ہو۔ تمہاری کھوپڑی میں بھیجا نہیں ہے۔ یہ ہے اصل مسئلہ تمہارے ساتھ! ہمیشہ ہی سے ایسے ہو! اور اس بارے میں کیا کہتے ہو

Scanned with CamScanner

جب تم نے برناردو کے بیل کو گر پا پڑا کر بدمست کر دیا تھا

نو ہ نہیں

اوہ، سو وہ تم نہیں تھے! ہر ایک یہی کہتا ہے۔ لیکن ہر واقعے کے پیچھے ہوتا وا اکاؤنٹ ہی ہے۔ کیوں؟"

چھوت سے قطعِ نظر نیک خو کے پراتوفنگو کے کثیر دورے (بظاہر پراسرار علاجوں کے باعث) خود کو دکھی کوڑھیوں کے لیے وقف کرنے کے باعث بھی واجب تھے۔ چھوت سے محفوظ (جس کا سبب بظاہر زاہدوں کا علاج معالجہ بھی تھا) وہ گاؤں میں ہر ایک کی چھوٹی چھوٹی ضرورتیں معلوم کرتا ہوا گھومتا رہتا اور جب ان کے لیے ہر وہ قابلِ تصور کام نہ کر لیتا جو اس کے امکان میں ہوتا، انھیں چین سے نہ چھوڑتا۔ وہ اپنے خچر پر پراتوفنگو اور ڈاکٹر ٹریلانی کے گھر کے درمیان مشورے اور دواؤں کے لیے اکثر آتا جاتا رہتا۔ خود کوڑھیوں کے نزدیک جانے کی ہمت ڈاکٹر میں نہیں تھی لیکن نیک میداردو کی رابطہ کاری کے باعث ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ان میں دل چسپی لینی شروع کر دی ہے۔

لیکن میرے ماموں کے ارادے اس سے سوا تھے۔ وہ صرف کوڑھیوں کے جسموں کی دیکھ بھال تجویز نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کا مقصد ان کی روحوں کا علاج بھی تھا۔ وہ ہمیشہ ان کے درمیان اخلاقیات کا پرچار کرتے، ان کے معاملات میں مداخلت کرتے، رسوائی مول لیتے اور نصیحت کرتے نظر آتے۔ کوڑھی انھیں برداشت نہ کر پاتے۔ پراتوفنگو میں رنگ رلیوں کے دن گزر چکے تھے۔ اس ایک ٹانگ والے دبلے، سیاہ لباس، پرتکلف اور سخن ساز پیکر کی وجہ سے کوئی بھی عوامی الزام دہی، عناد اور چغل خوری اُبھرے بغیر لطف اندوز نہیں ہو سکتا تھا۔ حد یہ ہے کہ ان کی موسیقی بھی جو گویا رائیگاں، شہوانی اور شیطانی جذبات سے مملو ہونے کے باعث موردِ الزام تھی، ناقابلِ برداشت ہو گئی تھی، اور ان کے عجیب و غریب سازوں پر گرد کی چادر چڑھنے لگی تھی۔ کوڑھی عورتیں، جو اب اپنی رنگ رلیوں سے محروم ہو چکی تھیں اپنی بیماریوں کو اچانک اپنے مقابل پا کر، اپنی شامیں مایوسی میں سسکیاں لیتے گزارتی تھیں۔

"دونوں آدھوں میں نیک خو تو بدخو سے بھی بدتر ہے،" پراتوفنگو میں لوگ کہنے لگے تھے۔

Scanned with CamScanner

لیکن نیک خو کی تعریف صرف کو مسیوں ہی میں زوال پذیر نہیں تھی۔
"شکر ہے کہ توپ کے گولے نے اسے صرف دو حصوں ہی میں بانٹا،" ہر ایک کہنے لگا تھا۔ "اگر وہ تین حصوں میں بٹا ہوتا تو کون جانے ہمیں کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا!"

اب ہیوگناٹ بھی اپنے آپ کو اس سے بچانے کے لیے باری باری پہرہ دینے لگے تھے کہ اس کے دل سے ان کا احترام اٹھ چکا تھا۔ وہ دن رات اس بات کی جاسوسی کیا کرتا تھا کہ ان کے غلے گھروں میں کتنی بوریاں ہیں؛ بہت زیادہ قسمیں رکھنے پر انھیں نصیحت کرتا اور ان کے ذخیرے کی خبر پھیلا کر ان کا کاروبار خراب کرتا تھا۔

ترالبا کے روز و شب اس طرح گزر رہے تھے۔ ہماری حسیات سن ہو چکی تھیں کہ ہم اپنے آپ کو ایک بدی اور ایک نیکی کے درمیان، جو یکساں غیر انسانی تھیں، گم محسوس کرتے تھے۔

۱۰

بُری روحوں میں کبھی چاندنی نہیں چٹکتی، صرف بُرے خیالات ہی سانپوں کی طرح پیچ و تاب کھاتے ہیں۔ جبکہ خیر روحیں دستبرداری اور نذر کے پھول کھلاتی ہیں۔ سو میدارو کے دونوں نصف مخالف غیظوں کی اذیتیں جھیلتے ترالبا کی چٹانوں میں بھٹکا کرتے تھے۔

پھر ہر ایک نے اپنا اپنا فیصلہ کیا اور اگلی صبح اسے عملی جامہ پہنانے نکل کھڑا ہوا۔

پامیلا کی ماں کنویں سے پانی نکالنے والی تھی کہ اس نے ایک پھندے میں ٹھوکر کھائی اور کنوئیں میں جا گری۔ وہ رسی پکڑ کر لٹک گئی اور چیخیں مارنے لگی۔ اس نے کنویں کے منہ کی گولائی میں آسمان کے مقابل بدخو کا ہیولا دیکھا جس نے اس سے کہا، "میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے طے کیا ہے کہ تمھاری بیٹی پامیلا جو اکثر ایک نصف شدہ آوارہ گرد کے ساتھ دیکھی جاتی ہے تمھیں اس آوارہ گرد سے اس کی شادی کر دینی چاہیے۔ اس نے تمھاری بیٹی کو مشتبہ کر دیا ہے۔ اگر وہ شریف ہے تو اسے صورتِ حال کا تدارک کرنا چاہیے۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ اس سے زیادہ مجھ

Scanned with CamScanner

سے مت پوچھو۔"

پامیلا کا باپ تیل نکالنے کے لیے زیتونوں کی ایک بوری لے جا رہا تھا لیکن بوری میں سوراخ تھا۔ سوراستے پر زیتونوں کا ٹپکا لگا ہوا تھا۔ بوڑھے شخص نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اس کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے، بوری اپنے کندھوں سے اتاری۔ اس نے دیکھا کہ بوری تقریباً خالی ہے۔ لیکن اپنے عقب میں اس کو نیک خو نظر آیا جو ایک ایک کر کے زیتون اکٹھے کرتے ہوئے اپنے چغے میں بھر رہا تھا۔

"میں تم سے بات کرنے تمہارے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے تمہارے زیتون بچا لیے۔ میرے دل میں جو بات ہے وہ یہ ہے کہ کچھ دنوں سے میں سوچ رہا ہوں کہ دوسروں کی ناخوشی، جسے میں دور کرنا چاہتا ہوں، غالباً میری موجودگی ہی سے بڑھ چکی ہے۔ میں ترالبا سے چلے جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ لیکن ایسا اسی صورت میں کروں گا اگر میری روانگی سے دو افراد کا سکون لوٹ آئے۔ ایک تمہاری بیٹی کا، جو شاندار مقدر کی منتظر ہونے کے باوجود ایک غار میں رہتی ہے۔ دوسرے میرے ناخوش واہنے حصے کا جسے اتنا تنہا نہیں چھوڑا جانا چاہیے۔ پامیلا اور وائکاؤنٹ کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دینا چاہیے۔"

پامیلا ایک گلہری کو سدھا رہی تھی کہ اس نے اپنی ماں کو دیکھا جو صنوبر کے تحت چل پھل ڈھونڈنے کا بہانہ کر رہی تھی۔

"پامیلا" اس کی ماں نے کہا۔ "وقت آ گیا ہے کہ نیک خو نامی بے خانماں تم سے شادی کر لے۔"

"یہ خیال تمہیں کیسے سوجھا؟" پامیلا نے پوچھا۔

"اس نے تمہیں مشتبہ کر دیا ہے۔ سوائے تم سے شادی کرنی ہوگی۔ وہ اتنا رحم دل ہے کہ اگر تم اسے یہ بتاؤ گی تو وہ انکار نہیں کرے گا۔"

"لیکن یہ خیال تمہیں آیا کیسے؟"

"اگر تم جانتیں کہ مجھے کس نے کہا ہے تو اتنے سوال نہ پوچھتیں۔ خود بد خو نے، ہمارے نامور وائکاؤنٹ نے، مجھے ذاتی طور پر کہا ہے!"

"وہ خدایا!" پامیلا نے گلہری کو اپنی آغوش میں گراتے ہوئے کہا "وہ ہمارے لیے کون

Scanned with CamScanner

سا دام تیار کر رہا ہے!"

تھوڑی دیر بعد جب وہ گھاس کی پتی میں سے اپنے آپ کو گنگناتا سکھا رہی تھی اس نے اپنے باپ کو دیکھا جو لکڑیاں ڈھونڈنے کا بہانہ کر رہا تھا۔

"پامیلا،" اس کے باپ نے کہا۔ "وقت آ گیا ہے کہ تم کلیسا میں شادی کرنے کی شرط پر وائکاؤنٹ کو، بدخو کو، ہاں کہہ دو۔"

"یہ خیال تمہارا ہے یا کسی اور کا؟"

"تم وائکاؤنٹس بننا پسند نہیں کرو گی؟"

"میرے سوال کا جواب دو۔"

"اچھا فرض کرو یہ بات مجھ سے دنیا بھر میں سب سے نیک دل شخص، نیک خو نامی بے خانماں نے کہی ہے۔"

"وہ، اس کے پاس تو اس کے سوا سوچنے کو اور کچھ ہے ہی نہیں۔ تم ذرا دیکھو، میں کرتی کیا ہوں!"

اپنے دبلے گھوڑے پر گھنی جھاڑیوں میں دوگامہ چلتے ہوئے بدخو نے اپنے منصوبے پر غور کیا۔ اگر پامیلا نے نیک خو سے شادی کر لی تو قانون کی رو سے وہ میداردو آف ترالب کی بیوی ہو گی، یعنی اس کی بیوی۔ اس حق کی بدولت بدخو اسے اپنے حریف سے جو اس قدر مسکین اور صلح جو ہے، بہ آسانی لے سکے گا۔

پھر وہ پامیلا سے ملا جس نے اس سے کہا، "وائکاؤنٹ، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر تم راضی ہو تو ہم شادی کر لیں گے۔"

"تم اور کون؟" وائکاؤنٹ نے پوچھا۔

"میں اور تم۔ میں قلعے میں آؤں گی اور کاؤنٹس بنوں گی۔"

بدخو کو اس بات کی توقع نہیں تھی۔ اس نے سوچا، "تب تو اپنے دوسرے نصف سے اس کی شادی کرنے کی اداکاری بےکار ہے۔ میں اس سے خود شادی کروں گا اور قصہ ختم!"

سو اس نے کہا، "ٹھیک ہے۔"

پاسیلا بولی، میرے باپ سے معاملات طے کر لو۔"

تھوڑی دیر بعد پاسیلا، نجر پر سوار نیک خو سے ملی۔

"میدارو، " اس نے کہا، "میں اب محسوس کرتی ہوں کہ مجھے سچ مچ تم سے محبت ہے۔ تم اگر مجھے خوش کرنا چاہتے ہو تو تمہیں میرے ماں باپ سے شادی کی درخواست کرنی ہو گی۔"

نیک خو، جس نے اس کی محبت کے لیے اتنی بڑی قربانی دی تھی، دنگ رہ گیا۔ "اگر پاسیلا مجھ سے شادی کرنے میں خوش ہے تو میں کسی دوسرے سے اس کی شادی نہیں کرا سکتا،" اس نے سوچا، اور کہنے لگا، "جانم، میں تقریب کا انتظام کرنے جا رہا ہوں۔"

"میری ماں کے ساتھ معاملات طے کر لو، لازماً!" پاسیلا نے کہا۔

پاسیلا کی شادی کی خبر پھیلی تو سارا تراالباسیجان میں آ گیا۔ کچھ نے کہا وہ یک سمت سے شادی کر رہی ہے، کچھ نے کہا دوسرے سے۔ اس کے ماں باپ معاملات کو جان بوجھ کر گڈمڈ کرتے نظر آ رہے تھے۔ قلعے میں یقیناً ہر چیز پر رنگ روغن کیا جا رہا تھا اور اس بڑی تقریب کے لیے آرائش جاری تھی۔ وائکاونٹ نے سیاہ مخمل کا لباس بنوایا تھا جس کی آستین پر ایک بڑا سا اُبھار تھا اور دوسرا ان پر۔ بے خانماں نے بھی اپنے بیساکھی گھر کو صاف ستھرا کیا تھا اور اپنے لباس کی گھٹنے اور آستین پر مرمت کی تھی۔ کلیسا میں سارے شمع دان جگ مگ کر رہے تھے۔

پاسیلا نے کہا کہ وہ بارات کے لیے تک جنگل کو خیرباد نہیں کہے گی۔ اس کے لباسِ عروسی کے سلسلے میں بھاگ دوڑ میں نے کی تھی۔ اس نے نقاب اور لمبے دُنبالے کے ساتھ اپنے لیے ایک سفید لباس سیا اور خزام کی شاخوں سے ستارہ پٹی بنائی۔ چوں کہ اس کے پاس چند گز کپڑا بچ رہا تھا، اس نے ایک عروسی عبا بکری کے لیے اور ایک عروسی لباس بطخ کے لیے بھی بنایا۔ اور یوں اپنے پالتوؤں کے ساتھ جنگل میں دوڑتی پھری یہاں تک کہ شاخوں میں اُلجھ کر اس کی نقاب پھٹ گئی اور راستوں میں پڑی صنوبر کی ہر سوئی اور بلوط کا ہر چھلکا اس کے دنبالے میں اُلجھ کر رہ گیا۔

لیکن شادی سے قبل کی رات وہ فکرمند اور تھوڑی سی تشویش زدہ تھی۔ وہ ایک عریاں ٹیلے کی چوٹی پر اپنی ٹھوڑی کو ہتھیلی پر ٹکائے بیٹھی تھی۔ اس کا دنبالہ اس کے پیروں میں لپٹا تھا اور اس کی

Scanned with CamScanner

سنگارپوشی ٹیڑھی میڑھی ہو چکی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر آہیں تھیں اور نظریں جنگل پر جمی تھیں۔

میں ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا کہ بجے عیسو کے ساتھ، جو بہرحال مفقود تھا، اس کے مصاحب کا کردار ادا کر رہا تھا۔

"تم کس سے شادی کرو گی، پاسیلا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتی،" اس نے کہا۔ "میں واقعی نہیں جانتی۔ نہ جانے کیا ہو گا۔ بات بنے گی یا بگڑ جائے گی!"

جنگل سے دم بدم ایک طرح کی حتمی چیخ یا آہ ابھر رہی تھی۔ یہ دونوں نصف شدہ عاشق تھے جو اپنی چوکسی کے جوش و خروش کا شکار ہو کر، اپنے سیاہ چغوں میں لپٹے، ایک اپنے دبلے پتلے گھوڑے پر، دوسرا اپنے لنڈورے خچر پر، متوحش تصورات میں کراہتے اور آہیں بھرتے جنگل کے میدانوں اور گھاٹیوں میں بھٹک رہے تھے۔ اور دونوں سواروں کے آمنے سامنے آئے بغیر گھوم گھروں اور دھنسی ہوئی زمین پر سے چھلانگیں لگا رہا تھا اور خچر ڈھلوانوں کے پہلوؤں پر گھسٹ رہا تھا۔

پھر فجر کے وقت گھوڑا، جسے سرپٹ چال پر اکسایا گیا تھا، ایک گھاٹی میں لنگڑا ہو گیا اور بد خو شادی کے لیے وقت پر نہ پہنچ سکا۔ اس کے برعکس خچر آہستگی اور احتیاط سے چلتا رہا اور عین دلہن کی آمد پر جس کا دنہارا میں سے اور عیسو نے، جسے آخرکار ڈھونڈ لیا گیا تھا، سنبھال رکھا تھا، نیک شخص پابندیٔ وقت کے ساتھ کلیسا پہنچ گیا۔

یہ دیکھ کر کہ پہنچنے والا واحد دولہا بیساکھی پر جھکا ہوا نیک خو ہے، ہجوم قدرے مایوس ہوا۔ تاہم شادی کی رسومات باضابطہ طور پر ادا کی گئیں۔ دوشیزہ دلہن نے ہاں کہا، انگوٹھی کی منظوری دی اور پادری نے کہا، "میداردو آف ترالبا اور پاسیلا مار کولفی، میں بذریعہ ہذا تمہیں مقدس ازدواج میں منسلک کرتا ہوں۔"

عین اسی وقت ناف کلیسا کے سرے سے اپنے آپ کو بیساکھی پر سہارے وائکاؤنٹ داخل ہوا۔ اس کا نئی تراش کا تحملیں لباس پھٹا ہوا تھا اور اس سے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اس نے کہا، "میدارو آف ترالبا میں ہوں اور پاسیلا میری بیوی ہے۔"

نیک خو جھولتا ہوا اس کے دوبدو ہو گیا۔ "میدارو میں ہوں جس سے پاسیلا نے شادی کی ہے۔"

بدخو نے اپنی بیساکھی پھینک دی اور اپنا ہاتھ تلوار پر رکھ لیا۔ نیک خو نے بھی ایسا ہی کیا، کہ اس کے پاس کوئی اور راستا نہیں تھا۔

"ہوشیار!"

بدخو نے حملہ کیا، نیک خو بچاؤ میں پیچھے ہٹا، لیکن جلد ہی دونوں فرش پر لڑھک رہے تھے۔ انھوں نے اتفاق کیا کہ ایک ٹانگ پر متوازن ہو کر لڑنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے مقابلے کو ملتوی کر دینا چاہیے تاکہ وہ بہتر طور پر تیاری کر سکیں۔

"جانتے ہو میں کیا کروں گی؟" پامیلا نے کہا۔ "میں واپس جنگل میں چلی جاؤں گی۔" اور وہ کلیسا سے، ونہار سنبھالنے والے لڑکوں کے بغیر ہی، بھاگ کھڑی ہوئی۔ اس نے پل پر بکری اور بطخ کو منتظر پایا جو اس کے پہلو بہ پہلو چلتی گئیں۔

مقابلہ اگلے روز فجر کے وقت راہباؤں کے میدان میں رکھا گیا۔ ماسٹر پیترو کیودو نے ایک طرح کی پرکار کی شکل کی ٹانگ ایجاد کی تھی جو نصف شدہ آدمیوں کی پٹیوں سے جوڑے جانے پر انھیں سیدھے کھڑا رہ کر حرکت کرنے اور اپنے جسموں کو آگے پیچھے جھکانے میں مدد دیتی تھی جبکہ اس کا سرا مضبوطی سے زمین کے اندر رہتا تھا۔ گالاتیو کوڑھی، جو صحت مندی میں مالی نسب ہوا کرتا تھا، منصف کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ پامیلا کا باپ اور سپاہیوں کا نگراں بدخو کے مددگار تھے جب کہ نیک خو کے مددگار دو ہیوگن ات تھے۔ اپنی خدمات مہیا کرنے کے لیے ڈاکٹر ٹریلانی پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ پٹیوں کا بہت بڑا گولا اور روغن کا مرتبان ساتھ لایا تھا جیسے اُسے میدانِ جنگ میں زخمیوں کی دیکھ بھال کرنی ہو۔ چوں کہ اسے یہ سب چیزیں لانے کے لیے میری مدد درکار تھی، لہذا میں یہ لڑائی دیکھ سکتا تھا جو میرے لیے خوش نصیبی کی بات تھی۔

یہ ایک سبز گوں سویر، تھا۔ میدان میں دونوں دُبلے سیاہ مقابلہ جُو ہاتھ میں تلواریں لیے ساکت کھڑے تھے۔ کوڑھی نے اپنا بھونپو بجایا۔ یہ مقابلہ شروع کرنے کا اشارہ تھا۔ آسمان تنے ہوئے ریشے کی طرح تھرتھرایا، بھٹوں میں چھپے خواب موشوں نے منہ مٹی میں گاڑ دیے، پروں میں سر دیے ہوئے چتنے کوے اپنے پہلوؤں سے پر اکھاڑ کر خود کو آزار دینے لگے، کیڑوں کے منہ خود اپنی دُمیں کھانے لگے۔ سانپوں نے اپنے دانتوں سے خود اپنے آپ کو کاٹ لیا، بھڑوں نے اپنے

ڈنک پتھروں پر توڑ دیے اور ہر ایک شے خود اپنے خلاف ہو گئی۔ تالاب پالے سے جم گئے، کائی پتھر میں اور پتھر کائی میں تبدیل ہو گئے، خشک پتے مٹی بن گئے اور درخت گاڑھے سخت رس سے بھر گئے۔ اسی طرح انسان تلواروں سے مسلّح دونوں ہاتھوں کے ساتھ خود اپنے خلاف اٹھ کھڑا ہوا۔

پیترو کیےدو نے ایک بار پھر ہنرمندانہ کام کیا تھا۔ پرکار نما ٹانگوں نے میدان پر دائرے بنائے اور مقابلہ جُو چمکتی دھات اور گڈاکتی لکڑی کے دھاووں میں ایک دوسرے پر حملے اور بچاؤ کرتے ہوئے جا پڑے۔ لیکن انھوں نے ایک دوسرے کو چھوا نہیں۔ ہر سطح پر تلوار کی نوک سیدھی مخالف کے پھڑپھڑاتے ہوئے چغے پر جاتی محسوس ہوتی تھی اور ہر ایک اس حصے پر وار کرنے کا تہیہ کیے ہوئے معلوم ہوتا تھا جہاں کچھ نہیں تھا، یعنی وہ حصہ جہاں خود سے ہونا چاہیے تھا۔ یقیناً اگر دو نصف مقابلہ جُوؤں کے بجائے دو سالم مقابلہ جُو ہوتے تو انھوں نے ایک دوسرے کو بار بار زخمی کیا ہوتا۔ ہر چند کہ بدخو طیش اور تندخوئی کے ساتھ لڑ رہا تھا تاہم وہ اپنے حملے کبھی اس جگہ نہ کر سکا جہاں اس کا دشمن تھا۔ نیک خو کو درست مہارت حاصل تھی لیکن وہ بھی وائکاؤنٹ کے چغے کو چھونے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

ایک موقعے پر انھوں نے اپنے آپ کو اس طرح دو بدو پایا کہ ان کی تلواروں کے دستے ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے اور ان کی چوبی ٹانگوں کے سرے نوک دار بلیوں کی طرح زمین میں گڑے تھے۔ بدخو نے چونک کر اپنے آپ کو چھڑایا۔ وہ اپنا توازن کھو کر زمین پر لڑھکنے ہی والا تھا کہ اس نے ایک زوردار جھونٹا دیا، ٹھیک اپنے دشمن پر نہیں بلکہ اس سے بہت قریب، یہ جھونٹا، جو نیک خو کے جسم کو منقطع کرنے والے کنارے کے متوازی تھا، اس قدر قریب تھا کہ فوراً یہ نہ کھل سکا کہ وار اِس پہلو پر ہوا ہے یا اُس پر، لیکن جلد ہی ہم نے چغے کے نیچے بدن کو سر سے جانگھ تک خون سے گلابی ہوتے دیکھا۔ اب کوئی شک نہیں رہا تھا۔ نیک خو جھول گیا لیکن اس نے گرتے گرتے بھی ایک اُلل ٹپ اور تقریباً کاہل رحم حرکت میں اپنے حریف کے بہت قریب سر سے پیٹ تک، اس مقام کے درمیان جہاں بدخو کا جسم نہیں تھا، مگر جہاں ہونا چاہیے تھا اپنی تلوار کو جھونٹا دیا۔ اب بدخو کے جسم سے بھی وسیع اور کھنڈ زخم کی پوری لمبائی میں لہو اُبل رہا تھا۔ دونوں کی شریانوں کے بند سرے ان کے ٹانکوں سے پھٹ گئے تھے اور وہ زخم جس نے انھیں دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا، پھر سے کھل گیا تھا۔ اب وہ ایک دوسرے کے روبرو زمین پر پڑے تھے اور وہ

Scanned with CamScanner

خون جو کسی ایک ہی آدمی کا ہو کرتا تھا، زمین پر پھر سے مل رہا تھا۔

میں، کہ اس نظارے سے وحشت زدہ تھا، ڈاکٹر ٹریلانی کو نہیں دیکھ پایا تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ اپنے ٹڈے جیسی ٹانگوں پر خوشی سے اچھلتے ہوئے تالیاں بجا بجا کر چلا رہا ہے، "وہ بچ گیا ہے! وہ بچ گیا ہے! اب سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو۔"

آدھے گھنٹے بعد ہم ایک واحد زخمی آدمی کو اسٹریچر پر ڈالے قلعے میں لے جا رہے تھے۔ نیک و بد آدمی کو مضبوطی سے کَس کر باندھ دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر نے دونوں حصوں کی تمام آنتوں اور وریدوں کو ملانے میں بڑی احتیاط برتی تھی اور پھر میل بھر لمبی پٹیوں سے انھیں اتنی سختی سے اکٹھے باندھا تھا کہ وہ زخمی آدمی سے زیادہ کوئی قدیم حنوط شدہ لاش نظر آ رہا تھا

زندگی اور موت کے درمیان معلق میرے ماموں کی دیکھ بھال روز و شب کی جاتی تھی۔ ایک صبح ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے، جس پر ماتھے سے ٹھوڑی اور پھر نیچے گردن تک ایک سرخ لکیر تھی، سب سے پہلے سباستیانا نے کہا، "دیکھو، اس نے جنبش کی ہے۔"

میرے ماموں کے خط و خال پر سچ مچ ایک لرزش طاری تھی اور اُسے ایک رخسار سے دوسرے میں منتقل ہوتے دیکھ کر ڈاکٹر خوشی سے رو پڑا۔

آخر کار میداردو نے آنکھیں اور ہونٹ بند کر لیے۔ پہلے پہل اس کا چہرہ اونچا نیچا تھا۔ اس کی ایک آنکھ میں غصہ تھا جبکہ دوسری میں التجا، ماتھے پر ایک جگہ بل پڑے ہوئے تھے تو دوسری جگہ متانت تھی؛ منہ ایک طرف مسکرا رہا تھا تو دوسری طرف دانت کچکچا رہا تھا۔ پھر اس کا چہرہ بتدریج متناسب ہوتا گیا۔

ڈاکٹر ٹریلانی نے کہا، "اب وائکاؤنٹ صحت یاب ہو گیا ہے۔"

اور پامیلا بولی، "آخر کار مجھے ایسا شوہر مل جائے گا جس کی ہر چیز مکمل ہو گی۔"

اس طرح میرے ماموں میداردو پھر سے ایک مکمل آدمی بن گئے جو بھلے تھے نہ بُرے، بس اچھائی اور برائی کا مرکب تھے، یعنی بظاہر اُس وجود سے غیر مماثل نہیں تھے جو وہ دولخت ہونے سے پہلے تھے، لیکن دونوں حصوں کا الگ الگ تجربہ حاصل کرنے کے باعث ان کا ہوش مند ہونا لازم تھا۔ انھوں نے ایک خوش و خرم زندگی گزار دی، بہت سے بچے پیدا کیے اور منصفانہ حکومت

Scanned with CamScanner

کی۔ ہماری زندگیوں میں بھی بہتری آ گئی۔ کچھ لوگوں کو توقع ہو گی کہ وائکاؤنٹ کے دوبارہ مکمل ہونے سے حیرت انگیز مسرت کے دور کا آغاز ہوا ہو گا لیکن ظاہر ہے کہ ایک مکمل وائکاؤنٹ ساری دنیا کو مکمل بنانے کے لیے کافی نہیں ہے۔

اب پیترو کیودو سُولیاں نہیں بناتا تھا بلکہ چکیاں تیار کرتا تھا اور ٹریلانی نے خسرہ اور موتیے کی خاطر چھلاوؤں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ پورے پن کے اس تمام جوش و خروش کے درمیان میں اپنے آپ کو اداس تر اور مزید ناقص محسوس کرتا تھا۔ بعض اوقات اپنے آپ کو ادھورا محسوس کرنے والا مسّن عمر میں کم ہوتا ہے۔

میں بلوغت کی دہلیز پر پہنچ چکا تھا لیکن اپنے آپ سے کہانیاں کہنے کے لیے ابھی تک بڑے بڑے درختوں کی جڑوں کے درمیان چھپا کرتا تھا۔ صنوبر کی ایک سوئی کسی نوب یا بیگم یا مسخرے کی نمائندگی کر سکتی تھی۔ میں انھیں اپنی نظروں کے سامنے چلاتا پھراتا اور ان کے متعلق ختم نہ ہونے والی کہانیوں میں کھو جاتا۔ پھر اس خیالی چلاؤ پر شرم سے مغلوب ہو کر دوڑ جاتا۔

پھر ایک دن آیا جب ڈاکٹر ٹریلانی بھی ہم سے رخصت ہو گیا۔ ایک صبح ہماری خلیج میں برطانوی پرچم لہراتا بیڑا آیا اور ساحل سے دور لنگر انداز ہو گیا۔ میرے سوا، کہ مجھے معلوم نہیں تھا، سارا ترالبا جہازوں کو دیکھنے ساحل پر گیا۔ جہازوں کے کنارے اور بادبانوں کے رسّے اناناس اور کچھوے اٹھائے ہوئے ملاحوں سے بھرے تھے جو اپنے طومار لہرا رہے تھے جن پر لاطینی اور انگریزی میں اقوال درج تھے۔ عرشے پر کئی ہیٹ اور وگ پہنے ہوئے افسروں کے درمیان کپتان کُک نے ساحل کو اپنی دوربین کی زد میں لیا اور جوں ہی ڈاکٹر ٹریلانی کو دیکھا اسے جھنڈے کے ذریعے اشارے دے کر بلانے کا حکم دیا۔ 'فوراً جہاز پر آؤ ڈاکٹر! ہم تاش کا وہی کھیل شروع کرنا چاہتے ہیں۔'

ڈاکٹر نے ہم سب ترالباوالوں کو الوداع کہا اور رخصت ہو گیا۔ ملاحوں نے ایک ترانہ 'اوہ، آسٹریلیا!" گاتے ہوئے ڈاکٹر کو جہاز پر کھینچ لیا جو چھچھوندر کے پیچھے پر سوار تھا۔ پھر جہازوں نے لنگر اٹھا لیا۔

میں جنگل میں دُور اپنے آپ سے کہانیاں کہہ رہا تھا، سو کچھ نہیں دیکھ پایا۔ بعدازاں جب مجھے معلوم ہوا تو میں نے چلاتے ہوئے ساحل کی طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ 'ڈاکٹر! ڈاکٹر ٹریلانی! مجھے اپنے ساتھ لے چلو! ڈاکٹر، تم مجھے یہاں نہیں چھوڑ سکتے!"

Scanned with CamScanner

لیکن تب تک جہاز افق پر غائب ہو رہے تھے اور میں ذمے داریوں اور چھلاووں سے بھری اس دنیا میں پیچھے رہ گیا تھا۔

**

علمی و ادبی کتابی سلسلہ

تحریر

ترتیب: رفیق احمد نقش

زیر اہتمام: ادارۂ تحریر، ۸۰-۳-ڈی، سیٹلائٹ ٹاؤن، میرپور خاص ۶۹۰۰۰
رابطے کے لیے: ب-۸۷، بلاک این، شمالی ناظم آباد، کراچی - ۷۴۷۰۰

ترقی پسند فکر کا ترجمان
علمی اور ادبی کتابی سلسلہ

ارتقا

ادارہ: حسن عابد، واحد بشیر، راحت سعید
۸، الاحمد مینشن، بلاک ۱۳ بی، گلشن اقبال، یونیورسٹی روڈ، کراچی

سہ ماہی

بادبان

مدیر اعزازی: ناصر بغدادی
E-2, 8/14 معمار اسکوائر، بلاک ۱۴، گلشن اقبال، کراچی ۷۵۳۰۰

سہ ماہی

رجحانات

مدیر: طاہر اسلم گورا
۳۵ سی، لوئر مال، لاہور

سہ ماہی

تشکیل

مدیر: احمد ہمیش
2-J, 8/6 عروج کلوسک بلڈنگ، ناظم آباد، کراچی

قلمکار اور قاری کے درمیان ایک پل

سہ ماہی

نیا ورق

مدیر: ساجد رشید

36/38, Aloopanoo Bldg., 4th Floor, Room 25,
Umer Khadi Cross Lane, Mumbai 9.

ادب اور فنونِ لطیفہ کا ترجمان

سہ ماہی

ذہنِ جدید

مرتب: زبیر رضوی

پوسٹ بکس ۷۰۳۳، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

اردو ادب کا شش ماہی انتخاب

سوغات

مدیر: محمود ایاز

۸۴، تھرڈ مین، سیکنڈ کراس، ڈیفنس کالونی، اندرانگر، بنگلور ۵۶۰۰۳۸

ماہ نامہ

شب خون

ترتیب و تہذیب: شمس الرحمن فاروقی

پوسٹ بکس ۱۳، الٰہ آباد ۲۱۱۰۰۳

سہ ماہی

جامعہ

ترتیب: شمیم حنفی، سہیل احمد فاروقی

ذاکر حسین انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

Scanned with CamScanner

aaj

an urdu journal of literature and ideas

Published quarterly from Karachi, *aaj* presents each time a selection of contemporary writings from many languages of the world, translated in Urdu, as well as some ground-breaking Urdu writings of today. At the end of each regular issue a special section - a small anthology in itself - is devoted to a particular writer or subject. The special issues of *aaj* published so far have presented selections of Arabic, Persian and Hindi short stories, selected fiction of Gabriel Garcia Marquez, writings from different parts of the world covering the tragedy of Bosnia, and, recently, the "Story of Karachi" in two volumes.

Subscription

Pakistan:
Rs 300 (one year), Rs 500 (two years)
Please send the subscription through
cheque/pay order/draft drawn in favour of
"Quarterly Aaj, Karachi"
to the following address:
Managing Editer, aaj,
A-16, Safari Heights,
Gulistan-e-Jauhar, Karachi 75290.
Tel: (021) 811-3474
e-mail: aaj@biruni.erum.com.pk

Outside Pakistan:
Individuls: US$ 25 (one year), US$ 45 (two years)
Institutions: US$ 40 (one year), US$ 70 (two years)
Please send the subscription in US dollars to
Dr Muhammad Umar Memon,
5417, Regent Street,
Madison, WI 53705, USA.
Tel: (608) 233-2942
Fax: (608) 265-3538
e-mail: mumemon@facstaff.wisc.edu

Subscription includes registered air mail charges.

Scanned with CamScanner

CITY PRESS

A series of publications on urban issues
Series Editor: Ajmal Kamal

A-16 Safari Heights, Block-15, Gulistan-e-Jauhar, Karachi 75290

Working with Government

The story of OPP's collaboration with state agencies for replicating its Low Cost Sanitation Programme

Arif Hasan

ISBN 969-8380-00-0
Price: Rs 100

How Communities Organize Themselves

Stories from the field

Compiled by
Kenneth Fernandes

ISBN 969-8380-01-9
Price: Rs 50

Urban housing policies and approaches in a changing Asian Context

Arif Hasan

ISBN 969-8380-06-x
Price: Rs 50

Housing Crisis in Central Asia

Arif Hasan

ISBN 969-8380-07-8
Price: Rs 120

John Brunton's Book

The Diary of John Brunton, Engineer, East India Railway Company

ISBN 969-8380-03-5
Price: Rs 150

Scanned with CamScanner

۲۵

قیمت: سو روپے

آج کی کتابیں
اے ۱۶، سفاری بالمس، بلاک ۱۵، گلستانِ جوہر، کراچی ۷۵۲۹۰